خدیجۃ الکبریٰ کی ۴۰ کی - علاوہ بریں خدیجہ پیغمبر صاحب کی پہلی بی بی تھیں اور پیغمبر صاحب خدیجہ کے تیسرے شوہر۔ ان کے پہلے شوہر ابو ہالہ اور دوسرے عتیق اِن کو بیوہ چھوڑ کر مرگئے تھے - اِس حکایۃ سے کام کی کئی باتیں مستنبط ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ نفسانی خواہش پیغمبر صاحب کو خدیجہ سے نکاح کرنے کی محرّک نہیں ہوئی ورنہ وہ اپنے سے پندرہ برس بڑی بیوہ صاحب اولاد کو نہ کرتے بل کہ خدیجہ میں چند در چند خصوصیتیں تھیں۔ سب سے زیادہ نمایاں خصوصیۃ اِن کے مذہبی خیالات تھے اِن کے تفصیلی حالات پیغمبر صاحب کی دوسری بی بیوں کی طرح اُن ہی کے بیانِ خاص میں لکھیں گے ۔ تو جب عنفوانِ شباب میں پیغمبر صاحب نے نفسانی خواہش کی پروا نہ کی بعد کے نکاحوں میں جب کہ یوماً فیوماً عمر رو بانحطاط تھی اور اسلامی تردّدات رُوبازدیاد کیوں کر کر سکتے تھے پیغمبر صاحب کے مزاج میں حیا کی بھی افراط بدرجۂ غایۃ تھی اَلْحَیَاۗءُ مِنَ الْاِیْمَانِ[57]۔ اور اس کی وجہ سے وہ تکثیر نار وا پر قادر ہی نہ تھے ۔ ایک دفعہ کا مذکور ہی کہ کعبہ آتشِ اتّفاقی سے جل کر مسمار ہو گیا تھا۔ قریش نے جمع ہو کر از سر نو اُس کو بنانا شروع کیا تو ہر شخص کار ثواب سمجھ کر اُس کی تعمیر میں جو جس سے بن پڑتا تھا خدمۃ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ مال مسالا گدھوں پر ڈھو ڈھو کر پہنچا رہے تھے۔ اُن میں پیغمبر صاحب کے چچا عباس بھی تھے۔ اتنے میں پیغمبر صاحب بھی آنکلے اور لگے کندھے پر پتھر ڈھونے ۔ اِس وقت پیغمبر صاحب کی عمر ۱۳ برس کی رہی ہوگی اور عرب میں اتنی عمر کے لڑکے ستر عورۃ بہت کم کیا کرتے تھے۔ عباس نے جوان کو کندھے پر پتھر لاتے دیکھا ان کا تہمد گنڈلی بنا کندھے پر رکھ دیا۔ کہ اس پر پتھر رکھو نہیں کندھا چھل جائے گا تہمد کا کھولنا تھا کہ یہ مارے حیا کے غش کھا کر گر پڑے ۔ تہمد بدستور باندھ دیا۔ تب اُن کو ہوش آیا پھر آخر عمر تک یہی حال رہا کہ عورتیں بیعۃ کرنے آتیں تو اُن کو دُور ہی سے کہہ دیتے کہ جاؤ تمھاری بیعۃ ہو گئی غرض کسی اجنبی عورۃ کا ہاتھ تک نہیں چھوا۔ ہم نے اب تک پیغمبر صاحب کی تکثیر ازواج کے متعلق جو کچھ لکھا پیغمبر صاحب کی طرف سے لکھا کہ اُن کی مناکحۃ میں غرضِ اوّلین پاسداریِ اسلام ہوتی تھی اور اگر علیٰ سبیل التنزّل غرضِ ثانوی کے طور پر اس میں شائبہ خواہشِ نفسانی کا بھی ہو تو چوں کہ خواہشِ نفسانی فطری اور خداداد اور بقائے نوعِ انسان کا سببِ ظاہر ہی اور اسی وجہ سے کوئی فردِ بشر اِس سے بری نہیں تو پیغمبر صاحب میں اِس خواہش کے ہونے سے اُن کی شانِ پیغمبری میں کسی طرح کا ضعف اور فتور نہیں آتا۔ بلکہ اِس خواہش کا فقدان نقصانِ بشریّۃ ہی اور پیغمبری کی شان اِس سے ارفع و اعلیٰ ہی۔ یہ سب کچھ ہی مگر نکاح سے تو زن و شو دو شخصوں کے حقوق متعلّق ہوتے ہیں۔ تو ہم کو اُمّہات المؤمنین کے لحاظ سے بھی پیغمبر صاحب کے نکاحوں پر نظر کرنی چاہیئے کہ کہیں یہاں پانی نہ مرتا ہو۔ تو عرب کے رسم و رواج نے تو عورتوں کے تمام حقوق پامال کر دیئے تھے کہ عورۃ مرد سے کسی حق کا مطالبہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اسلام نے لَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ[52] ۔ سے اور تکثیر ازواج کی صورۃ میں عدل کی شرط سے عورتوں کو حقدار ٹھیرایا۔ دیکھنا یہ ہی کہ پیغمبر صاحب اپنی ازواج میں کہاں تک شرطِ عدل کا ایفا کرتے تھے ۔ سو سیر کی تمام کتابیں بالاجماع گواہی دیتی ہیں کہ پیغمبر صاحب نے اُمّہات المؤمنین میں بالمساواۃ دن تقسیم کر رکھے تھے جس دن جس کی باری ہوتی اُسی کے یہاں شب باش ہوتے ۔ سفر میں کسی کو ساتھ

۵۷ حیا ایمان کی ایک شاخ ہی ۱۲ ۵۲ جیسے (مردوں کا حق) عورتوں پر ویسے ہی دستور کے مطابق عورتوں کا (حق مردوں پر) ۱۲

لے جانا ہوتا تو قرعہ ڈالتے۔ غرض سفر میں حضر میں کسی حالۃ میں مساوات کے قاعدے کا نقض نہیں کیا۔ جس دن مرض الموت میں علیل ہوئے زینب بی بی کی باری تھی۔ اس خیال سے کہ اُمّ المؤمنین عائشہ رضؓ کے گھر میں تیمارداری اچھی طرح ہوگی اور اُن کے والد ابوبکر رضؓ جو پیغمبر صاحب کے مُشیرِ خاص تھے بیٹی کے گھر بے تکلف آمد و شد کر سکیں گے سب بی بیوں کی اجازت سے عائشہ رضؓ کے گھر بیماری کے دن کاٹنے چلے گئے۔ دوسری بات یہ ہی کہ اُمّہات المؤمنین کو عام بی بیوں پر قیاس کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ[۵۱]۔ بے شک پیغمبر صاحب کی بی بیاں پیغمبر تو نہ تھیں اور کبھی کوئی عورت نبی نہیں ہوئی۔ مگر مردوں میں جو شرف پیغمبر صاحب کو حاصل تھا عورتوں میں شرف ہم بستریِ پیغمبر کو بھی اُسی کے لگ بھگ سمجھو۔ اَلطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ[۵۲]۔ دنیا کی نظروں میں۔ وَاَزْوَاجُہٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ[۵۳] کیا کچھ تھوڑا شرف ہی۔ جس طرح پیغمبر صاحب اسلام کے آگے کسی دنیاوی خواہش کی چنداں پروا نہیں کرتے تھے یہی حال کُل اُمّہات المومنین کا تھا کہ پیغمبر صاحب کی ہم بستری کے آگے اُن کی سب خواہشیں مغلوب تھیں۔ عورتوں کو نان و نفقے کی بڑی طمع ہوتی ہی تو اُمّہات المومنین سب کی سب خوش دلی کے ساتھ فقر و فاقے میں بسر کرتی تھیں۔ پیغمبر صاحب نے صاف لفظوں میں اِن سب سے کہہ دیا تھا۔ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ۝ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا[۵۴]۔ روایۃ ہی کہ آیۃ نازل ہوئی تو پیغمبر صاحب نے عائشہ رضؓ کی نوعمری کی وجہ سے اُن سے کہا تھا کہ دو ٹوک جواب دینے سے پہلے تم اپنے باپ سے رائے لے لینا۔ عائشہ رضؓ نے چھوٹتے ہی کہا کہ باپ سے صلاح لینے کی کچھ ضرورت نہیں۔ میں خدا رسول اور دارِ آخرت کو اختیار کرتی ہوں۔ ۔۔۔۔۔۔ اِسی سے سمجھ لو کہ اُمّہات المومنین پیغمبر صاحب کی زوجیۃ کی کس قدر عظمت کرتی تھیں۔ امّ المؤمنین سودہ رضؓ عمر سے اُتری ہوئی تھیں۔ اِن کو از خود خیال ہوا کہ کہیں پیغمبر صاحب مجھکو چھوڑ نہ دیں۔ انھوں نے خوشی راضی سے عائشہ رضؓ کو اپنی باری دے دی اور پیغمبر صاحب سے کہا کہ مجھکو اسی قدر بس کرتا ہی کہ میں قیامۃ میں آپ کی بی بی کہہ کر پکاری جاؤں۔

ہم کوئی ضرورت اس بات کی نہیں دیکھتے کہ پیغمبری تقدس کے لحاظ سے پیغمبر صاحب کے نکاحوں کو دنیوی اغراضِ خسیسہ کے لوث سے بالکل پاک اور بری ثابت کریں۔ ہم پیغمبر صاحب کو تمام لوازمِ ضعفِ بشریۃ کے ساتھ بشر مانتے ہیں اور وہ خود اُس کے معترف تھے۔ ہاں جو بات تفتیشِ حالات سے ہم کو ثابت ہوئی وہ یہ ہی کہ پیغمبر صاحب اور اُمّہات المومنین فریقین کو نکاح میں مذہبی غرض زیادہ تر مقصود تھی۔ پیغمبر صاحب کو اسلام کی تقویۃ اور اُمّہات المومنین کو شرفِ ہم بستریِ پیغمبر۔ دنیاوی اعتبار سے بھی کوئی عزۃ اِس عزۃ کو پا سکتی ہی کہ پیغمبر صاحب کی بی بیاں ادب اور تعظیم کی رو سے

---

[۵۱] پیغمبر کی بی بیو اتم کچھ عام عورتوں کی طرح تو ہو نہیں ۱۲ [۵۲] پاک عورتیں پاک مردوں کے لیئے ہوتی ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیئے ۱۲ [۵۳] اور پیغمبر کی بی بیاں (ادب و تعظیم میں) اُن کی مائیں ہیں ۱۲ [۵۴] کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کے ساز و سامان کی طلب گار ہو تو آؤ میں تمھیں (کچھ) دے دلا کر خوش اسلوبی سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم خدا اور اُس کے رسول اور آخرت کے گھر کی خواہاں ہو تو تم میں سے جو نیکو کار ہیں اُن کے لیئے خدا نے (بڑے) بڑے اجر تیار کر رکھے ہیں ۱۲

تمام اُمتہ کی مائیں قرار پائیں۔ کسی اَور عورۃ کو بھی یہ رتبہ حاصل ہی۔ عورتیں بالطبع کھانا پینا خوش حال گھر ڈھونڈا کرتی ہیں سو پیغمبر صاحب کو تو خوش حالی ساری عمر نصیب ہی نہیں ہوئی۔ اور ہوتی کہاں سے باپ کو تو آنکھ کھول کر دیکھا تک نہیں۔ دادا نے یتیم پوتے کو پالا۔ تو خیر ان کے وقت میں خدا نے ننگا بھوکا نہیں رکھا۔ دادا کے مرے پیچھے چچا ابو طالب نے دست گیری کی۔ تو وہ خود قرض دار اور کثیر العیال تھے۔ اُم المومنین خدیجہ رضؓ کے تعلق سے پیغمبر صاحب کی خوش حالی کا آغاز سمجھو تو مذہبی مخالفۃ کی وجہ سے قریش نے ان کو اور ان کے طرف داروں کو شعب ابی طالب میں نظر بند کر دیا۔ برادری سے خارج۔ کھان پان موقوف۔ لین دین بند۔ میل جول متروک۔ تو ایسی حالۃ میں خیالی خوش حالی کیا کام دے سکتی تھی۔ ہجرۃ کے بعد سے خیال ہو سکتا ہی کہ مدینے میں مریدوں سے فتوحات ہونے لگی ہوگی۔ تو فتوحات کا حال یہ ہی کہ زکوٰۃ اور صدقات کو پیغمبر صاحب نے نہ صرف اپنے اوپر بلکہ تمام بنی ہاشم پر حرام کر رکھا تھا۔ اور اُن کو لوگوں کے مال کا میل اور اُن کے لینے کو ذلیل بے غیرتی فرماتے تھے۔ ہاں غنیمۃ کی ایک رقم تھی جس سے خوش حالی کی توقع کی جا سکتی تھی تو عرب کا دستور تھا کہ لڑائی میں جو لوٹ کا مال ہاتھ آتا اُس کا چوتھائی فریق غالب کے سردار کا حق ہوتا اور تین چوتھائی لشکر کا۔ پیغمبر صاحب نے چوتھائی کو گھٹا کر پانچواں کر دیا اور پانچواں بھی یک انار و صد بیمار۔ واعلموا انما غنمتم من شئ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتمیٰ والمسٰکین وابن السبیل[۵۱]۔ ایک دفعہ کا مذکور ہی کہ حضرت علی رضؓ کو معلوم ہوا کہ پیغمبر صاحب کے پاس غنیمۃ میں کچھ لونڈیاں آئی ہیں آپ نے حضرت فاطمۃ الزہرا رضؓ کو جا خبر دی کہ تم شکایۃ کیا کرتی ہو کہ چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے ہیں اور گھر کے کام کاج سے مجکو اتنی فرصۃ نہیں ملتی کہ بچوں کی خبر لوں۔ لیسے میں جا کر اپنے والد صاحب سے ایک لونڈی مانگ لاؤ۔ حضرت فاطمہ گئیں اور ان کو پیغمبر صاحب کی عادۃ معلوم تھی کہ وہ مہاجر مسلمانوں کی تکلیف کے آگے اپنی اور اپنے قرابت مندوں کی تکلیف کی پروا نہیں کرتے ہچکچاتی ہوئی پیغمبر صاحب کے پاس تشریف لے گئیں۔ اتفاق سے اُس وقت پیغمبر صاحب گھر تشریف نہیں رکھتے تھے انھوں نے اُمّ المومنین بی بی عائشہ رضؓ سے اپنا واقعہ بیان کیا اور چلتے وقت کہتی گئیں کہ پیغمبر صاحب کو میرا آنا اور یہ واقعہ یاد دلا دینا۔ پیغمبر صاحب تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضؓ نے بی بی فاطمۃ الزہرا رضؓ کے آنے اور آنے کی ضرورۃ بیان کی۔ پیغمبر صاحب بی بی فاطمہ کے گھر تشریف لے گئے اور اُس وقت یہ دونوں میاں بیوی سونے ہی کو تھے۔ اُنھوں نے پیغمبر صاحب کی آہٹ پائی تو لگے کھڑے ہونے۔ پیغمبر صاحب نے فرمایا بیٹا! لیٹے رہو چناں چہ آپ بی بی فاطمہ رضؓ اور حضرت علی رضؓ دونوں کے بیچ میں جا بیٹھے اور لگے فرمانے کہ تم نے جس چیز کی مجھ سے درخواست کی ہی میں اِس سے بہتر ایک چیز تمھیں بتاتا ہوں وہ یہ کہ جب تم دونوں میاں بیوی سونے کے لیئے بچھونے پر آیا کرو تو ۳۳ دفعہ سبحان اللہ اور ۳۳ دفعہ الحمد للہ اور ۳۴ دفعہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو۔ یہ عمل تمھارے لیئے خادم سے بہت بہتر ہی۔ تو یہ نہیں کہ پیغمبر صاحب کو خوش حال ہونے کے مواقع نہ تھے۔ مواقع تو بہتیرے

[۵۱] اور (مسلمانو) جان رکھو کہ جو چیز تم (لڑائی میں) لوٹ کر لاؤ اُس کا پانچواں حصۃ خدا اور رسول کا اور (رسول کے) قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ۱۲

تھے مگر وہ آپ خوش حال زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اپنے خاندان بھر کے حق میں خدا سے دعا کیا کرتے تھے اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ کَفَافًا[ا] پیغمبر صاحب کی بڑی خوش حالی اگر اس کو خوش حالی سمجھا جائے یہ تھی کہ خیبر بے لڑے بھڑے فتح ہو گیا تھا وہاں کا خراج دستور کے مطابق بلا شرکت غیرے خاص پیغمبر صاحب کا حق تھا خیبر سے جو موٹا جھوٹا اناج از قسم جَو وغیرہ برس کے برس آتا وہ امہات المومنین میں علی السّویہ تقسیم کر دیا جاتا تھا اور اُس میں تنگی سے گزر اوقات ہوتی تھی تنگی پر مزید تنگی یہ تھی کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ تنگی کی شکایت کرے۔ ایک دفعہ تنگیِ رزق سے تنگ آ کر امہات المومنین نے پیغمبر صاحب سے فریاد کی تو پیغمبر صاحب روٹھ کر سب کے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ وہی مَثَل ہوئی کہ نماز معاف کرانے گئے روزے گلے پڑے۔ پیغمبر صاحب کو روٹھا دیکھ ابوبکرؓ نے عائشہ رضؓ کی اور عمرؓ نے حفصہؓ کی باپ ہونے کی حیثیت سے خوب خوب گوشمالی کی۔ اور تنگی پر گزر کی صورت یہ تھی کہ کسی نے عائشہ رضؓ سے پوچھا تو اُنھوں نے کہا کیسا چھاننا پھٹکنا جیسے جو آئے پیسے بھوسی پھونک مار کر اُڑا دی آٹا گوندھا پکایا کھا لیا۔ یہ روٹی ہوتی تھی اور سالن نِعْمَ الْاِدَامُ الْخَلُّ[۲]۔ ان لوگوں کی غالب غذا کھجوریں کھائیں اور پانی سے اُتار لیں۔ یہ تھی پیغمبر صاحب کی زندگی اُن وقتوں میں جب وہ قریب قریب تمام جزیرۂ عرب کے بادشاہ تھے۔ اس زہد اور اس ایثار پر بھی اگر وہ سچے پیغمبر نہ تھے تو پیغمبری باتیں ہی باتیں ہیں۔ پیغمبر صاحب کے حالاتِ عسرت و ضیقِ عیش کہ وہ دوست دشمن سب کو معلوم تھے۔ اس پر بھی امہات المومنین نے کیوں پیغمبر صاحب کی زوجیت میں آنا اور رہنا قبول کیا اس کی وجہ شرفِ ہم بستری کے سوائے اَور تو کچھ سمجھ میں آتی نہیں اور آسکتی بھی نہیں۔ سوکنوں کی باہمی کٹا چھنی معمولی اور ضروری بات ہے اور کٹا چھنی ہوتی ہے تو اغراض خسیسۂ دنیوی کی وجہ سے اور چوں کہ امہات المومنین کے حالات میں اس طرح کی بیہودگیوں کا کہیں مذکور تک نہیں یہ بھی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ امہات المومنین کو مذہبی شرف کے آگے دنیوی مبتذل اور چھوٹی اغراض پر نظر ہی نہ تھی۔ ورنہ خانہ داری کے ہمہ وقت کے رگڑے جھگڑے پیغمبر صاحب کو اس قدر پریشان کئے رہتے کہ وہ مقصدِ اہم اشاعتِ اسلام کی طرف توجہ کرنے کی مطلق فرصت نہ پاتے واذ لیس فلیس۔

مصنف امہات الامہ پر کفر کا فتوےٰ

اُمہات الامہ ہم نے ابھی دیکھ کر رکھی ہی تھی کہ روزانہ پیسہ اخبار لاہور میں کسی فرخ آبادی کا ایک مراسلہ دیکھنے میں آیا۔ جس میں یہی کچھ لکھا تھا کہ دہلی میں بہت بڑا جلسہ ہوا اور اُس میں امہات الامہ کے اکثر مضامین پڑھے گئے۔ آخر متفق اللفظ ہو کر وہاں کے مولویوں نے مصنفِ امہات الامہ کو کافر قرار دیا۔ اُن کے ساتھ کھان پان سب بند۔ حقّہ پانی ترک۔ اس کے چند ہی روز کے بعد ایک مطبوعہ اور مُہر شدہ کفر کے فتوے کی بھی زیارت ہوئی۔ زیارت کرتے ہی یادش بخیر ہمیں چند اَور کافر یاد آ گئے جن کی نسبت ایک زندہ علّامہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے "عوام کا ہر زمانے میں یہ حال رہا ہے کہ جو بات اُن کے فہم اور خیال سے باہر ہوتی تھی اُس کے اظہار پر وہ جان کے دشمن بن جاتے تھے۔ سلطنت کی روک تھام سے صرف اس قدر ہو سکتا تھا کہ کسی کی جان کو خطرہ نہ پہونچنے پائے۔ لیکن صرف اس بندش سے کیا کام چل سکتا تھا۔ عوام جس کو چاہتے تھے مردودِ عام کر سکتے تھے۔ سب و دشنام دے سکتے تھے۔ آرام و راحت سے بسر کرنے میں خلل انداز ہو سکتے تھے۔ اس سے بڑھ کر یہ آفت تھی کہ ظاہر پرست فقہا بھی عوام کے ساتھ

[ا] خداوندا محمد کی اہل و عیال کو اتنی روزی دے جس سے وہ سرکش اور مرتکب گناہ نہ ہوں ۱۲ [۲] عمدہ سالن سرکا ہے ۱۲

ہو جاتے تھے اور کفر کے فتووں سے انسان کا زندہ رہنا مشکل کر دیتے تھے۔ امام غزالی۔ آمدی۔ رازی۔ ابن رشد۔ شہرستانی اور ابن تیمیہ کے حالات پڑھو ان میں ایک بھی فقہا کے فتووں کے حملوں سے نہ بچ سکا۔ ان کافروں کا حال پڑھکر ہم کو معلوم ہو گیا کہ ہمارا زمانہ بھی متعصب فقہا سے خالی نہیں۔ جن بزرگوں نے مصنف امہات الامہ کے کفر کے فتوے پر مہریں لگائی ہیں اُن میں ماشاء اللہ آج ایک ایک فقیہ اور اسلام کا چمکتا ہوا تارا ہی۔ اُن کے علم و فضل کے ڈنکے چار دانگ ہندوستان میں بج رہے ہیں۔ وہ اسلام کی خدمت میں اپنے تمام عیش و نشاط کو نثار کیئے ہوتے جا بجا علمی مدارس قائم کرتے پھرتے اور اسلامی انجمنوں کی بنیادیں ڈالتے پھرتے ہیں۔ دہریوں۔ نیچریوں اور عیسائیوں اور آریوں اور خدا معلوم کن کن مذہب والوں کے سامنے بحث مباحثے کر کے اسلام کی حقانیت ثابت کرتے پھرتے ہیں مگر افسوس نتیجہ جو کچھ ہوتا ہی وہ سب کو معلوم ہی اور وہ یہ کہ سال بھر میں اگر ایک کو مسلمان بناتے ہیں تو چار کو خارج کرتے ہیں ؎

برا حوالِ آں کس بباید گریست — کہ دخلش بود نوزدہ خرچ بیست

غرض مولانا پر جو کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہی اُس کو ہم بطور یادگار نقل کفر کفر نباشد کے طور پر ذیل میں درج کرتے ہیں ؎

لاؤ تو کفر نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں — کس کس کی مہر ہی سر محضر لگی ہوئی

نقل فتویٰ

(ڈپٹی نذیر احمد صاحب بالقابہ کی کتاب امہات الامہ کی نسبت علمائے اسلام کا آخری فیصلہ)

ڈپٹی صاحب بالقابہ نے عیسائیوں کو جواب دینے کے پردے میں جو کتاب امہات الامہ لکھی ہی وہ کہنے کو تو عیسائیوں کا جواب ہی۔ لیکن فی الحقیقۃ اسلام اور پیغمبر اسلام اور اصحاب کرام اور اہل بیت عظام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سخت سے سخت حملہ ہی۔ اس میں ایسے ایسے لفظ استعمال کیئے گئے ہیں جو قاطبۃً تمام اہل اسلام کی دل شکنی کا باعث ہوئے۔ اطراف ہندوستان میں ایک شور مچ گیا۔ ہر طرف سے اُس کے بارے میں دہلی کے نامور علماء کے پاس تحریریں آنے لگیں کہ دہلی سے یہ کس آفت نے سر اُٹھایا۔ دہلی کے عمائد نے ہر چند کوشش کی اور ڈپٹی صاحب کے پاس پیام بھیجے کہ وہ ان کتابوں کو تلف کر دیں اور ان ناشایستہ الفاظ سے تحریری برات ظاہر کر دیں اور شائع فرما دیں کہ میں اپنے ان مضامین کو واپس لیتا ہوں مگر باوجود چند ماہ کی کوشش کے اُن کی جانب سے کوئی تسلی بخش جواب حاصل نہیں ہوا جس سے سمجھا گیا کہ ڈپٹی صاحب اُنھیں مضامین کے معتقد بھی ہیں اور اس اعتقاد سے ہٹنا نہیں چاہتے اس لیئے مجبور ہو کر ۱۹۔ اپریل ۱۹۰۹ء کو انجمن ہدایۃ الاسلام دہلی کے سالانہ جلسے کے مجمع میں۔ کہ انجمن کے جلسے سے علیحدہ تمام مجمع میں مولانا مولوی فیض الحسن صاحب نے تحریک فرمائی کہ علمائے اسلام ڈپٹی صاحب کی کتاب کے متعلق اپنی رائے ظاہر فرما دیں۔ اور مولانا ابو سراج نظام الدین احمد صاحب نے اس کی تائید کی اس پر عالی جناب فاضل اجل علامۃ اکمل مولانا مولوی محمد لطف اللہ صاحب مفتی ریاست رامپور نے علی الاعلان فرمایا کہ کتاب امہات الامہ اور اُس کے مصنف کی تمام وہ تصنیفات جو اسی قسم کے مضامین سے مملو ہیں بے شک اس قابل ہیں کہ کوئی مسلمان جو خدائے تعالیٰ اور اُس کے رسول اور دار آخرۃ پر ایمان رکھتا ہی ہرگز ہرگز اُن کو نہ دیکھے اور تمام مسلمانان ہندوستان وغیرہ اس کتاب کو دائرہ اسلام سے

خارج سمجھیں۔ اور اعلان کر دیں کہ کسی غیر مذہب والے کو یہ حق نہیں ہی کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں یہ کتاب یا اس کے مصنف کی دوسری کتابوں کے مضامین پیش کرے۔ ہمارے نزدیک اس کتاب کا مصنف دائرہ اسلام سے خارج ہی مسلمانوں کو اس سے سلام علیک ترک کرنا چاہیئے۔ اور تا وقتیکہ وہ ان مضامین سے توبہ شائع نہ کریں ان کو مسلمان نہ سمجھنا چاہیئے اور نہ تعلقات اسلامی ان کے ساتھ رکھے جائیں۔

مفتی صاحب کے اس کہنے سے تمام علماء نے اتفاق کیا اور تمام حاضرین نے ایک پُر جوش لہجہ سے اقرار کیا کہ ضرور ہم ایسا ہی کریں گے۔ وانا علیٰ ذالک لمن الشاھدین۔ محمد لطف اللہ عفی عنہ۔

العبد	العبد	العبد
احمد علی عفی عنہ مدرس مدرسہ میرٹھ	یہ سب میرے روبرو اسی طرح ہوا جس طرح کہ اوپر لکھا ہی۔ عبد اللہ عفی عنہ کرنالی	محمد فضل الرحمن عفا اللہ عنہ مدرس مدرسہ اسلامی کرنال
محمد اشفاق تھانوی واعظ انجمن ہدایۃ الاسلام دہلی		

العبد	العبد	العبد	العبد
سید عبد الواجد مفتی انجمن ہدایۃ الاسلام دہلی	محمد شفیع اللہ واعظ انجمن ہدایۃ الاسلام دہلی	فیض الحسن عفی عنہ آنریری جنرل سکرٹیری انجمن حمایۃ بیوگان قصبہ کٹھور ضلع میرٹھ	ابو الابرار محمد اسرار الحق سفیر انجمن ہدایۃ الاسلام دہلی

العبد	العبد	
حبیب احمد عفا اللہ عنہ	میں اگرچہ اس جلسے میں موجود نہ تھا مگر کتاب مذکور کے واجب التلف اور مصنف کتاب کے واجب المتارکۃ ہونے میں شک نہیں محمد کفایۃ اللہ عفا عنہ مولاہ مدرس مدرسۂ امینیہ دہلی	خادم العلماء ابو سراج نظام الدین احمد عفا اللہ عنہ جھجری وکیل انجمن ہدایۃ الاسلام دہلی

(مطبوعہ حقانی پریس دہلی)

کفر کے فتوے کے بعد راقم نے "کشف الغمۃ در رد امہات الامہ" ایک رسالہ دیکھا۔ جس میں مصنف امہات الامہ پر بہت سے جھوٹے جھوٹے الزام لگائے گئے ہیں۔ غلط غلط اعتراض کیئے گئے ہیں۔ اعتراضوں میں یہ بڑی چالاکی کی گئی ہی کہ ادھر اُدھر کے فقروں کو ملا کر اعتراض گھڑے گئے ہیں یعنی اس جھوٹ میں سچ بہت کم نظر آتا ہی ہاں جن صحیح فقروں یا عبارتوں پر اعتراض کیئے گئے ہیں ان میں بھی لغویت زیادہ ہی۔

ساری کتاب میں ہم کو تین مقام ضرور ایسے معلوم ہوئے جہاں مصنف کا قلم سرپٹ جاتے جاتے پھسل گیا ہی۔ مثلاً آنحضرتؐ کے اولاد ذکور زندہ رہنے پر مولف نے جن الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کیا ہی یا اسی طرح جو دل شکن مثالیں حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت فاطمہ رضؓ کے معاملات میں دی گئی ہیں وہ ضرور ایسے فقرے ہیں جن کو دیکھنے کی تاب نہیں ہو سکتی۔ راقم نے خود ایک مرتبہ مولف سے دریافت کیا کہ یہ فقرے اور آپ کے قلم سے!۔ کہنے لگے کہ "بے شک شوخی ہو گئی ہی"۔ خیر یہ اُن کا خیال ہی۔ مگر ہم تو اس کو گستاخی کہیں گے۔ یہ اور بات ہی کہ مولانا نہ سمجھیں۔ افسوس مولانا کے بے لگام قلم کو با خدا دیوانہ باش و با مصطفےٰ ہشیار باش کا بھی لحاظ و پاس نہ رہا۔

راقم نے اسی ملاقات میں مصنف سے جب کفر کے فتوے کا تذکرہ کیا تو کہنے لگے کہ "ہاں میں نے بھی دیکھا ہی۔ لوگ مجھ سے اسلام چھڑانا چاہتے ہیں اور اسلام ہی کہ مجھ سے لپٹا چلا جاتا ہی اور میں ہوں کہ اسلام سے

لپٹا چلا جاتا ہوں"

بہرحال مصنفِ امہات الامہ کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ یہ تھا - اب امہات الامہ کا حشر سنیئے کہ اس کی کل جلدیں دہلی کے بعض ممتاز شخصوں کے کہنے سے ایک تاجر کو دیدی گئیں اور ایک وقتِ ممتد کے بعد جلاکر خاک سیاہ کردی گئیں - سُنا گیا ہے کہ ایک قاری صاحب نے کسی جلسے میں فخراً یہ بیان کیا تھا کہ امہات الامہ کے ڈھیر پر مٹی کے تیل کی سات بوتلیں جس شخص نے ڈالیں وہ قابلِ فخر شخص میں ہوں اور جس نے سب سے پہلے دیا سلائی دکھائی وہ میرے یہ ہاتھ ہیں -

ایک صاحب نے کشف الغمۃ کے جواب میں کفش الغمہ در رد کشف الغمہ لکھنی شروع کی تھی - مگر ہم نے اُن کو اس جوتی پیزار سے باز رکھا اور کہا کہ تُو تُو مَیں مَیں سے کچھ فائدہ نہیں -

شمس العلماء علاّمہ شبلی فرماتے تھے کہ امہات الامہ کی تصنیف کے بعد جب ندوہ کا جلسہ دہلی میں ہونے والا تھا تو میں نے جلسے کا اشتہار دیتے ہوئے ہندوستان کے نامور علماء کی فہرست بھی شرکت جلسے کے لیئے چھاپی تھی - اس میں مولوی نذیر احمد خاں کا نام بھی تھا - وہ اشتہار کہیں مولوی نذیر احمد صاحب کے پُرانے حریف کی نظر پڑ گیا تو اُنھوں نے مجھے بھی صرف اس بنیاد پر کافر قرار دے کر فتوے چھپوا دیا کہ نذیر احمد کے نام کے ساتھ مَیں نے مولوی کیوں لکھا - اور اُن کو زمرۂ علماء میں کیوں شمار کیا - علامہ موصوف یہ بھی فرماتے تھے کہ کتاب قابلِ سوختنی تھی اور میں نے بھی جلا دینے کی رائے دی تھی اگرچہ میں اُس آگ لگانے والے جلسے میں شریک نہیں ہوا -

لکچر اور اسپیچیں

اسپیچ اور لکچر دینے کا جوہر ہمارے مولانا نذیر احمد صاحب کی ذات مجتمع الصفات میں عرصۂ دراز تک اس طرح چھپا رہا جیسے زبان میں گویائی کی قوۃ - ابتدائے سن سے ختم ملازمت تک غالباً مولانا کو لکچر یا اسپیچ کہنے کا موقع کہیں نہیں ملا - اِس کا بظاہر ایک سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اَور لوگوں کی طرح جنابِ ممدوح کو مجامعِ عام میں شریک ہونے کی عادت نہیں اور نہ کچھ شوق و رغبت ہی ہے - خیر زمانۂ ملازمت میں تو وہ کثرتِ کار کی وجہ سے عدیم الفرصۃ ہی رہا کرتے تھے - لیکن پنشن لینے کے بعد مولانا چاہتے تھے کہ اپنی بقیہ زندگی اِس طور پر گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر کاٹ دیجیے کہ کس نگوید ازیں جا بخیز و آنجا رو -

ممکن ہے کہ جنابِ ممدوح کو پنشن لینے کے بعد تک اپنی قوۃِ گویائی کے جوہر کا علم نہ ہو - لیکن لوگوں نے معلوم نہیں کیوں کر یہ دریافت کر لیا کہ جس طرح اُن کے قلم میں قوۃِ تحریر ہے ویسے ہی بلکہ اس سے زیادہ اُن کی زبان میں بھی قوۃِ تقریر ہے -

یقیناً اکتوبر ۱۸۸۸ء کا مذکور ہے کہ ٹاؤن ہال دہلی میں انڈین نیشنل کانگرس کے موئدین نے اپنے خیالات کی تائید میں ایک جلسہ کیا تھا اُسی زمانے میں مسلمانانِ دہلی نے اس جلسے کے خلاف وہیں ایک دوسرا جلسہ منعقد کیا - یہی پہلا موقع تھا کہ مولانا ممدوح کو اُن کے احباب نے اس بات پر باصرارِ تمام آمادہ بلکہ مجبور کیا کہ نیشنل کانگرس کی نسبت علی رؤس الاشہاد اپنے خیالات ظاہر فرمائیں - چناں چہ لوگوں کی خاطر مولانا کو نقضِ عادت کرنا پڑا اور ٹاؤن ہال دہلی میں

لیکچر دیا۔ مشہور ہے کہ ٹاؤن ہال میں سامعین کا اس قدر ہجوم تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی نیشنل کانگرس کے مقاصد
کے خلاف یہ لیکچر تھا جس کی ابتدا یہ تھی۔

"میرے کان تو تین تین ساڑھے تین تین برس ہوئے کانگرس کے نام سے آشنا ہیں۔ مگر کیا تمام حاضرین کا بھی
حال ہمہ مجکو توقع نہیں۔ مسٹر بھیم جی یا بھلیم جی صاحب (کیوں کہ مجکو ان کے نام کی بھی اچھی طرح صحت نہیں) غرض جو کچھ ہوں
اُن کے لیکچر سے شاید دو یا تین دن پہلے کا مذکور ہے کہ میں اور مولوی محمد کریم بخش صاحب اور ایک صاحب اور قبل المغرب
جامع مسجد کے حوض پر منتظرِ نماز بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک شخص مسٹر بھیم جی کا اشتہار دکھاکر پوچھنے لگے کیوں صاحب
یہ کیا چیز ہے؟ چوں کہ اُنھوں نے لفظِ نیشنل کانگرس پر اُنگلی رکھ کر پوچھا معلوم ہوا کہ پڑھے لکھے ہیں۔ مگر نہ لفظ نیشنل کانگرس
اُن کی زبان سے ادا ہوتا ہے نہ اُس کے معنی سمجھے ہیں۔ ضیقِ وقت کی وجہ سے اُن کے ساتھ زیادہ باتیں کرنے کی مہلت تو
نہیں ملی۔ تاہم اُن کے طرزِ استفسار سے ایسا مستنبط ہوتا تھا کہ نیشنل کانگرس کو اندر سبھا کی قسم کا کوئی تماشا سمجھے ہیں۔ ابھی تھوڑی
دیر میں میں آپ صاحبوں پر ثابت کروں گا کہ اندر سبھا کی قسم کا تو نہیں لیکن نیشنل کانگرس تماشا ضرور ہے۔ مجکو نیشنل کانگرس
کے کسی جلسے میں شریک ہونے کا اتفاق تو نہیں ہوا مگر جہاں تک اخباروں میں پڑھا اور جہاں تک لوگوں سے سنا اس
نیشنل کانگرس کی اصل حقیقت میں نے اپنے ذہن میں یوں ٹھیرا رکھی ہے کہ انگریزی تعلیم مدتوں سے چپکے چپکے دلوں میں
شورش پیدا کر رہی تھی۔ لوگ نوکری کے واسطے تیاری کرتے اور نوکری ہی کی امید میں سخت سخت زحمتیں اُٹھاتے تھے۔ سرکار
نے تعلیم پر ملکی ضرورتوں سے بہت زیادہ زور دیا جس کا ضروری نتیجہ یہ تھا کہ خواستگارانِ نوکری کا ایک بہت بڑا کثیر الانفا
گروہ پیدا ہو گیا بے شک عقلاً محال تھا کہ سرکار جس کی جُزرسی اور کفایت شعاری بھی مشہور ہے اُس جمِّ غفیر کو نوکریاں دے سکے۔
یوں سلسلہ بسلسلہ بڑھنے سے توقعات توقعات سے حرمان اور حرمان سے نارضامندی پیدا ہوئی جس کا مرادف ہے
نیشنل کانگرس۔ پس نیشنل کانگرس اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ چند ناکام انگریزی خواں اس پیرایے میں اپنے دلوں
کے جلے پھپھولے پھوڑ رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں گورنمنٹ کی طرف سے ناحق کے بخارات بھرے ہوئے ہیں۔
اور ان کے بخارات نے ان کی چشمِ انصاف کو اس قدر تیرہ و تار کر دیا ہے کہ گورنمنٹ میں سوائے عیب کے اُن کو
کچھ نہیں سوجھتا۔ ایک شاعر عربی نے کیا خوب کہا ہے ؎

وعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ[1] ولکنّ عین السخط تبدی المساویا

مولانا کا یہ پہلا لیکچر اس مجمع میں ایسا پھلا پھولا کہ سارے ہندوستان میں اُن کی خوش بیانی کی دُھوم مچ گئی۔
ملک میں تو انجمنوں کی رسم چل پڑی ہے۔ جب اِس لیکچر کی شہرت ہوئی تو لوگوں نے مولانا کو لیکچر دینے کی دعوتیں شروع
کیں۔ یہاں تک کہ تار پر زادِ راہ بھیجے۔ اور مولانا نے واپس کر کر دیے۔ اور جب تک وہ لیکچر دیتے رہے کوئی
مہینا خالی جاتا ہوگا کہ کہیں نہ کہیں سے بُلاوا نہ آتا ہو۔

کسی نے کیا اچھی بات لکھی ہے کہ ہمارے مولانا جس طرح پُرانے مولوی اور نئے حافظ ہیں اسی طرح وہ پُرانے مصنف

[1] یعنی خوشنودی کی آنکھ عیب کے دیکھنے سے قاصر ہوتی ہے۔ وہ تو غصے ہی کی ہے جس کو بُرائی ہی بُرائی سوجھتی ہے ۱۲

اور نئے لکچرار بھی ہیں - اب سے چار برس[۹۱] پہلے اَور تو اَور خود مولوی نذیر احمد صاحب کو بھی معلوم نہ تھا کہ مجھے لکچر دینے
کی بھی قدرۃ ہی - جس طرح ضرور نہیں کہ جو بڑا عالم ہو وہ بڑا مُعلّم بھی ہو - اسی طرح یہ ضرور نہیں کہ جو بڑا منشی یا ادیب ہو وہ بڑا
لکچرار بھی ہو - لکچر دینے کے لئے بعض ایسی صفتیں بھی درکار ہیں جو صرف وہبی یعنی خداداد ہو سکتی ہیں نہ اکتسابی کہ جو
چاہے محنت و مشقت سے حاصل کرلے - مثلاً لکچرار چاہیئے جہیر الصوت ہو کہ جو کچھ کہے حُضّارِ مجلس کو گنتی میں کتنے
ہی ہوں سُنا سکے - اور سُنا سکے بھی تو اس طرز پر کہ قریب متاذی نہ ہوں اور بعید محروم نہ رہیں - مولانا کو دلّی
لاہور - علی گڑھ میں لکچر دیتے دیکھا - چھ چھ سات سات ہزار آدمیوں کا مجمع اور خدا نے عجیب آواز دی ہی کہ سننے میں
پاس کے پاس اور دُور سے دُور کے لوگ سب یکساں - پھر لکچرار چاہیئے قوی دل کہ حاضرین کیسے ہی ذی رتبہ اور مقتدر
اور لائق ہوں وہ کسی سے نہ جھینپے - اچھے اچھوں کو دیکھا ہی کہ دماغ میں بہت کچھ بھرا ہوا ہی - گویائی بھی خاصی ہی - مگر مجمع
کو دیکھ کر کچھ ایسی سٹی گم ہو جاتی ہی کہ ایک بات کہتے نہیں بڑتی اور بتکلف کہی بھی تو پسینے پسینے ہوتے چلے جا رہی ہیں
آواز لڑکھڑائی جاتی ہی - ہاتھ پاؤں پڑے کانپ رہی ہیں - مگر مولانا لکچر دینے میں اگر مرعوب ہوتے ہیں تو اسی قدر کہ گرمی
کے دنوں میں پانی اور جاڑے میں چائے بار بار پیتے جاتے ہیں - ان سے پوچھا گیا تو کہا چیخ کر بولنے میں زور بہت پڑتا
اور گلا خشک ہوا چلا جاتا ہی - مگر ایسی تو کیا بات ہی کہ آڈینس کا کچھ بھی اثر نہ پڑتا ہو - پھر بھی بڑے ہی بے تکان بولنے
والے ہیں اور ایک خاص بات یہ ہی کہ اس عمر پر چار چار پانچ پانچ گھنٹے متصل اُسی کڑاکے سے بولتے رہیں -
اور نہ تھکیں اور نہ آواز بھرّائے - مولانا اکثر اپنا لکچر لکھ کر ساتھ لایا کرتے ہیں اور اتنے بڑے بڑے لکچر جو بجائے
خود کتاب نہیں تو رسالے تو ضرور ہوتے ہیں مگر وہ جو کچھ لکھ کر لاتے ہیں اُس کو نوٹ سمجھو اُچٹتی ہوئی سی ایک نظر ڈال لی
اور ایک پورے مطلب کو حاضرین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ادا کر دیا - اور اگر سر جھکائے لکھا ہوا دیکھ دیکھ کر بیان
کریں جیسے سررشتہ دار بیشِ حاکم رپورٹ پڑھتا ہی یا بار بار تحریر کو دیکھتے جائیں تو سُننے والوں کو مزہ ہی کیا خاک ملے
اگر بیان میں جادو ہی تو کہنے والے کی زبان سے نکل کر سُننے والے کے کان میں اور پھر اُس کے دل میں جگہ کرتا ہی
بہت سی باتیں مولانا کو عین وقت پر سُوجھتی جاتی ہیں اور وہی اُن کے لکچر کی جان ہوتی ہیں - مولانا نے معدودے
چند کے سوا اکثر بڑے بڑے مطوّل لکچر دیئے ہیں اور یہ اُن ہی کی ظرافت اور خوش بیانی کا اثر تھا کہ کبھی کسی کو ملول ہوتے
نہ دیکھا - وہ جو ہمارے مولانا کی تحریر خاص ہی اور جو الگ پہچان پڑتی ہی اُس زور سے تو نہیں مگر پھر بھی اُن کے لکچروں سے
ٹپکی پڑتی ہی - مولانا کو اردو فارسی اور عربی زبانوں پر یکساں قدرۃ حاصل ہی - اور عربی انگریزی کے الفاظ بلکہ جملے کے جملے
وہ ایسے بے تکلفی کے ساتھ بولتے چلے جاتے ہیں کہ گویا اُن کی اپنی زبان ہی - قوم اور ملک نے صرف طرزِ بیان اور
زورِ بیان ہی کی وجہ سے مولانا کے لکچروں کی قدر نہیں کی بلکہ اُن کے مطالب اور مضامین ایسے ضروری اور مفید ہیں
کہ لکچر اِن کی تصنیفات پر فائق اور مرجح نہیں تو دل چسپ ہونے میں کسی سے ہیٹے بھی نہیں - مولانا نے بہت سے
معرکۃ الآرا مضامین پر نہایت آزادی اور متانت اور استواری سے اپنی رائے ظاہر کی ہی اور وہ ایسی محکم اور مدلل ہی

[۹۱] یہ اشارہ ہی ۱۸۸۸ء کی طرف ۱۲

کہ چار و ناچار اس سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ مذہبِ اسلام اور تعلیم دونوں کیسے ضروری مضمون ہیں اور مولانا نے اُن پر ایسی مُوشگافیوں کے ساتھ بحث کی ہے کہ کوئی پہلو بچنے نہیں پایا۔ اسلام کی تائید میں اُن کے دلائل ایسے تشفی بخش اور یقین دلانے والے ہیں کہ علمِ کلام کی کسی کتاب میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ نوجوان انگریزی خوان جو سائنس اور مذہب کی کش مکش میں ثابت قدم رہ نہیں سکتے اِن کو دینِ اسلام پر جمے رہنے کے لیئے اِن لکچروں سے سہارا لینا ضرور ہے۔

ہمارے نزدیک لکچر دینے یا اسپیچ کہنے کے چار طریقے مروّج ہیں۔ ایک یہ کہ لکچرار یا اسپیکر اپنی اسپیچ یا لکچر لکھ کر کسی مجلس میں پڑھ دے۔ دوسرے یہ کہ اسپیچ کو لکھ کر زبانی یاد کر لے۔ تیسرے یہ کہ جو بیان کرنا ہو اُس کو دل میں سوچ سمجھ کر خیال کر لے۔ چوتھے یہ کہ صرف نوٹ کر لے اور اپنے خیالات کو نوٹ دیکھ دیکھ کر مجلس کے سامنے بیان کر دے ہمارے نزدیک اِن چار قسموں میں سے کوئی بھی فاضل لکچرار نے اختیار نہیں کی۔ بظاہر لوگ یہ گمان کر سکتے ہیں کہ لکچر دینے کے پہلے طریقے پر فاضل لکچرار کار بند ہیں۔ کہ گھر سے لکچر لکھ کر بلکہ چھپوا کر لاتے ہیں اور چوں کہ یہ نہایت سہل اور آسان طریقہ ہے اِس لیئے لکچرار کی اِس میں کچھ تعریف نہیں۔ لیکن اُن کا یہ گمان بالکل غلط ہے۔ فاضل لکچرار اِس میں کچھ شک نہیں کہ اپنا لکچر لکھ کر اور چھپوا کر لاتے ہیں۔ مگر لکچر دینے کی سہولت کے لیئے نہیں۔ بلکہ سامعین کی آسانی کے لیئے کہ وہ لکچر سُننے کے بعد لکچر کو خرید یں اور گھر لے جا کر اُس کو سبقاً سبقاً استفادہ حاصل کریں۔ اِس کے سوا ہم نے تو یہ دیکھا ہے اور ہزار ہا آدمی اِس کا گواہ ہے کہ فاضل لکچرار لکچر کو کتاب کی طرح نہیں پڑھتے۔ صرف ابتدا میں ایک نظر ڈالی اور لکچر کو بند کر کے میز پر ڈال دیا اور حافظے کے زور پر سارے کا سارا لکچر دیدیا۔ ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ خاص خاص مواقع پر لکچر میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اصل میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدۂ میرٹھ میں فاضل لکچرار کے لکچر پر کچھ لوگ بحث و مباحثہ کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے یہ فرمایا کہ مولانا میں یہ ایک خاص صفت ہے کہ جو کچھ وہ چھپوا کر لاتے ہیں اُس میں۔ اور کانفرنس میں جو کچھ بیان کرتے ہیں اُس میں ایک نقطے کا بھی فرق نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ جس ترکیب اور ترتیب سے جو الفاظ اور فقرے چھپے ہوتے ہیں وہی اُن کی زبان پر ہوتے ہیں اور اُس میں سرِ مُو فرق نہیں ہوتا۔ یہ بات راقم نے نہایت استعجاب سے سُنی۔ حُسنِ اتفاق سے مولانا کا لکچر اُس وقت تک نہیں ہوا تھا اس لیئے تجربہ کرنے کا اچھا موقع مل گیا۔ چناں چہ جب فاضل لکچرار اسٹیج پر تشریف لائے تو راقم ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھا اور بمشکل تمام نہایت کوشش بلیغ سے ذیل کا فقرہ اُس وقت یاد کر لیا جو فاضل لکچرار کی زبان سے اُس وقت سنا تھا جب کہ لکچر کی بند کاپی میز پر پڑی تھی اور فاضل لکچرار آڈینس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لکچر دے رہے تھے غرض وہ فقرہ یہ تھا۔

تمھارے سامنے انگریزوں کے نمونے موجود ہیں۔ اِن کے ربط ضبط دیکھو اِن کے انتظام دیکھو اِن کے ہنر دیکھو اِن کے سلیقے دیکھو اِن کی صناعی دیکھو اِن کی ہمّت دیکھو کہ ایک چھٹے بھر جزیرے کے رہنے والے اور جزیرہ بھی ایسا سمجھو کہ نیچر نے موسم کے اعتبار سے آب و ہوا کے اعتبار سے پیداوار کے اعتبار سے اُن کے ساتھ بہتیرا

ہی نکل گیا - مگر اُنھوں نے اپنی تدبیر سے نیچر کو مغلوب کر کے ہی چھوڑا - سمندر تو اُن کے لیئے شیر مادر تھا ہی خشکی میں ایسے پھیلے ایسے پھیلے کہ ربع مسکون کے اکثر حصّے پر چھا گئے - ایشیا کی جان ہندوستان تو نکال ہی چکے - روم پروانت ہی - چین وجاپان میں اپنی ٹانگ اڑا ہی رکھی ہی - افریقہ کا ہتّا بوٹی ہو ا مجھو تو پھر اب رہ ہی کیا گیا - صد رحمت اِن کی سپوتی ماں پر کہ کیسے بیٹے جنے ہیں کہ واہ رے واہ !!

فاضل لکچرار کا لکچر سننے کے بعد راقم ہنڈال سے باہر آیا اور لکچر خرید کر جھٹ پٹ جھٹ پٹ ورق گردانی شروع کی اور اِس مقام پر جب نظر پڑی تو حافظے پر زور دے کر نہایت غور وخوض سے اِس فقرے کو دیکھا تو ایک نقطے کا فرق نہ پایا - وہی ترکیب وہی ترتیب وہی الفاظ وہی سلسلہ - آخر معلوم ہوا کہ یہ سب حافظے کے کرشمے ہیں اور اِسی وجہ سے یہ عام شہرۃ بالکل صحیح ہی کہ فاضل لکچرار کی تصانیف میں نام کو بھی آورد نہیں یعنی جو کچھ وہ روزمرّہ بے تکلف باتیں کرتے ہیں وہی اُن کی کل تصانیف میں ہوتا ہی - یعنی وہی اسپیچ میں - وہی لکچر میں - وہی ناول میں - وہی اَور تصنیفات میں وہی ترجمۃ القرآن میں - یعنی نری آمد ہی آمد ہی آورد کا نام نہیں -

فاضل لکچرار اگر لکچر کو کہیں اپنا پیشہ بنا لیتے تو اِس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستان کے تمام واعظین کی روٹیاں بند ہو جاتیں - اور وہ مولوی اور واعظ مولٰنا کو کوس کوس کر کھا جاتے - غالبًا اِسی خوف سے یا عدیم الفرصتی کی وجہ سے اتنے بڑے ہندوستان میں صرف تین مجلسیں تھیں جہاں مولٰنا لکچر دیتے تھے (اور اب افسوس کہیں بھی نہیں جاتے)

سب سے اوّل انرایبل سر سیّد مرحوم کی کانفرنس یا کوئی بھی مجلس جس میں وہ فاضل لکچرار کو لکچر دینے کی تکلیف دیا کرتے تھے جاتے تھے - جن کی دعوۃ کی نسبت مولانا فرماتے ہیں "

"میں نے آج تک اُن (سر سیّد) کی دعوۃ کو رد نہیں کیا اور ان شاء اللہ کروں گا بھی نہیں - اور باوجودے کہ میں اُن سے بعض باتوں میں اختلاف بھی کرتا ہوں تاہم میرے دل میں اُن کی ایسی عَظَمت ہی کہ اگر میں اُن کے تمام عقائد سے اتّفاق رکھتا اور مجکو پیر کی تلاش بھی ہوتی تو میں ضرور اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا"

چناں چہ سر سیّد کی دعوۃ کی نسبت ایک مقام پر نظم میں فرماتے ہیں -

مُہرِ خاموشی تھی مدّت سے مرے مُنھ پر لگی ہر برس لکچر کے دینے کی یہ کیسی کَدّ لگی

سیّد احمد خاں کی خاطر ہی دگرنہ میں کہاں اور کہاں یہ بھیڑ جو ہی اندر اور باہر لگی

یا مثلًا دوسری جگہ فرماتے ہیں -

میں تم میں آ کھڑا ہوتا ہوں جب مجبور کرتے ہیں کہ گر تشریف لاؤ مہربانی ہو عنایت ہو

تم آ جاؤ اور آ کر اپنا لکچر دو تو جلسے میں ؛ ہجوم وازدحامِ خلق ہو لوگوں کی کثرت ہو

دوسری جگہ انجمن حمایت الاسلام لاہور تھی - جہاں مولانا بالالتزام لکچر دینے کے لیئے تشریف لے جایا کرتے تھے - تیسری جگہ مدرسۂ طبّیہ دہلی تھی - بس اِن مقامات کے سوا اتفاقیہ طور پہ ایک آدھ جگہ کہیں لکچر دیا ہو تو شاید دیا ہو ورنہ نہیں - اور اب عرصے سے نہ محمدن ایجوکیشنل کانفرنس میں لکچر دیتے ہیں نہ انجمن حمایت الاسلام میں اور نہ مدرسۂ طبّیہ میں

اصل بات یہ ہی کہ سرسید کے انتقال کے بعد گویا مولٰنا نے اس مشغلے کو بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اور اب اُن کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ کہیں بھی لکچر دیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں۔

کیا کہیں شغلہ لکچر کا اجی چھوٹ گیا ہم سے اک بار چھٹا ایسا کہ جی چھوٹ گیا
صبر رخصت ہوا سنتے ہی ترا عزم سفر تم تو کل جاؤ گے یہ ہم سے ابھی چھوٹ گیا
نہ سہی پَر تجھے دکھلاؤں گا اپنی پرواز گر قفس سے ترے صیاد کبھی چھوٹ گیا

ابھی چند روز ہوئے میں نے مدرسۂ طبیہ کے سالانہ جلسے میں لکچر دیتے وقت عذر کیا تھا کہ سید احمد خاں کے مرنے کی وجہ سے میری طبیعت حاضر نہیں اور جیسے لکچر کی توقع مجھ سے لوگ رکھتے ہیں میں دے نہیں سکتا۔ میں کیا کروں میرا حال یہ ہو گیا ہی کہ جب کبھی لکچر یا پبلک اسپیچ کا خیال کرتا ہوں۔ سید احمد خاں کی صورت سامنے آکھڑی ہوتی ہی۔ اُن کا تصور بندھا اور طبیعت بے قابو ہوئی۔ اور اس کا سبب یہ ہی کہ لکچر اور پبلک اسپیچ وغیرہ کی گدگدی ہم لوگوں میں اُسی مرحوم نے پیدا کی تھی۔ پس خود لکچر دینے کھڑا ہوتا ہوں تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں۔ کسی کو لکچر دیتے دیکھتا ہوں تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں"

غرض سرسید کے انتقال کے بعد نواب محسن الملک مرحوم بھی فاضل لکچرار کو تکلیف دیا کرتے تھے اور وہ طوعاً وکرہاً تشریف لاتے تھے۔ لیکن نواب صاحب مرحوم کے بعد کیا بلکہ اُن کی زندگی ہی میں غالباً لکھنؤ کی کانفرنس کے بعد تو بابِ لکچر میں مولانا نے چیپ کی قسم کا قفل ڈال دیا ہی اور اب امید نہیں کہ فاضل لکچرار اُس کو کھولیں۔ خارجاً سُنا گیا ہی کہ مولانا ان دعوۃ دینے والوں کی کج ادائیوں سے ناراض ہو گئے اور اسی وجہ سے علی گڑھ لاہور اور دلّی کی تینوں مجلسوں میں جانا چھوڑ دیا۔

راقم حُسنِ اتفاق سے مسلم لیگ دہلی کے جلسے میں شریک ہونے کی غرض سے گیا تو وہاں معلوم ہوا کہ مسلم لیگ کے بعد ندوۃ العلمار کا جلسہ بھی یہیں دلّی میں ہوگا۔ میں نے یہ سُن کر مولٰنا کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ نے اَور مجلسوں میں شریک ہونا بالکل چھوڑ دیا ہی اور وہ شاید اس وجہ سے کہ اب آپ دُور و دراز سفر کی زحمت نہیں برداشت کر سکتے لیکن ندوۃ العلمار کا سالانہ جلسہ تو یہیں ہونے والا ہی اور اُس میں آج تک آپ شریک بھی نہیں ہوئے ہیں۔ آپ اُس میں شریک ہو کر کچھ نہ کچھ ضرور ارشاد فرمائیں۔ میری درخواست پر فرمانے لگے کہ اِن مجلسوں کی طرف سے میرا دل کھٹّا ہو گیا ہی۔ اور میں اب کسی جلسے میں شریک ہونا پسند نہیں کرتا۔ چناں چہ مولوی شبلی صاحب کا بھی خط آیا ہی کہ میں ندوہ میں شریک ہوں۔ مگر میں نے اُن کو صاف جواب لکھ دیا کہ میں شریک ہونا پسند نہیں کرتا اور اب میرا دل اِن مجلسوں کی طرف سے بجھ سا گیا ہی۔ یہ فرما کر علامہ شبلی نعمانی کا خط مجھے دیکھنے کو دیا جو ذیل میں درج ہی۔

مخدومی مطاعی۔ تسلیم و نیاز۔ آپ کا ابرِ کرم ہر طرف برس چکا۔ صرف ندوہ رہ گیا تھا جس کی وجہ شاید بُعدِ مسافت تھی۔ لیکن اب تو ندوہ وہیں آتا ہی۔ کیا گھر آنے پر بھی کچھ دہ آپ کی رشحاتِ زبان سے محروم رہے گا۔ مولٰنا۔ یہ اخیر کام ہی۔ سالانہ جلسہ ندوہ کا وہیں ہی۔ اس میں کچھ ضرور فرمایئے۔ اور مجکو اطلاع دیجیے کہ میں اخباروں میں اُس کو

شائع کروں - امید ہی کہ ایک دیرینہ نیازمند کی درخواست کو آپ ردّ نہ فرمائیں گے -

شبلی نعمانی ندوہ لکھنؤ ۱۵ - جنوری سنہ ۱۹۱۰ء

ہم نے یہ خط اس لیئے یہاں نقل کر دیا ہی کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں کے عام و خاص جلسوں میں ہمارے مولانا کی شرکت کی کتنی سخت ضرورت ہی - اور ایک اُن کی عدم شرکت کی وجہ سے عامۃ المسلمین کو کتنا نقصانِ عظیم اُٹھانا پڑتا ہی - دوسرے یہ کہ مولانا کی عدم شرکت کی وجہ بھی ناظرین کو معلوم ہو جائے گی -

لکچروں پر اعتراضات

فاضل لکچرار اور نیز عام لوگوں کو یہ شکایت ہی کہ لکچرار لکچر دیتے دیتے اکثر لائن سے باہر ہو جاتا ہی - اگرچہ یہ ہی تو ٹھیک مگر راقم کے نزدیک یہ کوئی اعتراض نہیں عیب نہیں بلکہ غور و تامّل سے کوئی شخص فیصلہ کرنے بیٹھے تو مجھے اِس امر کی ڈگری دے کہ فاضل لکچرار کا لائن سے باہر ہو جانا اسپیکر اور لکچرار کا ایک اعلیٰ درجے کا ہنر ہی - مگر لائن سے باہر ہونا بالکل ایسا ہی ہو جیسا فاضل لکچرار کا - مثال کے طور پر مولانا کا لائن سے باہر ہو جانا ذیل میں درج کیا جاتا ہی فرماتے ہیں -

اُب کے سال ارادہ تھا کہ کوئی شگفتہ سا لکچر دوں گا - لیکن ع خوئے بد را بہانۂ بسیار - جوں ہی لکچر کا قصد کیا کہ یاد آگئی جنرل عظیم الدین خاں صاحب کی افسوس ناک خوف ناک اور بے ہنگام موت - مَیں نے رسم دنیا کے مطابق جنرل عظیم الدین خاں کی موت کو بے ہنگام موت کہا ورنہ کوئی موت بے ہنگام یعنی قبل الوقت یا بعد الوقت ہو ہی نہیں سکتی - اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ وعدے سے دم زیادہ نہ کم - اور اگر کسی موت کو بے ہنگام کہا جا سکتا ہی تو بڑی کثرت سے قبل الوقت موتیں وہ ہیں جو شاید طب یونانی نہیں بلکہ یونانی طبیبوں کے ہاتوں سے ہوتی ہیں اور جن کی تعداد کے گھٹانے بلکہ ہو سکے تو بالکل روک دینے کے لیے حکیم عبد المجید خاں صاحب نے اِس مدرسے کا ڈول ڈالا ہی - بے مشقی بھی کیا بری چیز ہی دو منٹ بات کرتے نہیں گزرے کہ میں لین سے باہر ہو گیا اور سلسلِ سخن کے لیے پھر اعادہ کرنا پڑا کہ میں نے امسال کوئی شگفتہ سا لکچر دینے کا ارادہ کیا کہ یاد آگئی جنرل عظیم الدین خاں کی موت"

یا مثلاً شاہجہاں پور کے ایک لکچر میں فرماتے ہیں -

"دنیا اسی ہندوستان یا اسی نارتھ ویسٹرن پراونسز یا اسی شاہ جہاں پور سے تو عبارت نہیں ہی - اگرچہ اپنی کوتاہ نظری سے لوگ دنیا کو نہایت محدود خیال کرتے ہیں - ایک آدمی چند اخباروں میں اپنا نام یا کسی دوسری طرح پر لوگوں میں اپنا تذکرہ ہوتا ہوا سُن کر اپنے تئیں مشاہیر میں شمار کرتا اور اپنے جی میں خوش ہو لیتا ہی - لیکن اگر وہ ذرا اپنی نظر کو وسیع کرے تو اُس کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ جس دائرے کو اس نے محیطِ زمین خیال کر رکھا ہی وہ حقیقت میں ایک نقطے سے زیادہ پھیلاؤ نہیں رکھتا - شاید افریقہ کا مذکور ہی کہ وہاں کسی ریاست کا بادشاہ اپنے تئیں ہفت اقلیم کا بادشاہ سمجھتا تھا اور اسی ایک بادشاہ پر کیا موقوف ہی بادشاہوں اور رئیسوں اور دولت مندوں بلکہ مَیں تو کہتا ہوں عموماً کل آدمیوں کے سر اس عُجب کے خبط سے خالی نہیں ہوتے - امیروں کے نام اور اُن کے خطاب دلالت کرتے ہیں کہ وہ اپنے تئیں کیا

سمجھتے ہیں۔ شروع کے مسلمانوں کے نام سے پتا لگتا ہی کہ اُن کے مزاجوں میں کس درجے کا انکسار تھا وہ باوجودے کہ دنیاوی اور دینی عظمتوں اور بزرگیوں کے جامع تھے اور عظمتیں اور بزرگیاں بھی اس درجے کی کہ اُس کا پاسنگ بھی کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ بااین ہمہ الفاظِ مفردہ میں اپنے نام رکھتے تھے۔ جیسے علی، حسن، حسین وغیرہ لیکن اب کیا حال ہی چاہے باوا نے نتھوا اور بدھوا ہی نام کیوں نہ رکھا ہو۔ پہلا کام جو ہم میں سے ایک آدمی شُد بُد حاصل کر لینے کے بعد کرنا چاہتا ہی یہ ہی کہ وہ اپنے نام کو شان دار بناتا ہی۔ اے کاش وہ اپنے تئیں لیاقت سے شان دار بنائے وہ مفرد نام کو پسند نہیں کرتا۔ اور پھر ترکیب[۵۱] پر بھی قانع نہ ہو کر تھمتا نہیں بلکہ کبراً و نخوۃً اطالتِ نام کے لیے لفظ محمد تو ضرور ہی اپنے نام کے ساتھ لگا لیتا ہی اور اُس کے بعد مذہب یا وطن یا نسبتِ نسبی میں بہتیری گنجائش ہی۔ اچھے نام رکھنا تو بہت اچھی بات ہی۔ مگر اُس داعیے کو دیکھنا چاہیے جس وجہ سے ناموں کو شان دار بنایا جاتا ہی۔ ہاں تو شاید افریقہ کا مذکور ہی کہ وہاں کسی ریاست کا بادشاہ اپنے تئیں ہفت اقلیم کا بادشاہ سمجھتا تھا۔ اتفاق سے وہاں کسی سیاح انگریز کا گزر ہوا۔ مجھ سے جس شخص نے یہ حکایت نقل کی اُس نے مطلق سیاح کہا تھا۔ انگریز کا لفظ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہی۔ اس لیے کہ اب یہ شوق جو ترقی تجارت بلکہ ملک گیری کی کلید ہی خدا نے انگریزوں ہی کو دیا ہی کہ یہ لوگ اگر سیر و سیاحت نہیں بھی کر سکتے تو گھر بیٹھے جغرافیے اور تاریخ کا اوڑھنا بچھونا بنائے رہتے ہیں اور یہی وجہ ہی کہ تعلیم میں جغرافیے اور تاریخ پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہی۔ رہے ہم گھر گھُسنے ہندوستانی۔ ہمارا تو حال یہ ہی کہ میں نے تو کسی طالب العلم کو جغرافیے اور تاریخ کا شائق نہ پایا۔ جس کو دیکھا روتے اور جھینکتے ہی دیکھا۔ اور میں دوسروں پر کیا الزام دوں کہ جغرافیے اور تاریخ کے نام سے خود مجھکو نفرت ہی۔ اِس سے کہ دو چار آدمی بضرورت ولایت گئے اور بارسٹری کا ڈپلوما اور ولایتی بی بی لے آئے یا حج کی تقریب سے اگر مقلد ہوئے تو حرمین شریفین اور غیر مقلد ہوئے تو غالباً صرف مکہ معظمہ کی زیارت سے مشرف ہو آئے۔ اِس سے فریضۂ سیر و سیاحت ادا نہیں ہوتا۔ ہندو اگر ملک کے باہر نہیں جاتا تو وہ معذور ہی کہ اُس کا مذہب اُس کو اجازت نہیں دیتا کہ کالے پانی سے عبور کرے۔ اور عبور کرنے کے علاوہ دوسرے ملک میں وہ کھانے پینے کی احتیاط باقی نہیں رکھ سکتا۔ مگر سر پیٹ لینے کی بات تو یہ ہی کہ جن کا مذہب مانعِ ترقی ہو وہ ترقی کریں۔ اور جن کا مذہب مانعِ ترقی ہونا کیا ترقی کے لیے اُلٹا متقاضی ہو وہ اُسی مذہب کا حیلہ بنا کر ترقی معکوس کریں۔ بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔ کیوں جی وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ[۵۲]۔ اور۔ وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ[۵۳]۔ اور یَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَا اِلَی الْمَدِیْنَۃِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْھَا الْاَذَلَّ وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰکِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ

[۵۱] مثلاً ایک مولوی فتوے پر دستخط کرتا ہی حررہ محمد عبد العلام الحنفی الہروی الغزنوی الکابلی اللاہوری الدہلوی البخاری یا دلی یا ایک شیخ طریقت شجرۂ بیعت پر عرب شاہ چشتی قادری نقش بندی نظامی باقی باللّٰہی مسکین شاہی وغیرہ وغیرہ [۵۲] تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے رہے اُن سے خدا کا وعدہ ہے کہ (ایک دن) اُن کو ملک کی خلافت (یعنی سلطنت) ضرور عنایت کرے گا جیسے اُن لوگوں کو خلافت عنایت کی تھی جو اُن سے پہلے ہو گزرے ہیں [۵۳] اور ہم زبور میں (پند و) نصیحت کے بعد یہ بات لکھ چکے ہیں کہ ہمارے نیک بندے زمین (کی سلطنت) کے وارث ہوں گے [۵۴] (یہ منافق) کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینے لوٹ کر گئے تو عزت والا ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا حالانکہ

یہ اور اس طرح کی اور بہت آئینیں جن سے استشہاد کروں تو بات بڑھتی چلی جائے تقاضائے ترقی نہیں تو کیا ہی اور ہندوؤں کا نام بھی میں نے اس لیئے لیا کہ ہم اور وہ ملے جلے ہوئے بستے ہیں۔ شاید اُن کی حالت دیکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں گدگدی پیدا ہو ورنہ قیود اور شرائط اور مزاحمتوں اور رُکاوٹوں کے اعتبار سے نصاریٰ کا مذہب تو سب سے گیا گزرا ہوا ہی اور پھر یہ لوگ معراج الکمال ترقی پر چڑھے چلے جا رہے ہیں۔ ہندوؤں کا مذہب تو سمندر پار ہی جانے کی مناہی کرتا ہی ان کے یہاں جگہ سے ہلنے تک کی مناہی ہی۔ کیوں کہ کل کے لیئے ذخیرہ کرنے ہی کی مناہی ہی اور فکرِ فردا نہیں تو یوں کہو کہ دنیا میں کوشش کوئی چیز نہیں۔ اٹلی میں گاریبالڈی ایک بڑا مشہور سپہ سالار ہو گزرا ہی جس نے روم کو پوپ کی سلطنت سے آزاد کرایا سنہ ۱۸۷۰ع میں وہ فتح مند اپنی فوج لے کر روم میں داخل ہوا۔ برسا برس فوج کے اِس داخلے کی یادگار میں تمام ملک خوشیاں مناتا ہی اب کے برس اس تقریب میں گاریبالڈی کا ایک بت بھی کھولے جانے کو تھا اُس موقع پر اٹلی کے وزیرِ اعظم کرسپی نے جو اسپیچ دی میں آپ صاحبوں کو انگریزی میں پڑھ کر سُناتا ہوں۔ اگر تلفظ میں غلطی کروں تو معاف فرمانا۔ کیوں کہ میں نے انگریزی کسی اسکول یا کالج میں نہیں پڑھی۔ اور نہ انگریزی سوسائٹی میں رہا اور نہ ساری عمر خدا نے انگریزی کے ذریعے سے مجکو معاش دی۔ لیکن با ایں ہمہ میں جو کچھ بھی ہوں اور جیسا کچھ بھی ہوں ہی انگریزی ہی کی بدولت۔ ورنہ سیکڑوں عربی فارسی پڑھے ہوئے مجھ سے بہتر اِس مجمع میں موجود ہوں گے (اس کے بعد لکچرار نے انگریزی عبارت پڑھی جس کا اُردو میں خلاصہ یہ ہی) کرسپی نے کہا وہ کہ مذہب کو مُلک داری اور مُلک گیری سے کچھ سروکار ہی نہیں۔ عیسائی مذہب تو یہ چاہتا ہی کہ تارک الدنیا ہو کر کسی گرجا گھر کے کونے میں بیٹھے یادِ الٰہی کیا کرو۔ با ایں ہمہ اہلِ یورپ عیسائیت کا بھی دم بھرتے ہیں اور مُلک بھی فتح کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ دین داری ہم مسلمانوں ہی کے حصے میں آئی ہی کہ ملک گیری اور مُلک داری کا کیا مذکور ہی یہاں خانہ داری سے بھی ایمان میں فرق آجاتا ہی۔ اے تب تو مسلمان اپنی حالت کو درست نہیں کرتے۔ مجھ میں یہ ایک بڑا عیب ہی کہ ایک بات شروع کرتا ہوں اور کہتے کہتے کہیں سے کہیں نکل جاتا ہوں اور وہ بات ناتمام رہ جاتی ہی لیکن آپ سب صاحب ذرا صبر سے بیٹھے رہیں۔ جو جو باتیں ناتمام رہ گئی ہیں مجکو معلوم ہیں اور میں ان شاء اللہ سب کو پورا کر کے ایک کا ایک سے جوڑ لگا کر دکھا دوں گا۔ آخر میں تو یہ بات ہو رہی تھی کہ افریقہ میں کسی ریاست کا بادشاہ حُمق سے اپنے تئیں ہفت اقلیم کا بادشاہ سمجھتا تھا!!

غرض ناظرین نے اِن دو مثالوں میں ملاحظہ کر لیا ہو گا کہ فاضل لکچرار کا لائن سے باہر ہونا کوئی اَن مل بے جوڑ بات ہوتی تھی یا بکار آمد اور نتیجہ خیز ہونے کے علاوہ کالملح فی الطعام۔

مسٹر موریسن کی راے فاضل لکچرار کی نسبت

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی سالانہ رپورٹیں۔ انجمن حمایت الاسلام اور مدرسۃ العلوم کی رودادیں فاضل لکچرار کی اسپیچوں اور لکچروں کی تعریف سے لبریز ہیں۔ جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں مگر ہم یہاں مسٹر موریسن سابق پروفیسر و پرنسپل مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی راے کا خلاصہ درج کیئے دیتے ہیں۔

مسٹر مورین جس زمانے میں علی گڑھ کالج کے پروفیسر تھے تو راقم بھی وہیں لائبریرین تھا۔ مولوی بشیر الدین مینیجر اسلامیہ اسکول اٹاوہ نے ایک سالانہ جلسے میں پروفیسر صاحب موصوف کو جلسے میں شریک ہونے کے لیئے مدعو کیا۔ چناں چہ اُنھوں نے دعوۃ کو قبول کر لیا۔ اور جانے سے دو روز پیشتر مجھے اپنے بنگلے پر بلایا اُن کو اُردو زبان سے بہت شوق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُردو زبان میں اُنھوں نے ایک لکچر لکھ کر تیار کیا تھا مجھ سے ارشاد کیا کہ تم بھی میرے ساتھ علی گڑھ سے اٹاوے چلو۔ اور میری طرف سے میرا لکچر وہاں پڑھ دینا۔ مَیں نے تعمیل ارشاد کا وعدہ کیا تو کہنے لگے کہ اوّل اِس لکچر کو میرے سامنے پڑھ کر سناؤ۔ میں نے سُنانا شروع کیا۔ تو جا بجا مجھے ٹوکا اور کہا کہ یہاں آہستہ پڑھو اور یہاں ذرا زور دے کر یہاں اِس قسم کی ٹون بناؤ اور فلاں مقام پر اِس طرح پڑھو۔ چناں چہ جب میں پڑھ چکا تو فرمایا کہ تم نے مولانا نذیر احمد صاحب کا بھی لکچر سُنا ہے۔ مَیں نے کہا جی ہاں۔ اُنھوں نے کہا تم اُن کی نقل کیوں نہیں اُتارتے۔ مَیں نے کہا اوّل تو میں لکچر دیا نہیں کرتا۔ اِس کے سوا اگر ایسا کروں تو لوگ ہنسیں گے۔ اِسی تذکرے میں پروفیسر صاحب کہنے لگے کہ مولانا نذیر احمد صاحب مسلمانوں میں ایسے لکچرار ہیں کہ اگر وہ یورپ کی عیسائی قوم میں پیدا ہوئے ہوتے تو آج یورپ بھر میں اُن کی اسپیچوں اور اُن کے لکچروں کا جواب نہیں ہوتا اور صدہا برس تک یورپ ایسا اسپیکر پیدا نہیں کر سکتا۔ مَیں نے ایسا بے دھڑک اور لاجواب اسپیکر نہیں دیکھا۔

فاضل لکچرار کے لکچروں کی تعداد اِس وقت پچاس ساٹھ کے قریب ہے اور وہ کئی مجلّدات میں طبع ہو چکے ہیں۔ اور تقریباً ہر بڑے کتب فروش کے ہاں ملتے ہیں۔ ہم نے اِس وقت تک لکچروں کا نمونہ ناظرین کے سامنے پیش نہیں کیا۔ اِس لیئے کہ اُن کے لکچر سیکڑوں مرتبہ چھپ چکے ہیں۔ ناظرین میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جس نے مولانا کے لکچروں کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ تاہم ایک معرکۃ الآرا لکچر "فطرۃ اللہ" کو نمونے کے طور پر پیش کش ناظرین کرتے ہیں۔ یہ وہ لکچر ہے جس میں توحید بڑی ٹیک رہی ہے اور جس پر مولوی محرم علی صاحب چشتی نے اپنے اخبار رفیق ہند میں اعتراضوں کا تانتا باندھا تھا۔ اور مولانا نے اُن پر ازالہ حیثیتِ عرفی کی نالش دائر کی تھی اور آخر میں مولوی محرم علی چشتی نے معذرت چاہی تھی اور مولانا نے اُن کے قصوروں کو معاف کر دیا تھا۔ غرض وہ لکچر قابلِ دید ہے اس لیئے درج کیا جاتا ہے۔

فطرۃ اللہ

اَب سے غالباً پینتیس^۳۵ برس پہلے کا مذکور ہے کہ ایسٹ انڈین ریلوے کا وہ حصّہ جو الہ آباد اور فتحپور کے درمیان واقع ہے کھولا گیا۔ میں اُن دنوں مدارس الہ آباد کا ڈپٹی انسپکٹر تھا۔ اور مجکو دَورے کی ضرورت سے اکثر ریل پر سفر کرنے کا اتّفاق ہوتا تھا۔ چوں کہ ریل نئی چیز تھی۔ انتظام میں بھی بہت سے نقص تھے اور لوگ ریل کے ضبطِ اوقات اور اُس کی قوت رفتار سے بھی اچھی طرح آگاہ نہ تھے۔ ایکسیڈنٹس (حادثات) اکثر واقع ہوتے رہتے تھے اُس وقت کی دو باتیں ابھی تک مجھے یاد ہیں۔ ایک ہنسی کی اور ایک افسوس کی۔

ہنسی کی بات تو یہ ہے کہ اتّفاق سے خبر نہیں کہاں کے۔ مگر وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ لکھنؤ کی طرف کے دو صاحب ایک سٹیشن پر گھنٹوں پہلے سے ریل کے منتظر بیٹھے باتیں کر رہے تھے اِتنے میں گھنٹی ہوئی اور ریل کے کسی

ملازم نے آواز دی کہ پچھم کے جانے والو ٹکٹ لینے چلو۔ ان دونوں نے بھی ٹکٹ لیئے اور پھر فراغت سے اپنی جگہ جاکر باتوں میں مشغول ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ریل آموجود ہوئی۔ اور لوگ گاڑیوں پر سوار ہونے کے لیئے دوڑے یہ دونوں بھی ٹکے گز کی چال سے چلے۔ اول تو جس تکلف سے انھوں نے اسباب اُٹھایا ہی قابل دید تھا دونوں ہاتھ اور بستر۔ اسباب کی گٹھری۔ پان دان۔ حقہ اور اُس کے اجزاے ثلاثہ نیچہ و چلم ٹکیوں کی تھیلی۔ ایک کفِ دست کے برابر ٹوپی جو سر پر اوڑھے تھے یا اُنہی کے محاورے میں کیوں نہ کہوں سر پر دیئے تھے۔ وہ اور شاید ناشتہ بھی۔ اتنی چیزیں سنبھالنے کو۔ اب مجھے یاد نہیں کہ اُنھوں نے ان چیزوں کو کیونکر سنبھالا۔ مگر گٹھری کو تو میں دیکھتا تھا۔ انگ سے چنگلی میں پکڑے تھے اور کمر بل کھا کھا جاتی تھی۔

اللہ اللہ کیا اختلافِ اوضاع ہو ایک تو وہ ٹوپی تھی کہ میں نے اُس کو کفِ دست کے برابر بتایا اور ایک تمھارے صافے ہیں کہ باقی سارا لباس ایک طرف اور ایک سر بند ایک طرف۔ پھر مختلف بندش کی پگڑیاں ہیں۔ اپنے ہاتھ کی باندھی ہوئی۔ دستار بندوں سے بندھوائی ہوئی۔ ایک منی ایچر آدی پرامڈز آو ایجپٹ آن دی سمالسٹ سکیل یعنی ننھا مُنّا اہرام مصر کا نمونہ۔ پارسیوں کی پگڑی اگر کہیں نظر پڑی ہو اور ایک منصب داری پگڑی ہمارے حیدرآباد کی ہی۔ ہلکی۔ سبک۔ پگڑی کی پگڑی اور ٹوپی کی ٹوپی۔ عمامے ہیں پھیٹے ہیں۔ ہمارے ہاں کے نیچریوں کی وضع مخصص لال پھندنے دار ترکی ٹوپی ہی۔ نیچری تو یہاں بھی بہت ہوں گے مگر لال ٹوپیاں کم دکھائی دیتی ہیں۔ اور خدا جانے کتنی قسم کی ٹوپیاں ہیں۔ جتنے سر و تنی پوششیں۔ اور دی لاسٹ دو نوٹ دی لیسٹ (سب سے آخر مگر رتبے میں کم نہیں) ایک بنگالہ ہی کہ اُس کو ٹوپی یا پگڑی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ غرض ہمارا ہندوستان بھی عجیب مختلف الشیون خطہ ہی ہر ایک کی وضع نرالی ہر ایک کی طرح جداگانہ۔ اور جتنا اختلاف ظاہر کا ہی اُس سے کہیں زیادہ مذہب کا معتقدات کا تم کو تعجب ہوتا ہوگا کہ وہ بقدر کف دست ٹوپی سر پر کیسے سنبھلتی ہوگی۔ اگر اوڑھنے کا ارادہ ہو تو تدبیر میں بتا دوں وہ ٹوپی آلپینوں سے بالوں میں اٹکالی جاتی ہی۔ لیکن اب پُرانی باتیں چھوٹتی چلی جاتی ہیں۔ اِلّا یہ ایک عجیب سیر دیکھنے میں آتی ہی کہ جو صوبے بعد کو انگریزی عملداری میں آئے وہ جلد جلد انگریزی اثر سے متاثر ہوتے گئے ہ

خیر تو وہ ریل کے دو مسافر اپنا سارا بکھیڑا لیئے ہوئے سوار ہونے کی غرض سے چلے۔ پلیٹ فارم پر جانے کو اکیلے اکیلے ایک گلیارے میں سے گزرنا ہوتا تھا۔ گلیارے کے سرے پر دونوں ٹھٹکے اب یہ اُس سے کہتا ہی کہ اے قبلہ آپ اور وہ اُس سے اصرار کرتا ہی اے قبلہ آپ ؛

یہ قبلہ قبلہ بیت المقدس تو نہ تھا کہ حکم آیا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (اے پیغمبر اپنا مُنہ مسجدِ حرام کی طرف کو پھیر لو اور تم لوگ کہیں بھی ہوا کرو مسجدِ حرام کی طرف اپنا مُنہ پھیر لیا کرو) اور حکم کے ساتھ سب کے سب کعبہ شریف کو مُڑ گئے۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تحویلِ قبلہ کے بعد پہلی نماز پڑھی اور نماز پڑھ کر گھر جا رہے تھے راہ میں ایک مقام پر بیت المقدس کی طرف کو نماز جماعت ہو رہی تھی۔ اُنھوں نے نمازیوں سے کہا تم کدھر کو نماز پڑھ رہے ہو قبلہ تو بدل گیا اور میں آنحضرت صلعم کے پیچھے ابھی

کی طرف نماز پڑھے چلا آتا ہوں وہ لوگ رکوع میں تھے سنتے ہی کعبہ کو پھر گئے۔
غرض ہمارے اِن لکھنوی دوستوں کا قبلہ قبلہ بیت المقدس تو نہ تھا کہ ایک حکم میں اُس کی تحویل ہو جاتی بلکہ وہ قبلہ تھا تکلف اور ظاہر داری کا۔ وہ قبلہ تھا دکھاوے کا۔ تپاک کا۔ وہ قبلہ تھا وقتی ضرورت پر نظر نہ کرنے کا۔ وہ نام کو قبلہ تھا اور حقیقت میں قطب از جا بجنبد۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریل نکل گئی اور یہ دونوں افسوس کرتے رہ گئے۔
دوسری حکایت یہ ہے کہ ایک مقام پر ریل کی سڑک دُور تک اُونچا ٹیلہ کاٹ کر نکلی تھی۔ دونوں طرف ٹیلے کی سلامی دیواریں بیچ میں سڑک۔ میں نے کہا تھا نا کہ یہ اُن دنوں کا مذکور ہے کہ ریل نئی نئی جاری ہوئی۔ نہیں معلوم بیلوں کا ایک گلّے کا گلّہ کیوں کر سڑک میں اُتر آیا۔ ڈرائیور نے دیکھ کر دُور سے ڈراؤنی آوازیں نکالنی شروع کیں پانی اُڑایا غل مچایا۔ بیل کیا سمجھیں۔ یہاں تک کہ ریل اُن دونوں دیواروں کے بیچ میں آ داخل ہوئی۔ دو بیلوں نے عجیب تماشا کیا۔ ایک تو بیچ سڑک میں گردن جھکا کان کھڑے کر پھنکارے مارتا ہوا ریل سے ٹکر لینے کو تیار ہوا اُس ریل کو شاید بھینس سمجھا ہوگا اور دوسرا دُم دبا کر نہیں بل کہ اُٹھا کر ریل کے آگے ہو لیا۔ اور باقی حیران و مبہوت ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کہ کدھر جائیں کدھر نہ جائیں۔ چٹکی بجاتے میں ریل نے اُس کا جو لڑنا چاہتا تھا اور اُس کا جو ریل کے آگے آگے بھاگتا تھا مگر ریل کی تیزی کو کیا پاتا اور اُن کا جو حیران و مبہوت تھے مگر کچھ کرتے نہ تھے غرض سب ہی کا تو قیمہ کر دیا۔ وہ ہاربل سین (منظرِ خوف ناک) مجھے ابھی تک بھولا نہیں اور بھولے گا بھی نہیں۔
ہاں دونوں حکایتوں سے سوچنے اور سمجھنے والے کے لیے بہت بڑی نصیحت نکلتی ہے۔ ریل کو سمجھو کہ وہ زمانے کا نمونہ ہے اور بیلوں کا گلّہ ہم لوگ ہیں۔ اگر ہم زمانے کی قوتِ رفتار سے واقف نہ ہوں تو۔ اور اُس کا مقابلہ کرنا چاہیں تو۔ اور اُس کے ساتھ ساتھ نہ چل سکیں تو اور کچھ نہ کریں تو زمانے کی ریل ہم میں سے کسی کو پیس کرنے والی (چھوڑنے والی) نہیں۔ یہ وہ چکّی ہے کہ خدا کسی کو اُس کے پاٹوں میں ڈالے ہی نہیں۔ پاٹوں میں آیا اور چاہے آٹا ہو یا گھن سب کو پیس کر رکھ دیتی ہے۔ یہ وہ درانتی ہے کہ گیہوں یا سرسوں یا السی جو کچھ اُس کے مُونہ پر چڑھ گیا بے کاٹے نہیں چھوڑتی اب یہ تمھارا کام ہے کہ زمانے کی رفتار کو پہچانو۔ اُس کی قوت کو سمجھو۔ اور پھر یہ دیکھو کہ تم کن میں ہو۔ اُن لکھنؤ والوں کی ٹکے گز کی چال چل کر ریل پر سوار ہو لو گے یا زمانے کی ریل کا مقابلہ کرو گے یا بھاگ کر اُس کی زَد سے بچ جاؤ گے یا آنکھوں پر پٹی باندھ کر کانوں میں روئڑ (پُرانی روئی) ٹھونس کر زمانے کی ریل کی آمد سے بے خبر ہو رہو گے۔ گُم سُم کھڑے دیکھا کرو گے اور ریل اُوپر اُوپر چلی جائے گی۔ ریل کے پونہچنے میں اب کچھ دیر نہ سمجھنا۔ وہ آئی یہ آئی۔ بھاگو بھاگو بچو بچو۔ انا نذیر العریان فالنجا فالنجا۔
یہ عربی سمجھے۔ حدیث شریف ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اہلِ مکّہ میں منادی کرائی کہ مجکو تم لوگوں سے کچھ ضروری بات کہنی ہے۔ فلاں وقت فلاں مقام پر جمع ہو جاؤ تو جو کچھ مجھ کو کہنا ہے تم کو اُس سے آگاہ کر دوں لوگ جمع ہوئے تو آپ نے پوچھا کہ بھلا اگر میں تم سے کہوں کہ دشمن کی فوج تم کو لوٹنے مارنے کے ارادے سے اِس پہاڑ کی آڑ میں آ کر چھپی پڑی ہے تو تم میری بات کا یقین کرو گے یا نہ کرو گے۔ سب بولے کہ ضرور یقین کریں گے کیوں کہ

تم اپنی قوم کے بدخواہ نہیں۔ جھوٹ بولنا تمھارا شیوہ نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ تمھاری خرابیاں حد سے گزر گئی ہیں اور نزولِ عذاب کا وقت آگیا۔ اور میں نے مارے جلدی کے کپڑے بھی نہیں پہنے اور جیسا بیٹھا تھا تم کو ڈرانے کے لیے بھاگا ہوا آیا ہوں۔

یہی مضمون قرآن میں بھی ہے مگر دوسرے الفاظ میں فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ مگر میں نے جو آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مقولے سے تمثل کیا تو صرف اتنی بات پر کہ میرا نام نذیر ہے اور چاہے یوں سمجھو کہ مجھی کو سوجھی۔ یا کسی دوسرے کے سُجھلانے سے سوجھی۔ مگر میں تمھارے اس بھرے مجمع میں اقرار کرتا ہوں ولا ابالی کہ دوسرے کے سُجھانے سے نہیں بلکہ اس کی دیکھا دیکھی سوجھی۔ کہ مسلمان دنیاوی تعزز۔ دنیاوی تمول کے اعتبار سے تباہ اور برباد ہوتے چلے جاتے ہیں اصل میں غل مچانے والا۔ سوتوں کو جگانے والا آؤ رہی اور میں تو اس کی ہاں میں ہاں ملانے والا ہوں۔ وہ بھی اُس کی سی دل سوزی نہیں۔ اُس کی سی اینگزائٹی (بیقراری) نہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ مسلمانوں کی بدقسمتی کا گرہ کچھ اُترا چلا ہے۔ اور جب سر سید احمد نے اہلِ پنجاب کو زندہ دل کا خطاب دیا تو میں نے ایسا خیال کیا کہ ایسا دُور اندیش۔ ایسا تجربہ کار جس نے مسلمانوں ہی کی دُنیاوی اصلاح کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے اور شبانہ روز اسی دُھن میں غلطاں پیچاں ہے ایک خطّے کے مسلمانوں کی نسبت ایسی عمدہ رائے ظاہر کرے تو یہاں کے مسلمان ضرور ایسے ہی ہوں گے لیکن سوائے اس ایک انجمن حمایت الاسلام کے پنجاب کے مسلمانوں نے اَور کوئی فلاحِ قومی کا کام کیا ہو تو بول اُٹھو۔ کیا اتنے بڑے پنجاب کو پنجاب کے اتنے سارے مسلمانوں کو بس اس ایک انجمن کی اور ایسی انجمن کی حاجت تھی جس کی گزران محض توکل پر ہے شعر

زیادہ ہوگا توکّل سے بھی کہیں روزہ ۔۔۔ کہ اس میں آئی تو روزی ہے اور نہیں روزہ

یاد تو کیوں نہ ہوگا کہ ایک مہینے سے بھی کم میں رمضان شریف تشریف لانے والے ہیں اگرچہ گزشتہ سالوں کی سی سختی اب کے رمضان میں نہیں ہوگی۔ مگر آخر روزہ روزہ ہے اُس وقت انجمن کی حالۃ کی تم کو قدر ہوگی اور پھر بھی جیسی قدر ہونی چاہیئے نہیں ہوگی۔ کیوں کہ تمھارے یہاں برس دن بعد رمضان آئے گا اور انجمن میں بارہ مہینے امیر خانی رمضان رہتا ہے۔

امیر خانی رمضان کا قصہ یہ ہے کہ امیر خاں پنڈارا ایک لُٹیرا آدمی تھا اور اُس نے اپنی قسم کے سپاہی جمع کر لیے تھے۔ ان لوگوں کو کبھی تنخواہ نہیں دی جاتی تھی۔ اتفاق سے نقالوں کا ایک طائفہ اُس کے لشکر میں پہنچا اور لوگوں کو اپنا تماشا دکھانا چاہا۔ لوگوں نے عذر کیا کہ ہم کو دانے گھاس کی مشکل پڑی رہتی ہے تم کو انعام واکرام کہاں سے دیں گے۔ سرگروہ طائفہ نے کہا کہ ہمارا تماشا کرا دو تو ایسی نقل کریں گے کہ شاید تمھاری تنخواہیں بھی تقسیم ہو جائیں۔ چناں چہ ایک شخص بہت بزرگ صورت جیسے ہماری انجمن کے نقیب الاولیا (خان نجم الدین صاحب)٭ آموجود ہوئے۔ طائفے میں سے ایک شخص نے پوچھا۔ کہ حضرت آپ کون بزرگ ہیں اُنھوں نے جواب دیا کہ رمضان شریف۔ اتفاق سے وہ مہینہ شاید ربیع الاوّل کا تھا تو دوسرے نے حیران ہو کر پوچھا کہ رمضان شریف کے اس مہینے میں آنے کا کون سا موقع ہے اُنھوں نے جواب دیا کہ تم کو معلوم

٭ یہ انجمن کے بڑے سرگرم ممبر ہیں۔ لیکچر کے وقت جلسے میں لوگوں کو یہی باترتیب بٹھا رہے تھے ۱۲

نہیں میری تعیناتی امیر خاں کے لشکر میں ہی صرف ایک مہینے کی رخصت ملتی ہی اسی میں سارے جہان میں پھر آتا ہوں اور پھر اپنے ٹھکانے آلگتا ہوں۔ سُنا ہی کہ یہ حکایت امیر خاں کے کان تک پہونچی اور اُس نے تنخواہ کے تقسیم کیئے جانے کا حکم دیا۔

کیا ہمہ وقت کوئی آدمی تمہارے آگے جھولی پھیلائے کھڑا رہے یا ہر ماہواری رسالے میں تمہارے پاس عرضیاں بھیجی جایا کریں یا ہر سالانہ جلسے میں تم کو یاد دلایا جائے کہ ایک انجمن ہی اور اُس نے قوم کی امید پر رفاہِ قومی کے بہت سے کام اُٹھا رکھے ہیں اُس نے ہول پراونس کے یتیموں کو اپنی حفاظت میں لیا ہی ادھ یتیم آدمی کے بچّے ہیں لاوارث بےکس اُن کو تمھاری طرح دو وقت بھوک لگتی ہی۔ جاڑوں میں سردی اُن کو رہنے کو مکان۔ ستر عورت کے لیئے کپڑا درکار ہی غرض وہ بھی آدمیوں کی سی ضرورتیں رکھتے ہیں اور سوائے خدا کی ذات کے کوئی اُن کی ضرورتوں پر نظر کرنے والا نہیں۔ یا نیچے تم۔ اگر خدا تمھارے دل میں رحم ڈالے اور یتیموں کا ترس کھاؤ۔ یا انجمن بیوہ عورتوں کی پرداخت کرتی ہی یا انجمن نے اسکول جاری کیا اور اب وہ اُس کو کالج کرنے پر مجبور ہوئی۔ اور ان سب باتوں کو چاہیئے خرچ۔ انجمن کیمیا بنانی نہیں جانتی اُس کو دستِ غیب کا عمل نہیں آتا۔ اُس نے کہیں سے دبا گڑا خزانہ نہیں پالیا۔ انجمن کے ممبر چور نہیں ڈاکو نہیں کہ کسی کا مال جا کر مار لائیں۔ اُس کا سرمایہ وہی جو تم ہاتھ اُٹھا کر دے دو۔ تم میں سے کون انجمن کی سی بے آس بے سہارے زندگی پسند کرے گا۔ کون ایسی زندگی کرتا ہی۔ کون ایسی زندگی کر سکتا ہی۔ تم کو شروع میں سمجھنا چاہیئے تھا کہ یہ انجمن کہاں تک پاؤں پھیلائے گی۔ اور پبلک کی نظر میں۔ غیر قوموں کی نظر میں۔ خدا اور رسول کی نظر میں اُس کے جاری ہونے سے تم کہاں تک ذمہ وار ٹھیروگے۔ اگر یہ انجمن سسک سسک کر جی جیسی کہ اب تک جی اور اب جی رہی ہی تو سمجھ لو کہ میرے مُنہ میں خاک یہ ایک دن مرے گی اور ضرور مرے گی۔ لیکن خدانخواستہ مری تو اکیلی نہیں مرے گی مسلمانوں کی عزّت کو ساتھ لے کر مرے گی مسلمانوں کی غیرت کو ساتھ لے کر مرے گی مسلمانوں کی حمیّت کو ساتھ لے کر مرے گی۔ میں انجمن کے اتنے ثبات کو بھی اپنے زمانے کا اسلامی معجزہ سمجھتا ہوں۔

سرسید پر جنھوں نے ہندوستان میں اس طرح کی نبّاشی (کفن کھسوٹی) کو رواج دیا جیسی چاہو بدگمانیاں کر لو۔ میں سرسید احمد کا بھاٹ نہیں۔ وہ اگر پیر ہوں تو اُن کا مرید نہیں۔ اُستاد ہوں تو اُن کا شاگرد نہیں مرثیہ خوان ہوں تو اُن کا بسوریا نہیں۔ امیر ہوں اور مجھ کو معلوم ہی کہ نہیں ہیں۔ لیکن اگر امیر ہوں تو اُن کا دست نگر نہ کبھی تھا نہ اب ہوں اور نہ ان شاء اللہ مدت العمر ہوں گا۔ مگر ہی کیا۔ آدمی ہوں۔ دوست دشمن میں تمیز کرنے کی۔ قومی حالت اور قومی ضرورتوں کی شناخت کی عقل رکھتا ہوں۔ تمھارے اس لاہور میں اور لاہور کیا چیز ہی علیگڈھ میں اور علیگڈھ کے شہر میں بھی نہیں۔ نیچر گڈھ میں یعنی محمڈن کالج میں خود سرسید اور اُن کے حواریین کے رُو در رُو میں نے اِس بات کے کہنے میں مطلق باک نہیں کیا۔ اور کیوں کرتا کہ میں اُن کے سب نہیں بعض معتقدات کو غلط سمجھتا ہوں۔ لیکن جیسا مجھ کو اُن کی غلطیوں کا تیقّن ہی اس بات کا بھی تیقن ہی کہ وہ شخص منافق نہیں۔ بُزدل نہیں۔ مکّار نہیں اور قومی خیر خواہی سے ایسا سرشار ہی کہ اُس کا بس چلے تو اپنی تو پہلے ہی سے اُتار رکھی ہی دوسروں کی پگڑی بھی اُتار کر مسلمانوں کے حوالے کردے وہ جو کہتے ہیں حُبُّكَ الشَّئَ يُعْمِي وَيُصِمُّ (آدمی کو ایک چیز کی محبت اندھا بہرا کر دیتی ہی) سید احمد خاں کو مسلمانوں کی دُنیاوی اصلاح کی دُھن میں آگا پیچھا کچھ نہیں سوجھتا۔ افراط تو ہر ایک چیز میں مذموم ہی پس میرے نزدیک سیّد احمد خاں میں عیب ہی تو یہ ہی۔ میری رائے

سید احمد کی نسبت اگر صحیح ہی تو میں کسی سے اُس کی تائید نہیں چاہتا اور اگر غلط ہی تو اصلاح کے لیئے اس کو کسی کے روبرو پیش نہیں کرتا۔ میں نے سید احمد خاں کے ساتھ کسی امر میں مخالفت کی ہو تو سب سے زیادہ مجھی کو اُس کا افسوس ہی۔ اگر مجھ سے اُس میں کسی طرح کی بے تہذیبی سرزد ہوئی ہو۔ اُن کو خدا نے شرف دیا ہی باعتبار عمر کے۔ شرف دیا ہی باعتبار نسب کے شرف دیا ہی باعتبار تعزز دنیاوی کے۔ بہت بڑا شرف دیا ہی باعتبار خیر خواہی قومی کے اور حدیث شریف میں آیا ہی۔ من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منّا (جو چھوٹے پر مہربانی نہ رکھے اور بڑے کا ادب نہ کرے وہ ہم میں کا نہیں) حدیث میں صغیر و کبیر دونوں لفظ مطلق واقع ہیں۔ صغیر سے نہ صرف بیٹا یا چھوٹا بھائی مراد ہی اور کبیر سے نہ صرف باپ یا رشتے کا کوئی اَور بزرگ اور نہ اس میں مذہب و عقائد کی قید ہی بل کہ جناب رسول خدا صلعم کی خدمت میں کچھ وفود یعنی ایلچی آئے اور وہ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اُن کے سرگروہ کو آتا ہوا دیکھ کر اصحاب سے جو حاضر خدمت تھے فرمایا۔ قوموا الی سیدکم (اپنے سردار کو استقبال کر کے لو) غرض من لم یرحم صغیرنا الخ ایسا گولڈن رول (قاعدہ زرّیں) ہی کہ اگر مسلمان اس پر پورا پورا عمل کریں تو اُن کی سوسائٹی سے بہتر شایستہ و مہذّب اور متفق و یک دل دنیا میں کوئی سوسائٹی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر مسلمان اپنے پیغمبرؐ کی بات نہ مانیں اور لوگوں کو زبان و قلم سے ایذائیں دیں اور اپنے بڑوں کا ادب ملحوظ نہ رکھیں اور یوں مسلمانوں میں رنجشیں اور عداوتیں پھیلیں اور وہ سنار کی سی کھُٹ کھُٹ کرتا ہی رہی اور یہ ایک لوہار کی سی جڑ دیں اور یہ سارا نزلہ آخرکار اسلام پر گرے تو اس میں اسلام اور بانیِ اسلام کا کیا قصور ہی۔

مسلمان رسول کی کیا مانیں گے جب وہ خدا کی نہیں مانتے۔ مَیں اس کی تائید میں قرآن کی چند آیتیں پڑھتا ہوں

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْہُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْہُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ۔ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوْنَ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِہْتُمُوْہُ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ۔

(اے ایمان والو کوئی گروہ دوسرے گروہ کی ہنسی نہ اُڑائے۔ عجب نہیں جن کی ہنسی اُڑائی جاتی ہی وہ ہنسی اُڑانے والوں سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کی ہنسی اُڑائیں عجب نہیں جن کی ہنسی اُڑائی جاتی ہی وہ ہنسی اُڑانے والیوں سے بہتر ہوں اور اپنوں کو چھیڑ دست اور نہ بُرے لقبوں سے یاد کرو۔ ایمان لائے پیچھے نافرمانی بڑی بدنامی کی بات ہی اور جو توبہ نہیں کرے گا تو وہی لوگ ظالم ٹھیریں گے۔ اے ایمان والو اکثر بدگمانیوں سے بچتے رہو کیوں کہ بہت سی بدگمانیاں داخلِ گناہ ہیں اور لوگوں کے حالات کی ٹوہ میں مت لگے رہو اور ایک دوسرے کی غیبت مت کرو۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کے گوشت کو کھائے۔ اِس سے تو تم کو ضرور گھن آتی ہو گی۔ اور ڈرو اللہ سے بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور بڑا مہربان ہی)

اور خیر سید احمد خاں سے یہاں بحث بھی کیا ہی۔ وہ اس انجمن کے سکرٹری نہیں، ممبر نہیں۔ پیٹرن نہیں بل کہ من وجہٍ یہ چاہتے ہوں تو تعجب نہیں کہ انجمن کے فنڈز جو کچھ ہوں لے جا کر علیگڈھ کالج میں ٹھونس دوں کہ نہ ہزار ادھورے

اور نہ ایک پورا۔ مگر جن کی طبیعتیں بیش زن واقع ہوئی ہیں وہ ہر ایک گاڑی میں کسی کی بھی ہو بے روڑہ اٹکائے نہیں رہتے۔ شعر

وو دو شوند ار بد نامے رسند　　　باو شوند ار بچرانے رسند

ان کی مثال خچر کی سی ہے کہ گدھوں کو لادنے لگے تو کہا میں گھوڑا ہوں گھوڑوں پر زین کسنے کی نوبت آئی تو لگا ہینچوں ہینچوں کرنے اِنَّ اَنکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ (سب سے بری آواز گدھے کی ہے) اے ظالم کہیں تو لدے اور لدنے گا نہیں تو یہ قومی بوجھ کیوں کر اٹھے گا۔ یہ لوگ کیسا ہی نیک کام ہو ہمیشہ بُرے موٹوز (اغراض) پر ڈھال لے جاتے ہیں شعر

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد　　　میلش اندر طعنہ پاکاں برد

اور کوئی جمتی ہوئی پھبتی نہیں سوجھتی تو مذہب کا حیلہ نکال کھڑا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تعدیۂ امراض میں اختلاف کر رہے ہیں لیکن جس میں اختلاف ہے وہ تعدیۂ امراض جسمانی ہے۔ روحی امراض کے متعدی ہونے میں کچھ بھی شبہہ نہیں ایک گندہ دل سارے کمیونٹی کے دلوں کے بگاڑ دینے کو کافی ہے۔ جیسے کہ ایک دیواسلائی ایک شہر کے جلا دینے کو بس کرتی ہے۔ اگر میٹر ٹیل ڈرائی (چیزیں خشک) اور ہوا موافق ہو۔ فکونوا علی حذر (خبردار ہو) شعر

اے بسا ابلیس آدم روے ہست　　　پس بہر دستے نباید داد دست

میں اپنے زعم میں بہت ہی آزادانہ زندگی بسر کرتا ہوں۔ نہ کسی کالج کا بانی ہوں نہ کسی انجمن کا سکرٹری نہ کسی اخبار کا اڈیٹر لوگوں کی مدح و ذم سے مستغنی تحسین و تحمیق سے بے نیاز۔ میں نے ساری عمر کچھ نہیں دیئے۔ خدمت سے علیحدہ ہو کر خانہ نشین ہوا۔ نہیں معلوم لوگوں نے کیوں کر سمجھ لیا کہ میں ہوا کا رُخ پہچانتا ہوں جو کچھ آپ سمجھتا ہوں دوسروں کو سمجھا سکتا ہوں بشرطے کہ سمجھنا چاہیں اور سمجھ کے پیچھے لاٹھی لئے نہ پھر رہے ہوں دس دفعہ بلایا ایک دفعہ آکھڑا ہوا اور آکھڑا ہوا تو کیوں کر ہو سکتا ہے کہ دل میں ہو کچھ اور کہوں کچھ شعر

راست می گویم ویزداں نہ پسندد جز راست　　　حرفِ ناراست سرودن روشِ اہرمن است

مجھ سے اختلاف ہو تو مجھے جو جی چاہے کہو اور جو جی چاہے سمجھو۔ مگر از برائے خدا یہ نہ کرنا کہ جیسے سید احمد خاں کے ساتھ مجھ کو سمیٹ لیا۔ میرے ساتھ اس بے چاری انجمن کو سان لو۔

مجکو تو نیچری کہلانا عار تھا۔ مگر نیچریت کے اب وہ معنی نہیں رہی جن کی وجہ سے میں نیچریت کو عار سمجھا کرتا تھا اب نیچریت یہ ہے کہ سید احمد خاں کو علیگڈھ کالج کا بانی کہو۔ نیچری۔ علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کا اڈیٹر کہو۔ نیچری۔ سَر کہو۔ نیچری ڈاکٹر کہو۔ نیچری۔ آدمی کہو نیچری۔ تو ایسی نیچریت کا قبول کرنا اس سے زیادہ موجب عار نہیں ہونا چاہیئے۔ جیسے دو اور دو کا چار کہنا۔ میرا نیچریت کو تسلیم کرنا اسی قبیل سے ہے جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ان کان رفضا حب آل محمد　　　فلیشهد الثقلان انی رافضی

(اگر آلِ محمد کے ساتھ دوستی رکھنا رفض ہے تو دونوں جہان اس پر گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں)

میں جو اپنے نفس کا احتساب کرتا ہوں تو میرا صرف ایک ہی خیال ایسا ہے جس کو کوئی معاند نیچریوں سے ملتا ہوا کہہ سکتا ہے یہ میری رائے ضرور ہے کہ تاویل کرنے سے کسی حکم کی ایسی بے حرمتی نہیں ہوتی جیسے اصرار اور اعلان اور تعمیم کے ساتھ اس کی

تعمیل نہ کرنے سے - بات کو صبر و سکون کے ساتھ سنو ہی نہیں تو اُس کا کیا علاج ہی مگر سُنو گے - اور زمانہ - ہماری دعا تو یہ ہی کہ تم ہی کو سُنائے ورنہ تمھاری پہلی نسل نہیں تو دوسری اور دوسری نہیں تو قسم کھانے کی بات ہی کہ تیسری ضرور سُنے گی - کیا چھوٹی چھوٹی باتوں کی فکر میں پڑے ہو انگریزی ایجوکیشن کو روکو - اگر تم سے روکی جائے اور اب تو یہ ایسی جڑ پکڑ گئی ہی کہ بعض انگریز بھی جن کی یہ بلا لائی ہوئی ہی مصرع اے صبا این ہمہ آوردہ تست ؛ اس کو روکنا چاہتے ہیں اور نہیں رُکتی - جن لوگوں نے ایجوکیشن کی قدر و قیمت کو جانا پہچانا وہ ایسے اِس کے گردیدہ ہیں کہ اگر گورنمنٹ اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے دست کش ہونا چاہے تو مارے اجیٹیشن کے یہاں سے ولایت تک گورنمنٹ کی دھجیاں بکھیر دیں - لیکن اگر گورنمنٹ اعلیٰ درجے کی تعلیم سے دست کش ہو بھی جائے تو وہ لوگ چاہے بھوکے مریں ننگے پھریں بھیک مانگیں مگر ایجوکیشن کا بال بیکا نہ ہونے دیں - بنگالی تو بنگالی ہمارے نارتھ ویسٹرن پراونسز (ممالک مغربی و شمالی) میں گورنمنٹ نے دو کالج بند کر دیئے - لوگوں نے چندہ کر کے دونوں کو بدستور قائم رکھا تو جو لوگ اسلام کو معرض خطر میں سمجھتے ہیں اُن کو چاہیئے کہ ایجوکیشن کو روکیں اگر اُن سے روکی جائے - اور یہ نہ رُکی اور نہیں رُکے گی تو جن باتوں کا سُننا ناگوار ہی وہ اُن سے بڑھ بڑھ کر تم آپ کہو گے یہ اپنے آنکھوں دیکھے واقعات ہیں کہ جن باتوں کی اب کوئی مطلق پروا نہیں کرتا اب سے چالیس برس پہلے ایک ایک بات کفر و زندقہ سمجھی جاتی تھی میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہرچند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دین دار - صاف کہہ دیا کہ مجھے اِس کا مر جانا منظور - اِس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں میں ایسے مولوی کا شاگرد ہوں جنھوں نے لاٹ صاحب سے باستکراہ ہرچہ تمامتر اور بہ مجبوری ہاتھ ملا کر اُس ہاتھ کو مٹی سے رگڑ رگڑ کر دھو ڈالا تھا - انگریزی صابون سے نہیں - جنھوں نے پانی پینے کا مٹکا جو جماعت میں رکھا رہتا تھا تُڑوا ڈالا تھا - اِس واسطے کہ اُس میں سے ایک شامت زدہ انگریزی خوان مسلمان پانی پی گیا تھا - تم کیا دین داری برتو گے دین داریاں یہ تھیں جو ہم نے دیکھیں ہیں اور اب اُن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں امرِ ایک دین داری یہ ہی جو ہم اور تم سب دیکھ رہے ہیں - اِن نینن کا یہی لیکھ - وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ - اور ایک دین داری اب سے پچاس برس بعد ہو گی اگر امام مہدیؑ نہ آ گئے - تم ایک سر سیّد کو لیئے پھرتے ہو - کچھ خبر بھی ہی زمانہ کتنے سر سیّد پیدا کر چکا اور کرتا چلا جا رہا ہی - جن میں کے سر سیّد ہیں اُن کا تو یہ مقولہ ہی شعر

اذا مات منا سید قام سید ۔۔۔ قول لما قال الکرام فعول

(جب ہم میں سے ایک سردار مر جاتا ہی تو اُس کی جگہ دوسرا سردار کھڑا ہو جاتا ہی اور وہ بھی بزرگوں کی سی باتیں کرنے لگتا ہی اور اُنھیں کے سے کام)

قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ پر جہاں اَور اعتراض ہیں وہاں ایک یہ بھی ہی کہ جو کچھ تمھاری کتاب میں لکھا ہی اُس پر تو عمل کرو فاتوا بالتوراۃ فاتلوھا ان کنتم صدقین ولیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ (توراۃ لے آؤ اگر تم سچے ہو تو اُسے پڑھ کر دیکھو - اور جن پر انجیل اُتری ہی اُن کو چاہیئے کہ جو کچھ اللہ نے انجیل میں اُتارا ہی اُس کے مطابق تو حکم دیں) یا اُن وقتوں کی باتیں رہنے دو - احکام عشرہ میں کے یہ احکام کہ کل کے لیئے ذخیرہ مت کرو - یا تمھارے داہنے کلّے پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا اُس کے سامنے کر دو - ہم نہیں کہتے کہ خدا نے یہ ناممکن التعمیل احکام بھیجے تھے شاید اُس زمانے میں ایسے متوکّل ایسے بے نفس لگ رہے ہوں گے مگر اب ہمارے وقتوں میں کوئی ایک یہودی کوئی ایک نصرانی یا کوئی ایک آدمی اِن حکموں کی تعمیل کرتا یا کر سکتا ہی - تو خود اُن ہی کا - لا

(قانون) اُن کو کنڈم کر رہا ہی (مجرم قرار دے رہا ہی) اب تم اپنی جگہ آپ احتساب کر لینا کہ مسلمان کسی ایسے الزام کے مورد ہیں یا نہیں۔ کیوں کہ معاملہ خدا کے ساتھ ہی۔ شعر

زور ت ار پیش می رود با ما ، با خداوندِ غیب داں نہ رود

کوئی نہیں کہتا اور کسی کو کہنا چاہیئے بھی نہیں کہ مذہب سے قطع نظر کرو۔ مذہب قطع نظر کرنے کی چیز نہیں ہی آدمی کی اور خصوصًا ہم مسلمانوں کی دنیاوی اور دینی فلاح موقوف ہی مذہب پر۔ ہم اُس گروہ کے لوگ ہیں جن کو مذہب نے کھڑا کیا مذہب نے ہم کو ترقی دی۔ مذہب نے ہماری حالت درست کی مفلس تھے مذہب کی بدولت امیر ہو گئے۔ خاکِ مذلت پر پڑے تھے۔ مذہب کی بدولۃ اوجِ عزت پر متمکن ہوئے۔ محکوم تھے مذہب کی بدولۃ حاکم بنے۔ رعیت تھے مذہب کی بدولۃ بادشاہ بنے۔ شاہنشاہ بنے۔ غرض کچھ نہ تھے مذہب کی بدولۃ سب کچھ ہو گئے۔ کیا یہ کچھ کم افسوس کی بات ہی کہ اب وہی ہم ہیں اصل ابتدائی حالۃ سے بھی کمتر فروتر۔ حالۃ میں اتنا انقلاب ایسا ردّ و بدل۔ اِس قدر اختلاف۔ یہ کیوں؟ یہ وہی مذہب کا مِسیُوس یعنی مذہبی غلط فہمی مذہب کو بُری طرح سے عمل میں لانا۔ یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہی ہر شخص اپنی جگہ اس کا فیصلہ کر لے کہ ہم مسلمان ہندوستان میں انگریزوں کی عمل داری میں اِسلام کو دنیاوی عزت۔ دنیاوی تموّل کے ساتھ جمع کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں کر سکتے تو کچھ بحث نہیں۔ تکرار نہیں۔ لڑائی نہیں جھگڑا نہیں۔ چلو اپنا اپنا بوریا بدھنا باندھ باندھ کر ان ظالموں کی عمل داری سے نکل بھاگیں۔ لیکن کتنے آدمی ہیں جو ایسا ارادہ کریں یا چلنے والوں کے ساتھ چل کھڑے ہوں۔ جن سے کہو گے وہی کانوں پر ہاتھ دھرے گا کہ نا بابا ہم ایسا امن۔ ایسی آسایش۔ ایسی آزادی کہاں پائیں گے۔ رہا مذہب وہ ہمارے دل کے ساتھ ہی جہاں ہم وہیں مذہب۔ شعر

میں وہ نہیں کہ تم ہو کہیں اور کہیں ہوں میں ، میں ہوں تمھارا سایہ جہاں تم وہیں ہوں میں

یہاں ہم کو کاہے کی روک ٹوک ہی۔ نماز پڑھنی چاہیں روزہ رکھنا چاہیں۔ کوئی مانع نہیں۔ زکوٰۃ دینی چاہیں یعنی انجمن حمایت الاسلام کی مدد کرنی چاہیں۔ کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں حج کو جانا چاہیں کوئی مزاحم نہیں۔ ہاں روک سمجھو ٹوک سمجھو تو صرف اِتنی کہ دوسرے مذہب والوں کے حقوق میں دست انداز نہ ہوں۔ لیکن کچھ ایسے بھی نکلیں گے جن کے حق میں شیخ سعدی علیہ الرحمۃ سات سَو برس پہلے کہہ مرے ہیں شعر ترکِ دنیا بہ مردم آموزند ، خویشتن سیم و غلّہ اندوزند

اور شاعرِ عربی کہتا ہی۔ شعر

عجبت من شیخی ومن زھدہ ، وذکرہ النار واھوالھا

یکرہ ان یشرب من فضۃ ، ویسرق الفضۃ ان نالھا

(مجھ کو اپنے پیر صاحب اور ان کی پرہیزگاری پر تعجب آتا ہی اور وہ جو دوزخ اور اُس کی ہولناک باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں اس سے بھی تعجب آتا ہی چاندی کے باسن سے تو پانی پینا مکروہ سمجھتے ہیں اور اگر دسترس ہو تو چاندی چُرا کر ڈب میں رکھ لیتے ہیں) حافظِ شیراز فرماتے ہیں شعر

فقیہ مدرسہ دے مست بود و فتویٰ داد ، کہ مے حرام ولے بہ ز مالِ اوقاف ست

یہ ہیں جو مسلمانوں کو اُبھرنے نہیں دیتے۔ عام مسلمانوں میں اتنی لیاقت نہیں کہ انجام کار کو سوچیں۔ بیچارے بہکانے میں آ جاتے ہیں۔ اور یوں مسلمانوں کی مٹی خراب ہو رہی ہی۔ لیکن یہ فتار بقدم رِجلا و یؤخر اخری (ایک پاؤں آگے رکھیں اور

ایک پیچھے) اس بُعد مسافت پر نظر کرتے کچھ بھی نہیں جو ہم کو طے کرنی ہی۔ کب تک اس تذبذب میں رہوگے بات کو یک سُو کر چلو۔ یا تو کچھ مت کرو کہ اُوپر والوں کو صبر آجائے اور کرتے ہو تو جی کھول کر کرو۔ یا مُرغے لڑانے منظور ہیں اور اسی میں کچھ مزہ ملتا ہی تو ویسی کہو مَیں تو اس مرتبہ تم سے دو ٹوک بات کرنے آیا ہوں۔ میری نسبت اگر مذہبی بدگمانی ہی اور میرے عقائد بُرے ہیں تو مجکو اُن کا وبال بُھگتنے دو۔ مَیں تم میں سے کسی سے شفاعت کا خواستگار نہیں **شعر**

رفتن بہ پائے مردیئے ہمسایہ در بہشت — حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابرست

یہ میری کبھی خواہش نہیں ہوئی اور انشاءاللہ ہوگی بھی نہیں کہ لوگوں کو مذہبی عقائد میں اپنا ہم خیال بناؤں اور اقل الجماعۃ کا بھی لیڈر سمجھا جاؤں۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے میرے اور لوگوں سے اُن کے افعال و معتقدات کا حساب لیا جائے گا وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (ایک کا بوجھ دوسرے پر نہیں ڈالا جائے گا) لیکن کہلواتے ہیں تو کہتا ہوں۔ پوچھتے ہیں تو بتاتا ہوں۔ سوال کرتے ہیں تو جواب دیتا ہوں کہ میرے نزدیک اسلام لازمۂ انسانیت ہی فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (اللہ کی بناوٹ جس کے مطابق لوگوں کو بنایا اللہ کی خلقت کو کون بدلے۔ یہی ہی ٹھیک دین لیکن اکثر لوگوں کو معلوم نہیں) کھانے سے۔ پینے سے۔ پہننے سے کسی وضع میں رہنے سے کسی زبان کے سیکھنے سے کسی علم کے پڑھنے سے آب و ہوا سے۔ دنیاوی حکومتوں کے ردّ و بدل سے اس میں فرق نہیں آسکتا۔ اگر انسان ایک خدا کا قائل نہیں تو وہ اوجِ انسانیت سے ساقط ہو کر حضیضِ حیوانیت پر آگرا ہی اور اگر ایک خدا کا قائل ہی اور بندہ بشر ہی کوئی امر نامشروع بھی اُس سے سرزد ہو جاتا ہی تو وہ ڈسپلن (قواعد) کو توڑتا ہی اور اُس کی پاداش میں شاید اُس کی ذلیل بول جائے یا اُس کا اینک (درجہ) توڑ دیا جائے یا اُس کا رشین (مراتب) گھٹا دیا جائے یا اُس کا بھتہ موقوف یا اور کوئی سزا دی جائے مگر فوج سے اُس کا نام نہیں کٹے گا۔ اُس کو گولی نہیں ماری جائے گی اُس کو پھانسی نہیں لگے گی۔ ڈیٹس آل (بس ہو چکا) اسلام کی جنرلیٹی (عمومیت) کہ قیامت تک اب کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔

ما کان محمد ابا احد من رجالکم و لکن رسول اللّٰہ و خاتم النبیین اور ما ارسلناک الا کافۃ للناس (محمد تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں بل کہ خدا کے رسول ہیں۔ جن پر نبوت ختم ہو گئی اور ہم نے تم کو کل دُنیا کے سارے لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کے بھیجا ہی) غرض کیا بلحاظِ زماں اور کیا باعتبارِ مکاں اسلام کی جنرلیٹی پڑی پکار رہی ہی کہ اُس کو کیا ہونا چاہیے اور لوگوں نے اُس کو کیا بنا رکھا ہی۔ مگر وہ اپنی اصلیت پر آئے گا ضرور آئے گا۔ اور یہی ایجوکیشن اُس کو اُس کی اصلیت پر لائے گی۔ لیکن یہ جنریشنز کے کام ہیں۔ ایجوکیشن اور مذہب یعنی مذہبِ متعارف میں کسر و انکسار ہونے کو مدتیں چاہئیں۔ اُس وقت تک پیشین گوئی کے جرم میں جس جس کی قسمت میں گالیاں کھانی لکھی ہیں گالیاں کھالے اور جس جس کی تقدیر میں لعنتیں بدی ہیں لعنتیں سُن لے۔ پھر جو ہونا ہی وہ ہوگا

نوشتہ بماند سیاہ بر سفید — نویسندہ را نیست فردا امید

ایسا پریکٹیکیبل (ممکن التعمیل) ایسا سمپل (سلیس) ایسا ریزنیبل (معقول) مذہب جیسا کہ حقیقت میں اسلام ہی۔ کوئی شخص جس کو خدا نے کامن سنس (معمولی عقل) دیا ہی اُس کو ریجکٹ (نامنظور) نہیں کر سکتا۔ وہ صرف تنکے کے اوجھل پہاڑ

ہی - ذرا از برائے خدا اس نکتے کو تو سمجھو کہ فطرۃِ انسانی اسی طرح سے واقع ہوئی ہی کہ جو پیدا ہوتا ہی وہ مسلمان ہی پیدا ہوتا ہی اس کے یہی معنی ہیں کہ تمام بنی آدم اصلِ خلقت کی رُو سے مسلمان ہیں یہ وہی بات ہی کہ کسی نے پوچھا ناک کدھر ہوتی ہی - ایک نے سامنے سے ناک پر اُنگلی رکھ کر بتادیا کہ یہ ناک ہی دوسرے نے گُدّی کے پیچھے سے ہاتھ لے جاکر بتایا کہ یہ ناک ہی ناک تو جہاں ہی وہیں ہی صرف بتانے کے طریقے مختلف ہیں قرآن سے تو اِس کی سند سُن ہی چکے ہو وہی فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا - اب لو حدیث ایک بار اُس رحمۃ اور شفقۃ کے جوش میں جو پیغمبروں کا خاصہ ہی ہمارے پیغمبر صاحب نے اپنے خادم بلال رضؓ کو حکم دیا کہ اے بلال رضؓ جا مدینے کی گلی کوچے میں میری طرف سے پکار پھر من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ (جو ایک خدا کا قائل ہو وہ جنتی ہی) بلال رضؓ چلے - راہ میں ملے عمر رضؓ پوچھا بلال رضؓ کدھر - اُنھوں نے بیان کیا تو عمر رضؓ اُن کو آں حضرت کی خدمت میں لوٹا لائے اور عرض کیا اے جناب کہیں ایسا نہ ہو یہ حکم عام سُن کر لوگ نیک کاموں کے کرنے سے باز رہیں وہ حکم ایک مصلحت سے اُس وقت مشتہر نہ ہوا مگر لکھا ہوا موجود ہی اور پڑھے لکھے اس سے واقف ہیں - اگر اسلام کو اُس کے اصلی پیرایے میں پیش کیا گیا ہوتا - تو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ اسلام کو لیا ہوتا - مگر دنیا کی بدنصیبی سے وہ پیش کیا گیا غارت گری اور خوں ریزی کے پیرائے میں - پیش کیا گیا عذاب اور مصیبت کے پیرائے میں اور پیش کرنے والے کون دنیا کے بادشاہ جاہ و ثروت کے فریفتہ ملک گیری کے حریص - پس لوگ اسلام کی ڈراؤنی صورت سے لگے بھاگنے - اور افسوس ہی کہ اب بھی مسلمانوں کی طرف سے استمالت اور تالیف قلوب کی مطلق کوشش نہیں کی جاتی وہ پشت ہا پشت کے موروثی مسلمانوں کو اسلام سے نکال دینے کی فکر میں لگے ہیں - مسلمانوں کو کافر کہہ بیٹھنا - مرتد بنا دینا یہ تو اُن کی ایک معمولی بات ہی - جن طبیبوں کے پاس مرجوعہ زیادہ ہوتا ہی وہ موسمی امراض کے کسی ایک نسخے کی بہت سی نقلیں کرا رکھتے ہیں - نہ نبض دیکھیں نہ حال پوچھیں - مریض آیا اور اُنھوں نے مسند کے تلے سے نسخہ نکال حوالے کیا اُدھر ایک عطار لگا ہوا ہی وہ حکیم صاحب کے دستور سے واقف ہی اُس نے پہلے ہی سے پڑیاں باندھ رکھی ہیں اتنا دیکھ لیا کہ نسخہ حکیم صاحب کا ہی - دواؤں کے نام اور اوزان پڑھے لونڈے سے کہا کہ فلاں خانے میں جو پُڑا رکھا ہی اُن کو لاکر دیدے - لائیے حضرت ساڑھے چار پیسے - قریب قریب یہی حال ہی اِس زمانے کے کفر کے فتووں کا - لیکن اے آریو - اے برہمو - اے ہندو بھائیو - اے عیسائیو - اے اسلام کے سوا کسی اَور مذہب کے ماننے والو - اے مذہب کی تلاش رکھنے والو - اِن لوگوں کی بات پر مت جاؤ اگر تم آدمی ہو اور ضرور آدمی ہو اگر تم عقل بھی رکھتے ہو اور ضرور رکھتے ہو - تو تم خدا کو مانتے ہو گے اور اُس کو ایک بھی جانتے ہو گے - اب تم ساری دنیا کو چھان ڈالو دیکھو تو اتنی ہی بات پر کوئی بھی تم پر ہاتھ دھرتا کوئی بھی تم کو نجات ابدی دلا دینے کا وعدہ کرتا ہی - ہاں ایک شخص ہی محمدؐ عربی اسلام کا پیغمبر - منکسر - متواضع - سیدھا سادہ - بے تصنّع - بے تکلّف - بے طمع وہ اطمینان کرتا ہی کہ چلو میں تم کو بخشوا دیتا ہوں بے شک لوگوں نے اس کی بُرائیاں تم سے کی ہوں گی اور اب بھی کرتے ہوں گے لیکن اگر کوئی تم سے کہہ دے کہ کوّا تمھارے کان لے گیا تو کیا سُننے کے ساتھ کوّے کے پیچھے دوڑے دوڑے پھرو گے کیوں نہیں پاس کے پاس ٹٹول لیتے کہ سر میں کان بھی ہیں یا نہیں - اِس کی بات کو تو جانچو کہ کہتا کیسے پتے کی ہی - ابدی نجات اور ایسی سستی - اور اگر نجات کی قدر ہی نہیں اور عذاب میں مرنا منظور رہی تو پڑو چولھے میں - ہم تو اپنا اُلاہنا اُتار چکے -

مذہب کا گڈ یوس (یعنی اچھا استعمال) یہ ہی کہ ہم اپنے نفوس کی اصلاح کریں۔ ہم کو آپ اپنا جج بننے کا کوئی استحقاق نہیں لا تزکوا انفسکم ھو اعلم بمن اتقی۔ (اپنے مُونہ آپ نیکوکار مت بنو خدا ہی کو خبر ہی کہ اُس کے نزدیک کون نیکوکار ٹھیرتا ہی) مَیں خیال کرتا ہوں کہ انسان کو اپنے نفس کی اصلاح کا ایسا شغل ہی کہ اگر وہ اِس ڈیوٹی کو اچھی طرح ادا کرے تو اُس کو دوسروں کے حالات کی تجسّس کی فرصت ہی نہیں مل سکتی۔ میری باتوں سے ایسا ظاہر ہوتا ہوگا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اُس پر عمل کرتا ہوں لیکن اگر عمل کرتا ہوتا تو تم سب پر عملِ مقناطیسی کر دیا ہوتا اثر جو نہیں ہوتا اِسی سے نہیں ہوتا کہ کہا سب کچھ جاتا ہی اور کیا کچھ بھی نہیں جاتا بیت

ہر یکے ناصح برائے دیگراں ⁂ ناصحِ خود یافتم کم در جہاں

کہنے کو تو چھوٹے چھوٹے دو جملوں میں سارے اسلام کا خلاصہ ہی لا الہ الاّ اللہ محمّد رسول اللہ (خدا ایک محمّد برحق) لیکن مُونہ سے ایک اور برحق کہنے کی سند نہیں۔ کردار سے۔ گفتار سے۔ رفتار سے۔ ثابت کرو۔ کہ تم نے خدا کو ایک اور محمّد کو برحق سمجھا۔ ایک توحید ہی ایسی ٹیڑھی کھیر ہی کہ اُمّتیں کی اُمّتیں اِسی امتحان میں فیل ہو گئیں۔ باوجودے کہ عقلی شہادت موجود ہی اور جو عقل ہم کو بتاتی ہی کہ خدا ہی یہی یہ بھی بتاتی ہی کہ وہ ایک ہی۔ مگر آدمی کچھ ایسا ڈھل مُل یقین مخلوق ہی کہ وقت پر بہک ہی جاتا ہی اسلام سے پہلے خدا ہی کی اُتاری ہوئی شریعتیں تھیں۔ ان شریعتوں میں اوامر تھے نواہی تھے آداب تھے مواعظ تھے حکم تھے۔ سب ہی کچھ تھا یہی باتیں تھوڑی ردّ و بدل سے اسلام میں بھی ہیں۔ پھر کیا ضرورت داعی ہوئی کہ ایک نیا مذہب جاری کیا جائے کہ وہ جورو کو خصم سے باپ کو بیٹے سے دوست کو دوست سے مالک کو جائداد سے گھر سے وطن سے۔ آدمی کو آدمی سے جدا کر دے۔ اور ایک جدید قانون ہو اور وہ فیصلہ کرے۔ فریق فی الجنۃ وفریق فی السعیر۔ (ایک گروہ جنت میں ایک گروہ دوزخ میں) ہاں وہ ضرورت تھی اُسی توحید کی خامی۔ اُسی توحید کا تزلزل۔ پس بڑی بات سب سے بڑی بات۔ مہتم بالشّان بات جو اسلام میں ہی وہ توحید ہی۔ پاک۔ صاف۔ خالص۔ بے آمیزش۔

جناب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تو اِس کا اس قدر اہتمام تھا کہ ساری عمر اِسی کی رخنہ بندیوں میں لگے رہی اپنی تعظیم تک جائز نہیں رکھتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو لوگ مبالغہ کرنے لگیں اور میرے ساتھ وہ معاملہ کریں جو یہود نے حضرت عزیر اور نصاریٰ نے حضرت عیلے علی نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ کیا بدر کی لڑائی فتح ہوئی تو انصار کی لڑکیاں بیت الرسالت میں آ کر شادیانے گانے لگیں۔ آپ خاموش پڑے سُنتے رہے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے کہا ہم میں رسول ہیں جو غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ جھٹ اُٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ نہیں نہیں وہی اپنا پہلا گیت گائی جاؤ۔ اپنی قبر کے بارے میں تو آپ نے بار بار فرمایا کہ دیکھنا میرے بعد میری قبر کو نہ پوجنے لگنا۔ تصویر کے کھینچنے۔ تصویر کے رکھنے کے باب میں جیسے جیسے وعید ہیں وہ سب تدبیریں تھیں سدِّ بابِ بُت پرستی کی۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اِس سے بڑھ کر انسان اَور کیا کر سکتا ہی کہ پانچوں وقت نماز میں ہر مسلمان کے مُنہ سے کہلوایا جاتا ہی کہ اشھد ان لا الہ الاّ اللہ واشھد ان محمدا عبدہ و رسولہ ؛

اِس نبیِ موحد علیہ افضل الصلوٰت واکمل التحیات کی امت کو دیکھو۔ ہم کو دوسرے ملکوں کی تو خبر نہیں مگر غالب ہی کہ یہی حال ہوگا جو یہاں کا ہی کہ بزرگانِ دین کی تعظیم کو جزوِ عبادت تک لے پہنچا دیا ہی جب تک مُنہ سے نہ کہیں معلوم نہیں ہوتا کس سے حاجت طلب کر رہی ہیں اور کس کی شفاعت چاہتے ہیں اور اگر خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم (بہتر لوگ میرے زمانے کے۔ پھر جو اُن کے بعد۔ پھر جو اُن کے بعد کے

سلسلے کی رعایت کی جائے اور رعایت ہونی چاہیئے کیوں کہ وہ فرمودۂ رسول ہے تو ان بزرگوں کی نوبت بھی نہ آئے۔ لیکن مسلمانان درگور مسلمانی در کتاب۔ معدودے چند مسلمان ہیں جو توحید کا پاس کرتے ہیں سو اُن کو وہابی وہابی کہہ کر اس فکر میں لگے ہیں کہ اُن کو باغیِ سرکار ٹھیرا کر بن پڑے تو جلاوطن کرا دیجیے۔ سورۂ مائدہ کا اخیر رکوع میرے اس مطلب سے بہت ہی چسپاں ہی فرماتے ہیں۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۝ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ط (اور جب اللہ پوچھے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ کیا تُو نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے علاوہ مجھ کو اور میری ماں کو معبود قرار دو تو حضرت عیسیٰ بارگاہِ رب العزت میں عرض کریں گے کہ اے خداوند تو عارِ شرک سے بری ہے بھلا یہ کہیں مجھ سے ہو سکتا تھا کہ جو بات مجھ کو سزاوار نہیں مُنہ سے نکالوں۔ اگر میں نے کہی ہو گی تو اے خدا ضرور تجھ کو اُس کا علم ہوا ہو گا۔ کیوں کہ تُو میرے دل کی بات جانتا ہے اور مجھ کو تیرے اسرارِ قدرت کی کچھ خبر نہیں میرے دل کی بات کیا تجھ کو غیب کی ساری باتیں معلوم ہیں۔ مجھ کو جو تُو نے ارشاد فرمایا تھا وہی جوں کا توں میں نے اُن لوگوں کو کہہ سنایا تھا اس کے سوا ایک حرف نہیں کہ اللہ کی پرستش کرو جو میرا اور تمھارا سب کا پروردگار ہے اور جب تک میں اُن کے ساتھ موجود رہا میں اُن کے حالات دیکھتا رہا جب تُو نے مجھ کو اپنے پاس بلا لیا۔ تو تُو اُن کا نگرانِ حال تھا اور تو بھی چیز کو دیکھتا رہتا ہے اگر تو اُن کو سزا دینی چاہے تو یہ تیرے بندے ہیں تیرے حکم سے باہر نہیں اور اگر معاف کر دے تو تُو اختیار رکھتا ہے اور مصلحت شناس ہے اس پر اللہ جل شانہ فرمائے گا۔ آج کا دن وہ دن ہے کہ سچوں کو اُن کا سچ کام آئے گا ان کے لیے باغ ہیں۔ جن کے تلے نہریں پڑی بہہ رہی ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اُن میں رہیں گے اللہ اُن سے راضی اور وہ اللہ سے خوش یہ ہے بڑی کامیابی ؎)

انبیاء کے بھی مدارج ہیں چناں چہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَیْنَا عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (یہ ہمارے رسول ہیں۔ اِن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر مدارج کے اعتبار سے بزرگی دی اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو ہم نے معجزے دیئے اور روح القدس سے مدد دی ؎)

جب تک قرآن یا حدیث میں صراحت نہ ہو ہم کسی پیغمبر کے درجے کی تعیین نہیں کر سکتے اِس آیت میں جو میں نے ابھی پڑھی عیسیٰ علیہ السلام کا بالتخصیص مذکور ہے اور ایک جگہ فرماتے ہیں شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسٰۤى (تمھارے لیے دین کی ایسی راہ نکالی جس کی وصیت نوح کو کی تھی اور اُسی کی وحی ہم نے تمھاری طرف بھیجی اور اُسی کی وصیت ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو کی تھی) اور ایک جگہ فرماتے ہیں۔ ولقد ارسلنا نوحًا و ابراهیم وجعلنا فی ذریتهما النبوة والکتٰب فمنهم مهتد و کثیر منهم فسقون ثم قفینا علٰی اٰثارهم برسلنا وقفینا بعیسی ابن مریم واتینه الانجیل (اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو رسول بنا کر بھیجا اور اُن کی نسل میں نبوت اور کتاب کو رکھا تو اُن میں سے بعضے راہ یاب ہیں اور اکثر اُن میں کے بدکار ہیں پھر اُنھیں کے قدم بقدم ہم نے اپنے دوسرے رسولوں کو چلایا اور اُن ہی کے قدم بقدم عیسیٰ کو چلایا اور ہم نے اُن کو انجیل دی) اِن آیتوں سے

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ بھی بڑے درجے کے پیغمبر ہیں اور صاحب کتاب ہونے میں تو کچھ شک ہی نہیں - ایک بات اُن میں خاص ہے کہ دوسرے انبیا کو معجزے دیئے گئے تھے اور حضرت عیسیٰ کو بھی دیئے گئے تھے مگر وہ خود بھی ایک معجزہ تھے کیوں کہ بے باپ کے پیدا ہوئے تھے بہر کیف وہ ایسے کچھ تھے کہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں نے غلطی کی - بیجا کیا برا کیا - مگر اُن کو خدا مانا - اچھا خدا مانا تو کیا کیا؟ کیا جو خدا کے ساتھ کرتے ہیں - اُن سے دعائیں مانگیں - اُن سے حاجتیں طلب کیں - اُن کو خدا کی طرح متصرف با اختیار سمجھا - اُن کی وہ تعظیم کی جو خدا کی کی جاتی ہے اسی کا نام ہے شرک اور یہی وہ بلا ہے جس کی خدا کو چڑ ہے وہ فرماتا ہے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (شرک بڑی ہی ظلم کی بات ہے) اور فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (اللہ کے ہاں اُس کی تو مغفرت نہیں جو شرک کرتا ہے لیکن شرک سے کم جو گناہ ہوں وہ جس کو چاہے معاف کر دے) اور واقع میں شرک تو کھلی کھلی بغاوت ہے جب ایک شخص خدا کو خدا ہی نہیں مانتا - پھر اُس سے امیدِ مغفرت کیسی جو تیرا خدا ہو اُس کے پاس جا اور اُسی سے مغفرت مانگ - خیر تو لوگوں نے حضرت عیسیٰ کو اور اُن کی والدہ کو شریکِ خدائی گردانا آدمی سے سب حمق ہو سکتے ہیں مگر نہیں ہو سکتا تو یہ کہ وہ اپنے تئیں خدا سمجھے اور فرعون کا انا ربکم الاعلیٰ سنا ہو تو وہ اُس کی بیہودہ شیخی تھی - اور خوش حالی اور حکومت کے غرہ میں آ کر حضرت موسیٰ کی ضد سے اُس نے نالائق بات مُنہ سے بک دی عجز و بے کسی کا وقت آیا تو اُس کی ساری قلعی کھل گئی - حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (جب لگا ڈوبنے تو بول اُٹھا کہ میں ایمان لایا اس بات پر کہ جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں مان نکلا) اور فرعون پر کیا موقوف ہے تمام آدمیوں کا یہی حال ہے کہ مصیبت کے وقت اُن کو خدا یاد آتا ہے اور خوش حالی میں خدا کی کچھ پروا نہیں کرتے - چناں چہ انسان کی اس عادت کو خدا تعالیٰ نے اس طرح پر بیان فرمایا ہے - حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ لَىِٕنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (یہاں تک کہ جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور بادِ موافق اُس کو لے چلتی ہے اور مرضی کے موافق ہوا پا کر خوش ہوتے ہیں تو ہوا کا جھونکا ناؤ کو آ لگتا ہے اور ہر طرف سے موجیں آنے لگتی ہیں اور لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ اب تو ہم گھر گئے تو بڑے خلوص کے ساتھ خدا کو پکارنے لگتے ہیں کہ اگر ہم کو اس بلا سے نجات دے تو ہم تیرے شکر گزار بندے ہو کر رہیں گے جب اُن کو خدا نجات دیتا ہے تو ناحق خشکی میں جا کر بغاوت کرنے لگتے ہیں - لوگو یہ بغاوت تمہارے ہی حق میں مضر ہے دنیا کے جیتے جی کے فائدے ہیں - پھر تم کو ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے اُس وقت ہم تم کو بتا دیں گے کہ تم نے کیسے عمل کیے) مُنہ بھر بھر کر فرعون پر لعنت کرنے کو تو سب ہی ہو جاتے ہیں اور مجھے ایک دن خیال آیا کہ فرعون کی طرح الیس لی ملک مصر وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ (کیا میں ملک مصر کا مالک نہیں ہوں اور یہ نہریں میرے محلوں کے نیچے پڑی بہ رہی ہیں) ہو اور پھر آدمی انا ربکم الاعلیٰ نہ کہے تو جانیں - وہ شیخی جو مادۂ فرعونیت ہے ہمارے ہاں کے ناموں اور خطابوں میں پڑی جھلکتی ہے تو غرض یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی شان سے نہایت بعید تھا کہ دعویٰ خدائی کریں اور اپنی پرستش کرانا چاہیں ما کان لبشر

ان یؤتیہ اللہ الکتب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتب وبما کنتم تدرسون ولا یامرکم ان تتخذ والملئکۃ والنبیین اربابا ایامرکم بالکفر بعد اذ انتم مسلمون (یہ کسی بشر کا کام نہیں کہ خدا اُس کو کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر وہ لوگوں سے لگے کہنے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بنو بل کہ وہ تو یہ کہے گا کہ خدا پرست بنو کیوں کہ تم کتاب اللہ پڑھتے پڑھاتے رہے ہو اور تم کو ایسا حکم نہیں دے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا بناؤ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم تو اسلام لے آئے اور وہ تم کو کفر کا حکم دے) لیکن حضرت عیسےٰؑ کے معتقدین نے اُن کی پرستش کی اور اُن کو اور اُن کی والدہ کو خدائی کے درجے میں لیا۔ لیکن یہ لیا اُن کو سہری نہیں (خلافِ قیاس) خیال ہے کہ واقع میں سخت تعجب ہوتا ہے لوگوں نے کیوں اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی دل میں آنے دیا۔ مگر پھر کچھ بھی تعجب نہیں ہوتا۔ کیوں کہ حضرت عیسےٰؑ تو پھر بھی بڑے رتبے کے پیغمبر تھے بے باپ کے پیدا ہوئے تھے معجزے کی طاقت سے مردوں کو جلاتے۔ اندھوں کو بینا۔ کوڑھیوں کو چنگا کرتے تھے ان کی نسبت ایسا یہ گمان کر لیا گیا ہو کہ یہی خدا ہیں یا یہ بھی خدا ہیں تو انسان کے ضعف سے کچھ بھی بعید نہیں۔ لیکن ہم مسلمانوں کا کیا حال ہے کہ ہم میں کا ایک جمّ غفیر قریب قریب اسی طرح کی مدارات ہر ایک شخص کے ساتھ کرتا ہے جس کو وہ بزرگ سمجھ لے تو ہم کس مُنہ سے اعتراض کر سکتے ہیں یہود پر نصاریٰ پر مشرکین پر۔

باقی رہی تاویل کہ ہم اُن کی تعظیم کرتے ہیں نہ پرستش ہم اُن سے شفاعت چاہتے ہیں نہ حاجت سو یہ تاویل تو نئی نہیں بل کہ مشرکین سے لی گئی ہے اور خدا کی جناب سے نامنظور ہو چکی ہے وہ بھی یہ کہتے تھے ہٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ (یہ ہیں ہمارے سفارشی اللہ کی سرکار میں) مَا نَعْبُدُہُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی (ہم تو ان کی پرستش اسی لیے کرتے ہیں کہ اللہ کی سرکار میں ہماری رسائی کی تقریب کر دیں) کیا انصاف ہے کہ وہ خدا کی نظر میں ایسی ہی شفاعت اور ایسی ہی تقریب کے ہوتے مشرک ٹھیریں اور ہم سو ہم کے موحّد۔ توحید نہ ہوئی بی بی تمیز کا وضو ہوا کہ وہ کسی طرح ٹوٹتا ہی نہیں۔ پس ہم نے بنی اسرائیل کی طرح خدا کے ساتھ ایک اَدّعائی خصوصیت پیدا کر رکھی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے نحن ابناء اللہ واحباؤہ (ہم اللہ کے فرزند ہیں اور اُس کے دوست) لن تمسنا النار الا ایاماً معدودہ (سوائے چند روز کے ہم کو آتش دوزخ چھوئے گی بھی تو نہیں) اُن سے پوچھا جاتا ہے اتخذ تم عند اللہ عہدا فلن یخلف اللہ عہدہ ام تقولون علی اللہ ما لا تعلمون (کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے کہ خدا اپنے عہد کے خلاف نہیں کر سکتا یا بے جانے بوجھے خدا پر بہتان بندی کرتے ہو) اگر ہم سے پوچھا جائے تو کیا جواب؟

لو تو اصل مطلب کی طرف دو باتیں متیقّن تھیں ایک یہ کہ حضرت عیسےٰؑ نے اپنی اور اپنی والدہ کی پرستش نہیں کرانی چاہی دوسری یہ کہ خدا کو علم تھا کہ اُنھوں نے نہیں کرانی چاہی۔ با این ہمہ چوں کہ خدا کو شرک سے حد درجہ کی ناراضی ہے۔ خدا نے نہ تو حضرت عیسےٰؑ کے تقرب کا پاس کیا اور نہ اُن کی برارت پر نظر فرمائی اور ہمارے محاورے کے مطابق اُن سے نہ صرف کیفیت دریافت کی بل کہ جواب طلب کیا ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاس۔ (کیا تُو نے لوگوں سے کہا کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا سمجھو) حضرت عیسےٰؑ کو اپنی برارت معلوم تھی اور یہ بھی جانتے تھے کہ خدا کو بھی میری برارت معلوم ہی چاہیئے تھا کہ ہیکڑی اور بے باکی سے جواب ہی کرتے مگر وہی **شعر**

بہ تہدید گر برکشد تیغ حکم ۔۔۔ بمانند کرّوبیاں صمّ و بکم

سوال سُنکر تھرّا اُٹھے اور جواب ہی کا وہ پیرایہ اختیار کیا کہ اقراری مجرم بھی نہیں کرتا **بیت**

گناہ اگرچہ نہ بود اختیارِ ما حافظ — تو در طریقِ ادب کوش وگو گناہِ من ست

چھوٹتے ہی تو یہ عرض کیا سُبحٰنَکَ اے پروردگار تیری شان اس سے کہ کوئی تیرا شریکِ خدائی ہو ارفع واعلیٰ ہی۔ اے عیسےٰ تم پر خدا کی رحمت اپنی صفائی ظاہر کرتے ہیں مگر کس خوبی سے۔ تعلیم شرک کا الزام تھا پہلے ہی شرک کی جڑ کاٹ دی۔ اس کے بعد عرض کیا مَا یَکُوْنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ (بھلا میں اور ایسی بات کہتا جو مجھ کو کہنی سزاوار نہ تھی) میں تو تیری طرف سے رسول بن کر گیا تھا اگر خدائی کا دعویٰ کرتا تو اپنے تئیں آپ ہی جھٹلاتا۔ اور مجھکو وہ خدائی پھبتی ہی کب تھی دوسرے لوگوں میں اور مجھ میں رسالت کے سوائے امتیاز ہی کیا تھا کہ میں خدا بننا چاہتا۔ ساری حاجتیں اور ضرورتیں جو دوسروں کو پیش آتی ہیں مجھ کو بھی پیش آتی تھیں۔ بے اختیاری اور درماندگی جیسی دوسروں میں ویسی مجھ میں۔ حضرت عیسےٰ چاہتے تو صرف سُبحٰنَکَ کہہ کر چپ کر جاتے یا خیر مَا یکون لی ان اقول مَا لیس لی بحق پر بس کرتے کیوں کہ اتنا کہنے سے وہ اپنی صفائی کر چکے تھے مگر انبیاء تو تقرب کے بھوکے ہوتے ہیں۔ ان کو خدا سے بات کرنے کا موقع ملے تو ایک منٹ کی جگہ ایک گھنٹہ لگا دیں ؛

جس وقت حضرت موسیٰ کو خلعتِ پیغمبری عطا ہو رہا تھا تو خدا تعالیٰ نے پوچھا وَمَا تِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یَا مُوْسٰی (موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا ہی) عرض کیا ھِیَ عَصَایَ۔ ھی کا لفظ بھی زیادہ ہی تھا مگر عصای سے ھی عصای کہنے میں کچھ دیر لگتی ہی۔ پھر موسیٰ تو ھی عصای پر بھی کب بس کرنے والے تھے۔ عرض کرتے ہیں اور کرتے ہی چلے جاتے ہیں اتوکّأ علیہا واھش بہا علےٰ غنمی ولی فیہا مآرب اخریٰ (میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور درختوں کے پتے جھاڑ کر بکریوں کو کھلاتا ہوں اور اِس سے میرے اَور بھی مطلب نکلتے ہیں

یہی حال حضرت عیسےٰ کا ہوا بلکہ اُن کو تو اپنی صفائی بھی کرنی تھی جہاں تک زبان نے یاری دی کہتے ہی چلے گئے۔ کہ میں نے ایسی نالائق بات منہ سے نکالی ہوگی تو تجھ کو ضرور خبر ہوئی ہوگی۔ کیوں کہ تُو تو میرے دل تک کا حال جانتا ہی اور میں تیرے دل کی بات کیا جانوں۔ کہ تُو مجھ سے تبلیغِ رسالت کے سوائے اَور کیا چاہتا تھا۔ اور تجھ سے تو غیب کی بھی کوئی بات پوشیدہ نہیں ابھی حضرت عیسےٰ کیا چپ کر سکتے ہیں اُن کو اپنی برارت کا جوش آ رہا ہی اور کہے چلے جاتے ہیں کہ مجھ کو تو جو حکم ملا تھا میں نے بے کم وکاست وہی کا وہی اُن کو سُنا دیا تھا کہ اللہ کی پرستش کرو جو میرا تمھارا سب کا پروردگار ہی اور جب تک اُن کا میرا ساتھ رہا۔ ان کی خبر رکھتا رہا کہ کہیں توحید سے بھٹک نہ جائیں۔ پھر جب تُو نے مجھ کو اپنے پاس بلا لیا تو اے خدا تُو آپ اُن کا نگران حال تھا۔ تجھ کو خبر ہوگی کہ اُنھوں نے میرے بعد کیا کیا۔ ہائے ہائے نبوت کی شان نہیں جاتی۔ اُمت کی وجہ سے مُفت جواب ہی میں پکڑے گئے۔ اپنا قصور نہیں لگاؤ نہیں۔ مگر اُمت کے حال پر جو شفقت تھی اُس میں کمی نہیں آئی۔ وہ لوگ خدا کے ساتھ شرک کریں اِن کو جواب ہی میں کھچوائیں اور یہ اُن کی سفارش کریں کہ اے خدا اگر تُو اُن کو سزا دینی چاہے تو تیرے بندے ہیں تیرے حکم سے باہر نہیں جو چاہے سو کر اور اگر تُو ان سے درگزر فرمائے تو کوئی تیرا ہاتھ پکڑنے والا نہیں کہ تُو کیوں اُن کو معاف کیے دیتا ہی ؛

اسی طرح میں ایک دن سورۂ یوسف پڑھ رہا تھا جب اُس مقام پر پونچا جہاں حضرت یوسف قید ہو چکے ہیں اور اُن کے ساتھ کے دو قیدیوں نے خواب دیکھے ہیں اور اُن سے تعبیر پوچھی ہی تو آپ نے فرمایا لَا یَاْتِیْکُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُکُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَکُمَا ذٰلِکُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ کٰفِرُوْنَ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ مَا کَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِکَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا (حضرت یوسف بے گناہ قید ہو گئے تھے اول تو قید ہی بے حرمتی کی چیز ہے اور پھر ایک جھوٹی تہمت پر ضرور مستعجل ہوں گے کہ کب وہ وقت آئے کہ میں عذاب سے چھوٹوں بارے خدا کا کرنا اذا اراد اللہ شیئاً ھیّأ اسبابہ (جب اللہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے اسباب مہیا کر دیتا ہے) کیوں بادشاہی کاب دار اور ٹیلر (ساقی) یوسفؑ کے ساتھ قید میں جائیں اور کیوں اُن کو خواب گھائی دیں اور کیوں یوسف سے تعبیر پوچھنے کی ضرورت واقع ہو اور یوں یہ واقعہ قید خانہ سے یوسف کے خلاص پانے کا سبب ہو جائے اُنھوں نے خواب بیان کیئے تو یوسف نے کہا گھبراؤ نہیں کھانے کے وقت سے پہلے پہلے میں تم کو تعبیر بتا دوں گا۔ خدا نے مجھ کو اس کا سلیقہ دیا ہے کیونکہ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خدا کو نہیں مانتے اور آخرت کے منکر ہیں میں اپنے آبائی دین یعنی ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوبؑ کے دین پر ہوں۔ ہم لوگ کسی چیز کو خدا کا شریک نہیں سمجھتے اور یہ اللہ کا احسان ہے ہم پر اور لوگوں پر و لیکن اکثر لوگوں کا دستور ہے کہ احسان نہیں مانتے) اے یارانِ محبس بھلا سمجھو تو سہی کہ کئی خدا کا ہونا بہتر یا ایک زبردست خدا کا جو سب پر حکمرانی کرے۔ خدا کے سوائے تم جن کو پوجتے ہو بس اُن کا نام ہی نام ہے خدا کے پاس سے تو اُس کی کوئی سند آئی نہیں اور خدا کے سوائے دوسرے کو حکم دینے کا اختیار نہیں اُس نے تو یہی فرمایا ہے کہ میری ہی پرستش کرو۔ سچا دین یہی ہے مگر بہتیروں کو معلوم نہیں اے یارانِ محبس تم میں کا ایک) آگے چل کر خوابوں کی تعبیر کا بیان ہے۔ تو مجھ کو یہ خیال آیا کہ حضرت یوسف سے پوچھی تو گئی خواب کی تعبیر وہ دوسرا دُکھڑا لے بیٹھے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ دُکھڑا رسالت کا دُکھڑا تھا جو ہمہ وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے نصب العین تھا۔ ان کی تمام دنیاوی ضرورتوں پر مقدم لن اجد من دونہ ملتحداً الا بلاغاً من اللہ ورسالاتہ (مجھے اس کے سوا کہیں پناہ ہی نہیں کہ خدا کا پیغام پہونچا دوں اور حقِ رسالت ادا کر دوں) مَیں لائن سے اِدھر اُدھر ہو جاتا ہوں اور اِس کی وجہ ہے میری کم مشقی بے مہارتی +

جب حضرت عیسیٰؑ اپنا اظہار دے چکے تو اللہ جل شانہٗ حکم الحاکمین نے یہ حکم اخیر صادر فرمایا کہ آج وہ دن ہے جو سچ بولتا ہے سچ اُس کے کام آئے اور وہ سچ سے فائدہ اُٹھائے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی تصدیق کی کہ تم ٹھیک کہتے ہو تمھاری اُمت آپ بہکی تم نے کسی کو نہیں بہکایا۔ تم ہمارے بندے تھے اور بندگی کی شان سے رہے اور اب بھی ہمارے مقبول بندے ہو۔ یہ باغ جن میں نہریں دوڑ رہی ہیں تم ہی جیسوں کے لیئے ہیں یہ نہیں کہ دیکھا بھالا اور رخصت بلکہ تم ہی ان باغوں کے مالک ہو اطمینان کے ساتھ ان میں ہو رہو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ اس رکوع کے پڑھنے سے ذہن میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ سے باز پرس کی گئی تو لیا نہ ہو کہیں اِن بزرگوں سے بھی خدا پوچھ بیٹھے کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ ہماری قبریں شاندار بناؤ اُن پر قیمتی غلاف اُڑھاؤ پنکھے چڑھاؤ۔ روشنی کرو۔ میلے جماؤ۔ ڈھولک بجواؤ۔ ناچ کراؤ اور ہماری ایسی تعظیم کرو کہ اس میں اور عبادت میں تمیز کرنی مشکل ہو۔ شفاعت کے لیئے ہمارے آگے گڑگڑاؤ اور حاجت کے لیئے خدا کے آگے نہیں یہ بزرگ تو حضرت عیسیٰؑ کی طرح عذر معذرت کر کے چھوٹ ہی جائیں گے مگر دیکھیئے اُمت پر کیا بنتی ہے۔

یہ ہے وہ اسلام جس کو لوگ منوانا اور یورپ و امریکہ میں لے جانا چاہتے ہیں۔ بھلا کوئی شخص جس کے سر میں دماغ اور دماغ میں عقل اور عقل میں سلامتی ہے ایسے اسلام کو مان سکتا یا ایسے اسلام میں رہ سکتا ہے اور پھر اس زمانے میں۔ وہی تمھارے قادیانی صاحب کی مثل ہوئی۔ مجھ کو تو اُن بزرگ کی خدمت میں نیاز نہیں۔ مگر میں نے اُن کا دہلی تشریف لانا سنا اور یہ بھی سنا۔ خدا جانے غلط یا صحیح کہ اپنے تئیں مسیحِ موعود کہتے ہیں میں نے تو سن کر یہ کہا تھا کہ آج کو سچ مچ کے مسیح اُتر آئیں تو یہ ایسا ٹیڑھا اور بُرا وقت ہے کہ اُن کو بھی

اپنا منوانا مشکل ہو۔ اِن بے چاروں کو کون پوچھے گا۔ آخر وہی ہوا کہ اب تو اُن کا غل دب دبا سا گیا۔ لیکن میں مسلمانوں کو آگاہ کیے دیتا ہوں کہ یہ نیچریت کا غل آسانی سے دبنے والا نہیں۔ اس واسطے کہ یہ شورش کسی ایک شخص خاص کی پیدا کی ہوئی نہیں اے کاش یہ شورش سیّد احمد خاں کی ذاتِ خاص سے پیدا ہوئی ہوتی کہ ایک دن اُنہی کے ساتھ مٹّی میں دب جاتی ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ نہیں نہیں۔ یہ شورش پیدا کی ہوئی ہو زمانہ کی۔ یہ شورش پیدا کی ہوئی ہو انگریزی عملداری کی۔ یہ شورش پیدا کی ہوئی ہو انگلش ایجوکیشن کی۔ یہ شورش پیدا کی ہوئی ہو لوگوں کے مخمصۂ اضطرار کی۔ سیّد احمد خاں کو اگر اس سے تعلق ہو تو اسی قدر کہ اُن کو خدا نے گِدھ کی سی آنکھ دی کہ جو بلا آنے والی تھی اور آگئی اُنھوں نے اُس کو پہلے سے دیکھ لیا بھلے سے ہوتے تو دیکھ کر چپ کر رہے ہوتے ع خدا جو بیٹھے بٹھائے اُسے خراب کرے ÷ لگے غل مچانے۔ یہ شورش تو تب دبے کہ خدا انگریزی عملداری کو غارت کرے اور وہی اگلے وقتوں کی سی گھس گھس پھر ہونے لگے نہ ریل ہو نہ تار ہو نہ ڈاک ہو۔ نہ منی آرڈر ہو۔ نہ ویلیو پے ایبل پارسل ہو۔ نہ دیوا سلائی ہو۔ نہ چاقو ہو۔ نہ سوئی ہو۔ نہ انگریزی کپڑے ہوں۔ نہ امن ہو۔ نہ آسایش ہو نہ آزادی ہو نہ حقوق کی حفاظت ہو۔ نہ فریاد کی شنوائی ہو۔ نہ بندوبست ہو۔ نہ انتظام ہو۔ اگر یہ منظور ہی تو میں قرآن کے لفظوں میں کہتا ہوں تعالوا ندع ابنائنا وابنائکم ونسائنا ونسائکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتھل فنجعل لعنۃ اللّٰہ (آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم بھی اپنے بیٹوں کو بلاؤ۔ ہم بھی گھر کی بی بیوں کو بلائیں اور تم بھی گھر کی بی بیوں کو بلاؤ۔ اور ہم بھی ہوں اور تم بھی ہو پھر خدا کے آگے گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر لعنت کریں) نصاریٰ نجران میں سے چند لوگ آں حضرتؐ کی خدمت میں مباحثۂ مذہبی کے لیئے آئے اور جناب رسول خدا صلعم کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ تہِ دل سے اپنے عقائد کے قائل نہیں ہیں اِس پر آپ نے اُن سے مباہلہ یعنی قسما قسمی کو کہا۔ اور آں حضرتؐ نے اپنے ساتھ حضرت علیؓ۔ جناب بتولؓ اور دونوں صاحبزادوں حضرت حسنؓ و حسینؓ کو لیا اور فرمایا کہ اللھم ھولاء اھل بیتی (اے پروردگار یہ ہیں میرے گھر والے) لیکن نصاریٰ نکل بھاگے اور قسم کھانے پر رضامند نہ ہوئے ÷

قرآن میں تو ہی علی الکاذبین ہم کو کہنا چاہیئے علی اھل بودبا یا علی الانگلین تو میں بھی تمھارے ساتھ قسما قسمی کرنے پر راضی ہوں۔ کوئی ایک تو تم میں سے آمین کہو مگر یہ سمجھے رہنا کہ دن رات میں کوئی نہ کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہو ایسا نہ ہو کہ آمین کہنے کے ساتھ لاہور میں سکھ آکر اپنا عمل دخل کر لیں۔ اور حمایت اسلام کے ممبر جو ہوں کے بلوں میں گھستے پھریں۔ غرض یہ نیچریت کی شورش تو تب دبے کہ انگریزی عملداری اُٹھ جائے یا تب دبے کہ مسلمانوں کو کچھ کرنا نہ پڑے اور اُن کی دنیاوی حالت آپ سے آپ درست ہو جائے مگر یہ تو شیخ چلی کے سے منصوبے ہیں نہ انگریزی عملداری کے اُٹھنے کی کوئی صورت ہو اور نہ اُٹھے گی اور مسلمانوں کو اپنی دنیاوی حالت کے مزاج کو اصلاح پر لانے کے لیئے آج کے آج اور کل کے کل چار و ناچار انگریزی تعلیم کا مسہل لینا پڑے گا علی گڈھ کالج کا مسہل لیں تو اور حمایت الاسلام کا مسہل لیں تو۔ وہ جلیپ یا کسٹرائیل کا جلّاب ہو۔ اور یہ تمھارا دیسی املتاس۔ اب جس کو جو پچے بہتر ہو کہ یہ املتاس کا جلاب تیار ہو آنکھیں میچ کر پی بھی جاؤ۔ شاباش۔ شاباش۔ وہ پی لیا۔ وہ پی لیا۔ اب ذرا طبیعت کو میری باتوں میں مشغول کرو کہ جلّاب اچھی طرح اُتر جائے لیکن جن کی دوکان سے جُلّاب بندھ کر آیا ہو یعنی انجمن حمایتِ اسلام کے سکرٹری منشی شمس الدین صاحب سردست جلاب کے دام بھی مانگ رہی ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں لکچروں کی اصلی شیر خشت اور نظموں کی ترنجبین قیمتی دوائیں ہیں۔ تو بھائی مانگیں سو دو۔ بلا سے روپیہ تو ہاتھ کا میل ہو۔ تم اچھے ہو جاؤ گے تو بہتیرا کما لو گے ÷

حیاۃ النذیر

حصّۂ ششم

مذہب اور معتقداتِ مذہب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم نے مولانا ممدوح کے مذہب اور معتقداتِ مذہب کا جو باب قائم کیا ہی اُس کی ایک خاص وجہ یہ ہی کہ وہ اگرچہ پشتینی مسلمان ہیں اور دین دار مسلمان کے گھرانے میں جنم لیا ہی۔ چاہیئے تھا کہ اوروں کی طرح اُن کا مذہب بھی تقلیدی مذہب ہوتا۔ مگر نہیں مذہبِ حقّہ کی تلاش میں اُنھوں نے اپنے آبائی مذہبِ اسلام کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ نہ وہ عیسائی تھے نہ یہودی نہ ہندو اور نہ مسلمان۔ بلکہ کھلّے کھلے لامذہب۔ لامذہبی مذاہبِ مرّوجہ کی آپس کی کشمکش نے پیدا کر دی تھی۔ خدا ایسی لامذہبی سب کو دے جس کے انجام میں اسلام چمکتا ہوا ظاہر ہو۔ سچ کہا ہی۔ عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد۔ لامذہب ہونے کے بعد مولانا نے تحقیقاتِ مذہب کی عینک اپنی آنکھوں پر چڑھائی۔ اور اس طرح یہ دشوار گزار راہ خس و خاشاک سے پاک کر کے آناً فاناً طے کر لی نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد خدا نے اُن کی دست گیری فرمائی۔ بہرحال مولانا نے جس خوبی و خوش اسلوبی سے سائنس اور مذہب کو میزانِ فطرۃ میں تولا ہی اُسے دیکھ کر بے اختیار زبان سے مرحبا نکلتی ہی

ہم نے مولانا کے مذہب کی چھان بین صرف اسی غرض سے کی ہی کہ اُن کا تحقیقی مذہبِ اسلام بالکل عقل اور فطرۃ کے موافق ہی۔ مذہب کے اہم مسائل وجودِ باری تعالیٰ۔ وحدانیۃ اور رسالت وغیرہ وغیرہ کو اس آسانی سے سمجھا ہی اور نیز لوگوں کو سمجھایا ہی کہ سبحان اللہ۔ خدا سب کی عقل میں ایسا نور بخشے۔ انگریزی خواں نوجوان اُن میں خواہ ہندو ہوں یا عیسائی یا مسلمان اگر یہ لوگ مذہب کی طرف سے بھٹکے بھٹکے پھرتے ہوں تو وہ ہمارے مولانا کے تحقیقی مذہب کو پڑھیں۔ خدا کی ذات سے امید ہی کہ اُن کو راہِ راست مل جائے گی۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کا نام ہم نے اس لیئے لیا کہ اگر وہ اپنے ہندو اور عیسائی مذہب پر ہوں تو بھی دیکھیں۔ اور مذہب اسلام کے سوا اگر اُنھوں نے کوئی اور مذہب اختیار کر لیا ہو تو بھی دیکھیں۔ مسلمانوں کا نام ہم نے اس لیئے لیا کہ اگر خدانخواستہ وہ جادۂ مستقیم سے ہٹ گئے ہوں اور ہم جانتے ہیں کہ جنھوں نے انگریزی پڑھی ہی

اُن میں کے اکثر بھٹک گئے ہیں وہ بھی ہمارے مولانا کے مذہب تحقیقی کو دیکھیں۔ اِس پر بھی اگر یہ لوگ راہِ راست پر نہ آئیں یعنی اسلام قبول نہ کریں تو ہمارا ذمہ۔

اِس حصے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نہ صرف خیالات کی رُو سے بلکہ اگر دیکھا جائے تو الفاظ کی رُو سے بھی جو کچھ ہے وہ مولانا ہی کے رشحاتِ قلم کے موتی ہیں۔ راقم نے مولانا کی بعض تصانیف میں سے اِن موتیوں کو چُن چُن کر ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ اور اِس طرح یہ ایک چھوٹا سا صحیفہ بنایا گیا ہے تاکہ اِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ سے کوئی انکار نہ کر سکے۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ۱؎

مسلمانو! اللہ پر ایمان لاؤ اور اُس کے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اُس نے اپنے رسول (محمد) پر اُتاری اور اُن کتابوں پر جو (قرآن سے) پہلے (دوسرے پیغمبروں پر) اُتاریں اور جو شخص اللہ کا منکر ہوا اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کی کتابوں کا اور اُس کے رسولوں کا اور روزِ آخرۃ کا وہ (راہِ راست سے) بڑی دور بھٹک گیا۔

ایمانِ مجمل

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَآئِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ وَاَرْکَانِہٖ

میں خدا پر ایمان لایا جیسا کہ وہ اپنے ناموں اور خوبیوں کے ساتھ موصوف ہے اور میں نے اُس کے سارے احکام اور ارکان تسلیم کر لیے۔

ایمانِ مفصّل

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ

میں خدا پر اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں اور روزِ قیامت پر ایمان لایا اور تقدیر کی بھلائی بُرائی پر ایمان لایا کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور مرے پیچھے جی اُٹھنے پر بھی ایمان لایا

تصدیق بالجنان کی تو خدا جانے لیکن ہم نے تو اقرار باللسان اور تحریر بالقلم کے ذریعے سے مولانا کو مسلمان جانا ہے اور ایک طرح سے ہم تصدیق بالجنان بھی کر سکتے ہیں ؏ می طراود ز زباں انچہ در آوندِ من است ؏ زبان پر آئے گی جو دل میں ہوگی ؏ انچہ از دل خیزد از زباں می ریزد۔ اگر ان وجوہ سے مولانا کی زبان اور اُن کے قلم کو ہم اُن کے دل کا ترجمانِ صادق سمجھیں تو بہت بجا اور بہت دُرست ہے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ مولانا ایک وقت میں تقلیدی مسلمان تھے یعنی مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے تھے مسلمانوں کا سا نام رکھا گیا تھا۔ مسلمانوں میں پرورش اور تعلیم پائی تھی مسلمانوں میں رہے سہے۔ لیکن تقلیدی زندگی میں مولانا نے ایک لمحے کے لیے بھی ترکِ تقلید کا خیال نہیں کیا۔ جس طرح اور عام مقلد مسلمان اسلام پر قانع اور اُس کی طرف سے مطمئن ہیں اسی طرح ہمارے مولانا بھی اُس کی طرف سے مطمئن تھے۔ جس طرح نماز روزہ دوسرے مسلمان کرتے ہیں وہ بھی کر لیا کرتے

تھے یعنی اعمالِ ظاہر کو مولانا صرف ایک رسم کے طور پر ادا کیا کرتے تھے اور اس طرح کون نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک مقلد مسلمان تھے اور بس۔

رکابیہ مذہب اختیار کرنا

دنیا میں سیکڑوں لوگ ایسے بھی ہو گزرے ہیں اور اب بھی دیکھے جاتے ہیں جو اپنی طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے یا دوزخِ شکم میں روٹی کے ٹکڑے ٹھونسنے کے لالچ میں اپنا مذہب بیچتے پھرتے ہیں۔ سنّیوں میں سُنّی۔ شیعوں میں شیعہ۔ خیر یہاں تک بھی غنیمت ہی غضب تو یہ ہی کہ عیسائیوں میں عیسائی۔ مسلمانوں میں مسلمان۔ ہندوؤں میں ہندو۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہی کہ اُن کا مذہب کوئی صلح کل مذہب ہی۔ بلکہ صرف دنیاوی اعزاز کی خاطر حکّامِ وقت کو یہ جتما دیا جاتا ہی۔ خدا ایسے لوگوں سے محفوظ رکھے۔ دین و دنیا میں لڑائی کے بانی ایسے ہی مفسد ہوتے ہیں۔ مَیں نے بچشمِ خود دیکھا ہی کہ ایک شخص اَبًا عَن جَدٍّ ایک اسلامی فرقے میں پیدا ہوا۔ اور اپنے اُسی فرقے کا معتقد رہا۔ لیکن امیروں میں بیٹھ کر وہ اُن کا مسخرا ہو گیا تھا۔ یہ امرا اِس کے خلاف ایک دوسرے اسلامی فرقے کے معتقد تھے۔ لیکن اِس بندۂ شکم مسخرے کی کیا حالت تھی کہ روٹیوں کی خاطر وہ اپنے مذہبی عقائد سے دست کش ہو جاتا تھا۔ اور جب تک اِن امیروں میں بیٹھا رہتا تھا اِنھیں کے مذہب کے عقائد کی پیروی کرتا تھا اور اِس پیروی کو جب تک وہ وہاں بیٹھا رہتا تھا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ وہاں سے اُٹھا اور کسی اَور مذہبی گروہ میں گیا تو وہاں اُن کے مذہبی عقائد کی تقلید کرنے لگا۔ غرض وہ مذہب کے لحاظ سے تھالی کا بیگن تھا۔ ؎ رہ مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز ÷ تا گنج زر از کہتر و مہتر بستانی ÷ مگر خدا نخواستہ ہمارے مولانا کی یہ حالت نہ تھی۔ اُنھوں نے جس زمانے میں رکابیہ مذہب اختیار کیا تھا وہ ایسا زمانہ تھا کہ اُن کا گزر کسی امیر کے دربار میں نہ تھا۔ بلکہ وہ اُن کا زمانۂ طالبِ علمی تھا۔ اورنگ آبادی مسجد جس میں یہ رہا کرتے تھے وہ مسجد دو مولویوں کے تحت میں تھی۔ ایک مولوی صاحب بدعتی مشہور تھے اور دوسرے مولوی صاحب وہابی کہلاتے تھے۔ وہابی مولوی صاحب جن طالب علموں کا انتظامِ خور و نوش فرماتے تھے وہ طالبِ علم وہابی کہلاتے تھے۔ اور بدعتی مولوی صاحب جن طالب العلموں کا انتظامِ خور و نوش کرتے تھے وہ طالبِ علم بدعتی۔ اگرچہ ہمارے مولانا بظاہر وہابی مولوی صاحب کے گروہ میں تھے مگر کبھی کبھی روٹیوں کی خاطر دوسرے گروہ میں بھی شامل ہو جاتے تھے یعنی مولانا کو جدھر کچھ ملنے کی اُمید ہوئی اُسی طرف ہو گئے اُس زمانے کے بدعتی یا وہابی گروہ میں شامل ہونے کو اگر کوئی شخص رکابیہ مذہب کہہ سکتا ہی تو خیر مولانا بھی رکابیہ مذہب رکھتے تھے۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ ہم نے رکابیہ مذہب کا ایک عنوان قائم کر دیا۔ ورنہ اُس زمانے میں مولانا کا مذہب رکابیہ تھا نہ وہابیہ۔

دہریت اور لامذہبی سے بال بال بچنا

ہمارا تو یہ خیال ہے کہ ہر شخص جس کے سر میں بھیجا اور بھیجے میں عقل ہی اور وہ مذہبِ تحقیقی اختیار کرنا چاہتا ہی تو اول وہ اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اُس کو خوب لتاڑتا ہی۔ پھر اُس کی نیت ڈانوا ڈول ہوتی ہی اور کسی دوسرے مذہب کی تلاش میں پاس پڑوس والوں کے مذہبی خیالات کے اصول و فروع کو دیکھتا ہی۔ پھر کبھی ایک کو پکڑتا ہی اور کبھی ایک کو چھوڑتا ہی۔ اور جب دوسرے مذہبوں کو بھی اپنی عقلی میزان کے پلڑوں میں اونچا نیچا دیکھتا ہی تو وہ گھبرا اُٹھتا ہی۔ اور چاہتا ہی کہ مذہب کا روگ اپنے پیچھے نہ لگائے۔ وہ مذہب کی قید سے آزاد ہونے ہی کو بڑی کامیابی سمجھتا ہی جب وہ مذہبی خیالات کے گورکھ دھندے

سے تنگ ہوتا ہی تو خداوند تعالیٰ کی خدمت میں بڑی بڑی گستاخیاں کرتا ہی۔ یعنی اُس کی حقیقت کی بھی حقیقت نہیں سمجھتا۔ اور بک اُٹھتا ہی کہ خدا کوئی چیز نہیں۔ یہ سب خیالی ڈھکوسلے ہیں۔ بس اس طرح کا نہ سہی لیکن اسی کے قریب قریب ایک واقعہ ہمارے مولانا پر بھی گزرا ہی۔ چناں چہ فرماتے ہیں "مجکو ٹھیک سنہ یاد نہیں مگر سنہ ۱۸۴۸ء کے لگ بھگ کا مذکور ہی کہ ہمارے دہلی کالج اور رنیٹل کلاسز کی ریاضی کے استاد ماسٹر رام چندر صاحب اصطباغ لینے کے لیئے آمادہ ہوئے۔ ماسٹر او بدلا کیا پھر گیا سٹوڈنٹ سب کے ساتھ مذہبی چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ مذہبی مناظرے کی وہ پہلی بھنگ تھی جو میرے کان میں پڑی اگرچہ میں عربی کی جماعت اول میں تھا اور فقہ کی مشہور کتاب فتاویٰ درمختار کورس میں تھی۔ لیکن دیکھتا تھا کہ ماسٹر ہم لوگوں کو بند کر دیتے تھے۔ مجھ کو ماسٹر صاحب کے ساتھ ایک خصوصیت بھی تھی اور اکثر ان کے مکان پر بھی جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ماسٹر نے تو مجھے گمراہ کر دیا ہوتا جیسا کہ قرآن میں ہی۔

اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ۔ تو تو لگا تھا کہ مجکو گڑھے میں ڈالے اور اگر نہ ہوتا میرے رب کا فضل تو میں بھی ہوتا اُن میں جو پکڑے آئے۔

مگر مجکو ادب عربی کا تھا شوق۔ میں قرآن کی عبارت پر لٹو تھا۔ اس تریاق نے مجکو اس زہر سے بچایا۔ یہاں تک کہ کالج سے اپنا ایمان سلامت لے نکل گیا۔ مگر کیسا ایمان متزلزل۔ متشکک۔ ضعیف۔ مضمحل۔ پھر میں نے علم کلام کی کتابیں دیکھنی شروع کیں۔ موافق و مخالف دونوں۔ ماسٹر نے مجھ کو عیسائی بنانا چاہا اور علم کلام نے سرے سے لامذہب"۔ بات یہ ہی کہ جس شخص کو ذرا سی بھی مذہب کی کرید رہتی ہی اُس کا یہی حال ہوتا ہی بلکہ اُس سے بھی بدتر اور جس کو انگریزی تعلیم جھوٹوں بھی چھو جائے گی قسم کھانے کی بات ہی کہ اُس کا ایسا ہی حال ہوگا۔ وہ کہے نہ کہے دل کا اگر بودا ہی تو ضرور چھپائے گا۔ اگر دل کا قوی ہی تو ظاہر کیئے بغیر نہیں رہے گا۔ غرض مولانا ایک دین دار گھر میں پیدا ہوئے اور گھر والوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی اوائل عمر میں دین دار تھے۔ بشرطیکہ اُس وقت کی اس طرح کی دین داری کو دین داری کہہ سکیں۔ خیر ایک وقت ایسا آیا کہ مولانا سرکاری کالج دہلی میں داخل ہوئے باوجودے کہ کالج پادریوں کا نہیں بلکہ سرکاری تھا اور اُس میں دین و مذہب سے کچھ بحث نہ تھی اور مولانا انگریزی نہیں بلکہ عربی پڑھتے تھے۔ تاہم چوں کہ ہر قسم کے لوگوں سے ملنا جلنا ہوتا تھا۔ مخالف آوازیں کان میں پڑنے لگیں۔ بہت دن نہیں گزرے تھے کہ مولانا کے مذہبی خیالات میں تزلزل پیدا ہونا شروع ہوا۔ نماز پہلے گنڈے دار ہوئی پھر ندارد۔ اور ع۔ خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری۔ دو چار دفعہ بڑوں کے لحاظ سے پڑھنی پڑی اور کبھی بے وضو بھی ٹرخا دی۔ پھر عیسائیت کی طرف رُجحان ہوا تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ ریائی نمازوں کی التحیات میں اشہد ان محمداً عبدہ و رسولہ۔ کی جگہ۔ اشہد ان عیسیٰ ابن اللہ کہنے لگے۔ مگر حضرت عیسےٰ کا خدا اور خدا کا بیٹا ہونا دل میں کچھ اچھی طرح جمتا نہ تھا۔ پھر جھجکتے جھجکتے وہی اشہد ان محمداً عبدہ و رسولہ کہنے لگتے۔ موںہ سے اقرار دل سے انکار۔ غرض مولانا کسی وقت میں عیسائی تھے کسی وقت میں مسلمان۔ کسی وقت کچھ بھی نہیں۔ وہ اس بات کی بھی کوشش کرتے تھے کہ مذہبی خیالات کو سرے سے سر میں آنے ہی نہ دیں۔ مگر کوئی نہ کوئی اتفاق پیش آتا ہی رہتا تھا کہ وہ خدا سے

بے تعلق محض نہیں ہونے دیتا تھا۔ اپنی بے اختیاری دیکھ کر مولانا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ بس یہی ایک چیز تھی جو مذہب کے خیالات کو مٹنے نہیں دیتی تھی۔ اسی حیص بیص میں کئی برس گزر گئے۔ مگر کس طرح کہ کبھی گرویدۂ مذہب اور کبھی بالکل ہٹتے سے اُکھڑے ہوئے۔ اسی تردد کی حالت میں مولانا نے علمِ مناظرے کی پچاسوں کتابیں دیکھ ڈالیں۔ لیکن کسی ایک سے بھی تسلی نہ ہوئی۔ اور تسلی ہوتی تو کیوں کر ہوتی۔ عیسائی مثلاً مسلمانوں پر ایک اعتراض کرتا ہے۔ مسلمان اُس اعتراض کو تو اٹھاتا نہیں مگر ویسا ہی یا اُس سے بدتر اعتراض عیسائی پر جڑ دیتا ہے۔ مولانا کی طبیعت میں اس سوال و جواب کا اثر یہ ہوتا تھا کہ دونوں سے بد عقیدہ۔ آخر اُکتا کر مولانا نے علم مناظرہ کی کتابیں دیکھنے سے تو توبہ کی۔ کیوں کہ اُن کو العلم حجاب الاکبر کا مصداق پایا۔ اب مولانا کو بالکل یقین ہو گیا کہ "میں اسی تذبذب اور تزلزل کی حالت میں مروں گا"۔ لیکن اس تصور سے جیسی ایذا مولانا کو ہوتی تھی وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ غرض اس جھکولے کے سوا مولانا کے تقلیدی مذہب میں عرصۂ دراز تک کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ مگر بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ خود بخود دل نے از سرِ نو مذہب حقہ کی تلاش میں آمادگی ظاہر کی۔ مولانا نے کتابیں تو دیکھنی شروع کیں اسلامی فرقوں کی اور وہ اندرونی اور باہمی اختلاف کی وجہ سے جا پھنسے دوسرے مذاہب کے جھگڑوں میں۔ اور اب اُن کا یہ تماشا ہو گیا کہ عقل کی بھول بھلیاں میں بھٹکے بھٹکے پھرتے تھے اور نکلنے کا رستہ نہیں سوجھ پڑتا تھا۔ ؎

باعقل گشتم ہم سفر یک کوچہ رہ از بے خودی　　شدہ پارہ پارہ دامنم از خارِ استدلالہا

مولانا پر ایک وقت ایسا گزرا ہے کہ وہ سرے سے کسی مذہب ہی کے معتقد نہ تھے اور دل میں کہتے تھے کہ شروع سے آدمی مذہب کے خیال کے پیچھے پڑے ہیں اگر مذہب حق واقع میں کوئی چیز ہوتا تو اب تک انسان کی نظر سے مخفی نہ رہتا۔ اور ساری دنیا میں کبھی کا ایک مذہب ہو گیا ہوتا۔ دُنیا جتنی پُرانی ہوتی جاتی ہے مذہبوں کا شمار بڑھتا چلا جاتا ہے تو جس چیز کو اتنی مدت ڈھونڈا جائے اور ڈھونڈا بھی جائے تو ایسی کاوش سے کہ کوئی فردِ بشر اس کی جست و جو سے فارغ نہیں اور وہ نہ ملے تو اس کے یہی معنی ہیں کہ اُس چیز کا وجود ہی نہیں۔ دنیا میں ہزاروں مذہب ہیں اور ہر ایک مذہب والا اپنے آپ کو برسرِ حق سمجھتا ہے اور حال یہ ہے کہ نیک اور بد ہر فرقے میں ہیں۔ کیوں کر مان لیں کہ ایک شخص خدا سے ڈرتا اور غریبوں پر ترس کھاتا اور کسی کو ایذا نہیں دینی چاہتا۔ معاملے کا صاف۔ دیانت دار امانت گزار۔ مزاج میں شیخی نہیں۔ غرور نہیں۔ وہ صرف اس وجہ سے کہ خاص طور کے عقیدے نہیں رکھتا اور نہیں رکھتا تو اس وجہ سے کہ وہ سچے دل سے اُن کو ٹھیک نہیں سمجھتا۔ کیوں کر مان لیں کہ ایسا شخص جہنمی ہو اور ابد الآباد کے لیے مستوجبِ عذابِ الٰہی۔ اور خدا کو بھی کس نے دیکھا ہے۔ یہی نا کہ دنیا میں کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی اور بنانے والے کون ہم ہی آدمی تو جو چیز ہم میں سے کسی نے نہیں بنائی۔ جس نے بنائی وہی خدا۔ یہ دلیل ظاہر میں تو بڑی مضبوط معلوم ہوتی تھی لیکن اُس کو منطق کی کسوٹی پر جب کس کر دیکھا جاتا تھا تو ٹھیک نہیں اُترتی تھی۔ کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی اس کی جگہ ہم کو یوں کہنا چاہیے کہ آدمی کے بنانے کی کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی۔ دو ہی لفظوں کی کمی بیشی میں بات کیا سے کیا ہو گئی۔ نہ دعویٰ رہا نہ دلیل۔ اور کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی ہیں تو خدا بھی آ گیا۔ تو گویا ہم ایک ہی سانس میں خدا کو مانتے اور اُس سے مکرتے بھی ہیں۔ جو شخص کسی چیز کے آپ سے آپ ہو جانے پر اچنبھا کرتا ہے بڑا اچنبھا یہ ہے کہ وہ خدا کے ہونے پر اچنبھا کیوں نہیں کرتا۔ اور دنیا میں اگر مثلاً ایک بات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہے تو دو سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہیں ہے۔ ہم ہزاروں

لاکھوں آدمیوں کو مبتلائے مصیبت دیکھتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ مصیبت اُن کی کسی بدکرداری کا نتیجہ نہیں ہے۔ جیسے کور مادر زاد۔ یا ایک عام مصیبت موت ہی کی ہے جس پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کام خدا کے نہیں ہیں اور نہیں ہونے چاہئیں۔ اور فرض کرو کہ خدا ہے تو مجبر و خدا کا ہونا چاہتا ہے کہ دین نہ ہو۔ کیوں کہ اگر خدا ہے اور اُس نے جیسا چاہا دنیا کو بنایا تو وہ دنیا کے خلاف کیوں چاہنے لگا۔ اور اگر چاہے تو اُس کی ایسی مثال ہو گی کہ ایک شخص گھڑی بنائے اور بنا کر اُس میں کیل ٹھوک دے کہ چل نہ سکے۔ ہم کو بے ہماری درخواست کے پیدا کیا اور چند در چند ضرورتیں اور خواہشیں ہمارے پیچھے لگا دیں پھر ہم کو اُن سے روکنے اور باز رکھنے کے معنی کیا؟

یہ یا اسی قسم کے اَور بہت سے خیالات ہیں جو مولانا کو تحقیق مذہب کے وقت دہریت کی دلدل میں پھانس رہے تھے اور اگر خدا کا فضل دست گیری نہ کرتا تو یہ خیالات اوندھے مونہ دوزخ میں جا گرانے کو بالکل کافی تھے۔ اِسی قسم کی چھان بین میں عرصے تک مولانا غلطاں پیچاں رہے۔ یہاں تک کہ آخر کار اسلام کی حقانیت کامل طور پر مولانا کے ذہن نشین ہو گئی جیسے پتھر کی لکیر۔ [۱] وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ

غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ یہ سب عقل کی گڑبڑی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب کوئی عقل سے اُس کی بساط سے زیادہ کام لینا چاہتا ہے اُس کی نہ دنیا ٹھیک اور نہ اُس کا دین دُرست۔ ع۔ اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ مذہب کا کچھ ایسا خاصہ ہے کہ جتنا چھانو اُتنا ہی کرکرا۔ جتنا نتھارو اُتنا ہی گدلا۔ اور اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ "دین ہے بڑھیوں کا اور مکتب کے مبتدی بچوں کا" یعنی بوڑھی عورتیں اور مکتب کے مبتدی بچے دل کے بھولے اور طبیعت کے صاف ہوتے ہیں۔ جس طرح کورا کپڑا رنگ خوب پکڑتا ہے بھولے دل اور صاف طبیعتیں دین کی باتوں کو جلد قبول کر لیتی ہیں۔ اور العلم حجاب اکبر جو کہا گیا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ بہت سیان پتی بھی آدمی کو گمراہ کر دیتی ہے۔ غرض مولانا پر دین کے اعتبار سے کچھ اس طرح کا وقت گزرا جیسے بنی اسرائیل چالیس برس جنگل میں بھٹکے بھٹکے پڑے پھرے۔ بہتیری اٹکلیں دوڑاتے اور ہر روز صبح سے شام تک چلتے آخر کار پھر کر وہیں آ کھڑے ہوتے جہاں سے چلے تھے۔ مگر تھا کیا کہ طلب تھی صحیح اور تلاش تھی سچی۔ اِس سوچ میں مولانا کا یہ حال ہو گیا تھا جیسے کوئی مبہوت۔ دیکھتے ہیں اور نظر نہیں آتا۔ سنتے ہیں اور سمجھتے نہیں۔ بہتیری کوشش کرتے کہ یہ خیال دل سے دُور ہو مگر سوتے جاگتے ہمہ وقت یہی تصور پیشِ نظر تھا کسی چیز میں طبیعت نہیں لگتی کسی بات سے جی نہیں بہلتا۔ کتاب لے کر بیٹھے ہر چند طبیعت پر زور دیتے ہیں مطلب معلوم نہیں ہوتا۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں اِن کو خبر نہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں یہاں تک کہ مولانا کے سنّہ ضرور یہ میں خلل پڑنے لگا اور چندے خوف رہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنون ہو جائے۔ اور سارا پڑھا لکھا غارت ہو۔ ایک رات آخرِ شب اسی خیال میں پڑے کروٹیں بدل رہے تھے کہ اُنھوں نے بے قرار ہو کر دعا کی۔

"اے خدا اگر واقع میں تو خدا ہے جیسا کہ تمام اہلِ مذاہب تجھکو مانتے ہیں تو

مجھکو اِس ورطۂ حیرت سے نکال اور حق بات میرے دل میں ڈال"

---

[۱] اور اس پر خدا کی تعریف ہے لے رب ہمارے دل نہ پھیر ہمارے جب ہم کو ہدایت دے چکا اور دے ہم کو اپنے ہاں سے مہربانی بے شک تو ہی ہے بہت دینے والا ۱۲

یہ دعا چوں کہ دل سے نکلی تھی ایسی مقبول ہوئی کہ آہستہ آہستہ دہریت اور لامذہبی کے شکوک مولٰنا کے دل سے سب رفع دفع ہو گئے۔ مگر گھن کھا کر۔ اور وہ اِس طرح کہ اُسی تشویشِ مذہب اور کش مکش کے زمانے میں مولٰنا کو خیال ہوا کہ مذہب رسم نہیں بلکہ زندگی کی ضرورتوں میں سے بڑی اشد ضرورت ہی۔ سب سے پہلے مولٰنا نے آپ ہی آپ ہر ایک چیز کو نظرِ غائر سے دیکھنا شروع کیا۔ اِس سے پہلے وہ جس چیز کو دیکھتے اوپری اور سرسری نظر سے دیکھتے اب ہر چیز کی تہ کو پونہچنے لگے کہ یہ کیا ہی؟ کیوں کر بنی ہی؟ کس غرض سے بنی ہی؟ آپ سے آپ بن گئی ہی یا کسی نے بنائی ہی؟ بنانے والے نے اِس کے بنانے میں کیا کاری گری کی ہی؟ بس اِسی سوچ بچار کو مولٰنا نے عمارتِ دین سمجھا اور بجا سمجھا۔ یہ اِس طرح کہ شروع شروع میں ایسی چیزوں پر نظر پڑتی تھی جس میں آدمی کے عمل کو بھی تھوڑا بہت دخل ضرور تھا۔ وہ مکانات تعمیر کرتا۔ باغات لگاتا۔ کاشت کاری کرتا۔ ساز و سامانِ خانہ داری بہم پونہچاتا اور بنظرِ ظاہر بنانے والا یعنی خالق خیال کیا جاتا۔ مگر غور سے دیکھا تو وہ ایک حد تک متصرف فی الامور ضرور ہی۔ یعنی چیزوں کی حالت اور ترتیب بدل سکتا ہی۔ لیکن معدوم کو موجود نہیں کر سکتا اور بہتیرے تغیرات اس کے دسترس سے خارج بھی ہیں۔ مثلاً آدمی نے مکان بنایا تو اُس کے بنانے کے یہی معنی ہیں کہ اُس نے مٹی سے اینٹیں تھاپیں۔ ان کو پکایا۔ درختوں کی لکڑی چیر کر کڑی۔ تختے کواڑ۔ چوکھٹ۔ یہ چیزیں بنائیں۔ اُن کو لوہے کی کیلوں سے جڑا۔ پھر سب چیزوں کو موقع موقع سے ترتیب دے دیا۔ اتنا کرنے سے بانیِ مکان کہلانے لگا۔ مگر پانی۔ مٹی۔ لکڑی۔ لوہا۔ کوئی چیز بھی آدمی نے پیدا نہیں کی۔ یہ چند باتیں تو مثال کے طور پر بیان کر دی گئی ہیں۔ آدمی خود سوچے سمجھے تو معلوم کر سکتا ہی کہ جس کو اختیار کہنا چاہیئے اُس کا تو نام ہی نام ہی۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بہت ٹھیک فرمایا ہی ؎

گرت چشم خدا بینی ببخشند نہ بینی ہیچ کس عاجز تر از خویش

دور کیوں جاؤ خود آدمی ہی کے حال کو دیکھو کہ پیدا ہونا جینا طفلی اور شباب اور پیری کی منزلیں طی کرنا مرنا ان میں کوئی چیز بھی آدمی کے اختیار میں ہی؟ ہم تو جینے کے یہی معنی سمجھتے ہیں کہ آدمی مونہ کی راہ ماکول و مشروب پیٹ کی کوٹھری میں بھر لیتا ہی۔ جیسے بھڑ بھونجا بھاڑ جھونکتا ہی۔ خیر یہاں تک تو آدمی کو جوتنا۔ بونا۔ کاٹنا۔ گاہنا۔ پیسنا۔ پکانا۔ نگلنا۔ کچھ کرنا بھی پڑتا ہی۔ نگلے پیچھے اُس کو خبر بھی تو نہیں ہوتی کہ غذا کیوں کر گوشت۔ پوست۔ ہڈی۔ پٹھے۔ رگ۔ ریشے۔ خون۔ بال۔ ناخن کی طرف مستحیل ہوتی ہی۔ غرض بہت نہیں تھوڑا سا غور کرنے سے مولٰنا کا دل اِس بات کو مان گیا کہ دنیا میں ہمہ وقت انواع و اقسام کے تغیّرات ہوتے رہتے ہیں اور کوئی تغیّر بڑا ہو یا چھوٹا بے سبب کے نہیں ہوتا۔ خواہ وہ سبب آدمی ہو یا کوئی اَور چیز کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں تک کہ پتھر جہاں پڑا ہی جب تک کوئی اُس کو جگہ سے نہ ہلائے جنبش نہیں کرتا۔ تخم کے بدون درخت نہیں اُگتا۔ بے بادل پانی نہیں برستا۔ آدمی کو ایک حد تک متصرف فی الامور دیکھ کر مولٰنا کو دھوکا ہو چلا تھا کہ شاید یہی تغیّرات کا باعث ہوتا ہو۔ مگر ساتھ ہی اس کا بھی مشاہدہ کر لیا کہ ہزاروں لاکھوں کروڑوں بے شمار تغیّرات ہوتے رہتے ہیں جن میں انسان کو کچھ بھی دخل نہیں۔ بلکہ انسان کو ان کی خبر تک بھی نہیں ہوتی۔ دخل کیا خاک ہو۔ علاوہ بریں ایک تغیّر معدوم محض کو موجود کرنے کا ہی کہ یہ

کرشمہ نہ کسی فردِ بشر نے کیا اور نہ کوئی کر سکے گا۔ مثلاً دنیا کی ہر قسم کی چیزوں کی اصلیت میں غور کرتے کرتے آخرِ کار یہ دریافت ہوا کہ چار چیزیں تمام چیزوں کی اصل ہیں جن کو عناصرِ اربعہ کہتے ہیں۔ آب و خاک و باد و آتش یعنی دنیا میں جو چیز بھی ہے بجائے خود ایک مرکب ہے۔ جس میں یہ چار عناصر ملے ہوئے ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ہر چیز کی ترکیب جدا ہے۔ اور مقدارِ عناصر مختلف۔ اب حال کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ جن عناصر کو ہم اب تک بسیط سمجھتے رہے وہ بھی مرکب ہیں۔ مثلاً ہوا میں تین قسم کی ہوائیں ملی ہوئی ہیں۔ آکسیجن۔ نائٹروجن۔ اور ہائڈروجن۔ ایک کا خاصہ ہے آگ کو مشتعل کرنا۔ دوسری کا بجھانا۔ لیکن عناصر بسیط ہوں یا مرکب۔ ہم کو تو اس بحث سے کچھ تعلق نہیں۔ ہمارا مدعا تو اسی قدر ہے کہ دنیا کی چیزیں عناصر کے اختلاط سے بنیں۔ عناصر کا اختلاط بھی ایک طرح کا تغیر ہے اور چوں کہ ہر ایک تغیر کا کچھ نہ کچھ سبب ضرور ہوتا ہے۔ اختلاطِ عناصر کا بھی کوئی سبب ہوا ہوگا۔ اور معلوم ہے کہ اختلاطِ عناصر میں آدمی کو کچھ دخل نہیں الا ماشاء اللہ۔ اور آدمی کو دخل نہیں تو محسوساتِ ظاہری عالم میں کسی کو نہیں۔ غرض اختلاطِ عناصر کا سبب بھی دریافت طلب ٹھیرا۔ اور اس سے بڑھ کر وجودِ عناصر کا سبب کہ یہ کیوں کر آموجود ہوئے؟ ان کا موجد کون؟ ممکن تھا کہ مولانا اس بارے میں کسی مولوی۔ کسی عالم۔ کسی واعظ۔ کسی صوفی یا کسی مشائخ سے مشورہ کرتے اور وجودِ عناصر کا سبب دریافت کرتے مگر اس امر کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ہاں کے موجودہ علماء کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ وہ تو صرف ایک دوسرے مسلمان کو کافر بنانے اور ملحد قرار دینے کے عالم۔ واعظ۔ صوفی اور مشائخ ہیں نہ ان باتوں کے سمجھانے کے لیے۔ یا علمِ کلام و مناظرہ کا ان لوگوں نے ایک اکھاڑا بنا رکھا ہے اور اُن میں ایسی گاؤزوری کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اس علم کی جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب کی سب اپنے اپنے مرکز سے ہٹی ہوئی ہیں۔ شاید ہی ان میں احقاقِ حق کے لیے کوئی کتاب لکھی گئی ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ کبھی باطل سے باطل مذہب بھی مغلوبِ مناظرہ ہو کر معدوم نہیں ہوا۔ پس اس لیے مولانا کسی مولوی یا مشائخ کے پاس تو بھولے سے پھٹکے نہیں۔ تدبیر یہ کی کہ دل ہی دل میں سوچتے رہے اور برسوں اسی فکر میں پریشان رہے۔ لیکن یہ معمّٰی کسی طرح حل نہیں ہوتا تھا کہ دنیا کا یہ عظیم الشان کارخانہ کہاں سے آموجود ہوا۔ کون اس کو اس ربط و ضبط کے ساتھ چلا رہا ہے۔ مولانا کی پریشانی یہاں تک بڑھی کہ آخرِ کار اُنھوں نے ایک دن دیوانِ حافظ میں فال کھولی تو قسمت سے یہ شعر نکلا ؎

سخن از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو　　　که کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمّی را

فال نے تو مولانا کی بالکل آس توڑ دی۔ اور ایک مدت تک اُنھوں نے اس خیال کو پاس نہ آنے دیا۔ اسی اثناء میں اتفاق سے مولانا کو تپ آنے لگی اور مسہلوں تک کی نوبت پہنچی۔ علالت کی حالت میں مولانا کو یہ خیال ہوا کہ اگر وہ اسی دُبدے کی حالت میں مر گئے تو کُتّے کی موت مرے۔ غرض تن درست ہوتے ہی اُنھوں نے پھر زور شور کے ساتھ کوشش شروع کی۔ وہ کیا کوشش تھی؟ وہ یہ کوشش تھی کہ اُنھوں نے سوچا کہ "میں کوئی انوکھا آدمی تو ہوں نہیں مجھ جیسے اور مجھ سے بہتر سوجھ بوجھ کے لاکھوں کروڑوں آدمی ہو گزرے ہیں اور اب موجود ہیں اور یہ خیال جو مجھکو پریشان کیے رہتا ہے کوئی ایسا دقیق مضمون نہیں جس کے لیے بڑی عقل درکار ہو بلکہ معمولی ہوش و خرد کا آدمی بھی ایسا خیال کیے بغیر

نہیں رہ سکتا۔ اور اگر آدمی نے ایسی ضروری اور پیش اُفتادہ بات کا بھی خیال نہ کیا تو حقیقت میں وہ جانوروں سے بھی گیا گزرا ہے۔"

غرض غور کرنے سے مولانا کو یہ ثابت ہوا کہ یہ خیال آدمی کی فطرت میں داخل ہے۔ آدمی کا دل اُس کو اِس خیال پر مجبور کرتا ہے اور یہ خیال خود بخود اُس کے دل سے پیدا ہوتا ہے۔ اور لوگوں کے اِس خیال کا نتیجہ اختلافِ مذاہب ہے۔ جیسا کہ دیکھا جاتا ہے۔ اور یہ اختلاف اختلافِ مدارجِ عقول۔ اختلافِ تعلیم اختلافِ تربیت۔ اختلافِ آب و ہوا کی وجہ سے ہے۔ چوں کہ مذہب بہت سی باتوں کے مجموعے کا نام ہے اور مذاہب ہیں کہ قریب قریب سبھی باتوں میں مختلف ہیں اس لیئے فروعی اختلاف تو چنداں قابلِ لحاظ نہیں۔ بڑا دیکھنا اصولِ اختلاف کا ہے۔ پس تمام اختلافات کی جڑ معرفتِ ذاتِ باری ہے۔ ذاتِ باری میں جو اختلافات ہیں اُن کے لکھنے کی گنجایش نہیں صرف وجہ اختلاف لکھی جاتی ہے اور وہ وجہ خود انسان کی طبیعت کا خاصّہ کرپزی ہے۔ کُرپزی کے بہت سے معنی ہیں لیکن یہاں معنی ہیں کہ نامعلوم چیزوں کے معلوم کرنے کا شوقِ مُفرط۔ اگرچہ یہ تعریف کی بات ہے۔ یہ نہ ہو تو بابِ ترقی مسدود۔ لیکن چوں کہ از حد بگزرد رسوا کند[٥]

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن ⁂ کہ جا ہا سپر باید انداختن

شوق کی ایک حد ہونی چاہیئے اور وہ حد یہ ہے کہ "ایاز قدرِ خود بشناس" بات یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس میں غور کرے تو آسانی سے بجھ سکتا ہے کہ گو وہ عقل رکھتا ہے اور عقل کی وجہ سے اشرف المخلوقات ہے۔ مگر ہزاروں باتیں ہیں جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ کُنہ اور حقیقت تو کسی چیز کی ہم جانتے ہی نہیں۔ مثلاً کوئی ہم سے پوچھے کہ پانی کی حقیقت کیا ہے؟ جواب میں ہم پانی کے خواص تو بہتیرے گنوا دیں گے کہ پانی ایک رقیق اور سیال چیز ہے۔ نشیب کی طرف کو بہتا ہے۔ جس ظرف میں بھرا جائے جوفِ ظرف کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جن چیزوں کا وزنِ مخصوص پانی کے وزنِ مخصوص سے ہلکا ہے وہ پانی پر تیرتی رہتی ہیں۔ جیسے لکڑی اور تیل۔ جان داروں کے لیئے سرمایۂ زیست ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (اور ہم نے پانی سے تمام جاندار چیزیں بنائیں) بے شک یہ ایسی صفتیں ہیں کہ ان سے ہمارا ذہن بے خطا پانی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے مگر ہیں سب اعراض۔ اسی طرح

جِسْمٌ نَامٍ حَسَّاسٌ مُتَحَرِّكٌ بِالْإِرَادَةِ بَادِي الْبَشَرَةِ عَرِيضُ الْأَظْفَارِ مُسْتَقِيمُ الْقَامَةِ

بڑھنے والا جسم ہے۔ رنج و راحت کو دریافت کرتا ہے۔ ارادے کے ساتھ حرکت کرتا ہے۔ اس کی جلدِ بدن کھلی ہوئی ہے۔ چوڑے ناخن سیدھا قد

انسان کی صفات اور اعراض ہیں نہ کُنہ و حقیقت۔ خدا نے قرآن میں آدم کی نسبت کہ اس میں بنی آدم بھی داخل ہیں وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (آدم کو سب چیزوں کے نام بتا دیئے) فرمایا ہے کہ نام بھی ایک طرح کی صفتِ عارضی ہے۔ نہ عَلَّمَ آدَمَ الْحَقَائِقَ اور ایک مقام پر تو صاف صاف وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (اور تم لوگوں کو اسرارِ الٰہی میں سے بس تھوڑا ہی سا علم دیا گیا ہے) سے آدمی کی قلعی کھول دی۔ اور دوسری جگہ اُس کو جہول[٥] کا خطاب دیا۔ جب انسان کی لاعلمی کا یہ حال ہے

[٥] چنانچہ فرمایا ہے انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنہا و اشفقن منہا و حملہا الانسان انہ کان ظلوما جہولا یعنی ہم نے ذمہ داری کو (جو انسان پر ہے) آسمانوں پر، اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا (اور یہ بوجھ اُن پر لادنا چاہا) تو اُنھوں نے بزبانِ حال اُس کے اٹھانے سے انکار کیا

تو اُس کو بھی جانوروں میں کا ایک جانور ہونا چاہئے لیکن آدمی قلیل العلم اور جہول ہونے پر بھی علم کے اعتبار سے جانوروں پر فضیلت رکھتا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝

اور البتہ ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور خشکی اور تری میں (ان کو جانوروں اور کشتیوں پر) سوار کیا اور عمدہ (عمدہ) چیزیں اُنھیں دکھانے کو دیں اور جتنی مخلوقات ہم نے پیدا کی ہیں اُن میں سے بہتیروں پر اُن کو برتری دی۔

جانوروں کا علم وہبی ہے اور آدمی کا وہبی اور اکتسابی دونوں اور اسی لیئے جانوروں کا علم ترقی پذیر نہیں اور آدمی کے علم کی ترقی کی کوئی حد نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ علمی شرافت ایک امر اضافی ہے آدمی شرافت رکھتا ہے جانوروں کے مقابلے میں مگر کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے خدا کے مقابلے میں جہول ہی رہے گا خدا کے علم کی شان تو یہ ہے ؎

ہر دو علم یک ذرہ پوشیدہ نیست   کہ پیدا و پنہاں بنزدش یکے است

غرض آدمی کی لاعلمی کے ثبوت میں بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ خود افراد بشر میں علم کے مدارج متفاوت ہیں۔ ہم میں کتنے اسٹیم الکٹرسٹی کے اسرار سے واقف ہیں۔ ہزار ہا قسم کی مشینیں یورپ اور امریکا میں ایجاد ہوئیں اور ہوتی چلی جا رہی ہیں ایسی کہ ہم میں کا بڑے سے بڑا بوجھ بجھکڑ اُن کو دیکھ کر ہکا بکا ہو کر رہ جاتا ہے۔ علوم وہبی میں خدا نے بعض جانوروں کو آدمی پر فضیلت دی ہے کہ جو کام جانور کر گزرتے ہیں آدمی سے بن نہیں پڑتا۔ شہد کی مکھی بے کسی کے سکھائے ایسا چھتّا بناتی ہے کہ اصول ریاضی کی رو سے کم سے کم موم کے خرچ میں زیادہ سے زیادہ شہد کے ذخیرے کے لیئے اس سے بہتر کوئی شکل ہو نہیں سکتی۔ آدمی بیے کا سا گھونسلا بنا ہی نہیں سکتا۔ نیولا سانپ کے زہر کے تریاق کی بوٹی کو پہچانتا ہے پرندوں کو طوفان باد اور زلزلوں کی آمد بدون کسی آلے کے پہلے ہی سے معلوم ہو جاتی ہے۔

آدمی کی لاعلمی کا حال یہ ہے کہ خود اُس کو اپنی روح کا علم شافی نہیں کہ یہ کیا چیز ہے اور اس کو جسم سے کس طرح کا تعلق ہے؟ آدمی نجوم۔ رمل۔ جفر۔ فال۔ تعبیر خواب مختلف طریقوں سے بہتیری ٹوہ لگاتا ہے غیب کا ٹھیک پتا نہیں لگتا۔ اور لگتا بھی ہے تو اندھے کی لاٹھی لگا تو تیر نہیں تو تکا۔ آج تک زندگی کا عقدہ نہیں کھلا کہ جسم میں جان کیوں کر پڑتی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ بیج کا درخت کیوں کر بن جاتا ہے پھولوں میں رنگ و بو۔ پھلوں میں مزہ کون پیدا کرتا ہے؟ چلتی ہوئی سرسری نگاہ سے دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے نہیں تو غور کرنے والے کو ذرہ ذرہ قطرہ قطرہ پتا پتا ہاتھی اور مچھر ہر چیز پہیلی ہے۔ اتا پتا ندارد۔ سچ کہا ہے۔

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ   ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

ان خیالات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں غور کرنا ہی لاحاصل ہے۔ غور کرنے سے ہوگا ہی کیا۔ مگر مولانا فرماتے

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اُس کے اٹھانے سے انکار کیا۔ اور اُس سے ڈر گئے۔ اور آدمی نے (گویا ارادۃً بے تامل) اُس کو اٹھا لیا۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ (اپنے حق میں) بڑا ظالم (تھا اور ظالم ہونے کے علاوہ) بڑا ہی نادان (تھا) ۱۲

ہیں کہ وہ غور نہ کرنا بھی ایک بڑی غلطی ہے آدمی کو ایک حد تک غور کرنا ضرور ہے۔ آدمی کو عقل اسی لیے دی گئی ہے۔ غور کرنے سے ہوگا یہ کہ یہی غور انسان کو خدا شناسی کی طرف راہ نمائی کرے گا" لیکن غور کرنے کی ایک حد ہے اور وہ حد یہ ہے کہ اُس (خدا) کے ہونے کا اعتراف کیا جائے۔ رہی یہ بات کہ وہ کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟ اور کہاں ہے؟ اسی کو مولانا کریدنی کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہی اختلافِ مذاہب کی جڑ ہے۔ مولانا تو

مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ — ہم نے تجکو ویسا نہیں پہچانا جیسا تیرے پہچاننے کا حق ہے۔

اور

اَلْعَجْزُ مِنَ الْاِدْرَاكِ اِدْرَاكٌ — خدا کی حقیقت دریافت کرنے سے عاجز رہنا ہی ایک طرح کا دریافت کرنا ہے

کی تعلیم ہی کی وجہ سے اسلام کے گرویدہ ہوئے ہیں۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب خدا کے ہونے کا اعتراف یہی ادراکِ بشری کی حد ہے آدمی اس سے زیادہ خدا کو جان ہی نہیں سکتا تو پھر یہ صفات جو خدا کے نو د و نہ ناموں سے ظاہر ہوتی ہیں کیوں کر معلوم ہوئیں پس اسلامی عقیدہ تو یہ ہے اور ہے بھی برحق کہ صفاتِ باری عین ذاتِ باری ہیں یعنی فی وقتِ من الاوقات ایسا نہیں ہوا کہ خدا ان صفات سے معرّیٰ رہا ہو۔ صفاتِ باری ذات باری کو لازم ہیں اُس سے منفک نہیں ہو سکتیں پس مولانا کا یہ فرمانا کہ خدا کے ہونے کا اعتراف ادراکِ بشری کی حد ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ایسے خدا کے ہونے کا اعتراف جو نو د و نہ صفات سے متّصف ہے ادراکِ بشری کی حد ہے۔ رہی یہ بات کہ مولانا نے خدا کا ان صفات سے متصف ہونا کیوں کر جانا۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ جہاں سے خدا کے ہونے کو جانا یعنی کائناتِ عالم سے وہیں سے اُس کے اِن صفات سے متّصف ہونے کو بھی جانا۔ یعنی اگر خدا اِن صفات سے معرّیٰ فرض کیا جائے تو کارخانۂ عالم بزبانِ حال پکارے کہہ رہا ہے کہ ایسا خدا خدا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ نہ وہ اتنا بڑا عظیم الشّان کارخانہ بایں حُسن و خوبی پیدا کر سکتا نہ اُس کو سنبھال سکتا۔ نہ اُس کو اِس انتظام سے چلا سکتا ہے ممکن ہے کہ ان خیالات کو دیکھ کر کوئی کہے کہ خدا کا وجود خیالی وجود ہے یعنی ہم نے دل میں فرض کر لیا ہے کہ خدا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ خدا کا وجود خیالی وجود تو تب ہوتا کہ عالم کا وجود خیالی ہوتا۔ مگر عالم کو تو ہم موجود فی الخارج دیکھ رہے ہیں تو ضرور ہے کہ خدا بھی پہلے سے موجود ہے۔ اِس پر بھی ایک اعتراض یہ وارد ہو سکتا ہے کہ عالم اَور چیز اور خدا اَور چیز۔ عالم کے وجود کو خدا کے وجود سے تعلق کیا۔ یہ تو ایسی بے تُکی مثال ہوئی کہ ہم کسی جگہ سے کوئلا نکلتا ہوا دیکھیں اور اُس کو سونے کے ہونے کی دلیل سمجھیں۔ لیکن یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے کوئلے کا ہونا سونے کے ہونے کا مستلزم نہیں اور عالم کا ہونا خدا کے ہونے کا مستلزم ہے۔ اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا عالمِ اسباب ہے کوئی اَدنیٰ تغیر بھی بے سبب نہیں ہوتا۔ خیر دوسرے تغیرات سے قطعِ نظر یہ بڑا تغیر عالم کا عدم سے وجود میں آنا۔ اِس کا محرک اس کا باعث اس کا سبب کون؟ سبب کی جُستجو میں مولانا نے ہر چہار طرف نظر دوڑائی مگر ان کو تو کہیں دکھائی دیا نہیں اور ہونے میں شک بھی نہیں ہوا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس حیرت میں ہمارے قصورِ علم نے ہماری دست گیری کی اور ہم نے

سمجھا کہ یہ ہمارے فہم کا قصور ہے۔ علم حاصل کرنے کے ذرائع جو ہم کو حاصل ہیں یعنی حواسِ خمسہ ہمارے لیئے عینک ہیں مگر دھندلی مثلاً حواسِ خمسہ میں سے ایک قوتِ باصرہ کو لو کہ چشم دید بڑا قوی ذریعہ یقین کا ہے۔ مگر قوتِ باصرہ میں یہ نقص بھی ہے کہ۔ مثلاً گھڑی میں گھنٹے کی سوئی حرکت تو کرتی ہے ہم کو حرکت سوجھ نہیں پڑتی۔ اسی طرح سایہ حرکت تو کرتا ہے ہم کو حرکت کرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ اور یہ تو ہم نے مثال کے طور پر ایک بات کہی نظر میں اور کئی نقص ہیں جو علم المناظر والمرایا کی کتابوں میں بالتفصیل مذکور ہیں۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ گھڑی میں گھنٹے کی سوئی یا سایے کی حرکت سوجھ نہ پڑنے سے سوئی اور سایے کو ساکن مانوگے یا قصورِ نظر کے قائل ہوگے۔ کارخانۂ عالم کی ساخت اور اُس کا انتظام متقاضی ہیں کہ اُس کا موجد اُس کا ناظم ایسا اور ایسا ہو۔ اور ایسا اور ایسا ہونا اِس بات کا مستلزم ہے کہ وہ ہمارے ناقص حواس کی گرفت میں نہ آسکے مگر پھر بھی ہم کو اُس کا ہونا ماننا پڑے گا۔ اور وہ ہے

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اِن منطقی دلائل کے سوا ہمارے مولانا وجودِ باری تعالیٰ کے ثبوت میں اکثر عام لوگوں کے سمجھانے کے لیئے فرمایا کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک گاؤں میں اتفاق سے ہاتھی کا گزر ہوا۔ تو سارا گاؤں ہاتھی کے دیکھنے کو نکل پڑا گانوں میں کچھ اندھے بھی تھے۔ اُنھوں نے بھی ہاتھی کا آنا سنا اور دیکھنے کو چل دوڑے آنکھیں نہیں ہیں کہ سموچے ہاتھی کو دیکھیں فیل بان نے ترس کھا کر ٹٹول لینے دیا۔ گھر پلٹ کر آئے تو لوگوں نے پوچھا کہ تم نے کیا دیکھا۔ کسی نے سونڈ ٹٹولی تھی کسی نے کان۔ کسی نے پیٹ۔ کسی نے پاؤں۔ کسی نے دُم۔ جس نے جتنا ٹٹولا اُسی کو ہاتھی سمجھا تھا وہی بیان کر دیا ہر ایک اندھا اپنی جگہ سچا تھا وہ ہاتھی کے مختلف حلیے بیان کرتے تھے مگر ہاتھی کے ہونے پر متفق تھے۔ یہی حال خدا کا ہے کہ وہ بشری حواس کی گرفت میں آنے کی چیز نہیں مگر آدمی ہے کہ اِن ہی ناقص حواس سے اُس کو معلوم کرنا چاہتا ہے۔ پس ع۔ ہر کس بخیالِ خویش خبطے دارد۔ کا مصداق ہے۔ یہ مشرک اور بت پرست بھی خدا کے حلیے میں غلطی کرتے ہیں ورنہ منکرِ خدا یہ بھی نہیں۔ ہاں عام طور پر مشہور ہے کہ دہریے خدا کو نہیں مانتے لیکن مولانا کے نزدیک اگر مشرک خاص چیزوں کو شریکِ خدائی کرتے ہیں تو بت پرست خاص چیزوں کو خدا مانتے ہیں۔ اور دہریے ساری خدائی کو۔ حافظ شیرازی نے ٹھیک فرمایا ہے۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ   چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

بات یہ ہے کہ خدا کے بارے میں لوگوں کی رایوں کے اختلاف کا اصلی سبب دنیا کا عالمِ اسباب ہونا اور انسان کے ذرائع علم کا نقص ہے۔ انسان بدو شعور سے زندگی بھر دیکھتا ہے کہ ہر ایک تغیّر کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے اور پھر سبب بھی خود ایک تغیر ہے اِس کا سبب اور پھر اُس کا سبب وھلم جرًا۔ مثلاً سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بھاپ کی طرف مستحیل ہوتا ہے۔ ہوا بھاپ کو اُبھار کر اُوپر لے جاتی ہے اِس لیئے کہ بھاپ ہوتی ہے ہلکی اور ہوا ہوتی ہے بھاری۔ اور ہلکی چیز کا خاصہ ہے کہ وہ بھاری چیز کے اوپر رہتی ہے۔ جیسے تیل اور پانی۔ پھر یہ بھاپ جو ہم کو بادل کی شکل میں دکھائی دیتی ہے اوپر کی سردی پا کر مینھ بن کر برستی ہے۔ پانی کی بھاپ۔ بھاپ کا پانی یہ آواگون (یا یہی ردوبدل) ہمیشہ ہوتا رہتا ہے

اور اس کی تصدیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ دیگچی میں پانی گرم کیا جائے اُس سے بھاپ پیدا ہوگی - کچھ تو ہوا ہو کر اُڑ جائے گی اور کچھ چپنی میں لگ کر بوندیں بن بن کر دیگچی میں ٹپکے گی - اس میں پانی کے بھاپ ہونے کا سبب ہے گرمی - پھر بھاپ کے پانی ہونے کا سبب سردی - مگر یہ دو تغیر سلسلۂ تغیرات کی صرف تین کڑیاں ہیں سلسلے کے اُوپر کی اور بیچ کی اور نیچے کی کڑیوں کو چھوڑ دیا گیا ہے - ورنہ آفتاب کا ہونا اُس کی گرمی اور پانی اور ہوا اور گرمی سردی کی مختلف تاثیرات - یہ سب تغیرات سبب کے محتاج ہیں غرض اس سلسلے کی کڑیوں کا کھوج لگاتے جائیے - آخر کار عاجز آکر ایک سبب ایسا ماننا پڑے گا کہ اُس کو سبب درکار نہیں وہ خود مسبب الاسباب یعنی خدا ہے - یہاں تک تو کسی کو اختلاف نہیں اور نہ کوئی اختلاف کر سکتا ہے - اختلاف ہے تعیینِ سبب میں اس وجہ سے کہ آدمی ادراکِ بشری کی رسائی تک تعیینِ سبب کر سکتا ہے اور یہاں انتظامِ عالم ایسا سبب چاہتا ہے جس کی مثال مرئیات و مشاہداتِ عالم میں موجود نہیں - لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ مثال کا موجود ہونا یگانگی اور یکتائی یعنی وحدانیت کے خلاف اور یکتائی موجدِ عالم یعنی خدا ہونے کے لئے صفتِ لازمی ہے -

خلاصہ یہ کہ مولنا کے تمام خیالات کا لبِّ لباب یہ ہے کہ انسان ایک مذہبی مخلوق ہے - یعنی مذہب کا تقاضا خود اُس کی طبیعت سے پیدا ہوتا ہے - دنیا میں آکر سب سے پہلی بات جو وہ سیکھتا ہے یہ ہے کہ دنیا عالمِ اسباب ہے اور زندگی بھر اُس کو ہمہ وقت اس کی تصدیق ہوتی رہتی ہے کہ یہاں پتا تک بھی بے ہلائے نہیں ہلتا - ہر چیز کے وجود پر حالت کے وقوع کا کچھ نہ کچھ سبب ضرور ہوتا ہے اور کچھ ایسا جال اسباب کا پھیلا ہوا ہے کہ ہر سبب بجائے خود محتاجِ سبب ہے - مینھ کا سبب بادل - بادل کا بخارات - بخارات کا گرمی آفتاب - اسی طرح ہر سلسلۂ اسباب عقلاً منتہی ہوتا ہے

وَاِلَیْہِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّہٗ   اور ہر ایک کام (کا دار و مدار) آخر اُسی پر جاکر ٹھیرتا ہے -

ایک ایسے سبب کی طرف کہ وہ مسبب الاسباب ہے اور اُس کا کوئی سبب نہیں اور اسی کو علیٰ اختلاف الالسنہ کوئی اللہ کہتا ہے کوئی خدا کوئی گاڈ کوئی بھگوان کوئی کچھ کوئی کچھ - ؎

ہے مسمّٰی ذاتِ واحد نام اُس کے مختلف   گاڈ یا بھگوان اللہ یا خدا کہنے کو ہیں

الغرض مولنا کے نزدیک خداشناسی کا سیدھا رستہ جو عقلِ اسلام نے تعلیم کیا ہے یہ ہے کہ کارخانۂ عالم پر نظر کر کے ادنیٰ تامّل سے ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کارخانے کا بنانے والا اور سنبھالنے والا کوئی ہے اور وہ کوئی اُن چیزوں میں سے نہیں ہے جن کو ہم دیکھتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں - ہم اپنے آپکو عقل و دانش کے اعتبار سے اشرف المخلوقات پاتے ہیں لیکن ہم خود اپنی جگہ درماندہ ہیں - مجبور ہو کر ہم کو ایسی ہستی کا قائل ہونا پڑتا ہے جو ہماری اور مخلوقات کی جنس میں سے نہیں ہے - بس خدا کے ہونے کی ہمارے پاس ایک ہی دلیل ہے ہمارے دل کی گواہی - ہم نے اپنے دل کی گواہی کو جب جب آزمایا صحیح ثابت ہوئی - مثلاً ہم صبح کے وقت مشرق کی طرف روشنی ہوتی دیکھتے ہیں اور ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ آفتاب نکلنے والا ہے اور اس گواہی کے صحیح ثابت کرنے کے لئے واقع میں بھی آفتاب نکلتا ہے - یا مثلاً ہم کو دور سے دھواں اُٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ دھواں کسی آگ سے پیدا ہوا ہے - ہم موقع پر جاکر دیکھتے ہیں واقع میں آگ پاتے ہیں - ہم نے لوگوں کو مرتے

دیکھا ہی اور ایک شخص خاص کی نسبت ہم حکم لگاتے ہیں کہ یہ بھی مرے گا اور وہ واقع میں اوپر سویر مرتا ہی - اسی طرح جب ہم ایک بنا ہوا مکان یا ایک چلتی گھڑی دیکھتے ہیں تو ہمارا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوتا ہی کہ اس مکان کا بنانے والا کوئی معمار اور گھڑی کا بنانے والا کوئی گھڑی ساز ضرور ہی اور تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہی کہ واقع میں مکان کا تعمیر کرنے والا معمار اور گھڑی کا بنانے والا گھڑی ساز ہی تھی - پس کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے دل کی گواہی یا ہماری عقل کا حکم کسی جگہ غلطی نہ کرے اور کرے تو خدا کے بارے میں - اس سے ثابت ہوا کہ مخلوقاتِ عالم کو دیکھ کر جو ہم نے سمجھا ہی کہ ان کا بنانے والا محسوسات میں سے نہیں ہی بلکہ وہ ہستی ہی جس کو ہم بچشم سر نہیں دیکھ سکتے - اور اسی کو ہم لوگ خدا کہتے ہیں ٹھیک ہی - اور جس طرح ہم نے خدا کی ذات کو پہچانا اسی طرح اس کی صفات کو پہچانا اور جس دلیل سی ہمنے خدا کو مانا اسی دلیل سی ہمنے اس کو ایک بھی مانا ؏

شاباش دلا ارشدک اللہ تعالیٰ ‏ ‏ پہچانا اسے تو نے جسے دیکھا نہ بھالا

توحیدِ باری تعالیٰ خدا خدا کر کے جب ہمارے مولٰنا کو معرفتِ باری تعالیٰ حاصل ہوئی تو جس طرح انھوں نے خدا کو دیکھا نہیں مگر مخلوقات سے خالق کو جانا اسی طرح انتظامِ دنیا سے اس کی صفات کو پہچانا - ازاں جملہ اس کی یکتائی کو - کہ عالم کا سارا صحیفۂ قدرت ایک ہی کاتب کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہی کہیں دائرے اور کشش اور نقطے اور حرکات اور سکنات اور شوشے اور نوک پلک میں ذرا تفاوت نہیں -

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ‏ ‏ اور اگر (قرآن) خدا کے سوا (کسی اَور) کے پاس سے (آیا) ہوتا تو ضرور اس میں بہت سے اختلافات پاتے -

ہے تو قرآن کی شان میں مگر صحیفۂ قدرت پر بھی منطبق ہی - دنیا میں ہزار ہا قسم کے انتظام ہیں مگر یہ مجموعۂ قوانین ایک ہی مُقنّن کا بنایا ہوا ہی - تمام قاعدوں میں ایک عجیب طرح کا تناسب ہی کہ ایک دوسرے کی تائید کرتا ہی -

كَالْبُنْيَانِ الْمَرْصُوصِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا ‏ ‏ جیسے سیسہ پلائی ہوئی عمارت کہ اس کا بعض بعض کو مستحکم کرتا ہی -

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ‏ ‏ اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو (زمین و آسمان دونوں کبھی کے) برباد ہو گئے ہوتے -

کا یہی مطلب ہی اور یہ عقیدہ توحید اسلام کی بڑی خصوصیتوں میں ہی اور اس کی صداقت اور حقانیت کی بڑی مستحکم دلیل ہی اسی کی وجہ سے اسلام نے دوسرے ادیانِ مروّجہ کو رد کیا ہی -

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست ‏ ‏ کتب خانہ چند ملت بشست

اسلام کا سارا زور توحید پر ہی یعنی اس بات پر کہ خدا ایک ہی وحدہٗ لاشریک لہٗ - اس کی وحدت اس طرح کی وحدت نہیں ہی جیسے کسی صوبے میں ایک لفٹنٹ گورنر یا برٹش انڈیا میں ایک ویسرائے یا ایک امپرر - مولٰنا فرماتے ہیں کہ یہ وحدتیں ناقص اور برائے نام ہیں - اصلی وحدت اس خدائے پاک کی ہی جس کی نہ ذات میں کوئی شریک اور نہ صفات میں لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ - نہ صرف اس سے نفسِ توحید ہوتا ہی کہ معاذ اللہ دوسرا خدا مانا جائے - بلکہ اس سے کہ معاذ اللہ دوسرا اس کے اختیارات میں دخیل مانا جائے - اور اس سے بھی کہ معاذ اللہ دوسرا مستحقِ عبادت سمجھا جائے

دنیا کے اس عظیم الشان کارخانے کا ذرہ ذرہ سمندروں کا قطرہ قطرہ درختوں کا پتا پتا خدا کی ہستی کا گواہ اور اُس کے وحدہٗ لاشریک لہٗ ہونے کا شاہدِ عادل ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ

اور جتنی چیزیں ہیں سب اُس کی حمد (وثنا) کے ساتھ اُس کی تسبیح (وتقدیس) کر رہی ہیں مگر تم لوگ اُن کی تسبیح (وتقدیس) کو نہیں سمجھتے

ہر گیاہے کہ از زمیں روید وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

اِس لیئے کہ کوئی چیز بڑی ہو یا چھوٹی زمین میں ہو یا آسمان میں خشکی میں ہو یا تری میں جان دار ہو یا بے جان اِس خوبی اور عمدگی کے ساتھ کہ اِس سے بہتر ہونا ممکن نہیں آپ سے آپ نہیں بن گئی۔ ضرور کسی کے بنائے سے بنی ہے غرض مولٰنا نے جب اُس بنانے والے کی جست جو کی اور زمین سے لیکر آسمان تک چھان مارا تو کسی کو اس لائق نہ پایا۔ جس کو دیکھا عاجز۔ جس کو ٹٹولا درماندہ۔ روئے زمین پر انسان ہی سب میں پیش پیش تھا کہ عقل رکھتا تھا تو وہ ایاز قدرِ خود بشناس" سُن کر اپنا سا مُنھ لے کر رہ گئے۔ ناچار آسمان پر نظر دوڑانی چاہی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ[۵۱] یاد کر کے مولٰنا خاموش بیٹھ گئے اور سمجھے کہ جس کی جستجو ہے وہ چشم سَر سے دیکھنے کی چیز نہیں بنی اسرائیل[۵۲] نے شوخ چشمی کی تو فاخذتھم الصاعقۃ کی سزا پائی۔ موسیٰ[۵۳] علیہ السلام نے غلبۂ شوق میں آکر حوصلہ کیا تو خر موسیٰ صعقا سے

---

۵۱ حضرت ابراہیمؑ کا یہ قصہ قرآن مجید میں اِس طرح مذکور ہے واذ قال ابراھیم لابیہ سے... وما انا من المشرکین تک (الانعام پارہ (۷))۔ ترجمہ:۔ اور (اے پیغمبر اُس وقت کو یاد کرو) جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کیا تم بتوں کو معبود مانتے ہو میں تو تم کو اور تمہاری قوم کو صریح گمراہی میں مبتلا پاتا ہوں اور (جس طرح ابراہیم کے دل میں ہم نے یہ خیال پیدا کیا) اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمان و زمین کا انتظام دکھانے لگے تاکہ وہ (کامل) یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں تو جب اُن پر رات چھا گئی اُن کو ایک ستارہ نظر آیا (اور اُس کو دیکھ کر) کہنے لگے کہ یہی میرا پروردگار ہے پھر جب وہ غروب ہو گیا تو بولے کہ غروب ہو جانے والی چیزوں کو تو میں پسند نہیں کرتا (کہ خدا مان لوں) پھر چاند کو دیکھا کہ بڑا جگمگا رہا ہے تو کہنے لگے یہی میرا پروردگار ہے پھر جب (وہ بھی) غروب ہو گیا تو بولے اگر مجھ کو میرا پروردگار راہِ راست نہیں دکھائے گا تو بے شک میں (بھی) گمراہ لوگوں میں ہو جاؤں گا۔ پھر جب سورج کو دیکھا کہ بڑا جگمگا رہا ہے تو کہنے لگے یہی میرا پروردگار ہے کہ یہ (سب سے) بڑا بھی ہے پھر جب (وہ بھی) غروب ہو گیا تو اپنی قوم سے مخاطب ہو کر بولے کہ بھائیو! جن چیزوں کو تم شریکِ (خدا) مانتے ہو میں تو اُن سے بے تعلق (محض) ہوں میں نے تو ایک ہی کا ہو کر اپنا رُخ اُسی (ذاتِ پاک) کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا اور میں شرکوں میں سے نہیں ہوں ۱۲

۵۲ بنی اسرائیل کی اِس شوخ چشمی اور شرارت کا قصہ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں مختلف پیرایوں کے ساتھ مذکور ہوا ہے ازاں جملہ سورۂ بقرہ کی ایک یہ آیت ہے واذ قلتم یموسٰی لن نؤمن لک حتی نری اللہ جھرۃ فاخذتکم الصاعقۃ وانتم تنظرون ثم بعثنکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون۔ یعنی اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے (یعنی تمہارے بڑوں نے) موسیٰ سے کہا تھا کہ اے موسیٰ جب تک ہم خدا کو ظاہر میں نہ دیکھ لیں ہم تو کسی طرح تمہارا یقین کرنے والے ہیں نہیں (کہ خدا ہی تم سے کلام کر رہا ہے) اس پر تم کو بجلی نے آدبوچا اور تم دیکھا کیئے پھر تمہارے مرے پیچھے ہم نے تم کو جلا اُٹھایا کہ شاید تم شکر کرو ۱۲

۵۳ حضرت موسیٰؑ کا یہ واقعہ قرآن کی اِن آیتوں میں مفصلاً مذکور ہے وواعدنا موسٰی ثلثین لیلۃ سے وانا اول المؤمنین تک (سورۂ اعراف پارہ (۹))
ترجمہ:۔ اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ کیا اور ہم نے دس (راتیں اور بڑھا کر ان) سے تیس کو پورا (چالیس) کر دیا اور یوں پروردگار موسیٰ کا وعدہ چالیس رات کا پورا چلہ ہو گیا۔ اور موسیٰ (کوہِ طور پر جاتے وقت) اپنے بھائی ہارون سے کہنے لگے کہ میری قوم (کے لوگوں) میں میری نیابت (بقیہ صفحہ آئندہ)

شرمندگی اُٹھائی - پس اِن باتوں سے مولانا کو معلوم ہوا کہ خدا ہمارے حواسِ ظاہر کی گرفت سے منزہ اور بالاتر ہی - اور یہ ہمارے حواس کا قصور ہی ؎

اے زدہ برتر از کمان خیمہ کبریائے را   کے بتو دست ہیر سد عقل شکستہ پائے را

ہاں چشمِ دل سے دیکھا جائے تو دنیا آئینہ خانہ ہی - اور در و دیوار خدا کے نور سے بڑے جھمگا رہے ہیں مولانا فرماتے ہیں کہ آدمی کو شروع ہی سے خدا کے بارے میں یہ غلطی واقع ہوئی ہی اور اب تک بھی اکثر خدا کے بندے اسی غلطی میں مبتلا ہیں کہ اُنھوں نے خدا کو اپنے حواسِ ظاہر کے ذریعے سے معلوم کرنا چاہا اور جب اِن کو اس ارادے میں کامیابی نہ ہوئی تو من مانا خدا فرض کیا - اور اُس کو اپنے اوہامِ باطلہ کا تختۂ مشق بنایا یعنی ذلیل سے ذلیل اور رذیل سے رذیل مخلوقات کو بھی پورا یا ادھورا خدا بنانے یا ماننے میں تامل نہیں کیا - پورا تو پورا ادھورے کے یہ معنی کہ اپنے زعم میں خدائی کے اختیار خدا سے چھین کر نا اہلوں کے حوالے کیئے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ خدا کو منصبِ خدائی سے معزول کر دیا - جس جس طرح پر خدا کے بندوں نے خدا کی جناب میں گستاخیاں اور بے ادبیاں کی ہیں اور کر رہے ہیں ناگفتہ بہ ہیں - کوئی تو اُس کی ذات پر حملے کرتا ہی کہ ایک نہیں دو خدا ہیں ایک پیدا کرتا دوسرا مارتا ہی - ایک خالقِ خیر ہو اور دوسرا خالقِ شر - کوئی کہتا ہی تین خدا ہیں اور پھر وہ ایک بھی ہی کوئی مانتا ہی کہ ہر چیز بجائے خود خدا ہی - کسی کا خیال ہی کہ خدا تو ہی مگر وہ اسباب کا سلسلہ قائم کر کے آپ انتظامِ دنیا سے دستکش ہو بیٹھا ہی ان کے نزدیک دنیا ایک طرح کی گھڑی ہی اور خدا گھڑی ساز - جس نے اس کو بنا کر کوک دیا ہی اور گھڑی پڑی چل رہی ہی - ذات تو ذات خدا کی صفات میں اس سے بڑھ کر بیہودگی کی جاتی ہی - غرض بندوں نے اتنے خدا بنا ڈالے کہ ایک خدا کے حصّے میں پورا ایک بندہ بھی نہیں آتا - اور یہ نہ سمجھے کہ خدائے واحد کے سوائے کوئی اَور خدا بھی ہوتا تو دو باسن ایک جگہ رکھے ہوئے کھٹکھٹا اُٹھتے ہیں - ایسا تو کیا ہی کہ دو یا زیادہ خداؤں میں اختلاف نہ ہو اور اختلاف ہو تو دنیا ایک لمحہ نہیں ٹھیر سکتی -

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا   اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا اَور معبود ہوتے تو (زمین و آسمان دونوں کبھی کے) برباد ہو گئے ہوتے -

دو بادشاہ آپس میں لڑتے ہیں تو مُلک کے مُلک خاک سیاہ ہو جاتے ہیں اور خداؤں کی لڑائی تو خدا کی پناہ - پس دنیا کا ایک اسلوب پر چلا جانا صاف اس بات کی دلیل ہی کہ تمام عالم میں ایک خدا کی حکومت ہی - اقوامِ روزگار میں دوسری

(بقیہ صفحہ گزشتہ) کرتے رہنا اور (ان میں) میل جول (قائم) رکھنا اور مفسدوں کے رستے نہ چلنا اور جب موسیٰ ہمارے وعدے کے مطابق (کوہِ طور پر) حاضر ہوئے اور ان کا پروردگار اُن سے ہم کلام ہوا تو (موسیٰ نے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار تُو (اپنے تئیں) مجھے دکھا کہ میں تیری طرف ایک نظر دیکھوں (خدا نے) فرمایا تم ہم کو ہرگز نہ دیکھ سکو گے مگر ہاں (ایسا ہی شوق ہی تو سامنے اس) پہاڑ پر نظر کرو (کہ ہم اسپر جلوہ فرما ہوں گے) پس اگر (یہ پہاڑ) اپنی جگہ ٹھیرا رہا تو (جاننا کہ تم ہم کو (بھی) دیکھ سکو گے پھر جب ان کا پروردگار پہاڑ پر جلوہ فرما ہوا تو اُس کو چکنا چور کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑے پھر جب ہوش میں آئے تو (بول) اُٹھے کہ اے پروردگار تیری ذات پاک ہی میں (نے جو دیکھنے کی بے جا درخواست کی تھی) تیری جناب میں (اس سے) توبہ کرتا ہوں اور (تجھ پر) ایمان لانے والوں میں پہلا ایمان لانے والا بندہ میں ہوں ۱۲

توموں میں خدا کے بارے میں جیسے کچھ خیالات رکھتی ہوں وہ جانیں اور اُن کی عقلیں۔مگر مسلمانوں کے ہاں جیسی فلٹر توحید تھی ویسی ہی اُنھوں نے عملاً اُس کو مکدّر کر دیا ہی۔ مثال کے طور پر ایک رزق ہی کا معاملہ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ فرماتا ہی۔

وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا — زمین میں جس قدر جان دار چیزیں ہیں سب کا رزق اللہ نے اپنے ذمے لے رکھا ہی۔

اور دوسری جگہ فرماتا ہی۔

یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ — جس کو چاہتا ہی زیادہ روزی دیتا ہی اور جس کو چاہتا ہی کم۔

تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جان دار کے رزق کی تحریری ذمہ داری کر لی ہی۔اِس سے بڑھ کر اَور وثیقہ کیا ہو سکتا ہی۔مگر سوال ہو سکتا ہی کہ کتنے دل رزق کی طرف سے مطمئن ہیں اِس واسطے کہ خدا کا وعدہ ہی شاید لاکھوں میں ایسا ایک کا بھی دل نہیں۔ہاں اگر ہم میں کوئی نوکری پیشہ ہی وہ رزق کی طرف سے مطمئن ہی۔اِس واسطے کہ اس کی نوکری لگی ہی۔یا اِس واسطے کہ اِس نے امتحان پاس کر کے نوکری کے لیے استحقاق ثابت کیا ہی۔اور کوئی حاکم اِس کو زبان دے چکا ہی کہ جب کوئی جگہ خالی ہو گی میں تمھاری پرورش کروں گا۔یا اِس کے پاس دوسرے وسائل ہیں جو اِس کو کبھی نہ کبھی نوکری کرا چھوڑیں گے۔اگر تجارت پیشہ ہی وہ مطمئن ہی کہ اُس کی تجارت چل رہی ہی اور فائدے کی توقع ہی۔اگر کاشتکار ہی وہ پیداوار کے بھروسے پر اُدھار کھا رہا ہی۔غرض ہر شخص کو خدا کے وعدے سے قطع نظر کر کے کچھ نہ کچھ وجہ تسلّی ضرور ہی۔بات وہی ہوتی ہی مگر ذرا سا سمجھ کا پھیر آدمی کو خدا سے بے تعلق کر دیتا ہی یعنی ایمان جاتا رہتا ہی۔نوکری کرو۔تجارت کرو۔کاشتکاری کرو جو تمھارے جی میں آئے کرو مگر یہ سمجھو کہ اصل میں رازق وہ ہی وہ چاہے تو بدون اِن حیلوں کے بھی دے ؎

انچہ نصیب است بہم مے رسد — ورنہ ستانی بہ ستم مے رسد

خدا چھپر پھاڑ کر دیتا ہی اور وہ نہ چاہے تو ایک نہیں ہزار حیلے کریں پھر بھوکے کے بھوکے ؎

گر زمیں را بآسماں دوزی — نہ دہندت زیادہ از روزی

مگر عادتِ الٰہی چونکہ یوں ہی ہی کہ ہم کو معاش کے لیے کچھ نہ کچھ حیلہ کرنا ضرور ہی

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ — بلا شُبہہ اللہ کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا۔

کا خیال ٹھیک رکھنا ہی تو کام رکھتا ہی۔ورنہ مومن اور کافر بلکہ انسان اور حیوان میں کچھ بھی فرق نہیں۔اگر ہم تدبیر اور اسبابِ ظاہر پر اعتمادِ کلّی کر بیٹھیں جیسا کہ افسوس ہی کہ ہم کر بیٹھے ہیں تو اس اعتماد کے سوائے اِسکے اَور کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اپنے زعم میں خدا سے اُس کے اختیارات چھین کر اُن چیزوں کو دیدیئے ہیں جو اُن اختیارات کے اہل نہیں۔اور ہم نہیں سمجھتے کہ یہ شرک نہیں تو کیا ہی۔بُت پرستی نہیں تو کیا ہی اور کفر نہیں تو کیا ہی مولانا فرماتے ہیں کہ اگر اِس بارے میں میری رائے سخت ہی اور تشدّد بے جا کرتا ہوں تو از برائے خدا مجھ کو ان شائع کا معاملہ سمجھاؤ۔اختلافاتِ سُنّی و شیعہ

حنفی شافعی وغیرہ سے قطع نظر کرو تو مسلمانوں کے دو بڑے گروہ ہیں ایک بے چارے ہم لوگ کلمہ گو ارباب ظاہر
جو پیری و مریدی کے سلسلے میں نہیں ہیں ہماری موٹی سمجھ تو یہ ہے کہ خدا کو اپنے بندوں کی معاش و معاد کی اصلاح
کے لیئے جو جو ہدایتیں صادر کرنی منظور تھیں وقتاً فوقتاً پیغمبر صاحبؐ وحی کے ذریعے نازل ہوتی رہیں۔ جب جب
وحی نازل ہوتی پیغمبر صاحب کمال احتیاط و دیانت کے ساتھ اُس کو قلم بند کراتے جاتے یہاں تک کہ قرآن جیسا
اب موجود ہے مدوّن ہو گیا۔ اور خدا نے فرما دیا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ فرمانِ
شاہنشاہی کو ختم کر کے اُس کے آخر میں مہر لگا دی کہ آیندہ کوئی شخص اُس میں کمی و بیشی نہ کر سکے۔ چنانچہ تیرہ سو
برس گزر گئے آج تک ایک نقطے کا فرق تو پڑا نہیں۔ اور پڑے گا بھی نہیں۔ کیوں کہ خدا نے اُس کی حفاظت کا وعدہ
کر لیا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ یہ اُسی وعدے کا ایفا نہیں تو کیا ہے کہ لاکھوں مسلمانوں
کے دلوں میں اس کے زبانی یاد رکھنے کا شوق پیدا کر دیا ہے۔ ناسخین اور مترجمین کی پیری کیا چل سکتی ہے کہ اس میں
تصرف کریں۔ اگر روے زمین کے سارے قرآن معدوم ہو جائیں تو ہو جانے دو۔ مسلمانوں کے دلوں میں اگا
عن جدٍّ اس کا ایک ایک حرف کندہ ہوتا چلا آتا ہے۔ جس کو نہ آگ جلا سکتی ہے نہ پانی دھو سکتا ہے۔ ایک حافظ مرنے
نہیں پاتا کہ ایسے ایسے پانچ اور برس کے برس رمضان میں تراویح کی امامت کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سامان ہی
ایسا اکر بندھا ہے کہ یہ آوازہ الی انقراضِ دنیا پست ہونے والی نہیں ہے۔ خیر یہ تو قرآن اصل دین ہے جیسے تنۂ درخت۔ اب
رہی حدیث فقہ اور دوسرے علوم دین۔ یہ سب فروعات ہیں۔ قرآن لا یعنی قانون۔ حدیث پراسیڈیور یعنی ضابطۂ
کارروائی۔ فقہ نظائر۔ اور اسی طرح دوسرے علوم دین کے لیئے بھی کوئی مابہ المماثلت پیدا کر لیا جا سکتا ہے۔ لا۔ اور
پراسیڈیور تو تبدیل پذیر نہیں مگر نظائر کا بدلنا موقوف ہے لوگوں کی ضرورتوں کے تجدد پر اور تعجب ہے کہ جب کثرت
سے ضرورتوں کے تجدد کا زمانہ آیا نظائر کا سلسلہ لوگوں نے موقوف کر دیا۔ مولانا فرماتے ہیں ابھی دو باتیں
اور بھی ہیں کہ پیغمبر صاحب پر جو وحی نازل ہوئی آپ نے بے کم و کاست ہو بہو اُس کو لکھوا دیا۔ سنا دیا مشتہر کر دیا
فرشتے نے کہا کان میں اُنھوں نے کوٹھے پر چڑھ کر پکار دیا۔ دنیا جہان میں اس کی منادی کر دی۔ ایسی کہ وہی بات ہر ہر
مسلمان کے منہ میں بھی اور سونہ میں ہے۔ اور قیامت تک مونہ میں رہے گی بات یہ ہے کہ پیغمبر صاحب مامور تھے اور ممکن نہ تھا کہ تبلیغ وحی نہ کریں وہ خود فرماتے ہیں

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا
قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا
قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ
مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ

اے پیغمبر لوگوں کو سنا دو کہ میں تو اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ کہہ دو کہ میں تمھارے بھلے بُرے کا مالک نہیں۔ کہہ دو کہ مجھ کو اللہ کے (عذاب سے) ہرگز کوئی پناہ نہیں دے گا۔ اور نہ مجکو اُس کے سوائے کوئی ٹھکانا۔ ہاں اس کے پیام پہنچا دینے پر میں بری ہو سکتا ہوں (ورنہ نہیں)۔

پیغمبر صاحب کے اس کہنے کو دیکھو کہ میں تم کو نفع و نقصان کچھ بھی نہیں پہنچا سکتا۔ ہمارے زمانے کے مشائخ تو ایسے بنتے
ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے سب ان ہی کے ایما سے ہو رہا ہے۔ اُن کے مرید اور معتقد اُن کی تعظیم خلافِ شرع کرتے ہیں اور وہ اُن

کو جائز رکھتے ہیں۔ ان سے امیدیں لگائی جاتی ہیں اور وہ کبھی اپنا عجز ظاہر نہیں فرماتے۔ اور دوسری بات ہی عموم
اسلام وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ کہ دعوتِ اسلام شامل تھی مرد اور عورت امیر و غریب شہری اور دیہاتی مقیم
اور مسافر عالم و جاہل بلا استثنائے احدے سب پر۔ اب ان سب باتوں کو جمع کرو۔ یعنی تمام وحی کا قرآن میں مدوّن
ہونا۔ پیغمبر صاحب کا وحی کو اگرچہ وہ ان کی شان کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اخفا نہ کر سکنا۔ اسلام کا عام ہونا۔ نتیجہ کیا
نکلے گا کہ مجموع مسلمان بطور ایک کلاس کے تھے اور پیغمبر صاحب اُن کے معلّم۔ کہ وہ ساری کلاس کو ایک ہی کتاب اور ایک ہی
سبق پڑھاتے تھے تو پھر مشائخوں نے بلا تشبیہ فری میشنوں کی طرح یہ اپنا خاص گروہ کیا بنا رکھا ہے کہ ایک تعلیم ہے سینہ بسینہ
اور وہ راز ہے درمیان پیر و مرید کے۔ اگر یہ تعلیم وہی تعلیم ہے جو قرآن و حدیث و فقہ میں ہے تو اس کا اخفا کیا اور اگر اس کے
خلاف یا مغائر ہے تو بڑی مشکل پیش آئے گی اور کچھ تاویل نہ کرتے بن پڑے گی اس آیت کی

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ

اے رسول جو کچھ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے اُترا ہے سب پونہچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے حق رسالت نہ ادا کیا

کیا کوئی تعلیم ایسی بھی تھی کہ پیغمبر صاحب نے اپنے عزیزوں میں سے کسی کو یا اپنے حواریوں میں سے کسی کو اس کے لیے
خاص کیا تھا۔ ہم کو تو اس کی کوئی سند ملی نہیں۔ اور عقل بھی اس سے اِبا کرتی ہے۔ معلوم ہے کہ بڑے بڑے بزرگانِ دین طائفہ
علیہ صوفیہ میں ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں مگر افسوس ہے کہ مجکو ان کے سیکرٹ (راز) میں دخل نہیں۔ اور ایک مجکو
کیا دخل نہیں لاکھوں کروڑوں مسلمان میری طرح اس نعمت سے اگر ہو محروم ہیں اور چوں کہ اوائل کار میں اشتباہات
واقع ہو گئے کبھی ارادہ بھی نہیں ہوا کہ اس راز کو معلوم کیجیے۔ اس خدشے کے سوا جو اوپر بیان ہوا مولانا کو
دو باتیں اَور بھی کھٹکتی ہیں۔ ایک تو پیروں کی تعظیم میں اس قدر افراط کر دی ہے کہ اس کو ایک طرح کی پرستش
کہا جا سکتا ہے۔ یہ فنا فی الشیخ اور تصورِ شیخ افراط فی التعظیم نہیں تو کیا ہے اس سے بہت کم درجے کی تعظیم صحابہ پیغمبر
صاحب کی کرنی چاہتے تھے اور پیغمبر صاحب اُس کو جائز نہیں رکھتے تھے۔ اس وجہ سے کہ کسی بندے کی تعظیم بڑھاتے
بڑھاتے لوگ اُسی کو خدا اور خدا کا فرزند نہ ماننے لگیں اور اُس کی قبر کی پرستش نہ کرنے لگیں۔

اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَآئِهِمْ مَسَاجِدَ

اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔

اور نہیں تو سدِّ باب فتنہ متقاضی ہے کہ یہ شیوہ ترک کیا جائے۔ ظنوا بالمومنین خیرًا۔ ہم خواص مسلمانوں کی نسبت
بدگمانی نہیں کرتے۔ مگر وہ یہ تو فرمائیں کہ عوام مسلمان کیوں کر محترز رہ سکتے ہیں۔ ہندوؤں میں بھی جو لوگ سمجھ دار
ہیں بُت پرستی کو بُرا سمجھتے اور تاویل کرتے ہیں کہ بت صرف آثار اور علامات ہیں یادوہانی اور خیال جمانے کے لیے ممکن
ہے کہ خاص خاص آدمیوں کا ایسا ہی خیال ہو مگر عوام میں اتنی بلند پروازی اور ایسا انتقالِ ذہن کیوں ہونے لگا۔ وہ کیا
سمجھیں کہ خواص جو اکثر متبوعِ عوام ہوتے ہیں کس غرض سے بتوں کی تعظیم کرتے ہیں یوں بت پرستی ایسی جڑ پکڑ گئی کہ
کسی کے اُکھاڑے نہ اُکھڑی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی ہے

وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ رَبِّ

مجکو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے محفوظ رکھ اے پروردگار

اِنَّھُنَّ اَضۡلَلۡنَ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ
کے سبب سے بہت لوگ گمراہ ہو گئے۔

پس بتوں کی شکایت اُس وقت بھی تھی اب بھی ہی اور جب سمجھنے والوں کی سمجھ پر پتھر پڑیں تو جب تک دنیا رہے گی یہ شکایت بھی رہے گی۔ صرف پتھر یا سونے یا چاندی پیتل کی مورتوں کا نام بت نہیں۔ کوئی چیز ماسوی اللہ جس کی ایسی تعظیم کی جائے جو خدا کے ساتھ مختص ہی گو وہ کوئی فرشتہ یا کوئی پیغمبر یا اُستاد یا شیخ یا پیر ہی کیوں نہ ہو اُس کو بھی مولنا بت کہتے ہیں وہ اپنی ذات سے بت نہیں ہی مگر جو اُس کی خدا کی سی تعظیم کرے جو خدا کی طرح اُس کو حاجت روا سمجھے اُس کا وہی بت ہی اگرچہ مولنا کو لوگوں کے احتساب کا کوئی حق نہیں۔ مگر ظاہر حال کیا بتا رہا ہی یہی بتا رہا ہی کہ جو حاجتیں انسان کو لاحق ہوتی ہیں ان سب کو اُن ہی زندہ یا مردہ فقیروں کے حضور میں پیش کیا جاتا ہی پیش کرنے والوں کے دل میں جو کچھ ہو مگر دیکھنے والا یہی سمجھتا ہی کہ اُن کو حاجت روا نہ سمجھتے تو حاجت لے کر کیوں آتے۔ بعینہٖ دنیا کے حاکموں کی سی مثال ہی کہ گنوار سے گنوار بھی حاکم اور اُس کے اہل کار بیشی میں فرق کرتا ہی۔ خوب جانتا ہی کہ اہل کار حاکم نہیں اس پر بھی رشوت سے خوشامد سے خدمت سے حاضر باشی سے اہل کار کو رضامند کرنا چاہتا ہی اور اُس کو یقین ہی کہ وہ اہل کار اُس کی کار برآری کر سکتا یا کرا سکتا ہی اگر ایسا اور اتنا خیال بھی خدا کے بارے میں ہو تو مولنا اُس کو بُت پرستی کہیں گے۔ خدا حاکمانِ دنیا کی طرح غافل نہیں بے خبر نہیں۔

لَا تَاۡخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّ لَا نَوۡمٌ
خدا اُونگھتا اور سوتا نہیں

یُجِیۡرُ وَ لَا یُجَارُ عَلَیۡہِ
وہ پناہ دیتا ہی اور کوئی اُس کے مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔

اِسلام کے احکام پر ایک اجمالی نظر ڈالیے کہ مسجدیں سادہ نہ اُن میں کوئی تصویر نہ مورت بلکہ زیب و زینت اور نقش و نگار بھی ایجاد مابعد ہی۔ اور دیواروں پر جو کلمہ یا درود یا آیاتِ قرآنی لکھ دیا کرتے ہیں فقہا اُس کو بھی نادرست لکھتے ہیں پھر نہ گاویں نہ ڈھول ہی نہ ناقوس ہیں نہ گھنٹے ہیں نری قرأت وہ بھی لئے نہ ہو گٹکری نہ ہو راگ نہ ہو۔ غرض داخلِ نماز اور خارجِ نماز کوئی چیز نہیں کہ صارفِ توجہ ہو۔ یہ ایک شانِ عبادت ہی اور عبادت ایسی ہونی چاہیئے۔ اور ایک شان وہ ہی جو ہم بزرگانِ دین کے مزاروں پر دیکھتے ہیں۔

مولنا فرماتے ہیں کہ میں بہت بزرگوں کے عرسوں میں شریک ہوا ہوں تو کیا دیکھا کہ ٹھوس چاندی کے چوبوں پر زربفت کا شامیانہ تنا ہی۔ قبر پر قیمتی اور پُرتکلف غلاف ہیں۔ تو بتو پھولوں کے انبار لگے ہیں۔ اگر کی بتیاں روشن ہیں۔ بیرونِ گنبد خدّام درگاہ مثل چوبداران شاہی صف بستہ کھڑے ہیں۔ مزار شریف کے روبرو مشائخ سرنگوں اور مؤدب بیٹھے ہیں جیسے اراکینِ سلطنت۔ پائین حلقہ میں رنڈیاں کھڑی مجرا کر رہی ہیں اور کہیں شرع کی زیادہ پابندی ہی تو قوالوں کا طائفہ ہی۔ ایک خوش رو خوش گلو لڑکا غزل گا رہا ہی۔

شرابِ لعل کش و روے مہ جبیناں بیں
خلافِ مذہب آناں جمالِ ایناں بیں

ٹپا۔ اور ٹھمری اور ہولی اور دادرا اور دیس اور بہاگ اور بھیرویں اور پیلو جتنے راگ اور راگنیاں ہیں اپنے اپنے وقت پر گائی جا رہی ہیں۔ وجد کی حالت میں کوئی حضرت کھڑے ہو جاتے ہیں تو ساری محفل کو اُن کی تعظیم کے لئے کھڑا رہنا پڑتا ہی۔ اب اس شان کو اُس سیدھی سادی مہذب باوقار متین شانِ نماز کے ساتھ ملا کر دیکھو اور آپ ہی اپنے دل میں فیصلہ

اکر لو - یہی وہ زیارتِ قبور ہی جس کی نسبت پیغمبر صاحب فرما گئے ہیں -

کُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ اَلَا فَزُورُوهَا — میں تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا کرتا تھا اور اب اُن کی زیارت کیا کرو کیوں کہ قبروں کی زیارت دنیا سے بے دلی اور آخرت کی طرف

فَاِنَّهَا تُزَهِّدُ عَنِ الدُّنْيَا وَتُرَغِّبُ فِي الْاٰخِرَةِ — رغبت پیدا کراتی ہی -

یہی وہ زیارتِ قبور ہی جس کے اجر و ثواب کی امید کی جاتی ہی ؟ یہی وہ زیارتِ قبور ہی جس سے خدا کی عظمت اور بے نیازی دنیا کی بے ثباتی انسان کی گو وہ کیسا ہی بندۂ مقرب و مقبول کیوں نہ ہو عاجزی اور بے اختیاری کا خیال تازہ ہوتا ہی -

بدنیا گر کسے پایندہ بودے — ابو القاسم محمدؐ زندہ بودے

یہ تھا وہ فتنہ جو پیغمبر صاحب کو پہلے سے دکھائی دے رہا تھا اور اسی کے انسداد کے لیے فرمایا کیے -

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُّعْبَدُ — اے اللہ میری قبر کو بُت نہ بنا یو کہ لوگ اُس کی پرستش کریں -

اِسی کے انسداد کے لیے قبروں کو اونچا کرنے پکّا بنانے کی ممانعت کی تھی ؟

مولانا فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی دنیا کو اتنا تباہ نہیں کیا جتنا دین کو - ہر ایک فرقہ جادۂ استقامت سے منحرف ہو گیا ہی - فساوات سب میں ہیں مگر مجکو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہی کہ اسلام کو کسی فرقے کی خرابی نے اتنا نقصان نہیں پونہچایا جتنا کہ اس فرقۂ مشائخ کی خرابی نے - علمار بھی اِس الزام سے بری نہیں مگر اُنھوں نے اَور طرح کی خرابیاں ڈالی ہیں - شرائع تو ہمیشہ بدلتی چلی آئی ہیں - وہ کچھ بڑی بات نہیں - اِسلام کا بڑا فخر یہ ہی کہ اُس نے آبِ حیاتِ توحید کو فاٹر (صاف) کر کے اُس میں کسی طرح کی آمیزش نہیں رہنے دی - اب دیکھنا یہ ہی کہ فرقۂ مشائخ نے توحید کے ساتھ کیا سلوک کیا - انا الحق اور ہمہ اوست وانا العرب بلاعین اور انا احمد بلامیم

احمد کو ہم نے جان رکھا ہی وہی احد — مذہب کچھ اَور ہو گا کسی بو الفضول کا -

من آں وقت کردم خدا را سجود — کہ ذات و صفاتِ خدا ہم نبود

یہ اَور اِس قسم کی بہت آوازیں کہاں سے پیدا ہوئیں - اسی فرقۂ مشائخ سے - پیشوایانِ مذہب یعنی پیرانِ طریقت کی تعظیم میں اِتنی افراط کہ اُس میں اور عبادت میں فرق کرنا مشکل ہی کہاں سے نکلی اِسی فرقۂ مشائخ سے - الفاظ کے مدلولِ ظاہر کو کس نے بدلا کہ شراب سے مراد ہی شرابِ وحدت - ساقی سے شیخ - جام سے دل وغیرہ وغیرہ اِسی فرقۂ مشائخ نے - غرض غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ مسلمانوں نے عملاً مشرکوں کی کوئی ادا نہ چھوڑی جس کی نقل نہ کی ہو - الا ماشاء اللہ وقلیلٌ ماہم -

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ — اور اکثر لوگوں کا حال یہ ہی کہ خدا کو مانتے ہیں اور شرک بھی کرتے جاتے ہیں -

اِس کو ہر شخص اپنے اپنے گریبان میں سر ڈال کر دیکھ لے اور سمجھ لے معاملہ خدا کے ساتھ ہی -

عذرت ار پیش می رود بارا — با خداوند غیب داں نہ رود

خدا کے بارے میں اسلامی عقیدہ ایسا سیدھا اور صاف ہی کہ اُس سے زیادہ سیدھا اور صاف عقیدہ ہو نہیں سکتا -

اسلام مخلوقات سے خدا کی ذات و صفات کا پتا چلاتا ہی اور یہی وہ رستہ ہی جسے مُوصِل الی المطلوب کہہ سکتے ہیں
مخلوقات سے ہم کو اتنا پتا چلتا ہی کہ کارخانۂ عالم کا بنانے والا اور سنبھالنے والا کوئی ہی اور وہ کوئی ان چیزوں میں
سے نہیں جن کو ہم معلوم کر سکتے ہیں - بس سوائے اِس کے ہم خدا کی ذات کے بارے میں اَور کچھ نہیں کہہ سکتے اور
عقل انسانی کی رسائی یہیں تک ہی -

پس خدا پر ایمان لانے کے یہ معنی ہوئے کہ وہ ہی اور ہمیشہ سے ہی اور ہمیشہ کو رہے گا - وہ کسی سے نہیں پیدا
ہوا اور نہ کوئی اُس سے پیدا ہوا - یعنی نہ کوئی اُس کا باپ نہ کوئی اُس کا بیٹا بیٹی - کارخانۂ عالم کا بنانے والا اور سنبھالنے
والا وہی ہی - اُس کی ذات میں تمام وہ صفاتِ کمال جو اُس کے اسمائے صفاتی سے ظاہر ہوتی ہیں موجود ہیں -
اور جس طرح اُس کی ذات ازلی ابدی ہی اُس کی صفات بھی ازلی ابدی ہیں - کارخانۂ عالم میں جو چھوٹے سے
چھوٹے اور بڑے سے بڑے تغیرات ہوتے ہیں وہ اُسی کے علم اور ارادے اور قدرت سے ہوتے ہیں وہ ظاہر
اور پوشیدہ سب کچھ جانتا ہی اُس کی کسی صفت میں کسی مخلوق کا ساجھا نہیں وہ اپنی ذات سے اکیلا ہی - خدا کے لیے
ایک ہونا شرطِ ضروری ہی - اگر اُس کی ذات یا صفات میں کوئی اَور شریک ہو تو ایسا خدا خدا ہونے کی صلاحیت نہیں
رکھتا - شرکت اگر ہوگی تو خود خدا میں کسی طرح کا ضعف ہوگا جس کی تلافی شرک سے کی جاتی ہی اور ضعف کا نام آیا
اور خدائی گئی گزری ہوئی -

خدایا جہاں بادشاہی تراست | زما خدمت آید خدائی تراست
پناہِ بلندی و پستی توئی | ہمہ نیستند انچہ ہستی توئی
ہمہ آفریدست بالا و پست | توئی آفرینندۂ ہر چہ ہست
توئی برترین دانش آموز پاک | زدانش قلم راند بر لوحِ خاک
چو شد حجتت بر خدائی درست | خرد داد بر تو گواہی نخست
خرد را تو روشن بصر کردۂ | چراغ ہدایت تو بر کردۂ
توئی کاسماں را برافراختی | زمیں را گزرگاہِ او ساختی
توئی کافریدی ز یک قطرہ آب | گہرہائے روشن تر از آفتاب
تو آوردی از لطف جوہر پدید | بجوہر فروشاں تو دادی کلید
جواہر تو بخشی دلِ سنگ را | تو بر روئے جوہر کشی رنگ را
نبارد ہوا تا نہ گوئی ببار | زمیں نا ورد تا نہ گوئی بیار
جہاں را بدیں خوبی آراستی | بروں زانکہ یاریگری خواستی
ز گرمی و سردی و از خشک و تر | سرشتی باندازہ در یک دگر
چناں برکشیدی و بستی نگار | کہ بہ زاں نیارد خرد در شمار

چناں بستی ایں طاق نیلوفری / کہ اندیشہ را نیست زو برتری

مہندس بسے جوید از رازِ شاں / نداند کہ چوں کردی آغازِ شاں

نباید زما جز نظر کردنی / دگر خفتنے باز یا خوردنی

زباں تازہ کردن باقرارِ تو / نینگیختن علت از کارِ تو

حسابے کزیں بگذرد گمرہی ست / ز رازِ تو اندیشہ بے آگہی ست

بہر چہ آفریدی و بستی طراز / نیازت نہ اے از ہمہ بے نیاز

چناں آفریدی زمین و زماں / ہماں گردشِ انجم و آسماں

کہ چنداں کہ اندیشہ گردد بلند / سیر خود بروں ناوری زیں کمند

نبود آفرینش تو بودی خدائے / نباشد ہمہ ہم تو باشی بجائے

نہ خلوت گزیدی کافرینش نبود / نہ چوں کردہ شد بر تو زحمت فزود

ز تعظیم تو پیش تو ہست نیست / اگر باشد و گر نہ باشد یکے ست

نہ پرگندہ تا فراہم شوی / نہ افزودہ نیز تا کم شوی

کواکب تو بربستی افلاک را / بہ مردم تو آراستی خاک را

توئی گوہر آمائے چار آخشیج / مسلسل کن گوہراں در مزیج

حصارِ فلک برکشیدی بلند / در و کردی اندیشہ را شہر بند

خرد تا ابد در نیارد ترا / کہ تابِ خرد بر نتابد ترا

وجودِ تو از حضرتِ تنگ بار / کند پیکِ اندیشہ را سنگسار

خیالِ نظر خالی از راہِ تو / ز گردندگی دور درگاہِ تو

سرے کز تو گردد بلندی گرائے / بافگندنِ کس نیفتد ز پائے

کسے را کہ قہرِ تو از سر فگند / بپامردیِ کس نگردد بلند

ہمہ زیر دستیم و فرماں پذیر / توئی یاوری دہ توئی دستگیر

اگر پائے پیل ست وگر پرِ مور / بہر یک تو دادی ضعیفی و زور

چو نیرو فرستی ز تقدیر پاک / ز مورے بہ مارے برآری ہلاک

چو برداری از رہ گزر دو را / خورد پشۂ مغزِ نمرود را

چو در لشکرِ دشمن آری رحیل / بمرغاں کشی فیل و اصحابِ فیل

گہ از نطفۂ نیک بختے دہی / گہ از استخوانے درختے دہی

گہ آری خلیلے ز بت خانہ / کنی آشنائے ز بیگانہ

گہے با چناں گوہرِ خانہ خیز
چو بوطالبے را کنی سنگ ریز
کرا زہرہ آن کہ از بیمِ تو
کشاید زباں جز بہ تسلیمِ تو

رسالت کیا شے ہے اور رسولوں کے تشریف لانے کی ضرورت

مولانا فرماتے ہیں کہ رسالت بھی اسرارِ الٰہی میں سے ہے جس کو خدا نے اپنی ذات
وصفات کی طرح بنی آدم سے اِس قدر مخفی رکھا ہے کہ عقل کے سوا کسی دوسری
چیز کو اس میں دخل نہیں - کیوں کہ رسالت کا تعلق بھی خدا کی صفات میں جا کر منتہی ہوتا ہے - اور جس عقل سے خدا کی صفات
پہچانی جاتی ہیں اُسی عقل سے رسالت کی تصدیق ہوتی ہے - پس خدا کی صفات اور اُس کی ذات کی طرح رسالت کی حقیقت
کو بھی عقل کی روشنی سے دیکھنا چاہیے جتنا بھی دیکھا جا سکے - جس طرح مخلوقات کو دیکھ کر مولانا نے خالق کو ڈھونڈ نکالا جو صرف
ہماری کوتاہ نظری کی وجہ سے مخفی تھا اسی طرح مولانا نے بیرونی علامات اور امارات سے پیغمبروں کو پہچان لیا کہ سچے پیغمبر ہیں
امارات اور علامات سے اصل چیز کی شناخت کی طرف ذہن کا منتقل ہونا بھی عقل کے بغیر نہیں ہو سکتا - اسی لیے مولانا نے
فطرت کو اصلی ثبوت سمجھا اور امارات اور علامات کو ثبوتِ مؤید - پھر ثبوت کا قوی یا ضعیف ہونا موقوف ہے مؤیدات
کی کثرت اور قلت پر - رسالت کے ثبوتِ مؤید تو بہت کچھ ہیں لیکن مولانا کے نزدیک تمام ثبوتوں سے قوی تر اور ضروری تر
ثبوت فطرۃ ہے اور شاید یہ اکیلا پیغمبروں کی رسالت کے ثابت کرنے کے لیے بس کرتا ہے - اس ثبوت سے مولانا کی مراد
ہے پیغمبروں کی تعلیم و تلقین کہ اُنھوں نے کس رستے پر اُمت کو چلانا چاہا - ہم یہ بات آگے چل کر دکھلائیں گے - یہاں
صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ پیغمبروں کے تشریف لانے یا اُن کے مبعوث ہونے کی ضرورت کیوں در پیش ہوئی -

چوں کہ انسان میں نیک و بد کا شعور بھی فطری ہے یعنی جس چیز سے اُس کو ایذا ہوئی آدمی نے اُس کو بالطبع
اپنے حق میں اور ہمدردی کے قاعدے سے دوسروں کے حق میں بھی بُرا سمجھا - اِس نیک و بد کو نیک و بد کہیے یا حسن و قبح
پس سیاست جو امن کے قائم رکھنے کے لیے درکار تھی افعال کے حُسن و قبح کے فطری احساس سے پوری ہو گئی
دنیا میں جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی امن دیکھنے میں آتا ہے اُس کا اکثر حصہ ہمدردی اور احساسِ حسن و قبحِ افعال کا طفیل ہے
توضیحِ مطلب کے لیے ذیل کی چند سطریں غالباً بالکل کافی ہوں گی -

آدمی ایک خاص طرح کا مخلوق ہے - کثیر العلائق - اس کی بناوٹ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ آرائش نہ بھی
سہی زندگی کی سیدھی سادی ضرورتیں اپنے بہت سے ہم جنسوں کی مدد کے بغیر بہم نہیں پہنچا سکتا - ایک ظریف کا
مقولہ ہے کہ جینا تو جینا مرنا بھی بے دوسروں کی مدد کے نہیں ہو سکتا - اور اسی لیے آدمی تھوڑے تھوڑے بہت بہت
جمع ہو کر قصبوں اور شہروں میں بستے ہیں تاکہ ایک دوسرے کی مدد کریں - اور کرتے ہیں - موچی جوتا بناتا جولاہا کپڑا بنتا - درزی سیتا
اور اسی طرح ہر یکے را بہرِ کارے ساختند - جو جس کام میں لگا ہے ابنائے جنس کی کوئی نہ کوئی خدمت کر رہا ہے اور اس اعتبار
سے ہر فردِ بشر خادم بھی ہے اور مخدوم بھی ہے - مگر چوں کہ سب کو جینا ہے - شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن - اور جینا ہے تو جینے کے
ساتھ ضرورتیں اور حاجتیں بھی سب ہی کے پیچھے لگی ہیں اور چوں کہ سارے آدم زاد ایک ہی طرح کے مخلوق ہیں ضرورتیں اور
حاجتیں بھی سب کی قریب قریب ایک ہی طرح کی ہیں تو اکثر ضرورتوں اور حاجتوں کی کشمکش میں آدمی

آپس میں لڑنے جھگڑنے بھی لگتے ہیں اور لڑائی جھگڑا ابھی تُو تُو مَیں مَیں تک ہو تو خیر باتوں باتوں میں خون خرابے تک کی نوبت پونہچ جاتی ہے۔ آخر بزرگوں نے دیکھا کہ یہی حالت رہی تو ایک دن یہ سب کٹ مریں گے اور آدم کی نسل معدوم ہو جائے گی ناچار سلطنت کا دستور نکالا۔ اور اپنے میں سے ایک کو سب کا سردھرا یعنی بادشاہ بنا کر اُس کو خدمت سپرد کی کہ اپنی رعایا میں سے کسی کو دوسرے کے حقوق میں دست اندازی نہ کرنے دے اور لوگ امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کریں اور طوعاً کرہاً سب اِس کا حکم مانیں۔ کچھ شک نہیں کہ اس انتظام سے زور وظلم کا بہت کچھ انسداد ہوا۔ مگر اس انتظام میں کئی نقص بھی تھے اور ہیں جو امن کو جیسا چاہیئے قائم نہیں ہونے دیتے۔ اول تو وقت کا بادشاہ جو امن قائم رکھنے والا ہے وہ بھی آدمیوں میں کا ایک آدمی ہے اور حرص اور طمع اور خودغرضی اور غصہ کہ اکثر ایسی ہی باتوں سے فساد پیدا ہوتا ہے۔ یہ سب بلائیں اس پر مسلط ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خود اُسی کی ذات سے امن میں بڑے بڑے رخنے پڑ جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کہتے ہیں اکیلا سورما چنا بھاڑ کو تو نہیں پھوڑ سکتا۔ رعایا میں امن قائم رکھنے کے لیئے بادشاہ کو چاہیئیں اعوان و انصار یعنی عملے فعلے لاؤ لشکر اور پھر بھی وہ آدمی ہوں گے اور اپنی اغراض کو دخل دے کر نئے نئے فساد کھڑے کریں گے اور یہی کچہریوں اور عدالتوں میں ہو رہا ہے۔ غرض اس ظاہری سلطنت کے انتظام سے لوگوں میں کامل امن و امان کے قائم رکھنے کی توقع کرنی فضول ہے ع او خویشتن گم است کرا رہبری کند۔ بااین ہمہ منصف مزاج اور خدا ترس بادشاہوں نے بہتیرا کچھ کیا ہے اور اب بھی بہتیرا کچھ کر رہے ہیں اور اس لیئے وہ ہماری شکر گزاری کے مستحق ہیں۔

بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا انتظام حکام وقت کرتے ہیں اور جرموں کا انسداد جتنا کچھ بھی ہے اُن کے قوانین کی وجہ سے ہے کہ قانون کے ڈر سے کوئی کسی طرح کی زیادتی نہیں کرتا۔ اور کرتا ہے تو اُس کو زیادتی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ مولنا فرماتے ہیں کہ ہم کو بھی اس سے انکار نہیں مگر ہمارا کہنا یہ ہے کہ ایک چھٹانک انتظام حکام وقت کا قانون کرتا ہے تو اس کے مقابلے میں مَن بھر بلکہ زیادہ قانون الٰہی کرتا ہے جس کا دوسرا نام ہے شریعت یا دین یا مذہب۔ اس لیئے کہ اول تو حاکم وقت کا قانون نقل ہے قانون الٰہی کی اور نقل بھی ہے ناقص و ناتمام۔ کجا حاکم وقت اور کجا خدائے تعالیٰ۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ حاکم وقت کیسا ہی بیدار مغز اور با اقتدار ہو پھر بھی بندہ بشر ہے مرکب من الخطاء والنسیان۔ اور اُس کا اختیار بھی محدود ہے۔ کیا آدمی اور کیا اُس کا قانون۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جرموں کا وقوع اس طرح پر ہوتا ہے کہ مجرم پہلے جرم کا ارادہ کرتا ہے پھر جس فعل کا ارادہ کرتا ہے اُس کو کر گزرتا ہے تو ارادے تک حاکم دنیا اس کا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لیئے کہ اس کو لوگوں کے دلی ارادے کا علم نہیں ہو سکتا۔ ہاں وقوع جرم کے بعد وہ اختیار رکھتا ہے کہ مجرم کو سزا دے۔ غرض جرم کا ارادہ قانون دنیا کی رُو سے جرم نہیں۔ لیکن قانون الٰہی میں جرم کا ارادہ کرنا بھی جرم ہے۔

وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ
أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ

اور (لوگو!) جو تمہارے دلوں میں ہے اگر اُس کو ظاہر کرو یا اُس کو چھپاؤ
اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔

اور ظاہر ہے کہ ارادہ اصل ہے اور فعل اُس کی فرع تو نتیجہ کیا نکلا کہ قانون الٰہی جرموں کو جڑ سے اُکھاڑتا ہے۔ اور حاکم وقت کا قانون

دُرموں کی جڑ پر تو دست رس نہیں رکھتا ٹہنیوں اور پتوں کو کاٹتا چھانٹتا رہتا ہے۔ بدی کی جڑ بدستور قائم ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ قانونِ الہی باطن اور ظاہر دونوں کی اصلاح کرتا ہے حاکمِ وقت کا قانون فقط ظاہر کی۔ حکامِ وقت کے قانون میں اس کے سوا ایک نقص اور ہے کہ اس قانون میں ثبوتِ جرم کا مدار شہادت پر ہے اور شہادت نہ ہو یا ہو اور کافی نہ ہو تو مجرم سزا سے بچ جاتا ہے اور ایسی صورتیں ہر حاکم کے اجلاس میں روزمرہ پیش آتی رہتی ہیں۔ بخلاف اس کے قانونِ الہی کا مجرم سزا سے بچ ہی نہیں سکتا۔ نفسِ لوّامہ کا مجسٹریٹ مجرم کے دل میں بیٹھا ہوا اُس کو ندامت اور ملامت اور حسرت اور افسوس کی سزا دے رہا ہے جس کی سزا قید اور جرمانے اور تازیانے سے بڑھ کر ہے۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا انتظام جہاں تک اُس کو آدمی سے تعلق ہے ہمدردی اور احساسِ حسن و قبحِ افعال کو اُس میں بہت بڑا دخل ہے۔ ہمدردی کہنے کو ایک مختصر سا لفظ ہے مگر اس میں دیوانی فوجداری وغیرہ یعنی فقہ کے تمام ضوابط اور قوانین اور احکام داخل ہیں۔ واضعِ قانون کیا کرتا ہے کہ مثلاً چوری کی نسبت اُس کو قانون بنانا ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ مثلاً زید میرے گھر میں چوری کرے تو اُس کے اس فعل سے مجھے راحت پونہچے گی یا تکلیف۔ اس کا دل اندر سے بولتا ہے کہ تکلیف۔ اب وہ ہمدردی کی بنا پر خیال کرتا ہے کہ جیسا شہر میں ویسے بشر ایک ڈھمک فلاں و بہماں سب۔ جیسا احساسِ تکلیف مجکو ویسا اُن کو۔ پس وہ چوری کو قیاسًا علی نفسہٖ جرم قرار دیتا ہے۔ اب وہ سوچتا ہے کہ چوری سے امن میں خلل پڑتا ہے۔ اس کا انسداد ہو تو کیونکر ہو۔ پس وہ چوری کی سزا تجویز کرتا ہے کہ چور سزا کے ڈر سے پھر ایسی حرکت نہ کرے۔ اور دوسروں کو بھی عبرت ہو۔ اور یہی حال ہے تمام مسائلِ فقہی کا۔ اوامر کا۔ نواہی کا۔ تمام افعال مستحقِ اجر اور مستوجبِ عقاب کا ہمدردی اور احساسِ حسن و قبحِ افعال کا خیال بقائے روح کے خیال کے ساتھ مل کر ایک بڑے ضروری خیالِ عاقبت کو ہماری فطرۃ کی حد میں لے آتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو دنیا کیا ہے ایک جملہ ہے ناتمام جس میں مبتدا کی خبر نہیں شرط کی جزا نہیں۔

مولانا نے سچ فرمایا ہے کہ علت و معلول اور اسباب و نتائج کا جیسا قاعدہ موجودات میں ویسا آدمی کے افعال میں موجودات میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ نقضِ قاعدہ کبھی نہیں ہوتا۔ آدمی کے افعال میں قاعدے کا عمل درآمد یکسانی کے ساتھ کیوں نہیں۔ ہر بدکرداری۔ ہر نافرمانی۔ ہر سرتابی پر سزائے عاجل اسی زندگی میں کیوں مترتب نہیں ہوتی آدمی جب یہ باتیں سوچتا ہے تو بقائے روح کا خیال اُس کو متنبہ کرتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ علت و معلول اور اسباب و نتائج کا قاعدہ تو صرف لزومِ علت و معلول کو ظاہر کرتا ہے کہ سبب پایا جائے گا تو اُس کا نتیجہ لازمی ضرور ہو کر رہے گا سو یہ ہو تو اور او پر ہو تو۔ اور چونکہ آدمی مرنے سے معدوم نہیں ہوتا اور مرے پیچھے بھی اُس کی روح باقی رہتی ہے اور بقائے روح بھی ایک طرح کی زندگی ہے تو گو دنیا کی زندگی میں مجرم کو نتیجۂ بد پیش نہ آیا۔ بقائے روح کی زندگی میں پیش آکر رہے گا۔ مگر پیش آکر رہے گا ضرور۔ اور وہاں کا نتیجہ یعنی سزا یا عذاب (خدا اُس سے محفوظ رکھے) دنیا کے نتیجۂ بد سے زیادہ موذی ہوگا۔

وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ([illegible] ع ۱)

اور آخرت کا عذاب تو (دنیا کے عذاب سے) کہیں بڑھ کر ہے۔ اے کاش (اس زمانے کے کافر) سمجھتے ہوتے۔

مولٰنا فرماتے ہیں کہ دیکھو معمارِ فطرت حسب ترتیب ذیل مذہب کی عمارت کو کس طرح درجہ بدرجہ بناتا ہے۔
(۱) معرفتِ الٰہی (۲) عبادت (۳) رضاجوئی (۴) ہمدردی (۵) احساسِ حسن و قبح (۶) جزا سزا (۷) عاقبت۔
انسان کو خدا کا بڑا ہی احسان ماننا چاہیئے کہ اُس نے آدمی کو جب کہ وہ جانوروں جتنی عقل بھی نہیں رکھتا تھا قطعہ

مرغک ز بیضہ بروں آید و روزی طلبد | آدمی زادہ ندارد خرد و عقل و تمیز
آں بنا گاہ کسے گشت و بہ چیزے نہ رسید | ویں بہ تمکین و فضیلت بہ گزشت از ہمہ چیز

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

اور (لوگو!) اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا (اور اُس وقت) تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور تم کو کان دیئے اور آنکھیں (دیں) اور دل (دیئے) تاکہ تم (اُس کا) شکر کرو۔

مطلب یہ ہے کہ جب پیدا ہوتے وقت تم بے شعور تھے تو اِسی سے معلوم ہوا کہ تم اپنے ارادے سے نہیں پیدا ہوئے غرض خدا نے محض اپنی مہربانی سے آدمی کو جب کہ وہ جانوروں جتنی عقل بھی نہیں رکھتا تھا تعلیم کے لیئے اُستادِ فطرت کے حوالے کیا۔ فطرت نے اُس کو ایسی مفید اور نافع تعلیم دی جس سے دنیا اور آخرت دونوں میں آدمی کا بیڑا پار ہوگیا۔ اور اُس کو کسی کی منت نہ اُٹھانی پڑی۔ اب ذرا تھوڑی دیر کے لیئے پھر عمارت کے ضلع میں آؤ کہ معمارِ فطرت نے مذہب کی عمارت تو بنا کھڑی کی جس میں کسی طرح کی کور کسر نہیں۔ مگر اس نگہداشت کا انتظام بھی ضرور ہے۔ کہتے ہیں کہ جس مکان میں چالیس دن جھاڑو نہ دی جائے رات کے وقت چراغ نہ جلے اُس کی لیپ پوت نہ ہوتی رہے۔ پڑے پڑے کھنڈر ہو جاتا ہے۔ تو خدا جس کو ہر طرح پر انسان کی پرداخت منظور تھی اُس کے مذہب کی عمارت کو درست رکھنے کے لیئے پیغمبروں کو بھیجتا رہا۔ خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں کے معتقدات خدا کے بارے میں اس قدر بیہودہ ہوگئے تھے کہ اُن کی وجہ سے نظامِ عالم میں فتور واقع ہو چلا تھا۔ اِن غلطیوں کی اصلاح کے لیئے خدا نے پیغمبروں کو وقتاً فوقتاً بھیجا۔ وقتاً فوقتاً سے مطلب یہ ہے کہ جب سے انسان تبھی سے فطرت۔ تبھی سے مذہب۔ تبھی سے پیغمبر۔

تمام انسان اور پیغمبروں کی فطرت جنسیت کے اعتبار سے یکساں ہے مگر نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہے

مولٰنا فرماتے ہیں کہ اگرچہ پیغمبر اِن خدا آدمی تو ہیں مگر ہم جیسے نہیں پیغمبروں کی فطرت دوسری طرح کی ہے ہماری فطرت سے متغایر یعنی جنسیت کے اعتبار سے تو ہماری اور پیغمبروں کی فطرت یکساں ہے قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ[۱]۔ مگر نوعیت کے اعتبار سے مختلف۔ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ[۲]۔ قواعدِ فطری سب آدمیوں میں بلا استثنائے احدے یکساں ہیں۔ مگر افراط تفریط اور اعتدالِ قویٰ کی رو سے لوگوں کے مدارج متفاوت ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مبدأ فیاض نے حافظہ سب آدمیوں کے سروں میں رکھا ہے۔ مگر کسی کا حافظہ قوی ہے۔ کسی کا ضعیف۔ کسی کا بدرجہ متوسط۔ اور اسی پر دوسرے قویٰ کو قیاس کر لو۔ اس کو ایک مثال سے خوب سمجھو گے۔

[۱] (اے پیغمبر تم ان لوگوں سے) کہو کہ میں (بھی) تم ہی جیسا بشر ہوں ۱۲ [۲] مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود بس (وہی) ایک معبود ہے ۱۲

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ
زَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی
بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (الرعد)

اور زمین میں پاس پاس کئی (کئی) قطعے (ہوتے) ہیں اور انگور کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے درخت (جن میں بعض) دو شاخے (ہوتے ہیں) اور بعض دو شاخے نہیں (ہوتے) حال آں کہ سب کو ایک ہی پانی دیا جاتا ہے اور (پھر بھی) ہم بعض کو بعض پر پھلوں میں برتری دیتے ہیں۔ بے شک جو لوگ عقل کو کام میں لاتے ہیں اُن کے لیئے اِن باتوں میں (قدرتِ خدا کی بہتیری ہی) نشانیاں (موجود) ہیں۔

ایک درخت میں ایک قسم کے سیکڑوں ہزاروں پھل لگتے ہیں اُن میں سے معدودے چند ہر طرح سے عمدہ ہوتے ہیں۔ کہ کوئی پھل اُن کو نہیں پاتا۔ یہی حال پیغمبروں کا ہی کہ اُن میں بھی سب بشری خواص موجود ہوتے ہیں مگر درجۂ توسط میں اور معتدل اور پیغمبروں کے معصوم ہونے کے بھی یہی معنی ہیں کہ اُن کے قُویٰ میں نہ افراط ہوتی ہی کہ اُن کے زور کو دبایا جائے اور نہ تفریط کہ اُن کو زور دیا جائے یعنی

خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَاطُهَا — بہترین امور بیچ کی راس کے کام ہیں

کی رُو سے وہ انسانِ کامل ہوتے ہیں اور اسی اعتدالِ قویٰ کی وجہ سے خدا اُن کو خدمتِ رسالت کے لیئے منتخب فرماتا ہی کہ اپنا نمونہ دکھا کر دوسرے لوگوں کی فطری قوتوں کو اعتدال پر لانے کی کوشش کریں تاکہ لوگوں میں قویٰ فطری کے افراط و تفریط کی رُو سے کسی طرح کی کش مکش واقع نہ ہو جس سے نقضِ امن لازم آئے۔ یہ ہی پیغمبروں کے بھیجنے کی اصلی غرض۔

صداقتِ پیغمبران مولٰنا فرماتے ہیں چوں کہ نورِ فطرت خداداد ہی۔ اور اس میں دونوں طرح کی قابلیت ہی۔ تعلیم و تربیت اور مشق و مہارت سے اس میں زیادہ چمک آسکتی ہی۔ اور اگر اس کی طرف سے غفلت کی جائے اور اس کی خبر نہ لی جائے تو ماند پڑ جاتا ہی۔ مگر ٹمٹماتا رہتا ہی۔ وعظ و نصیحت کی ہوا لگی اور بھڑک اُٹھا۔ باوجودے کہ اس زمانۂ فساد میں صداقت کا تھرمامیٹر گرا ہوا ہی اور جھوٹ بہت چل پڑا ہی۔ بااین ہمہ عدالتوں میں گواہوں کے حلفی بیان اسی بنا پر مقبول ہوتے ہیں کہ راستی اور حق گوئی انسان کی فطرت ہی۔ اور وہ گواہ کو سچ کے کہنے پر مجبور کرتی ہی۔ یوں شاید ایک گواہ قسم کھا کر جھوٹ بول بھی دے۔ لیکن اگر وہ مسلمان ہی اور اُس سے کہا جائے کہ قرآن ہاتھ میں لے کر یا اولاد کے سر پر ہاتھ رکھ کر اور ہندو ہی تو گنگا جلی لے کر گواہی دے تو غالب ہی کہ وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔ مولٰنا فرماتے ہیں کہ پیغمبروں کی شناخت میں ہم کو انسان کی اسی فطرت سے مدد لینی چاہیئے۔ خدا نے چاہا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی صاف کھل پڑے گا۔ مولٰنا نے تو جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی طرف سے اسی طرح اطمینان حاصل کیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہی کہ مولٰنا جب مذہب کی تحقیقات کرنے بیٹھے تو چھوٹتے کے ساتھ اُنھوں نے فیصلہ کر لیا کہ "مذاہبِ مروّجہ کو ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے طوفانِ اختلاف میں حق کے دریافت کرنے کے لیئے عمرِ نوح اور صبرِ ایوب کہاں سے لاؤں گا یہ تو میرے بس کی بات نہیں۔ نہ مجھ میں اتنی لیاقت نہ مجکو اتنی فرصت" بس اُنھوں نے اپنی تحقیقات کو صرف اسلام میں محدود رکھا اور کسی

دوسرے مذہب کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی تو نہ دیکھا۔ تحقیقات کو اسلام میں محدود رکھنے کے دو سبب ہوئے ایک یہ کہ مولانا حسن اتفاق سے مسلمان گھر میں پیدا ہوئے۔ مسلمانوں میں پلے اور بڑے ہوئے۔ اسلام کے قریب قریب کل حالات اُن کو معلوم تھے۔ دوسرے مذاہب مروجہ کے مقابلے میں اسلام ہی جدید العہد تھا اور یہ بات مولانا کے ذہن میں بیٹھی ہوئی تھی کہ پُرانی باتوں میں کچھ نقص ہوتا ہی تو اُس نقص کے رفع کرنے کو نئی بات ایجاد کی جاتی ہی تو اُنھوں نے خیال کیا کہ تحقیقات کرنے سے اگر میرا دل اسلام کی طرف سے مطمئن ہو جائے تو بس میں نے حق پالیا۔ مجکو کسی دوسرے سے پوچھنے کی کچھ ضرورت نہیں میں اپنے حق سے ادا ہوا۔ اس تحقیقات میں یہ بڑی خوبی تھی کہ کسی دوسرے کو اُس میں دخل نہ تھا۔ اور یہ بات تجربے میں آچکی ہی کہ ایک فریق مقدمہ یا اُس کا وکیل اپنی چرب زبانی سے جج کو جادۂ حق سے منحرف کر دیتا ہی۔ غرض مولانا ہی اس تحقیقات میں مدعا علیہ تھے۔ اور اُن کا دل گواہ اور وہ خود ہی جج اور اس طرح پر جو فیصلہ اُنھوں نے کیا میرے نزدیک وہ فیصلہ ناطق ہی۔ جس کا اپیل نہیں۔ اور اپیل کریں تو مولانا اور اُن کو وہ فیصلہ منظور ہی اس کے سوا مولانا ہر جویائے حق کو یہی رائے دیتے ہیں کہ اگر وہ دل سے جویائے حق ہی تو تحقیقات کا یہی طریقہ اختیار کیجے جو اُنھوں نے کیا۔ ان شاء اللہ خاطر خواہ نتیجہ نکلے گا۔ مگر تحقیقات کنندہ جس مذہب کے لوگوں میں پیدا ہوا جن میں پلا اور بڑا ہوا وہ اُسی مذہب میں تحقیقات کو محدود نہ رکھے۔ اگرچہ اُس مذہب کے استحسان سے ذہن کو خالی کرنا ہی ذرا ٹیڑھی کھیر۔ مگر چاہے کوئی مولوی ہمارے مولانا پر کُفر کا فتویٰ ہی کیوں نہ لگادیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں مولانا نے تو دورانِ تحقیقات میں ایسا ہی کیا تھا۔

غرض بعض پیغمبروں کا مذکور قرآن مجید اور تورات اور انجیل اور دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں میں ہی۔ مگر پیغمبروں کا انحصار ہم کو خدا نے نہیں بتایا۔ بلکہ قرآن میں ایک جگہ یہ بھی آیا ہی۔

مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ

اُن میں سے (بعض) ایسے ہیں۔ جن کے حالات ہم نے تم کو سنائے اور اُن میں سے (بعض) ایسے ہیں جن کے حالات ہم نے تم کو نہیں سُنائے۔

بہر کیف پیغمبروں کے ساتھ ایمان لانے کی یہ شکل ہی کہ جو معلوم ہیں وہ اور جو نہیں معلوم وہ سب خدا کے بھیجے ہوئے ہیں اور دعویٔ رسالت میں سچے ہیں۔ اِن کے مدارج خدا ہی کو معلوم ہیں۔ ہم اپنی طرف سے کسی کو فاضل اور مفضول نہیں کہہ سکتے۔ مجرّد پیغمبر کا ہونا ہی شرفِ بشر کے لیئے کافی ہی۔ دوسری بات پیغمبروں پر ایمان لانے کی یہ ہی کہ وہ بھی بندے ہیں مگر مقبول بندے اور بارگاہِ الٰہی کے مقرب۔ اُن کو خدا کے اختیارات میں بھی کچھ دخل نہیں یہاں تک کہ اُن کا اپنا نفع و ضرر بھی اُن کے اختیار میں نہ تھا۔

قُلْ لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوٓءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَّبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ

(اے پیغمبر لوگوں سے) کہو کہ میرا اپنا ذاتی نفع و نقصان بھی میرے اختیار میں نہیں۔ (میں تمہیں کیا بتاؤں) مگر (وہی ہو کر رہتا ہی) جو خدا چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو اپنا بہت سا فائدہ کر لیتا اور مجکو کسی طرح کا گزند [illegible] پہنچتا میں تو اُن لوگوں کو جو ایمان لانا چاہتے ہیں (دوزخ کا) ڈرا اور (بہشت کی) خوش خبری سنانے والا ہوں اور بس۔

نہ وہ اپنے اختیار سے معجزہ دکھا سکتے تھے اور نہ اپنے اختیار سے وحی اُتار سکتے تھے۔

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ۝ يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ۔

اور کسی رسول کی طاقت نہ تھی کہ بے حکمِ خدا کوئی معجزہ لا دکھائے ہر ایک وقتِ (موعود) کے لیئے (ہمارے ہاں) ایک قسم کی تحریر (ہوتی) ہے (پھر اُس میں سے) خدا جس کو چاہتا ہے منسوخ کر دیتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے اور اُس کے پاس اصل کتاب (یعنی لوحِ محفوظ موجود) ہے۔

منصبِ رسالت متوارث نہیں۔ خدا تعالیٰ جس کو اس امانت کے قابل سمجھتا ہے اُس کو منصبِ رسالت سے سرفراز فرماتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے باپ بت تراش تھے اور ابراہیم علیہ السلام اپنی ذات سے بڑے پکے موحد اور موحدوں کی پیشوا۔ نوح علیہ السلام کا بیٹا اِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ہونے کی وجہ سے طوفان میں غرق کر دیا گیا اور نوح علیہ السلام نے بتقاضائے شفقتِ پدری اُس کے حق میں دعا کرنی چاہی تو اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا۔ سوائے اس کے کہ پیغمبروں پر وحی نازل ہوتی ہے اور وہ تبلیغِ وحی میں کسی طرح کی خطا نہیں کر سکتے باقی تمام خواصِ بشری اُن میں موجود ہوتے ہیں اور اس سے اُن کی شانِ رسالت میں کسی طرح کا ضعف لازم نہیں آتا۔ الغرض رسالت ایک مرتبہ ہے بین العباد و بین اللہ۔ خدا سے فروتر اور تمام بندوں سے برتر۔ یہاں تک کہ فرشتوں سے بھی۔ کیوں کہ فرشتوں کو خدا نے نقائصِ بشری سے محفوظ پیدا کیا ہے اور اُن کی طبائع میں تقاضائے بدی فطرۃً نہیں ہوتا خواصِ بشری رکھ کر بدی پر غالب آنا تعریف کی بات ہے۔ فرشتوں کی معصومیت اضطراری ہے نہ پیغمبروں کی طرح اختیاری۔

غرض پیغمبروں کی تعداد ہم کو نہیں بتائی گئی۔ خدا جانے کتنے پیغمبر آئے اور آئے تو کیا حکم خاص یعنی شریعت لے کر کس وقت اور کن لوگوں کی طرف آئے۔ بات یہ ہے کہ بنی آدم کی حالت کو ثبات نہیں کہ شروع سے تمام روئے زمین کے آدمیوں کی ایک ہی حالت چلی آئی ہو تاریخ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آب و ہوا اور وقتی اور مقامی خصوصیتوں کے اختلاف کی وجہ سے لوگوں کی حالتیں بھی مختلف ہوتی رہی ہیں۔ کسی جگہ ایک زمانے میں لڑائی بھڑائی کے چرچے رہے ہیں تو دوسرے وقت شعر شاعری کے۔ بعض لوگ شاندار عمارتوں کے دلدادہ رہے ہیں کتنے حسن پرستی کے۔ چوری رہزنی ڈکیتی کم تولنا کم ناپنا۔ ابھی تک بھی دنیا اُن جرائم سے پاک نہیں۔ غرض حضرت آدم کی اولاد ایسی بے چین اور چلبلی اولاد ہے کہ اُن کا کوئی وقت فساد سے محفوظ نہیں رہا ہے۔ ایسی ہی بداعمالیوں کی روک تھام کے لیئے لوگوں کی مناسبِ حالت خدا وقتاً فوقتاً پیغمبروں کو بھیجتا رہا ہے آدمی جسم و روح دو چیزوں سے مرکب ہے تو اُس کے امراض اور علاج بھی دو طرح کے ہیں طب کی کتابیں امراضِ جسمانی کا علاج کرتی ہیں اور مذہبی کتابیں امراضِ روحانی کا۔ جالینوس طبیب الابدان تو پیغمبر طبیب الارواح۔ ہاں پیغمبروں کے ساتھ ایمان لانے میں ایک بات یہ بھی داخل ہے کہ آدم علیہ السلام سب سے پہلے پیغمبر تھے اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخری پیغمبر خاتم النبیین۔

خدا اور رسول کا تعلق

مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن کی سورۂ بقرہ میں ایک آیت ہے

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً

اللہ کسی مثال کے بیان کرنے سے (ذرا بھی) نہیں جھینپتا (چاہے وہ مثال)

فَمَا فَوْقَهَا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

مچھر کی ہو یا اُس سے بھی بڑھ کر (کسی اَور حقیر چیز کی) سو جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ تو یقین رکھتے ہیں کہ یہ (مثال بالکل ٹھیک ہے (اور یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ) اُن کے پروردگار (ہی) کی طرف سے (ہے) اور جو منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اِس (ذلیل) مثال کے بیان کرنے میں خدا کی کون سی غرض (اٹکی پڑی) تھی ایسی ہی مثال سے خدا بہتیروں کو گمراہ کرتا اور ایسی ہی مثال سے بہتیروں کو ہدایت دیتا ہے لیکن اس سے گمراہ کرتا (بھی) ہے (تو) بدکاروں ہی کو جو پکا کیے پیچھے خدا کا عہد توڑ دیتے اور جن (تعلقات) کے جوڑے رکھنے کو خدا نے فرمایا اُن کو قطع کرتے اور مُلک میں فساد پھیلاتے ہیں یہی لوگ آخرِ کار نقصان اُٹھائیں گے۔

اِس کی شانِ نزول مفسروں نے یوں لکھی ہے کہ جب آیہ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـــًٔـا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝

لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے تو اُس کو کان لگا کر سنو کہ خدا کے سوا جن (معبودوں) کو تم پکارتے ہو ایک مکھی (بھی) پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ اُس کے (پیدا کرنے کے) لیے (سب کے سب) اکٹھے (ہی کیوں نہ) ہو جائیں اور اگر مکھی اُن سے کچھ چھین لے جائے تو اُس کو اُس سے چھڑا نہیں سکتے۔ (کیسے) بودے یہ (بُت) جو (مکھی کے) پیچھے پڑیں (اور اس کو نہ پکڑ سکیں اور) کیسی بودی وہ (بیچاری مکھی) جس کا پیچھا کیا جائے (اور پھر بھی ہاتھ نہ آئے)

نازل ہوئی تو کفار نے طعن کیا کہ مسلمانوں کا خدا بھی کیسا خدا ہے اونچی دوکان پھیکا پکوان خدائی وعوے اور مکھی جیسی حقیر اور قابلِ نفرت چیز کا مذکور ہم کو تو مکھی کا نام لیتے ہوئے بھی گھن آتی ہے۔ اس طعن کے جواب میں آیہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ الخ نازل ہوئی جواب کا حاصل یہ ہے کہ مُمثّل بہ کیسی ہی ادنیٰ چیز ہو مثال کے نتیجے کو دیکھنا اور اُس سے پند پذیر ہونا چاہیئے۔

مرد باید کہ گیرد اندر گوش ورنبشت ست پند بر دیوار

اِس روایت کی بِنا پر مولانا خدا اور رسول کے باہمی تعلق کو حکامِ دنیا کی مثال دے کر سمجھانا چاہتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ہمارے وقتوں میں ہندوستان کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ تو اُنھوں نے کیا کیا ہے کہ جتنے کام بہ تعلقِ حکومت کرنے پڑتے ہیں سب کے قسم وار صیغے بنا رکھے ہیں۔ ایک فوجی صیغہ ہے۔ ایک مُلکی پھر مُلکی میں مال دیوانی فوجداری پولس تعلیم۔ ڈاک۔ آبپاشی۔ تعمیرات وغیرہ بہت سے صیغے ہیں اور ہر صیغہ ایک محکمہ جداگانہ۔ مثال کی تکمیل کے لیے مولانا ایک محکمہ مال کو لیتے ہیں۔ جس میں تحصیلِ خراج کا کام ہوتا ہے۔ یہ محکمہ تحصیل دار سے شروع ہو کر گورنر جنرل پر جا کر منتہی ہوتا ہے۔ اس طرح پر کہ پرگنہ کا محصّل تحصیلدار پھر کئی پرگنوں یعنی ضلع کا کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر پھر کئی ضلعوں یعنی قسمت کا کمشنر۔ پھر کئی قسمتوں کا یعنی صوبے کا بورڈ یا فنانشل کمشنر غرض کہ یہی حال کام کے ہر ایک صیغے کا ہے۔ پھر اور سب صیغوں

کا جامع صوبے کا گورنر یا لفٹننٹ گورنر یا چیف کمشنر کہلاتا ہی - اور ہندوستان کے صوبوں کے تمام صیغوں کا سب سے بڑا حاکم گورنر جنرل جسے ہندوستانی ریاستوں کے تعلق سے وایسرائے یعنی شہنشاہ کا نائب بھی کہتے ہیں - انتظام کے اِس سلسلے سے مولانا دو باتیں استنباط کرتے ہیں - ایک یہ کہ وحدت کے بدون کثرت انتظام نہیں پا سکتی - اور اِسی سے اُن کو خدا کی وحدانیت کا قائل ہونا پڑتا ہی خیر یہ تو جملہ معترضہ ہی - دوسری بات جو حکام انگریزی کے انتظام میں دیکھی جاتی ہی یہ ہی کہ یوں تو ہر حاکم کے ہاتھ تلے سررشتہ دار یا اہلکار پیشی ہوتا ہی اور وہی احکام وغیرہ لکھتا پڑھتا ہی مگر کمشنر تک لکھا پڑھی حاکم کے نام سے ہوتی ہی - کمشنر سے اونچے درجے کے حکام کی خط و کتابت اُن کے علوِ مرتبہ کے لحاظ سے اُن کا سکرٹری اپنے نام سے کرتا ہی جس کو عوام جو انگریزی نہیں جانتے سکتّر کہتے ہیں - سکتّر بھی اپنے افسر کے ہاتھ تلے کا سررشتہ دار ہی گو وہ اپنے نام سے خط و کتابت کرے مگر حقیقت میں وہ خط و کتابت اُس کے افسر کی ہی جس کا وہ سکتّر ہی - چوں کہ سکتّر اپنے افسر کا مزاج شناس ہوتا ہی کبھی وہ چھوٹی اور معمولی باتوں میں بے پوچھے بھی حکم جاری کرتا ہی - اور اُس کا وہ حکم افسر کے حکم کی طرح واجب التعمیل ہوتا ہی - چوں کہ مولانا دنیا ہی کی باتوں سے دین کی باتوں کا پتا لگاتے ہیں اِس لیے خدا اور رسول کے تعلق کو بھی ویسا ہی سمجھا ہی جیسا مثلاً وایسرائے اور اُس کے سکتّر میں ہوا کرتا ہی اور یوں قرآن اور حدیث دونوں چیزیں اپنے اپنے ٹھکانے سے بیٹھ گئیں - آپ نے اس بات سے سمجھ لیا ہوگا کہ رسول کا ادب متفرع ہی خدا کے ادب پر یعنی رسول کا ادب عین خدا کا ادب ہی - مگر خدا کا ادب اظہارِ عبودیت سے ہوتا ہی اور رسول کا اُن کے حکم کی بجا آوری سے - پھر حکم کبھی امر و نہی کے صاف لفظوں میں ہوتا ہی - کبھی حکم پر چلنے والوں کی مدح اور سرتابی کرنے والوں کی مذمت کے پیرائے میں کبھی اُممِ ماضیہ میں سے کسی امت کا حال بیان کیا جاتا ہی کہ اُن کو ایک حکم دیا گیا اُنھوں نے نہ مانا اُن پر عذاب نازل ہوا - کبھی وعدۂ اجر اور وعیدِ عذاب سے اظہارِ امر و نہی کیا جاتا ہی اور حکم کی ایک شان یہ بھی ہی کہ جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم تقربِ رسالت کی وجہ سے خدا کے ادا شناس اور مزاج داں اور دوسرے بندوں کی طرح مامور بھی تھے اُن کا قول و فعل بھی خدا ہی کا حکم سمجھا جائے گا - گو قرآن میں اُس امرِ خاص کی صراحۃً نہ ہو - مثلاً خدا نے مطلق زکوٰۃ کا حکم دیا نصاب کی تعیین اور مقدارِ زکوٰۃ اور حولِ کامل کا گزرنا یہ باتیں لوگوں کو رسول خدا کے عمل سے معلوم ہوئیں اور یہی حال ہی ارکانِ نماز اور ارکانِ حج کا - اس اعتبار سے حدیث کو قرآن کا ضمیمہ اور تتمّہ ماننا ہوگا - اس کی مثال بھی دنیا کی چیزوں ہی سے لیجیے - وہ یہ کہ انگریزوں کے انتظامِ مُلک داری میں مثلاً فوجداری کا ایک قانون ہی جس کا نام ہی **مجموعۂ قوانینِ تعزیراتِ ہند** - اس قانون میں ہر ایک جرم کی تعریف ہی - اور اُس کی انتہائی سزا لیکن اتنے سے کام نہیں چل سکتا تو اجرائے کار کے لیے ضابطۂ فوجداری بنانا پڑا - اور تعزیراتِ ہند اور ضابطہ دونوں مل کر فوجداری کا مکمّل قانون بن گیا - پس جو نسبت ضابطۂ فوجداری کو تعزیراتِ ہند سے ہی - ویسی ہی نسبت حدیث کو قرآن سے ہی - وجہ یہ ہی کہ جناب رسالت مآب کو خدا نے عقلِ صائب اور رسا اور آخر بین عطا فرمائی تھی اور وہ سنت اللہ کو خوب سمجھے ہوئے تھے -

جنابِ محمد پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت

اب ہم کو یہ دکھانا مقصود ہی کہ مولانا نے پیغمبر صاحبِ اسلام کی صداقت کو فطرت کی کسوٹی پر کیوں کر آزمایا - وہ اِس طرح آزمایا کہ پیغمبر صاحب کا زمانہ

کچھ ایسا دُور نہیں جیسے اہل کتاب کے اور پیغمبروں کا۔ اِن کے وقت کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ اگرچہ تاریخیں افراط تفریط سے محفوظ نہیں اور محفوظ ہو بھی نہیں سکتیں تاہم ایسی باتیں بھی ڈھونڈنے سے مِل جاتی ہیں جو مجمع علیہ ہیں

پھر مولٰنا نے سوچا کہ جیسا تناسُب آدمی کے اعضاء میں ویسا ہی تناسب اُس کے افعال میں یعنی انسان کے عضاء میں ایک طرح کی نسبت پائی جاتی ہے کہ سر اتنا بڑا ہاتھ پاؤں اس قدر لمبے قد اتنا اونچا علٰی ہذا القیاس ناک گردن اُنگلیاں سینہ کوئی عضو بے جوڑ نہیں۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ فَمَا یُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ۝ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ ۝

ہم نے اِنسان کو بہتر سے بہتر ساخت کا پیدا کیا پھر ہم اُس کو (بوڑھا کر کے) کم تر سے کم تر مخلوق کے درجے میں لوٹا لائے مگر جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل (بھی) کیے (اُن کو تنزّلِ پیری سے تنگ دل نہ ہونا چاہیئے کیوں کہ) اُن کے لیے (آخرت میں) اجر ہے بے انتہا تو (اے پیغمبر اب) کون ہے جو (اِن سب باتوں کے معلوم کیے) پیچھے (روزِ جزا کے بارے میں تم کو جھوٹا سمجھے کیا خدا سب حاکموں سے بڑا حاکم (اور قدرت والا) نہیں ہے (تو منکرین قیامت اُس سے کیوں نہیں ڈرتے)

اِس تناسُب کو لوگوں نے خیال کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر اتنا تو ہے۔ مثلاً آدمی کا قد تا چنبرِ گردن اُس کی اپنی بالشت سے آٹھ بالشت اور تا کاسہ سر دس بالشت اور اگر آدمی دونوں ہاتھ پھیلا دے تو ایک ہاتھ کی بیچ کی اُنگلی سے دوسرے ہاتھ کی بیچ کی اُنگلی تک کا فاصلہ بھی اُس کی دس بالشت۔ اسی طرح کا تناسب کُل اعضاء میں ہے۔ کوتہ گردن تنگ پیشانی۔ حرام زادے (شریر مفسد) کی یہی نشانی ہے۔

کُلُّ طَوِیْلٍ اَحْمَقُ اِلَّا عُمَرُ
کُلُّ قَصِیْرٍ فِتْنَةٌ اِلَّا عَلِیٌّ

عمرؓ کے سوائے جو لمبے قد کا ہوگا بے وقوف ہوگا۔ اور علیؓ کے سوائے جو پست قد ہوگا شریر ہوگا۔

مولٰنا فرماتے ہیں خصائصِ فطری کے اعتبار سے انگریزوں کی ولایت کے عجائب خانوں میں ظالموں اور خدا پرستوں اور بخیلوں وغیرہ کی بہت سی کھوپریاں جمع ہیں اور کھوپریوں کی ساخت سے نتیجے مستنبط کیے گئے ہیں۔ خیر یہ تو ایک بات ہے جو انگریزی اخباروں میں نظر پڑی ہے۔ اِسی قبیل سے ایک حکایت یہ ہے کہ کابل کی پہلی مہم میں جس میں امیر دوست محمد خاں کو انگریز پکڑ لائے تھے اور اُس کے جواب میں امیر دوست محمد خاں کے فرزند محمد اکبر خاں نے انگریزی فوج کے افسروں اور اُن کی میموں کو قید کر لیا تھا اس مہم میں آگرے کے لالہ جوتی پرشاد محکمۂ رسد رسانی کے داروغہ تھے۔ مہم کے ہو چکنے پر مصارفِ جنگ کا حساب کتاب ہونے لگا تو لالہ جوتی پرشاد نے کئی کروڑ روپے کا مطالبہ سرکار کے ذمّے نکالا۔ محاسب سرکار نے اپنی رائے کے مطابق رقموں میں بہت کاٹ چھانٹ کی۔ جوتی پرشاد کو دعویٰ دائر کرنا پڑا۔ تحقیقات کے لیے کمیشن بیٹھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرکار کو رقم دینی آئی۔ مقدمے میں جوتی پرشاد کی طرف سے ایک اخبار کا اڈیٹر جو بارسٹر بھی تھا وکالت کرتا تھا۔ اُس کو خدا نے اِس بلا کا حافظہ دیا تھا کہ ہزار ہا رقمیں بقید آنہ پائی اہلِ کمیشن کے روبرو برجستہ بلا تامل بیان کرتا

چلا جاتا تھا جیسے کوئی لکھے ہوئے حساب کو پڑھتا چلا جاتا ہو اور مزہ یہ ہی کہ اُس نے حساب کو صرف ایک مرتبہ دیکھ لیا تھا اور ایک مرتبہ کے دیکھنے میں اُس کو اس قدر محفوظ ہو گیا تھا کہ کہیں غلطی نہیں کرتا تھا تمام اہلِ کمیشن اس کی قوتِ حافظہ پر متعجب تھے اخباروں میں اُس پر بڑے بڑے مضمون لکھے جانے لگے۔ آخرِ کار ڈاکٹروں نے اس کا سر اِس شرط سے مول لیا کہ اِس کے مرے پیچھے اِس کی کھوپڑی کی تشریح کریں گے کہ خلافِ معمول قوتِ حافظہ کا سبب دریافت کریں۔ اور یہی ہوا کہ اُس کا دماغ معمول سے کوئی چھٹانک سوا چھٹانک زیادہ نکلا۔ اور کاسۂ سر کی ساخت میں بھی کچھ فرق تھا ایسی ہی خبر سید احمد خاں علیہ کی نسبت بھی مشہور ہوئی تھی کہ اُنھوں نے اپنا سر بیچ دیا تھا۔ مگر یہ خبر غلط تھی لیکن اگر واقع میں اُنھوں نے اپنا سر بیچ دیا ہوتا اور اُس کی تشریح کی جاتی تو کچھ نہ کچھ فرق تو ضرور نکلتا پڑ نکلتا۔ لوگ درازیِ ریش کو بھی حمق کی دلیل بتاتے ہیں اور کسی کتاب میں ایک ہنسی کی بات بھی نظر سے گزری ہی کہ کوئی طویل اللحیہ شب کے وقت چراغ کے آگے بیٹھا ہوا کتاب دیکھ رہا تھا اتفاق سے اُس میں لکھا تھا

ریش باید دو سہ موے وز نخداں پوشے ۔۔۔ نہ کہ انبوہ وراں بچہ دہد خر گوشے

اور ایک مُشت ریش فقیہ وَمَا زَادَ عَلٰی ذٰلِکَ فَلِلسَّفِیْہِ[1] اُس شخص کو اپنی ریش کی درازی معلوم تھی۔ اُسی وقت چاہا کہ ڈاڑھی کو ایک مٹھی کی حد میں لے آئے۔ مقراض موجود نہ تھی اُس نے ڈاڑھی کو مٹھی میں پکڑ مازاد کو چراغ کی لَو پر رکھ دیا جب ہاتھ کو پونہچی گرمی اضطراراً مٹھی ہٹالی۔ ڈاڑھی بھک سے اُڑ گئی اُس نے کتاب کے حاشیے پر لکھ دیا اِنِّی عَلٰی ذٰلِکَ لَمِنَ الشَّاھِدِیْنَ[2] ہمارے ہندوستان میں کبودیِ چشم کو دلیلِ بے وفائی اور تنگیِ چشم کو دلیلِ بخل سمجھا جاتا ہی۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ "سر بڑا سردار کا پیر بڑا گنوار کا" یہ سب باتیں علمِ قیافہ کی ہیں۔ ہندو ہاتھ کی لکیروں سے عمر اور اولاد اور بیماریاں بہت سی باتیں بتایا کرتے ہیں علمِ قیافہ آدمی ہی تک محدود نہیں رہا آدمی نے بعض جانوروں کا قیافہ بھی معلوم کیا ہی۔ مثلاً گھوڑے کی بال بھونری۔ گنوتی گامچی۔ رنگت دیکھتے ہیں غرض آدمی کے اعضاء اور افعال میں باہمی تناسب اور تعلّق ہی۔ مولانا نے جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو قیافے اور تناسبِ افعال دونوں پہلوؤں سے جانچا اور تحقیقات کے بعد مولانا کو کامل اطمینان ہو گیا کہ اس قیافے اور ان اخلاق و عادات کا آدمی محالِ عقل ہی کہ نبوت کا غلط دعویٰ کرے۔ اور خدا پر جھوٹ بولے جس کی عظمت اور جس کا جلال ہمہ وقت اُس کے پیشِ نظر ہی۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ

اور اگر (پیغمبر زبردستی) کوئی بات ہمارے سر چپکتا تو ہم نے (خونیوں کی طرح) اُس کا داہنا ہاتھ پکڑ کر اُس کی گردن اُڑا دی ہوتی[ف۱] اور تم میں کوئی بھی ہم کو اُس سے روک نہ سکتا۔

اور وہ کسی حالت میں یادِ خدا سے غافل نہ ہو یہاں تک کہ ساری عمر کھِلکھلا کر نہ ہنسے۔

[1] اور ایک مٹھی سے زیادہ ہو تو بے وقوف ہی ۱۲ [2] بے شک میں اِس پر گواہ ہوں ۱۲ [ف۱] وتین ایک رگ ہی جو گردن میں ہو کر گزرتی ہی اور وہ سر اور دل کے درمیان ایک رابطہ ہی اگر اُس کو کاٹ دیا جائے تو جان نکل جاتی ہی۔ اِس آیت کے لفظی معنی تو یہ ہیں کہ "ہم نے اُس کی رگِ دل کاٹ دی ہوتی" لیکن محاورے کے لحاظ سے یہ [illegible] اختیار کرلیے ہیں ۱۲ [ف۲] جس زمانے میں سید صاحب کو سر کا خطاب ملا تھا تو بعض جاہلوں نے اور بعض متعصبوں نے اس خطاب کے یہی معنی سمجھے تھے کہ

اَلضَّحِكُ يُمِيتُ الْقَلْبَ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔

اکثر اوقات خائفانہ آسمان کی طرف دیکھا کرے۔ شدائدِ جان کنی میں اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی [۵۱] کے سوا کوئی بات اُس کے مونہ سے نہ نکلے۔ اُس پر خدا کا خوف اس قدر غالب ہو کہ راتوں کو نماز میں کھڑے کھڑے اُس کے پاؤں سوج سوج جائیں۔ یہاں تک کہ خدا اُس کی حالت پر ترس کھا کر خود

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى (اے پیغمبر) ہم نے تم پر قرآن اس لیئے تو نازل کیا نہیں کہ تم اس کی وجہ سے اس قدر) مشقت اُٹھاؤ۔ ف[۱]

اور لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ [۵۲] فرمائے اور وہ اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا (کیا میں بندۂ شکر گزار نہ ہوں) کہہ کر عبادت سے باز نہ آئے۔ جس نے ساری عمر جھوٹ نہ بولا ہو اور لعنۃ اللہ علی الکاذبین اُس کا تکیہ کلام ہو اور وہ اپنی رسالت پر سخت سے سخت قسمیں کھائے اور قسموں کو وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا [۵۳] الخ اور اسی طرح دوسری باتوں سے موکد کرے کسی کی عقل جائز رکھ سکتی ہے کہ ایسا راست باز بھول کر بھی جھوٹ رسالت کے دعوے پر اصرار کر سکتا ہے ایک یہ وَمَنْ اَظْلَمُ سے الی آخرہ ایسی بات ہے کہ شقی سے شقی آوارہ سے آوارہ بد وضع سے بد وضع بے باک سے بے باک آدمی کو اس طرح پر قسم دی جائے تو تھرا اُٹھے اور سوائے سچ کے کچھ کہتے نہ بن پڑے۔

یہ تو تناسبِ افعال سے پیغمبر صاحب کی صداقت پر استدلال ہوا۔ اب قیافے کی رُو سے استدلال کیا جاتا ہے مولانا فرماتے ہیں کہ خانۂ کعبہ چوں کہ ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا معبد ہے اور تمام عرب ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ قدیم سے سارے عرب خانۂ کعبہ کا ادب کرتے چلے آئے ہیں۔ اسلام سے پہلے بھی سال و رسال حج ہوتے تھے مگر زمانۂ جاہلیت میں کچھ بیہودہ رسمیں داخلِ حج ہو گئی تھیں۔ اسلام نے اُن کی اصلاح کر دی۔ پیغمبر صاحب نے دعوتِ اسلام شروع کی۔ تو مدینے کے چند حاجی ابتدا ہی میں اسلام لے آئے تھے۔ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کے نرغے سے نکل کر مکے سے مدینے ہجرت کر آئے تھے۔ اور اُنھوں نے حج سے لوٹ کر مدینے میں عام خبر کر دی تھی کہ مکے میں فلاں صاحب نے نبوت کا

---

[۵۱] الٰہی مجکو بلند مرتبہ ساتھیوں یعنی انبیاء اور صلحاء میں پونہچا ۱۲ ف[۱] پیغمبر صاحب پیغمبر ہوئے پیچھے اپنے نفس پر بڑی مشقت اُٹھاتے تھے۔ راتوں کو نماز میں کھڑے رہتے یہاں تک کہ آپ کے پاؤں سوج سوج جاتے تھے پھر سارا سارا دن لوگوں کے سمجھانے اور وعظ کہنے میں گزر جاتا تھا اور نومسلموں کو کافروں کی ایذاؤں سے بچانا بجائے خود بڑا کام تھا۔ غرض منصبِ نبوت کی شرائط کا ادا کرنا کچھ آسان کام نہ تھا اور پیغمبر صاحب خدمتِ رسالت کے بجالانے میں اس قدر زحمت اُٹھاتے تھے جس سے خوف ہوتا تھا کہ اُن کی تن درستی میں خلل واقع ہوگا اس لیئے خدا نے بنظرِ مزید عنایت اُن کو زحمتِ شاقہ سے روک دیا ۱۲

[۵۲] لام کا تعلق ظاہر کرنے کے لیئے اُس کے ماقبل جملے کو ملاؤ تو مطلب بآسانی سمجھ میں آئے انا فتحنا لک فتحا مبینا لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر ویتم نعمتہ علیک ویھدیک صراطا مستقیما وینصرک اللہ نصرا عزیزا یعنی (اے پیغمبر یہ حدیبیہ کی صلح کیا ہوئی) حقیقت میں ہم نے کھلم کھلا تمھاری فتح کرا دی تاکہ (تم اس فتح کے شکریے میں دینِ حق کی ترقی کے لیئے اور زیادہ کوشش کرو اور) خدا (اس کے صلے میں تمھارے) اگلے اور پچھلے گناہ معاف کرے اور تم پر اپنے احسانات پورے کرے اور تم کو (دین کے) سیدھے رستے لے چلے (اور کوئی تمھارا مانع ومزاحم نہ ہو) اور خدا تمھاری زبردست مدد کرے ۱۲

[۵۳] اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون جو خدا پر جھوٹ بہتان باندھے ۱۲

دعویٰ کیا ہے۔ اور وہ لوگوں کو شرک اور بت پرستی سے پھیر کر خدائے واحد کی پرستش کی طرف بلاتے ہیں اور چوں کہ باتیں معقول کہتے ہیں ہم تو اُن پر ایمان لے آئے ہیں اور اہلِ مکہ اور خود اُن کے قبیلے کے لوگ اُن کو اور ہمارے چند اُن کے ہمراہیوں کو ناحق ناروا طرح طرح کی ایذائیں دے رہے ہیں اور ہم نے اُن سے عہد و پیمان کر لیا ہے کہ اگر آپ مدینے تشریف لے آئیں تو ہم ہر طرح آپ کی حمایت کریں گے۔ چناں چہ وہ صبح و شام آنے ہی والے ہیں۔ غرض آنے سے پہلے مدینے کے لوگ حضرت کی تشریف آوری کے منتظر تھے جس دن آنے کو ہوئے سارا مدینہ مسلمان استقبال کے لیے اور نامسلم دیکھنے کے شوق میں باہر نکل کھڑے ہوئے۔ عبداللہ بن سلام جن کی نسبت پیغمبر صاحب نے فرمایا کہ اِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ [۹۱]۔ اور جن کے بارے میں قرآن کی یہ آیت اُتری وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ [۹۲]۔ روایت کرتے ہیں کہ میں اُس وقت تک اسلام نہیں لایا تھا اور مدینے کے باہر اپنے باغ میں درختوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ وہیں میں نے پیغمبر صاحب کا آنا سنا میں بھی دیکھنے دوڑا تو پیغمبر صاحب اونٹنی سے اُتر کر ابوایوب انصاری کے گھر میں بیٹھ چکے تھے میں نے پیغمبر صاحب کو دیر تک بغور دیکھا اور میں اُن کا دعویِ نبوت تو سُن ہی چکا تھا بے قصد میری زبان سے نکلا وَاللّٰهِ مَا هٰذَا الْوَجْهُ كَذَّابٍ [۹۳]

در دلِ ہر قوم کش از حق مزہ است　　روئے آوازِ پیمبر معجزہ است

پس مولانا نے اگرچہ عبداللہ بن سلام کی طرح پیغمبر صاحب کو دیکھا نہیں مگر اُن کا حلیہ اُن کا سراپا۔ اُن کی کتابوں میں دیکھا جو شمائل پر لکھی گئی ہیں۔ مزید احتیاط کے لیے مولانا نے پیغمبر صاحب کے سراپا کو قیافے کی کتابوں سے ملایا تو سارا سراپا محاسنِ اخلاق پر دلالت کرتا تھا۔ اس موقع پر مولانا فرماتے ہیں کہ وائے کاش میں نے پیغمبر صاحب کو دیکھا ہوتا مگر ایسے نصیب کہاں تھے۔ یا اب خواب میں ایک نظر دیکھ لوں کیوں کہ حدیث میں آیا ہے۔

مَنْ رَاٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَاٰنِیْ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَتَمَثَّلُ بِیْ (رواہ البخاری)

پیغمبر صاحب نے فرمایا کہ جس نے مجھکو (یعنی میرے حلیے اور سراپا کو) خواب میں دیکھا درحقیقت اُس نے مجھ ہی کو دیکھا کیوں کہ شیطان میری صورت بن کر خواب میں نہیں آتا۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

تاہم قیافے کی بات تو کچھ ایسی مہتم بالشان بات نہ تھی کہ مولانا نے اُس کو پیغمبر صاحب کی صداقت کا ثبوت سمجھا ہو بلکہ من جملہ مؤیدات کے ایک مؤید۔ بڑی بات تو تناسبِ افعال ہے کہ فطرت افعال میں بے مناسبتی ہونے نہیں دیتی۔ اَلْعَادَةُ كَالطَّبِيْعَةِ الثَّانِيَةِ [۹۴]۔ تو مولانا نے پیغمبر صاحب کے خصائل اور عادات اور اخلاق اُن کی زندگی کے واقعاتِ روزمرہ سے اخذ کیے جیسے بھی کتابوں میں مرقوم ہیں بے شک اِن میں ایسی باتیں بھی ہیں جن پر ایک غیر مذہب والا جو پہلے سے پیغمبر صاحب کی طرف سے بدظن ہے نکتہ چینی کر سکتا ہے مگر پھر بھی مجموعی حالات ایک خالی الذہن آدمی کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہیں۔ کہ پیغمبر صاحب معتدل اور سلیم فطرۃ کے فردِ اکمل تھے۔

[۹۱] بے شک یہ شخص جنتیوں میں سے ہے ۱۲ [۹۲] اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے گواہی دی ۱۲ [۹۳] بخدا یہ شان و صورۃ جھوٹے مونہ کی نہیں ہے ۱۲ [۹۴]

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝ (اے پیغمبر) بے شک تمہارے اخلاق البتہ بڑے (اعلیٰ درجے کے) ہیں

اور اُن میں فطرتِ سلیم کا ملکہ ایسا راسخ تھا کہ وہ اُس کے خلاف کر نہیں سکتے تھے اور اسی کو مولنا پیغمبر کہتے ہیں خیر اور اخلاق کو تو رہنے دیجیے صرف صدق کو لیجیے جس کی اس وقت بحث ہی مولنا فرماتے ہیں قاعدہ کُلیہ ہی کہ آدمی کے تمام افعال معلّل بالاغراض ہوتے ہیں۔ یعنی آدمی کے ہر ایک فعل کا محرِّک اور سبب کوئی نہ کوئی مطلب ہوتا ہی۔ اور وہ مطلب دو قسم سے خالی نہیں لالچ یا خوف۔ سو لالچ اور خوف دونوں کئی طرح کے ہیں۔ لالچ ہی دولت کا۔ لالچ ہی سلطنت اور لوازمِ سلطنت یعنی حکومت اور برتری اور ترفّع اور تفضیل کا۔ لالچ ہی انتقام کا۔ علیٰ ہٰذا القیاس خوف بھی طرح طرح کے ہو سکتے ہیں منفعت حاصلہ کے فوت ہو جانے کا خوف۔ بدنامی کا خوف۔ یا مجمل طور پر کہنا چاہو تو لالچ ہی فائدے کا اور خوف ہی نقصان کا۔ چوں کہ ہر ایک آدمی کے خاص اغراض ہوتے ہیں اس لیے فائدے اور نقصان کی صورتوں اور قسموں کو ہم محصور نہیں کر سکتے۔ لیکن جہاں تک پیغمبر صاحب کی اغراض پر نظر احاطہ کر سکتی ہی اُن کا لالچ اور خوف اگر ہوتا تو ان ہی صورتوں میں سے کسی صورت میں ہوتا جو مولنا نے گنوائیں۔ لیکن اُن حضرت کے حالات پکارے کہہ رہے ہیں کہ اگر بالفرض اُنھوں نے جھوٹ مُوٹ نبوت کا دعویٰ کیا تو کوئی محرِّک اُن کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ پس اذا فات الشرط فات المشروط۔ جب شرط ہی نہیں تو مشروط کہاں" کی رو سے جھوٹے دعویِ نبوت کرنا غلط یعنی صداقت "ثابت۔

ایک تاریخی واقعہ جس سے کسی نے انکار نہیں کیا اور نہ اُس میں انکار کی گنجایش ہی ذیل میں نقل کیا جاتا ہی جس سے ثابت ہوتا ہی کہ تخویف و تطمیع دونوں پیغمبر صاحب کے حق میں بے اثر محض تھیں۔ جب پیغمبر صاحب مبعوث ہوئے اور قرآن مجید اُترنا شروع ہوا تو آپ نے سب سے پہلے اپنے خاندان کے لوگوں کو تبلیغ کی اور جب دیکھا کہ آپ کے وعظ و نصیحت کا ان پر کچھ اثر نہیں پڑتا تو حرم کعبہ میں تشریف لا کر اُس پتّھر پر کھڑے ہوئے جو آپ کے جدِّ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نصب کیا تھا اور بآواز بلند فرمایا۔ اے گروہِ قریش میں تم کو خدا کی توحید اور اپنی رسالت کی طرف بلاتا ہوں میری بات مانو اور شرک و بت پرستی ترک کر دو۔ ایسا کرو گے تو دین و دنیا کی بادشاہت تمھیں نصیب ہو گی۔ جس کو سُن کر کفار نے ایک بڑا قہقہہ لگایا اور آپس میں لگے کہنے کہ محمد کو جنون ہو گیا ہی۔ پیغمبر صاحب موقع بموقع وعظ فرماتے اور رات دن توحید خداوندی کی منادی کرتے تھے مگر کفار ہر موقع پر آپ سے استہزا کرتے اور توہین و تذلیل میں کوئی بات اُٹھا نہ رکھتے۔ کچھ دنوں تک آپ نے صرف توحید کے وعظ پر بس کی مگر جب دیکھا کہ منکرین بت پرستی سے باز نہیں آتے اور پتّھر مٹی کی بے جان اور عاجز مورتوں کو خدائے تعالیٰ جلّ و علا کی ذات و صفات میں شریک کیے جاتے ہیں تو آپ نے اُن کو مشرک کے ذلیل لقب سے خطاب کرنا اور اُن کے دین کو سر تا سر گمراہی و ضلالت بتانا شروع کیا۔ اس پر جہلاء قریش کو سخت طیش آیا اور اُنھوں نے آپ کے چچا ابو طالب کو کہلا بھیجا کہ اپنے بھتیجے کو روکو کہ وہ ہمارے دین کی سخت ہجو کرتا اور ہمارے آبا و اجداد کو بُرائی سے یاد کرتا ہی۔ لیکن جب ابو طالب پر اُن کے اس پیام کا کچھ اثر نہ ہوا تو چند روسائے قوم جمع ہو کر خود ابو طالب کے پاس گئے اور کہا اب تک تو ہم آپ کی بزرگی اور جلالت شان کی وجہ سے نہایت خاموشی کے ساتھ صبر و تحمل کرتے رہے مگر اس کے آگے ہم سے تحمل نہیں ہو سکتا پس یا تو محمد کو ان باتوں سے باز رکھیے یا اُسے اور ہمیں دونوں کو چھوڑ کر آپ

کنارہ کش ہو جایئے تاکہ ہم ہی غارت ہو جائیں یا وہی۔ ابوطالب نے پیغمبر صاحب کو بلا کر قریش کی اس گفتگو سے مطلع کیا اور کہا فرزندِ من! اپنی جان کو اور اپنی جان کے ساتھ مجھ بوڑھے کی جان کو ہلاکت سے بچالو۔ اور اس قدر بوجھ مجھ پر نہ ڈالو جس کی مجھکو برداشت نہ ہو۔ پیغمبر صاحب نے ابوطالب کی یہ گفتگو سن کر خیال کیا کہ شاید چچا میری حمایت سے دست بردار ہوا چاہتے ہیں۔ آپ نے نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ جواب میں فرمایا کہ چچا! اگر یہ لوگ اس امید پر کہ میں اس عظیم الشان امر کی بجا آوری سے پہلوتہی کروں گا، میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند لا رکھیں تو بھی میں اس کو ہرگز ترک نہ کروں گا۔ میں اس بات کا بیڑا اٹھا چکا ہوں کہ تاوقتیکہ خدا اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب نہ کر دے گا میں اس کوشش سے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ ابوطالب پر پیغمبر صاحب کے اس جملے نے وہ اثر کیا کہ بے اختیار ان کی زبان سے نکلا اِذْهَبْ يَا ابْنَ أَخِي فَقُلْ مَا أَحْبَبْتَ فَوَاللهِ لَا أُسْلِمُكَ لِشَيْءٍ أَبَدًا۔ یعنی میرے بھتیجے! تم جاؤ اور جو بات تم کو پسند ہو بے دھڑک کہہ گزرو۔ خدا کی قسم میں دشمنوں کے ہاتھوں میں تمھیں ہرگز نہ سونپوں گا اور ساتھ ہی ذیل کے اشعار فی البدیہہ پڑھے ۵

واللّٰه لن يصلوا اليك بجمعهم	حتى اوسّد فى التراب دفينا
فاصدع بامرك ما عليك غضاضة	وابشر وقرّ بذاك منك عيونا
ودعوتنى وزعمت انك ناصحى	ولقد صدقت وكنت ثم امينا
وعرضت دينا لا محالة انه	من خير اديان البرية دينا
لولا الملامة او حذار مسبّة	لوجدتنى سمحا بذاك مبينا

قریش کو جب معلوم ہوا کہ ابوطالب پیغمبر صاحب کی حمایت سے پہلوتہی کرنا نہیں چاہتے تو اپنی قوم کے ایک رئیس زادے مغیرہ کے پوتے ولید کے بیٹے عمارہ کو جو نہایت خوب صورت اور خوب صورت ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھا ابوطالب کے پاس لے کر حاضر ہوئے اور کہا آپ اسے متبنّٰی کر لیجیے۔ یہ آپ کے بڑھاپے میں کام آئے گا۔ اور اس کے عوض اپنے بھتیجے کو جس نے آپ کی قوم میں تفرقہ ڈال دیا ہے اور آپ کے آبا و اجداد کو احمق و بیوقوف بتاتا ہے ہمارے سپرد کر دیجیے تاکہ ہم دنیا سے اس کا جھگڑا ہی پاک کر دیں۔ ابوطالب نے اس نامعقول درخواست کا نہایت دل شکن جواب دے کر انھیں رخصت کر دیا اور یہ معلوم کر کے کہ کفار پیغمبر صاحب کے قتل پر آمادہ ہیں اپنے قبیلے اور خاندان کے لوگوں کو پیغمبر صاحب کی حمایت و نصرت پر آمادہ کیا۔ ابولہب کے سوا تمام بنی ہاشم پیغمبر صاحب کی حمایت کے لیے کھڑے ہو گئے مگر یہ لوگ تھے ہی کتنے ایک قبیلہ یا ایک خاندان ایک شہر کا تو مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہاں اتنا تو ضرور ہوا کہ پیغمبر صاحب بنی ہاشم کی حمایت کی وجہ سے چند روز تک کفار کی ایذاؤں سے محفوظ رہے مگر غریب نومسلم تو جب تک مکے میں رہے مخالفوں کی ایذاؤں

---

۵ خدا کی قسم اگر یہ سب لوگ مل کر بھی تمھیں ضرر پہنچانا چاہیں تو جب تک میں زمین میں دفن نہ ہو جاؤں تمھیں ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ تمھیں جو حکم ہوا ہے اسے کھول کر سنا دو اس میں تمھاری کچھ ذلت نہیں اور خوش ہو اور اس سے آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ تم نے مجھے اسلام کی طرف بلایا اور میں جانتا ہوں کہ تم میرے خیر خواہ ہو اور اس سے پہلے ہی تم صادق اور امین کے لقب سے پکارے جاتے ہو۔ تم نے ایسا دین پیش کیا جو مخلوق کے تمام دینوں سے یقیناً بہتر ہے۔ اگر مجھے ملامت و دشنام دہی کا خوف نہ ہوتا تو تم مجھے اپنا کھلا ہوا مددگار پاتے ۱۲

کے شکار ہی رہے - خلاصہ یہ کہ کفار نو مسلموں کو اور خود پیغمبر صاحب کو تکلیفیں پونہچانے میں حتی الامکان کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے - اور جب دیکھتے کہ درشتی اور سختی سے مدّعا حاصل نہیں ہوتا تو نرمی اور ملایمت سے کام نکالنا چاہتے تھے - چناں چہ ایک دن کا ذکر ہے کہ مغیرہ بن شعبہ جو اپنی قوم میں بڑا رئیس اور ذی وجاہت اور مالدار تھا اپنی قوم کے اشارے سے پیغمبر صاحب کے پاس آیا اور خلافِ معمول نہایت نرمی اور ملایمت اور تسلی اور دل جوئی کے ساتھ کہا میرے بھتیجے تم صاحب اوصافِ جمیلہ اور عالی خاندان ہو پھر کیا سبب ہے کہ ہمارے معبودوں کو سبّ و شتم کے ساتھ یاد کرتے ہو اور اُن کی عبادت و بندگی کی وجہ سے ہمیں بے وقوف اور پاگل بتاتے اور ہماری قوم میں تفرقہ ڈالتے ہو کیا اس سے تمہارا یہ مقصود ہے کہ کسی مالدار حسین و جمیل اور عالی خاندان عورت سے تمہاری شادی ہو جائے - ؟ اگر یہی غرض ہے تو سکے بھر میں جس عورت کو تم پسند کرو ہم ابھی اُس سے تمہاری شادی کرا دیں اور اگر مال و زر مطلوب ہے تو ہم ابھی تمہارے پاس اس قدر دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ اور اگر حکومت و سرداری کی تمنا ہے تو ہم سب لوگ تم کو اپنا سردار بلکہ بادشاہ بنا لیتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ ہم تمہاری اطاعت کے آگے اسی طرح سرِ تسلیم خم کیے رہیں گے اور تمہاری فرماں برداری بالکل اسی طرح کریں گے جس طرح ایک بڑے جلیل القدر جبّار بادشاہ کی کی جاتی ہے - اور اگر کسی بھوت پریت کا سایہ ہو گیا ہے یا جن پری کا اثر معلوم ہوتا ہے اور تم اس کے دفیعے سے عاجز ہو تو ہم سے صاف صاف کہو ہم کسی ایسے حاذق و ماہر معالج کو تمہارے واسطے تلاش کر کے لائیں گے جو تم کو تن درست کر دے گا - جب مغیرہ بن شعبہ یہ کہہ کر خاموش ہوا تو پیغمبر صاحب نے فرمایا کہ بس کہہ چکا یا کچھ اور کہنا باقی ہے مغیرہ بولا کہ اتنا ہی کہنا تھا - پیغمبر صاحب نے فرمایا کہ اچھا بیٹھ جا اور سن اور آپ نے سورۂ فصّلت[1] کی چند

---

[1] حٰمٓ ۝ تنزیلٌ من الرحمٰن الرحیم کتابٌ فصّلت اٰیاتہٗ قرآناً عربیاً لقوم یعلمون لٹ سے ماد ثمود تک ترجمہ :- حٰمٓ (یہ فرمان - خدائے) رحمٰن (و) رحیم (کے حضور) سے صادر ہوتا ہے - یہ قرآن کتاب ہے جس کی باتیں زبانِ عربی میں سمجھ دار لوگوں کے لیے تفصیل کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں (ماننے والوں کو خوشنودیِ خدا کی) خوش خبری سُناتا اور (منکروں کو عذابِ خدا سے) ڈراتا ہے اس پر (بھی) اُن میں سے اکثروں نے مونہہ موڑ لیا اور وہ (اُس کو) سنتے ہی نہیں اور (اے پیغمبر یہ لوگ یہ بھی) کہتے ہیں کہ جس بات کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو ہمارے دل تو اُس سے پردوں میں ہیں (کہ تمہاری بات دل کو نہیں لگتی) اور ہمارے کانوں میں (ایک طرح کی) گرانی ہے (کہ تم جو کہتے ہو سنائی نہیں دیتا) اور ہم میں اور تم میں (ایک طرح کا) پردہ (حائل) ہے (کہ تم ہم پر کسی طرح کا اثر نہیں ڈال سکتے) تو (اس سے بہتر ہے کہ) تم (اپنے طور پر) عمل کیے جاؤ ہم (اپنے طور پر) عمل کر رہے ہیں (اے پیغمبر تم ان لوگوں سے) کہو کہ میں (بھی) تم ہی جیسا بشر ہوں (مگر) مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود بس (وہی) ایک معبود ہے پس سیدھے اُسی کی طرف (مونہہ کیے) چلے جاؤ اور اُس سے (اپنے گناہوں کی) معافی مانگو اور شرک کرنے والوں پر افسوس جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں البتہ جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل (بھی) کیے اُن کے لیے (آخرت میں) بڑا اجر ہے جو (کبھی) موقوف ہونے والا نہیں - (اے پیغمبر تم ان لوگوں سے) کہو کیا تم اُس (قادرِ مطلق کی خدائی سے) انکار کرتے ہو جس نے دو دن میں زمین کو پیدا کیا اور تم (دوسروں کو) اُس کا ہم سر بتاتے ہو یہی (خدا تو) سارے جہان کا پروردگار ہے اور اُسی نے زمین میں اُس کے اُوپر سے (بھاری بوجھل) پہاڑ گاڑ دیئے اور اُس میں ہر طرح کی برکت دی اور اُسی میں اُس کی پیداوار کا اندازہ بھی ٹھیرا دیا - اور (یہ سب کچھ) چار دن میں (سب) مانگنے والوں کے لیے برابر پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ (اُس وقت تک) کُہر (کی طرح کا) تھا تو اُس (کُہر) کو اور زمین کو حکم دیا کہ تم دونوں آؤ خوشی سے آؤ تو اور زبردستی آؤ تو (اور جو حکم ہم دیتے ہیں اُس پر کاربند رہو) دونوں نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے (حکم بجالانے کو) حاضر ہیں اُس کے بعد دو دن میں اُس (کُہر کے طبقات) کے سات آسمان بنا دیئے اور ہر ایک آسمان میں (جو انتظام خدا کو کرنا منظور تھا وہ) انتظام (کارکنانِ قضا و قدر کو) بتا دیا اور ورلے آسمان کو ہم نے (ستاروں کی قندیلوں سے) (بقیہ صفحہ آئندہ)

آیتیں پڑھنی شروع کیں۔ غرض کتابیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر صاحب پر دعویٰ نبوت کے بارے میں لالچ اور خوف کا شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ وہ حالات واقعاتِ نفس الامری ہیں جن کو دوست و دشمن سب نے مانا ہے کہ پیغمبر صاحب اصل میں جزیرۂ عرب کے شہر مکّہ کے رہنے والے تھے مکّے کی عظمت جو کچھ ہے خانۂ کعبہ کی وجہ سے ہے کہ یہ معبد ابتدا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا بیچ میں کئی بار اس کی تعمیر بھی ہوئی ہے۔ چوں کہ تمام عرب ان ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اور یوں بھی ابراہیم علیہ السلام ابوالانبیاء ہیں اور اُن کو یہودی اور عیسائی اور مسلمان سب اہلِ کتاب یکساں مانتے ہیں۔ کعبہ قدیم الایّام سے تمام اہلِ عرب کا مقدس پرستش گاہ رہا ہے۔ جب سے بنا ہر برس اُس کے حج ہوتے رہے ہیں۔ پیغمبر صاحب کے وقت میں بھی جزیرۂ عرب قبائل میں منقسم تھا اب بھی ہے۔ قبائل میں بزرگ ترین قبیلہ قریش کا تھا۔ اِس لیے کہ یہی لوگ خانۂ کعبہ کے متولّی اور خدّام اور مجاور تھے یہاں تک اُن لوگوں کا ادب کیا جاتا تھا کہ عرب میں ذیقعدہ۔ ذی الحجہ۔ محرم۔ رجب کے چار مہینے چھوڑ کر باقی آٹھ مہینے عرب کے قبائل خود سر آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ لڑائی کے مہینوں میں قریش کے سوائے کسی کی مجال نہ تھی کہ کسی دوسرے قبیلے کی سرحد میں ہو کر گزر جائے مار ڈالتے تھے۔ لُوٹ لیتے تھے اور امن کے چار مہینے بھی خانۂ کعبہ کے ادب سے قرار دے رکھے تھے کہ لوگ بے روک ٹوک کعبے کا حج اور عمرہ کریں۔ اور ان مہینوں میں دم لے کر لڑائی کے لیے بھی سانوتے ہو جائیں۔ لڑائی کے مہینوں میں بھی قریش سے کوئی معترض نہیں ہوتا تھا بلکہ ملوکِ حوالی تک اُن کی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔ اِسلام سے پہلے سارا عرب مشرک و بُت پرست تھا۔ خود قریش نے خانۂ کعبہ میں بُت بھر رکھے تھے۔ اور ہندوستان کے پانڈوں کی طرح اُن کی پوجا کراتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم اپنے جدّ امجد ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں حال آنکہ توحید کا چرچا اور زور و شور حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے شروع ہوا تھا

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝

میں نے تو ایک ہی کا ہو کر اپنا رُخ اُسی (ذات پاک) کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمان و زمین کو بنایا اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا ؕ وَلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (النحل)

بے شک ابراہیم (لوگوں کے) پیشوا ہو گزرے ہیں خدا کے فرمان بردار (بندے) جو ایک (خدا) کے ہو رہے تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے خدا کی نعمتوں کے شکر گزار۔ خدا نے اُن کو انتخاب کر لیا تھا اور اُن کو (دین) کا سیدھا رستہ (بھی) دکھا دیا تھا۔

قریش کی اَور بھی شکمی شاخیں تھیں۔ سب میں شریف تر بنی ہاشم۔ اُن میں شریف تر بنی عبد المطلب جن میں جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے کیوں کہ وہ عبد اللہ کے بیٹے اور عبد المطلب کے پوتے تھے اگر پیغمبر صاحب مذہب کی

{بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ} سجایا اور (سجانے کے علاوہ) حفاظت کے لیے بھی یہ (اندازے) اُس (خدا) کے باندھے ہوئے ہیں جو زبردست (اور) دانا ہے پس اگر (اتنے سمجھانے پر بھی کفارِ مکّہ) سرتابی کریں تو (اے پیغمبر تم ان سے) کہہ دو کہ جیسی کڑک عاد اور ثمود پر ہوئی تھی اُسی طرح کی کڑک سے میں تم کو بھی ڈراتا ہوں ۱۲

چھیڑ چھاڑ نہ نکالیں تو شرافتِ ذاتی کے اعتبار سے تمام قریش کے سرگروہ ہوتے - خیر دین کی چھیڑ چھاڑ تو آگے چل کر شروع ہوگی خدا کو یوں منظور ہوا کہ پیغمبر صاحب ابھی بطنِ مادر ہی میں تھے کہ اُن کے والد نے قضا کی - دادا عبد المطلب متکفلِ پرورش ہوئے - مگر وہ خود کثیر العیال تھے - بیوہ بہو اور یتیم پوتے کا خرچ اور اُٹھانا پڑا - پیغمبر صاحب سات برس کے تھے کہ دادا کا بھی انتقال ہوگیا تو چچا ابو طالب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے والد نے دست گیری کی - اِس روداد سے پیغمبر صاحب کی مالی مقدرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس کی دنیاوی وجاہت کے لیئے بڑی سخت ضرورت ہے - اِس پرطرہ یہ کہ پیغمبر صاحب کی طبیعت خاص طرح کی واقع ہوئی تھی - شروع سے اُن کو از خود شرک اور بت پرستی کی چڑ تھی اور جن لوگوں میں اُن کو چار و ناچار رہنا تھا اُن کی عادات اُن کی اوضاع اُن کے اطوار یعنی خود اُن کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے نہ اُن کے میلوں تماشوں میں شامل ہوتے نہ ناچ رنگ اور شراب خواری اور قمار بازی کی صحبتوں میں شامل ہوتے - یہاں تک کہ زمانۂ طفولیت میں ہمجولیوں کے ساتھ کھیلتے بھی نہ تھے لوگوں کو کیا غرض پڑی تھی کہ یہ تو اُن کی صورت سے بھاگیں اور وہ زبردستی اِن کے سر ہوں - مان نہ مان میں تیرا مہمان - عُمر کے ساتھ اجنبیت بڑھتی گئی ۲۵ برس کی عمر میں ام المومنین حضرت خدیجہؓ سے اُن کا بیاہ بھی ہوگیا - مگر دل برداشتگی بدستور مکے سے تین میل کے فاصلے پر کوہِ ابو قبیس میں حرا نامی ایک غار ہے - گھر سے کئی کئی دن کا کھانا پانی لے جاتے اور غار میں اکیلے بیٹھے خدائے واحد کی عبادت کرتے - نتیجہ یہ ہوا کہ اسی غار میں اِن کو پیغمبری ملی اور دینِ حق کی منادی یعنی دعوتِ اسلام کا حکم ہوا - اِس حکم کی تعمیل نے تو ایک دم سے سارے ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک آگ سی لگا دی اور اپنے بیگانے سب پیغمبر صاحب کے دشمن ہو گئے اس لیئے کہ دعوتِ اسلام سے بتوں کی توہین - بزرگوں کی تحمیق ہوتی تھی - مکے کی مرجعیت اور خاص کر قریش کی روزی میں خلل پڑتا تھا - لوگوں نے بھی کوئی بے حرمتی نہ تھی جو پیغمبر صاحب کے ساتھ نہ کی ہو - آخر دعوت کے چودھویں برس پیغمبر صاحب کو جان لے کر مدینے بھاگ جانا پڑا - اِس بیان میں بہت سی ضروری باتیں چھوڑ دی گئی ہیں تاکہ اصل مطلب دور نہ جا پڑے - پیغمبر صاحب کے حالات جو بیان کیئے گئے اُن کی یتیمی - اُن کی خاص طرح کی طبیعت - لوگوں سے اُن کی وحشت اور اجنبیت - اُن کی خلوت پسندی یہ سب تاریخی واقعات ہیں زمانے کی پتھر کی تختی پر ایسے گہرے کندہ کیئے ہوئے ہیں کہ کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتے - اور ایسے صاف پڑھے جاتے ہیں کہ جیسے آج کندہ کیئے گئے ہیں - اب ناظرین ان حالاتِ حقۂ صحیحہ کو حاضر فی الذہن رکھ کر ٹھنڈے دل سے اور انصاف سے تجویز کریں کہ پیغمبر صاحب جھوٹا دعویٰ رسالت کر کے کس مفاد کی توقع کر سکتے تھے - اسی دعوے نے تو اُن کی یہ گت بنوائی تھی اسی دعوے نے اُن کو شہر بدر کرایا سالہا سال پے در پے اس کا تجربہ ہوئے پیچھے کوئی احمق سے احمق بھی عکس مدعا ایسے دعوے سے کسی فائدے کی توقع کر سکتا تھا نہ پیغمبر صاحب جیسا زیرک آدمی جس نے حقانیت کے بل پر صرف باتوں سے ایک عالم کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور خالی ہاتھ پانوں سے ایسی زبردست سلطنت قائم کر دی جس کی نظیر اقوامِ روزگار میں سے کسی قوم کی تاریخ میں پائی نہیں جاتی - جھوٹ میں یہ قوت نہ کبھی ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے - یہاں ایک بات یہ بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ دوسرے مذاہب والے مثلاً ہنود اور نصاریٰ بھی اِس سے استدلال کر سکتے ہیں بلکہ بدرجۂ اولیٰ اِس واسطے کہ وہ شمار میں مسلمانوں سے بہت زیادہ ہیں - بات یہ ہے کہ ہر ایک مذہب میں کچھ

نہ کچھ صداقت ضرور ہی۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ پس یہ اُن کا استدلال صحیح ہوگا۔ لیکن وہی تھوڑی بہت صداقت کی وجہ سے۔

بہر حال یہ بات ثابت ہوگئی کہ پیغمبر صاحب نے کسی عاجل مفاد کی توقع پر پیغمبری کا غلط دعوٰی نہیں کیا۔ لیکن ایک بات اَور صاف کرنی چاہیئے کہ پیغمبر صاحب نے زیرک آدمی تو تھے ہی یہ نہ معلوم کر لیا ہو کہ آخر کار مجکو کامیابی ہونی ہی گو بدیر ہو اور اِس دور دراز توقع پر پیغمبری کا غلط دعوٰی کر بیٹھے ہوں۔ غرض یہی بات صاف کرنے کے قابل ہی کہ پیغمبر صاحب کو اگر ایسی بے سرو سامانی اور سارے جزیرۂ عرب اور خاص کر اہلِ مکّہ اور متولیانِ خانۂ کعبہ کی ایسی سخت مخالفت کے ہوتے برسوں پہلے اپنی کامیابی کا علم ہوا تو کیوں کر ہوا۔ اپنی عقل کے زور سے ہوا تو یہ خلاف فطرت ہی اور خود پیغمبر صاحب علمِ غیب کا نام سُن کر کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔

لَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (الاعراف)

(اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کہ) اگر میں غیب جانتا ہوتا تو اپنا بہت سا فائدہ کر لیتا اور مجکو (کسی طرح کا) گزند (ہی) نہیں پہنچتا میں تو ان لوگوں کو جو ایمان لانا چاہتے ہیں (دوزخ کا) ڈر اور (بہشت کی) خوش خبری سنانے والا ہوں اور بس۔

اور اگر خداوند تعالےٰ کے بتانے سے ہوا

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (النّور)

(مسلمانو) تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل (بھی) کرتے ہیں اُن سے خدا کا وعدہ ہی کہ (ایک نہ ایک دن) اُن کو ملک کی خلافت (یعنی سلطنت) ضرور عنایت کرے گا جیسے اُن لوگوں کو خلافت عنایت کی تھی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں اور جس دین کو اُس نے اِن کے لیئے پسند کیا ہی (یعنی اسلام) اُس کو اُن کے لیئے جما کر رہے گا اور خوف و (خطر) جو اُن کو (لاحق) ہی اِس کے بعد عن قریب (ہی) ان کو (اس کے) بدلے میں امن دے گا کہ (باطمینان) ہماری عبادت کیا کریں گے (اور) کسی کو ہمارا شریک نہ گردانیں گے اور جو شخص اِن تمام (احسانات) کے بعد ناشکری کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔

اور وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَأْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ [ط] - تو دعوِیِ نبوت جھوٹا نہ ٹھیرا۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَإِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ أَنْ قَدْ

اُسی کو غیب کی خبر ہی تو وہ اپنی غیب کی باتیں کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر (ہاں اپنے) برگزیدہ پیغمبروں پر (مصلحۃً) کوئی بات ظاہر کرنی چاہتا ہی تو وہ (بھی اِس احتیاط سے کہ) اُن کے آگے اور اُن کے پیچھے (فرشتوں کا) پہرہ (اُن کے ساتھ) رکھتا ہی تاکہ دیکھ لے کہ پیغمبروں نے اپنے پروردگار کے پیغام لوگوں کو ٹھیک

ط اللہ تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرما چکا ہی کہ تم اُن پر قابض ہوگئے تو یہ (خیبر کی غنیمت) تم کو دلوا دی ۱۲

اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (الجن)
ٹھیک) پونچا دیئے اور اُن کے سارے معاملات اُسی کے احاطۂ (علم) میں ہیں اور اُس نے تمام چیزوں کی گنتی (تک اپنی نظر میں) کر رکھی ہی۔

اب دوسری بات یہ رہی کہ خوف نبوت کے غلط دعوے کا محرک ہوا ہو تو یہ لالچ سے زیادہ بے تُکی ہی خوف کے معنی کیا ہیں۔ اُمورِ ناملائم جو آیندہ پیش آنے والے ہوں اُن سے تحرّز اور تحفّظ کا نام ہی خوف۔ وہ یہاں آیندہ کا کیا مذکور ہی۔ جتنے امورِ ناملائم کسی ظالم کے خیال میں آ سکتے ہیں عین دعوےِ پیغمبری کے وقت سبھی تو پیغمبر صاحب کے ساتھ عمل میں لائے جا رہے تھے۔ مخالف اِس سے زیادہ کر ہی کیا سکتے تھے جس کا پیغمبر صاحب کو ڈر ہوتا۔

طبل و علم ہی پاس نہ اپنے نہ ملک و جاہ   ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

غرض یہاں تک مولانا نے پیغمبر صاحب کی رسالت کو فطرت کی دلائل سے ثابت کر دیا۔ لوگ اثباتِ رسالت کے اَور اَور دلائل پیش کرتے ہیں مگر اُن سے مولانا کا اطمینان پورا پورا نہیں ہوتا۔ اِس لیے کہ ایسے کتنے مسلمان ہیں جو حقیقت میں دین دار ہیں۔ ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں میں مرد و زن ملا کر بمشکل چھ لاکھ۔ اور چھ لاکھ بھی مولانا اس خیال سے کہتے ہیں کہ دوسری قومیں ہم مسلمانوں کو ایسا گیا گزرا نہ سمجھیں۔ خدا کے عفو و درگزر سے کام چل رہا ہی ورنہ ہمارے اعمال تو اس قابل ہیں کہ تختے کا تختہ غرق کر دیا جائے "مسلمانان در گور مسلمانی در کتاب" پھر چھ لاکھ جن کو مولانا نے دین دار فرض کیا ہی تقلیدی دین دار ہیں اور مذہبی شرائط کو صرف رسم کے طور پر بجا لاتے ہیں۔

اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (الزخرف)
ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا اور اُن ہی کے قدم بہ قدم ہم (بھی اُن کی) پیروی کر رہے ہیں۔

اُن کو

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ٥ (البقرہ)
بھلا اُن کے بڑے کچھ بھی نہ سمجھتے اور نہ راہِ راست پر چلتے رہے ہوں تو بھی (وہ اُن ہی کی پیروی کیے چلے جائیں گے)۔

کا بھول کر بھی خیال نہیں آتا اور اگر کوئی شامت کا مارا ایسا خیال ظاہر کرے تو وہ شاید اُس کا مُونہ نوچ لیں ہاں بعض خدا کے بندے ایسے بھی ہیں "وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ" جن کی طبیعت حق جُو واقع ہوئی ہی۔ مگر وہ اُن خیالات کو جو بچپن سے اُن کے ذہن نشین ہو گئے ہیں دل سے دُور نہیں کر سکتے۔ غرض تقلید کا جال ایسا زبردست جال ہی کہ اُس سے نکلنا بہت ہی مشکل ہی۔ اور تقلید اور تحقیق میں ٹھیرا بَیر۔ اِس سے تمام مذہب والوں میں اور از اں جملہ مسلمانوں میں بھی تحقیق کا دروازہ ایسا بند ہوا ہی کہ کھُلنے کا نام نہیں لیتا۔ مگر آپس کی تُو تُو مَیں مَیں جس کا نام لوگوں نے کلام اور مناظرہ رکھ چھوڑا ہی ہر جگہ ہمیشہ ہوتی رہتی ہی تو اُس کو احقاقِ حق سے کچھ واسطہ اور سروکار نہیں۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی   کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

غرض جناب پیغمبر صاحب کی صداقت کو مولانا نے نہایت عمدہ طور پر ثابت کیا ہی۔ حضرت نظامی فرماتے ہیں

فرستادۂ خاص پروردگار   رسانندۂ حجت استوار

گراں مایہ تر تاجِ آزادگاں ۔ گرامی تر از آدمی زادگاں
محمد کازل تا ابد ہرچہ ہست ۔ بآرایشِ نامِ او نقش بست
چراغیکہ پروانہ بینش بدوست ۔ فروغِ ہمہ آفرینش بدوست
ضمانداری عالم سیہ تا سپید ۔ شفاعت کنِ روزِ بیم و امید
درختے سہی سرو در باغِ شرع ۔ زمینے باصل آسمانے بہ فرع
زیارت گہِ اصلداران پاک ۔ ولی نعمتِ فرع خوارانِ خاک
چراغے کہ تا او نیفروخت نور ۔ زچشمِ جہاں روشنی بود دور
سیاہی دہِ خالِ عباسیاں ۔ سپیدی کُنِ چشمِ شماسیاں
لب از بادِ عیسیٰ پُر از نوش تر ۔ تن از آبِ حیواں سیہ پوش تر
فلک بر زمیں چار طاق افگنش ۔ زمیں بر فلک پنج نوبت زنش
ستوں شد خردمند از پشتِ او ۔ مہ انگشت کش گشت از انگشتِ او
خراج آورش حاکمِ روم و رے ۔ خراجش فرستاد کسریٰ و کے
محیطے چہ گویم چو بارندہ میغ ۔ بیک دست گوہر بیک دست تیغ
بگوہر جہاں را بیاراستہ ۔ بہ تیغ از جہاں داد و دیں خواستہ
اگر شحنۂ تیغ بر سر برد ۔ ق ۔ سرِ تیغِ او تاج و افسر برد
بسر بردنِ خصم چوں پَے فشرد ۔ بسر برد تیغے کہ بر سر نبرد
قبائے دو عالم بہم دوختند ۔ وزاں ہر دو یک نیورہ افروختند
چو گشت آں طمع قبا جائے او ۔ بدستے کم آمد ببالائے او
ببالائے او کایزد آراستہ است ۔ ہم آرایشے ایزدی خواستہ است
کلیدِ کرم بود در بدوِ کار ۔ کشادہ بدو قفل چندیں حصار
فراخی بدو دعوتِ تنگ را ۔ گواہی بر اعجازِ او سنگ را
تہی دست سلطانِ پشمینہ پوش ۔ غلامی خرد بادشاہی فروش
زمعراجِ او در شبِ ترکتاز ۔ معرّج گرانِ فلک را طراز
شب از چترِ معراجِ او سایۂ ۔ وزاں نردباں آسماں پایۂ

پیغمبر صاحب کا ادب

مولٰنا فرماتے ہیں کہ "آداب جمع ہی ادب کی۔ ادب کا سب سے بہتر ترجمہ جس سے ادب کے ٹھیک مفہوم کی طرف ذہن منتقل ہو جائے پاس اور لحاظ ہی۔ جس کا ادب کیا جاتا ہی اُس کے تعلق سے ادب حق ہی اور ادب کرنے والے کے تعلق سے فرض۔ آدمی اپنے سے برتر کا ادب کرتا ہی تو برتری کئی طرح کی ہوتی ہی۔

برتری رشتے اور قرابت کی ۔ برتری عمر کی ۔ برتری علم وہنر کی ۔ برتری استادی اور تعلیم وارشاد کی ۔ برتری حکومت کی ۔ برتری دولت کی ۔ برتری احسان کی ۔ برتری دینداری کی اور سب سے بڑھ کر برتری رسالت کی کہ پیغمبر بہت سی برتریوں کا جامع ہوتا ہے ۔ پیغمبر صاحب کے ادب کی حد معلوم کرنا چاہو تو ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر ۔ سے معلوم کر سکتے ہو ادب کے طریقے خود خدا تعالیٰ نے قرآن میں بتا دیے ہیں ۔ ایک سجدہ تو خدا کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں باقی ہر طرح کا ادب ہر طرح کی تعظیم و توقیر سب سے بڑھ کر پیغمبر صاحب کا حق ہے ۔ بس اتنی احتیاط رہے کہ وہ ادب عبادت کی حد تک نہ پونہچنے پائے جن کو مرقدِ مبارک کی زیارت نصیب ہو اُن کو اس بات کا زیادہ خیال رکھنا چاہیئے ۔ پیغمبر صاحب کے ادب کے اکثر مواقع تو اُن کی وفات اور وہ وقت گئے گزرے ہونے کی وجہ سے فوت ہو گئے پیغمبر صاحب موجود نہیں کہ وہ بُلائیں اور ہم سر کے بل دوڑے جائیں ۔ وہ ارشاد فرمائیں اور ہم ہمہ تن گوش ہو کر سُنتے رہیں ۔ اُن کی خدمت میں کچھ عرض کرنا ہو تو دھیمی آواز سے عرض کریں ۔ پیغمبر صاحب کی ازواجِ طاہرات زندہ نہیں کہ ہم انھیں ماں سمجھیں اور اپنی ماؤں سے بڑھ کر اُن کا ادب کریں ۔ اب تو یہی ادب ہمارے نصیبوں میں ہے کہ پیغمبر صاحب کی عظمت دل میں ہو اُن کی دل سوزی نصب العین ۔ اُن پر درود وسلام بھیجتے رہیں ۔ اُن کے ارشادات کی تعمیل میں سعادتِ دارین سمجھیں ۔ ایسا تو کوئی بدبخت مسلمان نہ ہوگا کہ پیغمبر صاحب کا ادب اُس کو ملحوظ نہ ہو ۔ اگر پیغمبر صاحب کے ادب کے متعلق مسلمانوں سے غلطی ہوتی ہے تو وہ افراطِ ادب ہے کہ پیغمبر صاحب کو خدا اور ادب کو عبادت بنا دیتے ہیں جو شرکِ جلی ہے ایک شاعر کہتا ہے ۔

احمد کو ہم نے جان رکھا ہے وہی احد ۔۔۔ مذہب کچھ اَور ہوگا کسی بوالفضول کا

اور غضب یہ ہے کہ اَنَا اَحْمَدُ بلا میم وَالعرب بلا عین لیسے ایسے جھوٹے اور غلط دعوے پیغمبر صاحب کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں سُبْحَانَکَ[۵۱] هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ بلکہ پیغمبر صاحب تو رہے اپنی جگہ متصوفوں کے گروہ میں تو بزرگانِ امت کو شریکِ خدائی بنایا جاتا ہے ایسے ہی لوگوں کے حق میں وعید وَمَا يُؤْمِنُ[۵۲] اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۔ نازل ہے حالاں کہ پیغمبر صاحب اور عشرۂ مبشرہ کے علاوہ ہم کو کسی کی عاقبت کا حال معلوم نہیں ہاں اُذکروا[۵۳] موتاکم بالخیر کے قاعدے سے ہم سب گزشتگاں کے حق میں حسن ظن رکھتے ہیں ۔ بہر کیف توحید کا رستہ بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے ۔ بڑی احتیاط کے ساتھ قدم رکھنا ہوگا ۔

اتباعِ سنت مولانا فرماتے ہیں کہ لغت کی رُو سے تو سنت کے معنی طور وطریق کے ہیں مگر محدثین اس سے مراد لیتے ہیں طور وطریق جنابِ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ۔ اصحاب کا ۔ تابعین کا ۔ سنت کی اس تعریف میں اصحاب اور تابعین اور طور وطریق یہ تین لفظ تشریح طلب ہیں ۔ سو اصحاب جمع ہے صحابی کی اور صحابی وہ ہے جو اسلام لایا اور اُس کو شرفِ صحبتِ پیغمبر بھی حاصل ہوا ۔ اور عقیدۂ اسلام ہی پر اُس نے وفات پائی ۔ صحبت کے لیے مدت کی قید نہیں ۔ تھوڑی ہو یا بہت جو نسبت صحابی کو ہے پیغمبر صاحب سے وہی نسبت تابعی کو ہے صحابی سے یعنی تابعی وہ ہے جس کو کسی صحابی کے ساتھ صحبت رہی ہو اسلام کی شرط بدستور

---

[۵۱] حاشا وکلا یہ تو بڑا بھاری بہتان ہے ۱۲ [۵۲] اور اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ خدا کو مانتے ہیں اور شرک بھی کرتے جاتے ہیں ۱۲ [۵۳] اپنے مُردوں کو بھلائی کے ساتھ یاد کرو ۱۲

پھر طور وطریق سے مراد ہی قول - اور فعل - اور تقریر - تقریر سے گفت گو مراد نہیں بلکہ تقریر یہ ہو کہ کسی کو کچھ کرتے دیکھا یا کہتے سُنا اور خاموش ہو گئے - رد و انکار نہ کیا جس سے سمجھا گیا کہ قول یا فعل کو جائز رکھا پس سنت تو قسم کی ہوئی - (۱) پیغمبر صاحب کا قول - (۲) پیغمبر صاحب کا فعل - (۳) پیغمبر صاحب کا کسی کے قول یا فعل کو جائز رکھنا اسی طرح کی تین قسمیں صحابی کے تعلق سے پھر اسی طرح کی تین قسمیں تابعی کے تعلق سے - یہ سب نو ہوئیں - خود پیغمبر صاحب کی سنت کی پیروی کے لیے تو قرآن ناطق ہی - اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ - [۵۱] صحابہ کے حق میں پیغمبر صاحب فرماتے ہیں اَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ [۵۲] - رہے تابعی ہم اُن کی پیروی حدیث خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ [۵۳] سے استنباط کرتے ہیں کہ خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي عہد صحابہ کو بتارہا ہی پہلا اَلَّذِينَ يَلُونَهُمْ تابعین کو اور دوسرا اَلَّذِينَ يَلُونَهُمْ تبع تابعین کو - بہر کیف ہم کو قرآن کے علاوہ خدا کے حکم سے پیغمبر صاحب کی اور پیغمبر صاحب کے حکم سے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کی پیروی کرنی ہی اور پیروی بھی کرنی ہی تو اُن کے فعل کی قول کی تقریر کی - جس کے معنی ہم اوپر لکھ چکے ہیں اور چوں کہ قول اور فعل اور تقریر میں کسی قسم کی تصریح اور تخصیص اور تعیین نہیں بلکہ قرآن میں اتبعونی اور حدیث میں اقتدیتم دونوں لفظ عام ہیں تو اس پیروی کا مطلب یہ ٹھیرا کہ ہم ایسے سخت شکنجے میں کسے ہوے ہیں کہ دائرۂ تقلید سے پاؤں باہر نہیں رکھ سکتے - یا یوں کہو کہ ہم کو بالکل اُسی طرح بہ زندگی بسر کرنی چاہیے جس طرح پر اب سے ہزار برس پہلے قرونِ اُولیٰ کے لوگ زندگی بسر کرتے تھے - ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ - [۵۴] ایک طرف تو عام پیروی سے یہ زبون نتیجہ نکلتا ہی اور دوسری طرف فَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيمَ [۵۵] - اور قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِي اَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ [۵۶] سے پایا جاتا ہی کہ دینِ اسلام میں کسی طرح کی تنگی نہیں - اور ان دو متضاد باتوں یعنی تنگی اور فراخی دونوں کا ماخذ قرآن حال آنکہ خداے تعالیٰ جل شانہ نے قرآن کے کتابِ آسمانی ہونے کے جہاں اور بہت سی دلائل قرآن میں بیان فرمائی ہیں اُن میں سے ایک دلیل یہ بھی ہو کہ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا - [۵۷] یعنی قرآن کی تعلیم میں اختلاف کا نہ ہونا اُس کے منزل من اللہ ہونے کی ایک دلیل ہی - پس ضرور ہوا کہ اس تنگی اور فراخی کے اختلاف اور اختلاف بھی نہیں تناقض و تضاد کو رفع کیا جائے - تو ہم نے رفع اختلاف کا پتہ یوں لگایا کہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین مکہ کی ایذادہی کی وجہ سے ہجرت فرما کر نئے نئے مدینے تشریف لائے تو یہاں بھی وہی اسلام کی اشاعت اور لوگوں کے مشرکانہ اور فاسد عقائد کی اصلاح اُن کا رات دن کا مشغلہ تھا - مکے میں تو زراعت فلاحت کا نہ پہلے ہی کہیں نام و نشان تھا نہ اب ہی یہاں

---

[۵۱] (اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو کہ اللہ (بھی) تم کو دوست رکھے اور تم کو تمہارے گناہ معاف کر دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہی ۱۲

[۵۲] میرے صحابی ستاروں جیسے ہیں تم اُن میں سے جس کی اقتدا کرو گے راہ پاؤ گے ۱۲ [۵۳] زمانوں میں سب سے بہتر زمانہ میرا ہی پھر اُن لوگوں کا زمانہ بہتر ہی جو اس عہد کے لوگوں سے نزدیک ہوں گے اور پھر ان کا جو اُن سے نزدیک ہوں گے ۱۲ [۵۴] صریح گھاٹا یہی کہلاتا ہی ۱۲ [۵۵] (مسلمانو!) دین (کے بارے) میں تم پر کسی طرح کی سختی نہیں کی (تمہارے لیے وہی) دین (تجویز کیا جو) تمہارے باپ ابراہیم کا تھا ۱۲ [۵۶] (اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہو کہ اللہ نے جو زینت کے

[illegible]

مدینے میں آکر دیکھا کہ کھیتی کے علاوہ نخلستان کی بڑی کثرت ہے یہاں تک کہ کھجوروں ہی پر گویا ان لوگوں کا گزارہ ہے کھاتے بھی ہیں بیچتے بھی ہیں مگر یہ لوگ کھجور کے درختوں میں نر و مادہ کی تفریق کرتے تھے۔ جس طرح ہندوستان میں قلم کا دستور ہے یہ لوگ بار آور ہونے کی غرض سے کھجور کے نر درخت کا گابھا مادہ درختوں میں ملاتے اور اس عمل کو اپنی بولی میں تابیر کہتے تھے۔ پیغمبر صاحب کو نخلستان کی رکھوالی کا کبھی کاہے کو اتفاق ہوا تھا سمجھے کہ یہ بھی ان لوگوں کے زمانہ جاہلیت کے اوہام میں سے ہوگا تابیر کو منع فرما دیا سارا مدینہ پڑتی پڑ گیا لوگوں نے فریاد کی تو فرمایا اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ یعنی میں نے اپنے خیال کے مطابق تابیر کو منع کر دیا تھا۔ اگر تابیر شرطِ بار آوری ہے تو کرو دنیا کی باتیں تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ اس واقعے سے ثابت ہوا کہ امورِ دنیا میں پیغمبر صاحب کی پیروی شرطِ دینداری نہیں اور پیغمبر صاحب کی نہیں تو صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کی بدرجۂ اولیٰ نہیں۔ بظاہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنگی اور فراخی کا اختلاف جو سنت کی پیروی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا آسانی کے ساتھ رفع ہو گیا۔ مگر نہیں ابھی ایک مشکل درپیش ہے کہ انتم اعلم باموردنیاکُم نے ہم کو پیروی سنت کی قید سے تو نجات دی مگر اُمورِ دنیا اور امورِ دین کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دکھایا کہ جب کبھی کوئی معاملہ پیش آئے ہم سمجھ سکیں کہ یہ امورِ دنیا میں ہے اور اس میں سنت کی پیروی ضرور نہیں۔ ورنہ ہم تو دنیا کو جوہر اور دین کو عرض سمجھے ہوئے ہیں کہ دنیا میں شرعی شان کے ساتھ زندگی کرنے کا نام ہے دین۔ دنیا کو دین سے کیسے الگ سمجھ لیں۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کے اکثر اوامر و نواہی دنیا سے متعلق ہیں۔ مثلاً جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو مال و دولت کو فضول نہ اُڑاؤ۔ یہ سب احکام دین ہیں اور یہ ہیں دنیا ہی کی باتیں۔ پس انتم اعلم باموردنیاکم میں امورِ دنیا سے خاص خاص باتیں مراد ہونی چاہئیں کہ اتباعِ سنت بھی فوت نہ ہو اور اسلامی آزادی و سہولت بھی باقی رہے ہم نے تو دین کی کتابوں سے یہ بات استنباط کی ہے کہ قرآن اسلام کا مکمل دستور العمل ہے اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا[1] اُس کے مکمل ہونے کا گواہ مسلمانوں کو جو کچھ بھی دنیا اور آخرت کے لیے اس زندگی میں کرنا ہے قرآن میں اس کی بابت ہدایت موجود ہے۔ تو جہاں تک سنت سے احکام قرآن کی توضیح و تفسیر ہوتی ہو یا سنت قرآن کے کسی حکم کا طریقِ عمل بتاتی ہو یا سنت کا کوئی مسئلہ قرآن کی کسی اصل پر متفرع ہوتا ہو وہاں تک تو سنت کی پیروی ضرور ہے اس کے علاوہ جو کچھ بھی سنت ہے قرآن کے اتبعونی اور حدیث کے اقتدیتم سے خارج مگر تاریخی حیثیت سے قابلِ قدر ہے۔"

ادب میں افراط اور تفریط کا لحاظ ضرور رہنا چاہیے

چناں چہ مولانا فرماتے ہیں "کہ جن چیزوں کے سمجھنے سے فہمِ انسان قاصر ہے اور ایسی بہت سی چیزیں ہیں اُن میں سے ایک نبوۃ بھی ہے۔ ایک شاعر نے جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کیا خوب کہا ہے ؎ اِدھر مخلوق میں شامل اُدھر اللہ سے واصل ٭ خواص اُس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدد کا ٭ دنیا کا حال تو یہ ہے کہ ادنیٰ رعیت ایک بادشاہِ جلیل القدر کے ساتھ ہم کلام ہونا چاہے تو نہیں ہو سکتا حالانکہ رعیت و بادشاہ کچھ بھی ہوں پھر بھی ہم جنس اور ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ذرّے کو آفتاب سے قطرے کو سمندر سے چیونٹی کو ہاتھی سے یا خلقًا مِمّا یکبُرُ فِی صُدُورِکُم سے پھر بھی ایک طرح کی نسبت ہے اور نہیں ہے تو آدمی کو خدا سے آدمی آدمی ہی ہے اور خدا خدا ہی ہے۔

[1] اب ہم تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر چکے اور ہم نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور ہم نے تمہارے (اسی) دینِ اسلام کو پسند فرمایا۔[2] کوئی اور چیز بھی بن جاؤ جو تمہارے خیال میں بڑی دَرخت ہو ۱۲

سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کس طرح ایک بشر سے بلا واسطہ یا بواسطہ ہم کلام ہوتا ہے۔ غرض نبوت ایک مشکل معما ہے جس کا حل کرنا مقدورِ بشر نہیں۔ با ایں ہمہ ہم نبوت سے انکار بھی نہیں کر سکتے اس کے لیے بہت سے دلائل ہیں ناممکن التردید۔ پس پیغمبر کے بارے میں جادۂ اعتدال پر قائم رہنا ہی ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہم ایک **حکایت** نقل کرتے ہیں جس سے ظاہر ہو جائے گا کہ لوگ نبوت کے بارے میں کس کس طرح طریقِ مستقیم سے انحراف کرتے ہیں۔ دو شخص دونوں مسلمان اور دونوں ایک ہی جگہ دلی کے رہنے والے بلکہ ایک دوسرے کے رشتہ دار بھی ایک ساتھ حج کو روانہ ہوئے۔ ایک تھا متشدد غیر مقلد۔ دوسرا کٹا مقلد۔ کسی طرح جدہ پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ جدے پہنچ کر دونوں رفیق ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ غیر مقلد سیدھا مکے پہنچا۔ اور اس نے ارکانِ حج اوقاتِ مقررہ پر پورے پورے ادا کیے۔ مقلد نے جدے اتر کر ادھر مدینے کی راہ لی غیر مقلد نے کہا بھی کہ وقت تنگ ہے۔ مدینے ہو کر حج میں شامل نہ ہو سکو گے۔ مقلد نے اس کی مطلق پروا نہ کی حج تو فوت ہو گیا مگر پیغمبر صاحب کے مزارِ مبارک کی زیارت بافراغت نصیب ہوئی۔ ادھر غیر مقلد مدینے نہ جا سکا۔ لوٹتیوں کو پھر دونوں جدے میں جمع ہوئے تو جس طرح غیر مقلد کو زیارتِ مدینہ سے محروم رہنے کا افسوس نہ تھا مقلد کو حج نہ کرنے کا کچھ ملال نہ تھا۔ یہ ہے وہ افراط و تفریط جس سے ہم مسلمانوں کو آگاہ کیے دیتے ہیں۔ قرآن اور حدیث میں کہیں تو پیغمبر صاحب کی حالتِ بشری کا بیان ہے تو وہاں عجز اور مسکنت ہے اور کہیں ان کے تقربِ الٰہی کا تو وہاں محبوبیت ہے فوق البشریت۔

تمام پیغمبروں کے حقوق سب پر یکساں ایمان لانا اور سب کی کتابوں کو برحق ماننا

مولانا فرماتے ہیں وہ مزید آگہی کے لیے ذیل میں ان پیغمبروں کی فہرست دی جاتی ہے جن کا مذکور بتصریح تمام قرآن میں ہے۔ ان کے علاوہ خدا جانے اور کتنے پیغمبر آئے اور آئے تو کیا حکمِ خاص یعنی شریعت لے کر کس وقت کن لوگوں کی طرف۔ بات یہ ہے کہ بنی آدم کی حالت کو ثبات نہیں کہ شروع سے تمام روئے زمین کے آدمیوں کی ایک ہی حالت چلی آئی ہو۔ تاریخ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آب و ہوا اور وقتی اور مقامی خصوصیتوں کے اختلاف کی وجہ سے لوگوں کی حالتیں بھی مختلف ہوتی رہی ہیں کسی جگہ ایک زمانے میں لڑائی بھڑائی کے چرچے رہے ہیں تو دوسرے وقت شعر شاعری کے بعض لوگ شان دار عمارتوں کے دل دادہ رہے ہیں۔ کتنے حسن پرستی کے چوری رہزنی ڈکیتی کم تولنا کم ناپنا۔ ابھی تک بھی دنیا ان جرائم سے پاک نہیں۔ غرض حضرت آدم کی اولاد ایسی بے چین اور چلبلی اولاد ہے کہ ان کا کوئی وقت فساد سے محفوظ نہیں رہا ہے ایسی بداعمالیوں کی روک تھام کے لیے لوگوں کی مناسبِ حالت خدا وقتاً فوقتاً پیغمبروں کو بھیجتا رہا ہے۔ آدمی جسم و روح دو چیزوں سے مرکب ہے تو اس کے امراض اور علاج بھی دو طرح کے ہیں طب کی کتابیں امراضِ جسمانی کا علاج کرتی ہیں اور مذہبی کتابیں امراضِ روحانی کا۔ جالینوس طبیب الابدان ہے تو پیغمبر طبیب الارواح۔ بید اور طبیبِ یونانی اور ڈاکٹر کا طرزِ علاج گو مختلف ہو مگر مقصودِ علاج سب کا متحد ہے۔ اصلاحِ بدن۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو خدا نے لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ[1] تعلیم فرمایا اور یہی وجہ ہے کہ ہم برابر کے درجے میں تمام پیغمبرانِ خدا کی تعظیم کرتے ہیں۔ اس سے کہ اسلامی شریعت تمام سابقہ شریعتوں کی ناسخ ہے پچھلے

[1] ہم خدا کے پیغمبروں میں سے کسی ایک کو (بھی) جدا نہیں سمجھتے (یعنی سب کو مانتے ہیں)

پیغمبروں کی کسی طرح کی توہین لازم نہیں آتی - جیسے اِس سے کہ ہم اِس وقت ایڈورڈ ہفتم کی رعایا ہیں شاہانِ سلف کی - انبیاءِ سابقین علیہم السّلام کی تعظیم کا مسئلہ بھی نازک اور احتیاط طلب مسئلہ ہی - انبیاءِ سابقین کی اُمّتوں نے بعض کے ادب میں اِفراط کی کہ اُن کو خدا اور خدا کا بیٹا بنا دیا تو ہم افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ مسلمان اُن کے ادب میں تفریط کرتے ہیں جو لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ کے صریح خلاف ہی - پادریوں نے عہدِ عتیق اور عہدِ جدید یعنی توراۃ اور صُحُفِ سماوی اور انجیل کی اشاعت میں اتنا مبالغہ کیا کہ ہر مُلک اور ہر زبان میں لاکھوں کروڑوں کتابیں چھپوا چھپوا کر مفت تقسیم کرتے پھرتے ہیں - بے شک ہم مسلمانوں کے نزدیک یہ کتابیں منسوخ العمل ہیں اور کہیں کہیں یہودی اور عیسائی اِن میں تحریفِ معنوی بھی کرتے ہیں مگر پھر بھی خدائے پاک کا کلام پاک ہی اور اُس کا ادب واجب - مگر مسلمان اِن کتابوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں کہ عطّار اُن کے اوراق سے پُڑیاں بناتے یا شب برات میں لوگ اُن کو پٹاخوں کے کام میں لاتے - یا دوسری طرح پر اُن کی بے توقیری کرتے ہیں - یہ طریق عمل سخت بیہودہ اور موجبِ معصیت ہی اِن کتابوں کی توہین میں انبیاء علیہم السلام کی توہین ہی - اور انبیاء کی توہین عین خدا کی - اعاذنا اللہ وسائر المسلمین منہا فانہم لا یکذبونک ولکن الظلمین بایٰت اللہ یجحدون - جس طرح تبرّائی شیعوں کی ضد میں گروہِ خوارج کھڑا ہوا اِسی طرح عیسائیوں کی ضد میں جو مسیح علیہ السلام کو خدا اور خدا کا بیٹا مانتے ہیں کچھ متعصب اور غالی مسلمان کھڑے ہوگئے ہیں جو ولادتِ مسیح علیہ السلام کو گوبر کے کیڑے کی ولادت سے تشبیہ دیتے اور عیسائیوں کی دعاءِ طلبِ رزق کو انکر الاصوات لصوت الحمیر سے - اگر لوگوں نے افراط فی الادب کر کے مسیح علیہ السلام کو خدا بنایا تو اُس میں مسیح علیہ السلام کا کیا قصور ہی۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰھَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ قَالَ سُبْحٰنَکَ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ اِنْ کُنْتُ قُلْتُہٗ فَقَدْ عَلِمْتَہٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَھُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِہٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ وَکُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْھِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ ۝

اور (قیامت کے دن یہ معاملہ بھی پیش آئے گا کہ) اُس دن اللہ (عیلے سے) پوچھے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیلے کیا تم نے لوگوں سے یہ بات کہی تھی کہ خدا کے علاوہ مجکو اور میری والدہ کو (بھی) دو خدا مانو (عیلے) عرض کریں گے کہ اے پروردگار تیری ذات پاک ہی تجھ سے یہ کیونکر ہو سکتا ہی کہ (میں تیری شان میں) ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجکو کوئی حق نہیں - اگر میں نے ایسا کہا ہوگا تو میرا کہا تجکو ضرور [illegible] کیوں کہ تو (تو) میرے دل (تک) کی بات جانتا ہی [illegible] کی بات نہیں جانتا غیب کی باتیں تو تو ہی خوب جانتا ہی [illegible] حکم دیا تھا بس وہی میں نے ان لوگوں کو کہہ سنایا تھا کہ اللہ جو میرا اور تمہا(را سبکا) پروردگار ہی اُسی کی عبادت کرو اور جب تک میں ان لوگوں میں موجود رہا میں اِن کا نگراں (حال) رہا پھر جب تُو نے مجکو دنیا سے اُٹھالیا تو تو ہی اِن کا نگہبان تھا اور تو تمام چیزوں کی خبر رکھتا ہی

سلہ اس کا ترجمہ اوپر گزر چکا ۱۲

مناظرہ جب حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو وہ مجادلہ کہلاتا ہے۔ ان وقتوں کے مسلمانوں کو جو نیک صلاح دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی غیر مذہب کے ساتھ مناظرے کے پہلو پر نہ آئیں۔ اور اگر بضرورت آ نا پڑے تو مناظرے کو مجادلے کی حد میں نہ آنے دیں اور

لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ

اور (مسلمانو) جو لوگ خدا کے سوا (دوسرے دوسرے معبودوں کو حاجت روائی کے لیے) بلایا (یعنی اُن کی پرستش کیا) کرتے ہیں اُن کو بُرا نہ کہو کہ یہ لوگ (بھی) براہِ نادانی ناحق (ناروا) خدا کو بُرا کہہ بیٹھیں گے۔

کی تعلیمِ مفید کو پیشِ نظر رکھیں۔ اول تو لوگ عموماً دین کی طرف سے غافل ہیں صرف قرآن کے پڑھنے اور سمجھنے کے لالے پڑے ہیں۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ منسوخ کتابوں کا مطالعہ کیا کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص دین کی باتوں میں توغّل کرے اور مجتہدانہ پچھلی کتابوں کو دیکھتا پڑھتا رہے تو ہم اس کو کسی طرح کا الزام نہیں دے سکتے یہ خیال کرنا کہ پچھلی کتابوں کے پڑھنے سے آدمی اسلام کی طرف سے متشکّل ہو جائے گا واہمہ بے اصل ہے۔ ہم نے عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کو بالاستیعاب انگریزی عربی فارسی اُردو چاروں زبانوں میں بار بار پڑھا ہے اور پادری سکلٹن سے انجیل کی تفسیر بھی۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ان کتابوں کے پڑھنے سے قرآن کی قدر آئی۔ اور جس کو تاریخی مذاق ہے اُس کے حق میں تو پچھلی کتابوں کا دیکھنا از بس ضرور ہے کہ ان کتابوں کے مطالعے سے اُس کو قرونِ خالیہ کے لوگوں کی حالتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اُن کی افتادِ مزاج اور الٰہی تربیت۔

اقتدائے پیغمبراں

مولانا فرماتے ہیں کہ آیاتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام گزشتہ انبیاء علیہم السلام کا اصلِ دین ایک تھا اور سب اُسی اصلِ دین پر متفق تھے۔ اُن میں اگر اختلاف ہوا ہے تو اصلِ دین میں نہیں بلکہ اُس کے طریقوں میں ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اُن پر ایمان لانا اُن کی شریعتوں کو برحق جاننا۔ اُن کی کتابوں کا یقین کرنا اصلِ دین میں اقتدا کرنا۔ نفسِ نبوت میں ایک کو اعلیٰ دوسرے کو ادنیٰ۔ ایک کی تعظیم دوسرے کی تنقیص نہ کرنی فرض ہے اور تا وقتیکہ ہم ان باتوں کی پورے طور پر تعمیل نہ کریں مسلمان نہیں۔ اس امر کی تفصیل کہ انبیاء علیہم السلام کا اتفاق کن کن باتوں میں رہا ہے یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جس قدر انبیاء و رسل ہو گزرے ہیں سب کا اس پر اتفاق ہے کہ عبادت و استعانت صرف خدا کا حق ہے۔ جو باتیں خدا کی بارگاہِ قدس کے نامناسب ہیں اُن سے وہ پاک و منزہ ہے۔ بندوں پر خدا کا حق ہے کہ اُس کی انتہا درجے کی تعظیم کریں۔ اپنی جانوں اور دلوں کو خدا کے حوالے کر دیں۔ شعائر اللہ کے ذریعے سے قربِ خداوندی حاصل کریں اور اِس بات کا پکّا اعتقاد رکھیں کہ حوادث کے پیدا ہونے سے پہلے ہی خدا نے حوادث کو مقدّر کر دیا تھا۔ فرشتے خدا کے بندے ہیں۔ وہ خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔ اُنھیں جو حکم ملتا ہے اُس کی تعمیل کرتے ہیں اور بڑی سرگرمی سے تعمیل کرتے ہیں۔ خدا اپنے بندوں میں سے جس کو مستحق اور قابل سمجھتا ہے اُس پر کتاب نازل فرماتا ہے۔ اپنی اطاعت بندوں پر فرض کرتا ہے۔ قیامت کا برپا ہونا۔ مرے پیچھے جی اُٹھنا۔ جنت و دوزخ کا ہونا سب حق ہے علیٰ ہذا القیاس تمام انبیاء علیہم السلام اقسامِ طہارت اور نماز روزہ زکوٰۃ حج نوافل طاعت دعا ذکر کتابِ الٰہی کی تلاوت کرنے سے خدا کے حضور میں تقرّب حاصل کرنے پر متفق ہیں۔ نکاح اور حرمتِ زنا پر متفق ہیں۔ عدل و انصاف قائم کرنے پر متفق ہیں۔

ہر طرح کے ظلم کو حرام بتانے پر متفق ہیں۔ نافرمانوں پر حدود قائم کرنے میں متفق ہیں۔ یہ باتیں امورِ دین کی بیخ و بنیاد ہیں اور ان پر تمام انبیاء علیہم السلام کا ہمیشہ سے اتفاق رہا ہے۔ ہاں ان کی صورتوں اور شکلوں میں کچھ کچھ اختلاف ہوا کیا۔ مثلاً شریعت موسوی میں نماز کے وقت بیت المقدس کی طرف مونہ کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے پیغمبر کی شریعت میں کعبے کی طرف مونہ کرکے نماز پڑھنی ہوتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں زانی کی حد سنگساری تھی۔ ہماری شریعت میں محصن کے لیے رجم اور غیر محصن کے واسطے تازیانے مقرر ہیں اور اسی پر قیاس کر لو اوقاتِ طاعت اور آدابِ طاعت اور ارکانِ طاعت کو۔ الغرض ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ان چھوٹے چھوٹے اختلافات کو نظر انداز کرکے اصلِ شریعت میں ان کی پوری پوری اقتدا کریں۔ اور سب کو خدا کے برگزیدہ اور مقبول بندے جانیں ان میں سے ایک کی فضیلت اور دوسرے کی منقصت کے قائل نہ ہوں۔ ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ بعض خصوصیات میں تمام انبیاء و مرسلین سے افضل ہیں اور اس لحاظ سے ہمیں درست ہے کہ ان کی فضیلت و برتری اوروں پر ثابت کریں مگر اس کو کیا کریں کہ خود پیغمبر صاحب نے ہمیں اس سے منع کر دیا ہے۔ امام بخاری نے ایک حدیث بایں مضمون نقل کی ہے کہ ایک یہودی اور ایک صحابی میں کچھ تکرار ہو گئی یہودی حضرت موسیٰ کی برتری ثابت کرتا تھا اور صحابی پیغمبر صاحب کو حضرت موسیٰ پر ترجیح دیتے تھے آخر کار صحابی کو غصہ آ گیا اور انھوں نے یہودی کے مونہ پر زور سے طمانچہ مارا۔ وہ آیا پیغمبر صاحب کے پاس۔ آپ نے سارا قصہ سن کر فرمایا کہ مجھے حضرت موسیٰ پر ترجیح نہ دو کیوں کہ قیامت کے روز جب دوسری دفعہ صور پھونکا جائے گا اور تمام اولین و آخرین بے ہوش ہو کر ہوش میں آئیں گے۔ تو موسیٰ عرش کا کونہ پکڑے کھڑے ہوں گے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ بھی اور لوگوں جیسے بیہوش ہوں گے یا نہیں۔ بخاری کی ایک اور روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو تم یونس بن متّٰی پر میری فضیلت اور برتری ثابت نہ کرنا۔"

ایمان بالکتب

مولانا فرماتے ہیں کہ تیسری چیز جس پر ایمان لانے کا حکم ہے کتابیں ہیں۔ جو خدا نے پیغمبروں پر نازل کی ہیں۔ بڑی کو کتاب اور چھوٹی کو صحیفہ کہتے ہیں۔ اور کبھی بڑائی چھٹائی کا لحاظ نہیں بھی کیا جاتا۔ جس طرح خدا نے پیغمبروں کا شمار ہم کو نہیں بتایا پیغمبروں کی کتابیں اور ان کے صحیفے بھی محفوظ نہیں۔ یوں کہنے کو چار کتابیں بہت مشہور ہیں زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ توراۃ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر۔ انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر۔ اور آخر میں قرآن مجید حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ مولانا اگرچہ فرماتے ہیں کہ ہم جناب مسیح علیہ السلام یا ان کی والدہ یا انجیل کی مذمت کا کوئی کلمہ مونہ سے نکالیں سیدھے جہنم میں چلے جائیں مگر اسی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ مسلمان تو قرآن مجید کے ہوتے زبور اور توراۃ اور انجیل کی طرف التفات نہیں کرتے اور التفات کرنے کی ضرورت بھی نہیں کیوں کہ قرآن مجید ہمیشہ کے لئے تمام دینی و دنیاوی ضرورتوں کے لئے کفایت کرتا ہے۔ مگر عیسائیوں اور یہودیوں نے توراۃ کو محفوظ رکھا ہے۔ اس میں توراۃ و زبور کے علاوہ چند پیغمبروں کے صحیفے بھی شامل ہیں۔ مجموعے کو بائبل یعنی عہدِ عتیق کہتے ہیں اور عہدِ عتیق کے مقابلے میں انجیل کو عہدِ جدید۔ عہد کے معنی ہیں وہ معاہدہ جو خدا نے بندوں کے ساتھ کیا۔ ممکن ہے کہ عہدِ عتیق کے علاوہ کچھ صحیفے دوسرے پیغمبروں کے بھی ہوں۔ جو عہدِ عتیق کے مجموعے میں شامل نہیں۔ ہم مسلمان جو عہدِ عتیق اور عہدِ

جدید کی پروا نہیں کرتے - اس کے یہی معنی ہیں کہ قرآن کے ہوتے ہم کو ان کتابوں کے پڑھنے اور ان کے احکام پر عمل کرنے کی ضرورت باقی نہیں - اور قرآن کو جو ہم لوگ پچھلی کتابوں کا ناسخ مانتے ہیں وہ بھی اسی معنی کر ہے - علاوہ بریں ان کتابوں میں تحریف بھی پائی گئی ہے یعنی پیغمبر صاحب آخر الزماں کی پیشین گوئیاں براہ عداوت نکال ڈالی گئی ہیں اور جو باقی رہ گئی ہیں ان کے معنی ایسے کرتے ہیں جن سے پیشین گوئیوں کا مصداق کسی اور کو ٹھیراتے ہیں باایں ہمہ مولانا فرماتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو تمام پیغمبروں کی کتابوں پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے وہ ایمان بھی اجمالی ایمان ہے یعنی یہ کہ زبور - توراۃ - انجیل اجمالی طور پر ویسی ہی الہامی کتابیں ہیں جیسے قرآن نہ یہ کہ ان میں کہیں تحریف نہیں ہوئی اور نہ یہ کہ ان کے احکام اب واجب العمل ہیں قرآن میں جہاں کہیں اہلِ کتاب کا ذکر ہے ان سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں سب سے پہلا دینِ الٰہی یہودیوں کا ہے پھر ان سے جدا ہو کر نصاریٰ ہوئے - یہودیوں نے نہ عیسیٰ علیہ السلام کو مانا اور نہ ان کی کتاب انجیل کو - پھر آخر میں ہم مسلمان ہوئے یہود اور نصاریٰ دونوں نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے قرآن سے انکار کیا اور ہم مسلمان ہیں کہ یہود اور نصاریٰ دونوں کے بزرگوں اور دونوں کی کتابوں کو بھی مانتے ہیں جیسے نصاریٰ توراۃ کو اور تمام پیغمبروں کو جو عہد عتیق میں ہیں - مگر توراۃ میں داؤد - اور سلیمان - اور لوط علیہم السلام کو پیغمبر نہیں کہا -

قرآن ہی ایک بہت بڑا معجزۂ اسلام ہے

مولانا فرماتے ہیں کہ بہت سے کیا کل تقلیدی مسلمان پیغمبر صاحب کی رسالت کی تائید میں معجزے اور پچھلے پیغمبروں کی پیشین گوئیاں پیش کرتے ہیں - مگر ناظرین کو معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے مولانا چوں کہ فطرۃً فطرت پرست اور فطرت ہی کی وجہ سے وہ مسلمان ہوئے ہیں -

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الروم)

تو (اے پیغمبر) تم تو ایک (خدا) کے ہو کر (اس کے) دین کی طرف رُخ کیے رہو (یہ) خدا کی (بنائی ہوئی) سرشت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی (بنائی ہوئی) بناوٹ میں ردّ و بدل نہیں ہو سکتا یہی دین (کا) سیدھا (رستہ) ہے مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے +

غرض فطرت مولانا کے ساتھ آئی اور فطرۃ ہی ان کے ساتھ قبر میں جائے گی - نہ فطرت ان کو چھوڑ سکتی ہے اور نہ وہ فطرت کو چھوڑ سکتے ہیں - ع یہ ناطہ خدا کا لگایا ہوا ہے - یہ کیوں کر چھوٹ سکتا ہے - مذہب کی کوئی سی بات بھی ہو چھوٹی یا بڑی مولانا تو فطرت ہی کی کسوٹی پر کس کر اس کا کھوٹا کھرا پرکھا کرتے ہیں - معجزے کے معنی ہی خلافِ فطرت کے ہیں، در اسلام ٹھیرا عین فطرت - وہ دو مخالفوں کو جمع کرنا نہیں چاہتے - لوگ خلافِ فطرت سے خدا کی قدرت کے قائل ہوتے ہیں اور مولانا خود فطرت سے - خلافِ فطرت شاذ ہے اور فطرت اکثر - اکثر کو چھوڑ کر سچ ہے کہ وہ شاذ کا سہارا کیوں ڈھونڈیں تاہم دو باتیں مولانا کو معجزے کا انکار نہیں کرنے دیتیں - ایک خدا کی قدرت کہ وہ چاہے پانی سے جلانے کا کام لے اور آگ سے بجھانے کا دوسرے خدا کے کاموں میں دخل دینا چھوٹا منہ بڑی بات ہے -

لَا يُسْـَٔـلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔـلُوْنَ (الانبیاء)

جو کچھ وہ کرتا ہے اس کی بازپرس اس سے نہیں کی جا سکتی اور (ان) لوگوں سے (ان کے کیے کی) بازپرس ہونی ہے

ممکن ہے کہ خدا کسی مصلحت سے قانونِ فطرت کسی خاص صورت کے لئے ملتوی کر دے - پس مولانا منکرِ معجزہ نہیں ہیں بلکہ فطرت کے ہوتے اپنے اطمینان کے لئے معجزے کی ضرورت نہیں دیکھتے - کیوں کہ معجزے کے ثبوت میں ایک کمزوری بھی ہے کہ واقعہ ہمارا چشم دید تو ہی نہیں - بلکہ معجزہ ہے اُس کا وقوع سیکڑوں برس پہلے کا ہے اور اُس کا ثبوت مدارِ شہادت اور شہادت بھی اُن ہی وقتوں کی شہادت اور اُن لوگوں کی شہادت جن کا نام ہی نام ہم نے سُنا ہے - بھلا ایسی شہادت کو فطرت کی شہادت سے کیا مناسبت - حدیثوں میں تو معجزات کا کچھ شمار نہیں - مگر قرآن میں کہیں صاف لفظوں میں پیغمبر صاحب کے معجزوں کا مذکور نہیں - بلکہ بعض مقامات میں تو معجزے سے صریح انکار کیا گیا ہے جیسے

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا (بنی اسرائیل)

اور ہم کو (فرمائشی) معجزوں کے بھیجنے سے (کوئی اَور وجہ) مانع نہیں (ہوئی) مگر یہی کہ اگلے لوگوں نے اُن کو جُھٹلایا ف۱ چناں چہ ہم نے (قومِ) ثمود کو اونٹنی کا (کُھلا ہوا) معجزہ دیا تھا پھر بھی لوگوں نے (نہ مان کر) اُس کو ستایا (یہاں تک کہ اُس کو ہلاک کر دیا) اور (یہ جو) ہم معجزے (بھیجا کرتے ہیں تو) صرف ڈرانے کی غرض سے بھیجا کرتے ہیں ف۲

اور

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا

اور (اے پیغمبر کفارِ مکّہ تم سے) کہتے ہیں کہ ہم تو اُس وقت تک تم پر ایمان لانے والے ہیں نہیں کہ (یا تو) ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ بہا نکالو یا کھجوروں اور انگوروں کا تمہارا کوئی باغ ہو اور اُس کے بیچ بیچ میں تم (بہت سی) نہریں جاری کر دکھاؤ۔

ف۱ پیغمبر صاحب سے معجزوں کی فرمائشیں ہوتی تھیں اور وہ ہرانی جتانی باتیں تھیں ایسی درخواستیں منظور نہیں ہوئیں - اور وہ منظور ہونے کے قابل بھی نہ تھیں ایسے ہی معجزوں کی نسبت فرمایا ہے کہ ہم نے اگلے لوگوں کی تکذیب کے خیال سے ایسے معجزوں کا بھیجنا بند کر دیا ہے اور مثال بھی فرمائشی معجزے ہی کی دی ہے کہ قوم ثمود نے حضرت صالحؑ سے یہ درخواست کی تھی کہ پہاڑ سے اونٹنی پیدا ہو اُس پر بھی لوگوں نے نہ مانا اور ہمارے پیغمبر صاحب کے زمانے کے لوگ بھی اِسی قسم کے تھے کہ فرمائشی معجزے دیکھتے اور نہ مانتے ورنہ دوسرے معجزات سے قطعِ نظر خود قرآن ایک عظیم الشان جیتا جاگتا معجزہ موجود ہے ۱۲

ف۲ یعنی معجزوں سے اِس کے سوا کوئی اَور غرض متعلق نہیں - قرآن کی تعلیم کا تو خلاصہ یہ ہے کہ لوگ دنیا کے معمولی واقعات آسمان اور زمین اور دن اور رات اور ہوا اور بادل اور مینہ اور بجلی اور موت اور حیات اور چیونٹی اور مچھر وغیرہ سے خدا اور اُس کی قدرتوں کے قائل ہوں - پیغمبر صاحب نے بھی معجزے دکھلائے مگر اُنھوں نے معجزات پر کبھی زور نہیں دیا - اور چوں کہ معجزے کا وقوع ایک وقتِ خاص میں خاص شخصوں کے روبرو ہو سکتا ہے اور اُس میں بھی مخالفین چند در چند شکوک اور احتمال پیدا کرتے رہتے تھے - تو معجزہ کوئی ایسی مستحکم دلیل نہیں ہو سکتا ہے جس پر زور دیا جائے معمولی واقعات ایسے معجزات ہیں جو ہمہ وقت واقع ہوتے رہتے ہیں - اور کسی کو اُن میں گنجائشِ انکار نہیں ہو سکتی - وہ خاص طبیعتیں ہیں جو معجزے کی محتاج ہیں اور جن کی ایسی طبیعتیں ہوتی ہیں وہ معجزے پر بھی مشکل سے ایمان لاتے ہیں وہ ایک واقعہ غیر معمولی دیکھ کر فی الفور ڈر جاتے مگر اِدھر خوف زائل ہوا اُدھر پھر اصلی طبیعت کے شکوک نے عود کیا اور سحر وغیرہ پر محمول کرنے لگے ۱۲

أَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَٰئِكَةِ قَبِيلًا ۝ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَآءِ ۖ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا (بنی اسرائیل)

خدا یا فرشتوں کو (ہمارے) سامنے لا کھڑا کر دیا (رہنے کے لیے) کوئی تمھارا طلائی گھر ہو یا آسمان میں چڑھ جاؤ اور جب تک تم ہم پر (خدا کے ہاں سے ایک) کتاب اُتار کر نہ لاؤ کہ ہم آپ اُس کو پڑھ (بھی) لیں تب تک ہم تمھارے (آسمان پر) چڑھنے کو (بھی) باور کرنے والے نہیں۔ (اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہو کہ سبحان اللہ میں کیا چیز ہوں یہی ایک بندہ بشر خدا کا بھیجا ہوا اور بس۔

معراج اور شقِ صدر دو معجزوں کا حوالہ قرآن میں دیا جاتا ہے تو بعض مفسروں نے ان الفاظ کی ایسی توجیہ کی ہے کہ معجزہ گیا گزرا ہو جاتا ہے اور پھر مولنا فرماتے ہیں کہ معجزہ رسول کے اختیار کا تو نہیں۔

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ (الرعد)

اور کسی رسول کی طاقت نہ تھی کہ بے حکم خدا کوئی معجزہ لا دکھائے۔ ہر ایک وقت (موعود) کے لیے (ہمارے ہاں ایک قسم کی تحریر ہوتی ہے۔

تو معجزے سے رسالت پر استدلال کرنے کے کیا معنی۔ ہاں خدا کی قدرت پر استدلال کرو تو جائے سر بھی ہے۔ معجزات میں ایک قرآن کا معجزہ البتہ لاجواب ہے۔ جن دنوں قرآن نازل ہوا عرب میں فصاحت بلاغت کا بڑا چرچا تھا قاعدے کی بات ہے کہ جب بہت لوگ مل کر ایک کام پر متوجہ ہوتے ہیں تو اُس میں ضرور کامیابی ہوتی ہے۔ مثلاً یورپ و امریکا اور جاپان صنعت اور حرفت اور ایجاد میں منہمک ہیں تو اقوام روے زمین میں سب پر غالب اور سب سے پیش پیش ہیں۔ اُنھوں نے حکمتِ عملی میں ایک صدی کے اندر ہی اندر ایسی ترقی کی ہے کہ دیکھ کر عقل دنگ ہوتی ہے۔ یہی حال پیغمبر صاحب کے زمانے میں عرب کا تھا کہ اپنی زبان کو معراج الکمال پر پونہچا دیا تھا اور اپنے سوا سب لوگوں کو عجم یعنی گونگے کہتے تھے فصحاے عرب نے قوتِ گویائی سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر رکھا تھا۔ گویا شعرا ملک میں حکمرانی کر رہے تھے سارے کمالات گویائی اور زبان آوری کے آگے ہیچ تھے۔ ایسے وقت میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا۔ وہی عربی بولی تھی مگر خدا پیغمبر صاحب کی زبان سے بولتا تھا تو اُس کے الفاظ اور اُس کے مضامین کا کیا کہنا۔ اگر کلام خدا فصحا کے کلام سے کسی بات میں اُنیس بیس کے فرق سے بھی گرا ہوا ہوتا تو عرب کے لوگ جن کو اپنے حسنِ کلام پر بڑا فخر و ناز تھا اُس کو چٹکیوں میں اُڑاتے مگر باوجودیکہ اَلْحَقُّ مُرٌّ شرک اور بت پرستی کی مذمت ہوتی تھی یا پند و نصیحت کی ناگوار باتیں اور وہ بھی نثر میں مگر پیرایہ کچھ ایسا دلچسپ ہوتا تھا کہ جو سُنتا تھا لٹّو ہو جاتا تھا۔ اور سرآمد شعرا اپنی جگہ لوہا مان گئے تھے۔ غرض خدا نے اہلِ عرب کو اُسی داو سے پچھاڑا جو اُن کو خوب رواں تھا۔ اِدھر سے بار بار تحدی ہوتی تھی کہ

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِن لَّمْ

اور وہ جو ہم نے اپنے بندے (محمد) پر (قرآن) اُتارا ہے اگر تم کو اُس میں شک ہو اور (یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب خدا کی نہیں بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے) اور (اپنے اس دعوے میں) سچے ہو تو اسی جیسی ایک سورۃ (تم بھی بنا) لاؤ اور

نَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (البقرہ)

اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بھی بُلا لو[1] پس اگر (اتنی بات بھی) نہ کرسکو اور ہرگز نہ کرسکو گے تو (دوزخ کی) آگ سے ڈرو جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے (اور وہ) منکروں کے لیئے (دہکی دہکائی) تیار ہے۔

اور

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى أَنْ يَّأْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل)

(اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہو کہ اگر آدمی اور جنات جمع (ہو کر اس بات پر آمادہ ہوں) کہ اِس قرآن کی طرح کا (اور کلام) بنالائیں تاہم اس جیسا نہیں (بنا) لاسکتے اگرچہ ان میں سے ایک کی پُشتی پر ایک (کیوں نہ) ہو۔

اور اُدھر سب کو سانپ سونگھ گیا تھا کچھ جواب ناہیں۔ کیا معجزے کے سر میں سینگ ہوتے ہیں۔؟ اس سے بڑھ کر اَور معجزہ کیا ہو سکتا ہے اور یہ کیسی مزے کی بات ہے کہ اَور معجزے تو اس قسم کے ہیں کہ پیغمبر نے خلافِ فطرت ایک بات واقع کر کے دکھا دی۔ معدودے چند نے دیکھا کسی نے جادو سمجھا کسی نے معجزہ۔ بات گئی گزری ہوئی۔ اب بعد الوقوع معجزہ ایک واقعۂ تاریخی ہو گیا بیٹھے بیٹھے تحقیقات کیا کرو کہ واقع میں ہوا بھی تھا یا وہی پیراں نمی پرند مریداں می پرانند۔ قرآن یہ ایک ایسا زندہ معجزہ ہے کہ روزِ نزولِ قرآن سے الیٰ ساعتنا ھذہٖ برابر فاتوا بسورۃ من مثلہ۔ اور۔ قل لئن اجتمعت الانس والجن۔ کی تحدّی ہو رہی ہے اور جب تک قرآن پڑھا پڑھایا جائے گا یعنی روزِ قیامت تک ہوتی رہے گی۔ کسی نے تحدّی کے جواب کی ہامی بھری؟ کیا عربی زبان روئے زمین پر سے معدوم ہو گئی؟ یا جن ملکوں میں عربی بولی جاتی ہے مخالفان اسلام نہیں بستے؟ سوا تیرہ سو برس کے عرصے میں کسی نے تو جواب کی جرأت کی ہوتی۔ غرض مولانا نے فطرت کی دلائل سے پیغمبر صاحب کو پیغمبر مانا۔ اور اُسی کے ساتھ قرآن کو کلام الٰہی تسلیم کیا۔ پیغمبر صاحب کی رسالت اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کا ایک اَور بدیہی ثبوت

مولانا جب سے قرآن کے سمجھنے پر قادر ہوئے۔ اُس کے استحسان میں کبھی ایک لمحے کے لیئے بھی کمی نہیں ہوئی۔ اور اُس نے اُن کو وہ کام دیا جو عصا کام دیتی ہے ایک بڈھے مرتعش کو۔ مولانا نے ہر طرف سے مایوس ہو کر خیال کیا کہ میں بڑے بڑے نامی گرامی آٹھ و ّں کی نظم و نثر دونوں طرح کے کلام پڑھتا ہوں زمانۂ جاہلیت کے مخضرمین[2] کے۔ اسلام کے بعد اور خود آنحضرت صلعم کے جن کے مونہ سے الفاظِ قرآنی نکلے اور آپ کے دوسرے مقالات مجلداتِ احادیث میں منضبط ہیں۔ مواعظ ہیں۔ خطبات ہیں۔ قصص و حکایات ہیں۔ مراسلات ہیں۔ یہ بات کیا ہے کہ قرآن کی عبارت کو

[1] پیغمبر صاحب اپنی پیغمبری اور قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کے بہت سے دلائل پیش کرتے تھے اُن میں سے یہ دلیل سب سے زیادہ مستحکم تھی کیوں کہ جن دنوں قرآن نازل ہوا عرب میں فصاحت و بلاغت کا بڑا چرچا تھا۔ شعر موزوں کر دینا اُن کے نزدیک ایک معمولی سی بات تھی لونڈیاں تک مختلف مضامین پر ایسے برجستہ اشعار کہہ دیا کرتی تھیں کہ آج اچھے سے اچھا ادیب اُن کا مثل نہیں کہہ سکتا تو ایک اَن پڑھ پیغمبر کا پکار پکار کر کہنا کہ اس طرح کی ایک ہی سورت بنالاؤ بڑی وقعت رکھتا ہے اور یہ ایک ایسا معجزہ ہے کہ تا قیام قیامت مستمر ہے ۱۲ مصنفین ۱۲

[2] جنھوں نے جاہلیۃ و اسلام کے دونوں زمانے پلائے ۱۲

کوئی نہیں پاتا۔ دوسرے مصنف اِس پر قادر نہ ہوں تو خیر۔ مگر ایک ہی قائل کیوں کر دو مختلف طرزوں میں اور مختلف بھی اِس درجے کے کہ زمین و آسمان کا تفاوت۔ کلام کرنے کی قدرت پا سکتا ہی۔ یہ تو عادۃً محال ہی۔ مثلاً ہندی شعرا میں سے زیادہ نہیں۔ میر تقی۔ اِنشاءاللہ خاں۔ سودا۔ تین شاعروں کو لو۔ ہر ایک کی طرز جداگانہ ہی۔ اور جو سخن فہم ہیں مضمون اور بندش سے پہچان لیتے ہیں کہ اِن تین میں سے کس کا شعر ہی۔ میر صاحب کے مضامین حسرت آلود ہوتے ہیں اور زبان نہایت درجہ شستہ اور سلیس۔ یہ بات خاص میر صاحب ہی میں دیکھی گئی کہ ضرورتِ شعری کی وجہ سے لفظ کا دب کر نکلنا بھی جائز نہیں رکھتے۔ اِنشاءاللہ خاں پھکڑ ہیں بیان میں شوخی۔ سودا ہر قسم کے مضامین پر قادر ہیں۔ بندش بھی مضبوط ہوتی ہی۔ متاخرین میں مثلاً داغ اور امیر میں تمیز کرنا کیا مشکل ہی۔ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ۔ غرض ہر ایک کی اپنی اپنی طرز ہی۔ مولانا کو خود ایسا اتفاق ہوا ہی کہ بہ ضرورت کسی اخبار میں کوئی مضمون دیا اپنے نام سے نہیں مگر تاڑنے والے تاڑ گئے کہ یہ مولانا کا مضمون ہی۔ پس یہ عقدہ کہ پیغمبر صاحب نے دو طرح کے کلام پر کیوں کر قدرت پائی مولانا نے اِس طرح حل کیا کہ پیغمبر صاحب کی اپنی طرز تو وہی تھی جو احادیث سے ظاہر ہوتی ہی۔ رہا قرآن وہ پیغمبر صاحب کا کلام ضرور تھا کیوں کہ اُن کے مُونہ سے ادا ہوتا تھا۔ مگر نزولِ وحی کے اوقاتِ خاص میں جب کہ وہ اپنے اختیار میں نہیں ہوتے تھے ؎

چوں کلامِ خدا کلامِ خدا است ۔۔۔ از صفاتِ کلامِ بندہ جدا است

ایمان بالملائکہ مولانا فرماتے ہیں کہ فرشتے جن پر ایمان لانے کا حکم ہی۔ ایک جداگانہ مخلوق ہی از قسمِ جنات۔ جو نیک ہیں وہ فرشتے کہلاتے ہیں اور بدوں کو جن کہتے ہیں۔ لوگوں کا مقولہ تو یہ ہی کہ فرشتے نور سے بنے ہیں اور جنات آگ سے اور دونوں جیسی شکل چاہتے ہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ فرشتوں کی شکل و صورت کے بارے میں قرآن اتنا ہی بتاتا ہی کہ یہ ایک خاص طرح کی مخلوق ہیں اور اُن کے دو دو۔ تین تین۔ چار چار اور زیادہ بھی پَر ہوتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ط

ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو (سزاوار) ہی جس نے (محض عدم سے) آسمان اور زمین بنا نکالے (اور) اُسی نے فرشتوں کو (اپنا) قاصد بنایا جن کے دو دو۔ اور تین تین اور چار چار پر ہیں (اپنی مخلوقات کی) بناوٹ میں جو چیز چاہتا ہی زیادہ کر دیتا ہی۔

اسلام سے پہلے عرب کے ایک گروہ کا یہ عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ اِس عقیدے پر قرآن میں کئی جگہ بڑی سختی کے ساتھ اعتراض کیا گیا ہی۔ فرشتوں کے شمار کا بھی قرآن سے کچھ پتا نہیں چلتا۔ مگر حدیث میں آیا ہی کہ سارے آسمان میں ایک چپہ بھر زمین نہیں جہاں فرشتہ سجدے میں پڑا ہوا خدا کی تسبیح و تقدیس نہ کرتا ہو۔ یعنی فرشتوں کی یہ کثرت ہی۔ بقیاسِ دنیا فرشتے بارگاہِ الٰہی کے چوب دار اور حشم و خدم کی طرح کے ہیں۔ اُن میں سے بہتیروں کو انتظامِ دنیا کی خدمتیں سپرد ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جو ہمہ وقت مصروفِ عبادت رہتے ہیں بلکہ نیک بندوں کے لیے طلبِ مغفرت کرتے رہتے ہیں۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ

اور فرشتے (ہیں کہ) اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ (اُس کی) تسبیح و تقدیس بولتے ہیں ۔۔۔ ۱۲

یَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ — میں لگے ہیں اور جو لوگ زمین میں (رہتے) ہیں اُن (کے گناہوں) کی معافی مانگا کرتے ہیں۔

قرآن سے صرف تین فرشتوں کا نام ملتا ہے۔ اوّل حضرت جبرئیل جن کا خطاب ہی امین۔ یہ حضرت حامل وحی ہیں۔ یعنی پیغمبروں کے پاس حکم الٰہی یہی لاتے رہے ہیں۔ امین اس سے کہلائے کہ پیام الٰہی میں اپنی طرف سے کمی بیشی نہیں کر سکتے۔ پیام الٰہی امانت ہے اور یہ اُس کے امانت دار۔ دوسرے حضرت میکائیلؑ

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ — جو شخص اللہ کا دشمن ہو اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کے رسولوں کا اور (خاص کر) جبرئیل (فرشتے) کا اور میکائیل (فرشتے) کا تو اللہ بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔

یہ بندوں کے رزق پر مسلّط ہیں یعنی جہاں حکم ہوتا ہے وہاں پانی برساتے ہیں۔ جس سے بندوں کی روزی پیدا ہوتی ہے

تیسرے مالک داروغہ جہنّم ہیں

وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ — اور (دوزخی داروغہ جہنم کو) آوازیں دیں گے کہ اے مالک (تم ہی کوئی ایسی تدبیر کرو کہ کہیں) تمھارا پروردگار ہمارا کام تمام کر چکے۔

ان کے علاوہ دو اور معزّز فرشتے ہیں جن کے نام تو قرآن میں مذکور نہیں ہوئے مگر خدمتوں کا ذکر موجود ہے۔ ایک حضرت عزرائیل۔ یہ حضرت بندوں کی جان قبض کرنے پر مامور ہیں اور ان کی ماتحتی میں فرشتوں کا ایک بڑا گروہ رہتا ہے۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ — اور فرشتے (اُن کی جان نکالنے کے لیے اُن پر طرح طرح کی) دست درازیاں کر رہے ہیں (اور کہتے جاتے ہیں) کہ اپنی جانیں نکالو۔

دوسرے حضرت اسرافیل جو قیامت کے روز صور پھونکیں گے۔ باقی چند فرشتوں کی خدمتیں معلوم ہیں نام معلوم نہیں اول کراماً کاتبین

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ — حال آں کہ تم پر (ہمارے) چوکیدار (تعینات) ہیں (یعنی) کراماً کاتبین (فرشتے) جو کچھ بھی تم کرتے ہو اُن کو معلوم رہتا ہے۔

لفظ کراماً کاتبین کے معنی ہیں معزّز لکھنے والے۔ دو فرشتے ہر شخص کے ساتھ تعینات ہیں۔ ایک اعمالِ صالحہ لکھتا رہتا ہے اور ایک اعمالِ بد۔ قرآن میں ایک آیت ایسی بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کے ساتھ چند فرشتے محافظ بھی رہتے ہیں۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ — (انسان کسی حالت میں بھی ہو) اُس کے آگے اور اُس کے پیچھے باری باری سے (خدا کے) موکّل لگے رہتے ہیں جو بحکم خدا اُس کی حفاظت کرتے ہیں۔

پھر آٹھ فرشتے قیامت کے دن عرشِ الٰہی کو اُٹھائے ہوں گے۔ اُن کے نام بھی نہیں فرمائے خدمت بتا دی ہے۔

وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ — اور اُس دن تمھارے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اپنے اوپر اٹھائے ہوں گے

پھر اُنیس[۱] زبانیہ دوزخ ہیں۔ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ۔ فرشتوں کا شمار اور اُن کی خدمات یہ سب اسرارِ الٰہی ہیں اُن کے بارے میں

[۱] اُس پر (یعنی دوزخ پر) اُنیس (پاسبان تعینات) ہیں ۱۲

کاوش کے ساتھ پوچھ پاچھ کرنا بے سُود اور بے سود ہونے کے علاوہ حدِّ بشریّت سے تجاوز کرنا ہی۔ احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہی کہ کچھ فرشتے دن میں زمین پر رہتے ہیں پھر عصر کے وقت اُن کی بدلی ہو جاتی ہی اور رات کے لیئے دوسرے فرشتے آتے ہیں۔ دن کے فرشتے بارگاہِ الٰہی میں بندوں کے حالات عرض کرتے ہیں۔ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کو کئی بار بچشمِ سر دیکھا۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى — اور انھوں نے (یعنی پیغمبر نے) تو (معراج کے وقت) سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جبرئیل کو ایک دفعہ اور بھی (اصلی صورت پر اپنے پاس آیا ہوا) دیکھا تھا۔

تو فرشتوں کے ساتھ ایمان لانے کا یہ مطلب ہی کہ اُن کا ہونا تسلیم کیا جائے اور ہونے کے ساتھ اُن کی خدمات جو بارگاہِ خداوندی سے اُن کے سپرد ہیں اور یہ کہ اُن میں نر و مادہ ہونے کی صلاحیت نہیں نہ اُن میں نافرمانی کا مادہ ہی۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ — خدا جو اُن کو حکم دے اُس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو اُن کو حکم دیا جاتا ہی (بے کم و کاست) اُس کی تعمیل کرتے ہیں۔

وہ بھی خدا کے بندے ہیں اور خود کسی طرح کا اختیار نہیں رکھتے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ نئے مذہبی فرقوں میں ایک فرقہ ہی جو نیچری کہلاتا ہی۔ یہ لوگ اکثر انگریزی خواں ہیں اور اُن کے معتقدات فلسفیوں کے سے ہیں ہر ایک بات میں رائے کو بہت دخل دیتے ہیں۔ باتیں تو بہت ہیں مگر مولانا کو کسی کے ساتھ مناظرہ کرنا نہیں اِس واسطے کہ مناظرہ سے نہ کبھی کوئی بات فیصل ہوئی ہی نہ آیندہ ہو مگر چوں کہ قرآن مجید میں فرشتوں پر ایمان لانا ایمان باللہ کا جزو قرار دیا گیا ہی مولانا کو مناظرے کے طور پر نہیں بلکہ اپنا خیال ظاہر کرنے کے لیئے بیان کرنا ضروری ہی کہ فرشتوں کے بارے میں عام اسلامی عقیدہ تو یہ ہی کہ فرشتے نور کے بنے ہوئے خاص مخلوق ہیں اُن میں نر و مادہ نہیں ہوتے۔ وہ جو جسمانی صورت چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ جبرئیل حاملِ وحی جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آدمی بن کر بھی آتے رہے فرشتوں کی طبیعتوں میں آدمی کی طرح بدی کا تقاضا نہیں۔ وہ نیکی اور خدا کی فرماں برداری پر مجبول ہیں۔ غرض وہ شاہی چوبداروں کی طرح کے ہیں۔ فرشتے اور جن ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اتنا فرق ہی کہ فرشتے نور سے بنے ہیں اور جن آگ سے اور جنّوں میں کا ایک جن شیطان بھی ہی۔ چوں کہ اِس طرح کی مخلوق دیکھنے میں نہیں آئی فلسفی جنّوں اور فرشتوں اور شیطان کسی کے قائل نہیں۔ فلاسفہ کے تمام اعتراضات اور اشتباہات پیدا ہوئے اِس سے کہ اُنھوں نے مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا[1] پر تو نظر کی نہیں ہر کس را عقلِ خود بکمال و فرزندِ خود بجمال" کے مطابق براہِ خود پسندی اپنی معلومات کو جامع اپنی عقل کو کامل۔ اپنے ذہن کو رسا فرض کر لیا۔ اور جو بات سمجھ میں نہ آئی بجائے اِس کے کہ اپنے قصورِ فہم کے معترف ہوں اور ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن — کہ جاہا سپر باید انداختن

[1] اور تم لوگوں کو اسرارِ الٰہی میں سے بس تھوڑا ہی سا علم دیا گیا ہی ۱۲

پر عمل کریں۔ لگے اُس کو جھٹلانے تاکہ فرمودۂ خدا

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ○

یہ لوگ لگے اُس چیز کو جھٹلانے جس کے سمجھنے پر اُن کو دسترس نہ ہوا اور ابھی تک اُس کی تصدیق کا موقع ہی اُن کو پیش نہیں آیا۔ اسی طرح اُن لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا جو اِن سے پہلے ہو گزرے ہیں (اے پیغمبر) دیکھو (اُن) ظالموں کا کیسا (بُرا) انجام ہوا۔

پورا ہوا اور وہ پورا ہونا ہی تھا۔ فلسفی نے جو کچھ اپنی معلومات اپنی عقل اپنے ذہن کی نسبت سمجھا غلط سمجھا۔ ایاز قدرِ خود بشناس۔ اِس کی معلومات کا تو یہ حال ہی کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہی انسانی معلومات کا ذخیرہ بڑھتا چلا جارہا ہی نئی نئی چیزیں دریافت ہوتی جاتی ہیں۔ جو پہلے لوگوں کے وہم وگمان میں بھی نہ تھیں۔ کمالِ عقل اور رسائیِ ذہن کی یہ کیفیت ہی کہ آدمی باس کے پاس اپنی روح کی حقیقت تو تاحدِ اطمینان دریافت نہیں کرسکا۔ اور دریافت کر بھی نہیں سکے گا اس لئے کہ خدا نے

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي

اور (اے پیغمبر۔ لوگ) تم سے روح کی حقیقت دریافت کرتے ہیں تو (اُن سے) کہہ دو کہ روح (بھی) میرے پروردگار کا حکم ہی۔

فرما کر اُس کو اِس تفتیش سے روک دیا ہی۔ ایسا ارخود بے خبر اسرارِ الٰہی ہیں جن کا شمار نہیں کیا دخل دے سکتا ہی اور دخل دینا چاہے تو یہ اُس کی یاوہ سَری ہی ؎ تو کارِ زمیں را نکو ساختی ؎ کہ با آسماں نیز پرداختی ؎ مخلوقاتِ عالم پر نظر کرتے ہیں تو سارا جہان ایک حیرت کدہ دکھائی دیتا ہی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عظیم الشّان کارخانہ بایں حسن وخوبی کیونکر موجود ہو گیا اور اِس ربط وضبط کے ساتھ کیوں کر چل رہا ہی۔ مُشتے نمونہ از خروارے مثال کے طور پر ایک آدمی کو لیتے ہیں کہ شروع میں مٹی تھا پھر مٹی سے نباتات کی شکل میں آیا۔ پھر حیوان کی۔ پھر آدمی کی۔ بھلا مٹّی کو جیتے جاگتے چلتے پھرتے سوچتے سمجھتے آدمی سے کیا مناسبت۔ اسی طرح کوئی سا پھل پھول اور درخت لو عقل نہیں کام کرتی کہ بیج نے یہ رنگ وبُو یہ ذائقہ یہ نقش ونگار یہ تن وتوش کہاں سے پایا۔ ہمہ وقت ہزارہا واقعات واقع ہوتے رہتے ہیں اور بڑے سے بڑا بوجھ بجھکڑ آدمی بھی اُن کی لِمّ نہ آپ سمجھتا ہی اور نہ سمجھا سکتا ہی ایک فارسی شاعر نے کیا اچھا کہا ہی

ہرکس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ ؎ ایں ہا ہمہ راز ست کہ معلومِ عوام است

خواجہ حافظِ شیراز فرماتے ہیں اور خوب فرماتے ہیں۔

سخن از مطرب ومی گو وراز دہر کم ترجو ؎ کہ کس نکشود ونکشاید بحکمت ایں معمّارا

عربی کا مشہور شاعر متنبّی کہہ گیا ہی۔

کُلُّ مَا لَمْ یَکُنْ مِنَ الصَّعْبِ فِی الْاَنفُس ؎ سَھْلٌ فِیْمَا اِذَا ھُوَ کَانَا

اِسی طرح کے مضامین ہیں۔ جن کی وجہ سے شعرا کو تلامذۃ الرحمٰن کہا جاتا ہی یہ خیالات دل میں جاگزیں ہوں تو ایک صحیح العقل

سلیم الفطرت آدمی اشتباہ واعتراض کا نام بھی نہیں لے سکتا۔ وہ جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھے گا ایک سے ایک عجیب چیز اُسے دکھائی دے گی۔ اور وہ بے اختیار بول اُٹھے گا۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ط سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ہ

اے پروردگار تُو نے اس (کارخانۂ عالم) کو بے فائدہ (تو) نہیں بنایا تیری ذات (ایسے فعل عبث کے کرنے سے) پاک ہے (اور یہ کارخانہ خبر دے رہا ہے کہ آخرت میں نیکی کی جزا اور بدی کی سزا ہونی ہے، تو اے ہمارے پروردگار ہم کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھیو۔

پھر فلسفی جو ازل اور ابد کے قُلّابے ملاتے اور ہر ایک چیز میں رائے زنی کرتے ہیں اور اُن کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ لوگ جہان کے بنانے پیدا کرتے وقت خدا کے صلاح کار تھے۔

مَا أَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلَا خَلْقَ أَنْفُسِهِمْ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّينَ عَضُدًا

ہم نے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرتے وقت بلکہ خود شیاطین کے پیدا کرتے وقت بھی شیاطین کو (اپنی مدد کے لیے) نہیں بُلایا اور ہم (کچھ گئے گزرے) نہ تھے کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا (قوتِ) بازو بناتے

غرض فلسفی بڑے لمبے چوڑے دعووں کے ساتھ عجائباتِ دنیا کے متعلق وثوق کے ساتھ کوئی بات بھی نہیں کہہ سکتے۔

مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ

ان کو معاملۂ تقدیر کی کچھ خبر تو ہے نہیں نری اٹکلیں دوڑا رہے ہیں۔

ہاں اٹکلیں دوڑاتے ہیں کہ مثلاً آدمی کے جدِّ امجد بندر رہے ہوں گے۔ اچھا یوں سہی۔ مگر اس سے زندگی کا معمّا تو حل نہیں ہوتا

کج دار و مریز ساقی دیر — مے بین و مکن حوالہ بر غیر
ایں نقش کہ دانیش نمونہ — کُہنش زدہ نعل واژگونہ

مولانا ایک موٹی سی بات پوچھتے ہیں کہ ایک پہیلی مرغی اور انڈے اور درخت اور بیج کی ہے کہ ان میں سب سے پہلے توالد و تناسل کیوں کر شروع ہوا۔ انڈے اور بیج کو جڑ قرار دو تو مشکل اور مرغی اور درخت کو اصل ٹھیراؤ تو مشکل۔ اس سے ثابت ہے کہ نیچر کے اصول ضرور ازلی نہیں اور ممکن ہے کہ ابدی بھی نہ ہوں۔ کوئی بدعقل جو خدا ہی کا قائل نہیں اس قسم کے اعتراضات اور شبہات کرے تو ایک بات بھی ہے بڑا تعجب اور افسوس تو اُس وقت ہوتا ہے کہ جب کوئی آدمی خدا کو مان کر کہتا ہے کہ فرشتوں اور جنّوں اور شیطان کا ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اسی لیے مجھے اُن کا ہونا تسلیم نہیں۔ یا میں کسی معجزے کے وقوع کو باور نہیں کرتا۔ یا میں کسی دعا کا معتقد نہیں کہ وہ حصولِ مدعا کا سبب ہو سکتی ہے۔ یا یہ کہ گناہ نزولِ عذاب کا سبب ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔ یا جنت اور دوزخ اور قیامت کی وہی حقیقت ہے جو مذہبی کتابوں میں بیان کی جاتی ہے۔ یا آفرینش کا سلسلہ اسی طرح پر شروع ہوا ہے جیسا آسمانی کتابوں میں لکھا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بات اس کی سمجھ سے باہر ہے اور اسی وجہ سے اُس کو انکار ہے تو ہم نہیں سمجھتے کہ خدا کو اُس نے کیوں کر سمجھ لیا اور خدا کو سمجھ لیا تو پھر اس کو کسی چیز کسی بات پر تعجب اور انکار کا کیا حق باقی رہا۔ گُڑ کھاؤں اور گُلگُلوں سے پرہیز۔ ہاں اس کو اس بات سے اپنا اطمینان کر لینا ہوگا کہ جو بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی وہ خدا کی اُتاری ہوئی کتاب میں بھی ہے یا نہیں۔ خدا کے رسول نے بھی فرمائی ہے یا نہیں۔ اگر خدا کی اُتاری ہوئی کتاب میں ہے۔

یا خدا کے رسول نے فرمائی ہی تو سمجھ میں آئے یا نہ آئے اِس کو بے چون وچرا ماننا پڑے گا اور توجیہ و تاویل کی اجازت نہیں دی جائے گی - نہ یہ کہ سمجھ میں نہ آنے کا عذر کر کے پہلے سے منکر ہو بیٹھے اور فرمودۂ خدا اور رسول ہونے کی طرف سے اطمینان کرنے کے اَور بہت سے رستے ہیں -

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

بات یہ ہی کہ دلوں سے دین و مذہب کی وقعت اُٹھ گئی ہی اور دنیا کی چند روزہ زندگی اور خوش حالی نے آدمی کو خدا کی جناب میں مغرور اور گستاخ کر دیا ہی - دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہی - قرآن کو ناولوں اور اساطیر الاولین کی طرح بے پروائی اور بے باکی کے ساتھ پڑھتے ہیں اصلِ مطلب کی طرف توجہ نہیں - بات بات میں لایعنی خدشے واقع ہوتے ہیں خدا تعالیٰ جلّ و عَلا شانُہٗ نے قرآن کے حق میں فرمایا ہی -

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ

(اے پیغمبر) اگر ہم نے قرآن کسی پہاڑ پر اُتارا ہوتا (اور آدمی کی طرح اُس کو شعور بھی ہوتا) تو تم اُس کو دیکھ لیتے کہ خدا کے ڈر کے مارے جھک گیا (ہوتا اور) پھٹ پڑا ہوتا اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ سوچیں (سمجھیں)

غرض مولانا فرماتے ہیں کہ جس طرح آنکھیں دیکھنے کے لیے ہیں اُسی طرح عقل سوچنے سمجھنے کے لیے تو جس طرح ہم تاریکی میں آنکھوں کو دیکھنے کی تکلیف نہیں دیتے بعینہ اِسی طرح غوامضِ اَسرارِ حکمتِ الٰہی میں عقل کو غور کرنے کی تکلیف دینی نہیں چاہیئے -

ایمان بالیوم الاٰخر

مولانا فرماتے ہیں کہ ایمان کا سلسلہ اس طرح پر ہی کہ پہلے آدمی خدا کا قائل ہو - پھر اس کا کہ وہ نیکی سے خوش اور بدی سے ناخوش ہوتا ہی اور نہ صرف یہ کہ خوش اور ناخوش ہو کر رہ جاتا ہی بلکہ نیکوں کو ثواب اور بدوں کو سزا دیتا ہی - کبھی تو دنیا ہی میں نیکی اور بدی کا نتیجہ مل جاتا ہی اور کبھی خدا اپنی مرضی سے روزِ آخرت پر موقوف رکھتا ہی - جب کہ دنیا کا سارا کارخانہ اُٹھا دیا جائے گا اور نیکی بدی کا حساب ہو کر آخیر فیصلہ کر دیا جائے گا - نیک بندے جنت میں ہوں گے اور نافرمان گنہگار دوزخ میں - مولانا فرماتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہی کہ روزِ آخرت کے فیصلے کے بعد جو زندگی ہوگی ہمیشہ کے لیے ہوگی - دنیا میں پھر آنا نہیں - ایک طرف تو قیامت کے ہونے کا یقین ایسا ضروری عقیدہ ہی کہ دین و مذہب کی ساری عمارت اسی ایک ستون پر قائم ہی - قیامت کے خیال کو دل سے نکال دو تو مکڑی کے جالے کی طرح انکار کی ایک پھونک دین و مذہب کی تمام بندشوں کو توڑ تاڑ برابر کر دے - دوسری طرف قیامت اپنی ذات سے ایسا معاملہ ہی کہ اس کے وقوع کا ثبوت رہتی دنیا تک مل ہی نہیں سکتا - جس سے دل کو اطمینان ہو اس لیے کہ ثبوت کسی قسم کا بھی ہو آخر کار معائنے اور مشاہدے پر جا کر منتہی ہوتا ہی اور یہاں معائنے اور مشاہدے کا موقع ہی نہیں - لے دے کر دلیل کہو ثبوت کہو دل کی گواہی کہ ایک عالم سمجھ رہا ہی کہ آدمی مرنے سے فنا نہیں ہوتا - یہی خیال دنیا میں نیکو کاری اور حسنِ معاشرت کا بڑا ضامن ہی - اسی خیال نے بڑے شاطر مجرموں سے جن پر تخویف اور تطمیع اور تعذیب کی تدبیریں بے اثر محض ثابت ہوئیں ارتکابِ جرم کا اقرار کرا چھوڑا ہی - اسی خیال پر لوگ مال اور جان جیسی عزیز چیز قربان کر دیتے ہیں -

یہی خیال دردمند کی تسلّی ہے۔ اور یہی خیال دنیا میں امن کا باعث ہے۔ اور اسی کا نام ہے فطرۃ جو تمام دلیلوں سے بڑی دلیل اور تمام ثبوتوں سے بڑا ثبوت ہے۔ بے شک سمجھ میں نہیں آتا کہ ہزاروں برس کے مُردے جن میں سے بعض سمندروں میں ڈوبے اور اُن کو مچھلیاں کھاگئیں اور بعض پارسیوں کے دخمے میں رکھ دیئے گئے اور چیلوں اور گدوں نے اُن کی بوٹیاں نوچ کھائیں اور بعض مدفونِ قبر ہو کر مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ کے مصداق ہوئے کیسے جِلا اُٹھائے جائیں گے اور جِلا اُٹھایا جانا بھی کیا۔ بَلٰى قَادِرِينَ عَلٰى أَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَهُ یہی وہ استبعاد تھا جس کو منکرینِ قیامت یہ کہہ کر ظاہر کرتے تھے

أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ۝

کیا (واقع میں) جب ہم مرگئے اور مٹّی اور ہڈیاں ہو کر رہ گئے کیا ہم (قیامت میں دوبارہ) اُٹھا کھڑے کیئے جائیں گے۔

جیسا استبعاد تھا ویسا ہی جواب ملتا تھا۔

أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ

کیا ہم اوّل (بار) پیدا کرنے میں تھک گئے (کہ قیامت میں دوبارہ پیدا نہیں کرسکیں گے نہیں) بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) یہ لوگ (خلافِ عادت) از سرِ نو پیدا کرنے کی طرف سے شک میں (پڑے) ہیں۔

جواب کی تشریح اِس طرح پر ہے کہ آدمی شروع میں ہٹّی تھا مٹّی سے نباتات کی جون میں آیا۔ نباتات سے حیوانات میں جنم لیا۔ نباتات اور حیوانات آدمی کی غذا ہوئی۔ غذا سے نطفہ بنا۔ نطفے سے بہت سے تبدّلات کے بعد آدمی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۝

اور ہم نے انسان کو مٹّی کے سَت سے بنایا پھر ہم ہی نے اُس کو حفاظت کی جگہ (یعنی عورت کے رحم میں) نطفہ بنا کر رکھا پھر ہم ہی نے نطفے کا لوتھڑا بنایا پھر ہم ہی نے لوتھڑے کی بندھی بوٹی بنائی پھر ہم ہی نے بندھی بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہم ہی نے ہڈیوں پر گوشت مڑھا۔ پھر (آخر کار) ہم ہی نے اُس کو (گویا بالکل) دوسری ہی مخلوق (کی صورت میں) بنا کھڑا کیا تو (سبحان اللہ) خدا بڑا ہی بابرکت ہے جو (سب) بنانے والوں میں بہتر بنانے والا ہے۔ پھر (لوگو!) اِس کے بعد تم (سب) کو مرنا ہے۔ پھر قیامت کے دن تم (سب) اُٹھا کھڑے کیئے جاؤگے

عالم کے ذرّے ذرّے میں خدا کی قدرت کے ایسے بہت سے کرشمے ہیں مگر ہم کو اُن کرشموں کے دیکھنے کی عادت سی ہوگئی ہے اِس وجہ سے ہم اُن کا استبعاد نہیں کرتے حشر بعد الموت بھی اِسی طرح کا ایک کرشمہ ہے اور ہم کو اُس کے استبعاد کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اور اسی کا نام ہے ایمان بالآخرۃ فرمودۂ خدا کے انضمام سے اور تمام بنی آدم کے تعامل سے اِس یقین کو قوت ہوتی ہے۔ اور غفلت اور بے فکری سے کمزوری قیامت کا انکار متفرّع ہے اس پر کہ ہم نے روح کی حقیقت کو نہیں جانا۔ روح اور جسد کے تعلق کو نہیں پہچانا۔ خدا کی قدرت کی وسعت کا ٹھیک اندازہ نہیں کیا۔ چوں کہ آدمی مرنے سے معدوم نہیں ہوتا اور

---

۵۱ (لوگو!) اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور (مرے پیچھے) اسی میں تم کو لوٹا کر لائیں گے ۱۲

۵۲ بلکہ ہم اِس بات پر قادر ہیں کہ اُس کی پور پور (اُس کے اصلی ٹھکانے سے بٹھا دیں ۱۲

مرے پیچھے بھی اُس کی روح باقی رہتی ہے اور بقائے روح بھی ایک طرح کی زندگی ہے تو گو دنیا کی زندگی میں مجرم کو نتیجہ بد پیش نہ آیا بقائے روح کی زندگی میں پیش آگر رہے گا مگر پیش آگر رہے گا ضرور۔

ایمان بالقدر

اب رہا مسئلۂ تقدیر تو مولانا فرماتے ہیں کہ یہ ایسا مشکل مسئلہ ہے کہ عوام تو عوام اکثر خواص بھی اُس کو نہیں سمجھ سکتے۔ سارا اشکال خود آدمی کی خاص بناوٹ کا ہے کہ آدمی نہ تو کنکر پتھر کی طرح مجبورِ محض ہے جہاں پڑا پڑا ہے کوئی اُس کو جگہ سے ہلائے تو ہلے۔ اور نہ بااختیارِ مطلق ہے کہ جو چاہے کر گزرے۔ آدمی کی اِس حالت کو پیشِ نظر رکھ کر تقدیر کے معنی سمجھنے کے ہیں۔ تقدیر کی نسبت لوگوں کا عام خیال تو یہ ہے کہ آدمی کو بھلا بُرا جو کچھ پیش آتا ہے اور جو کچھ پیش آنے والا ہے پہلے سے خدا نے اُس کے لیے ٹھیرا دیا ہے یہاں تک کہ اُس کا جنتی اور دوزخی ہونا بھی۔ دوسرے لفظوں میں اِس کے یہ معنی ہیں کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اپنے اختیار سے نہیں کرتا اور اسی لیے نیکی کی جزا کا مستحق اور بدی کی سزا کا مستوجب بھی نہیں۔ بے شک کٹ حجتی کے لیے بڑی گنجایش ہے۔ اور اس خیال کی تائید میں بہت سی باتیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے انسان کی مجبوری ظاہر ہوتی ہے۔ مگر یہ لوگ انسانی زندگی کے دوسرے پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور نہیں دیکھتے کہ انسان کچھ اختیار بھی رکھتا ہے اور اُسی اختیار کی بنا پر وہ دنیا میں اپنے افعال کا جواب دہ سمجھا جاتا ہے۔ دنیا میں یہ قاعدہ جاری ہے تو آخرت میں کیوں نہ ہو۔ دنیا اور آخرۃ میں نقل اور اصل کی نسبت ہے اور ایک کا دوسرے کے مطابق ہونا ضرور ہے اچھا پھر تقدیر کو کیا سمجھنا چاہیئے تو لفظ تقدیر نکلا قدر سے جس کے معنی اندازے کے ہیں پس تقدیر کے معنی اندازہ ٹھیرانے کے ہوئے جو معنی إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَٰهُ بِقَدَرٍ[1] کے ہیں وہی معنی تقدیر کے ہیں۔ اِس کو مولانا فرماتے ہیں ایک مثال سے بآسانی سمجھو گے۔ ہم نے ایک درزی کو کپڑے کا تھان دیا کہ اُس میں سے جتنے بن سکیں ہمارے کُرتے بنا دو۔ تو درزی پہلے آگا پیچھا کلیاں چوبغلے آستینیں ہر ایک چیز کا اندازہ کر لیتا ہے تب قطع کرتا ہے۔ لغت کی رُو سے اسی کا نام ہے تقدیر۔ معمار تعمیر سے پہلے مکان کا نقشہ بناتا ہے۔ بڑھئی چوکی کے لیئے لکڑی کی تراش کا اندازہ کرتا ہے۔ یہ سب تقدیر ہے اسی طرح خدا نے جو چیز بھی پیدا کی ایک اندازے کے ساتھ پیدا کی۔ یہی اُس چیز کی تقدیر ہوئی۔ دوسری مخلوقات کے ساتھ ایک تقدیر انسان کی ہے کہ اُس کی دو آنکھیں ہیں دو کان۔ دو ہاتھ۔ دو پانوں۔ ایک ناک۔ وہ خاص ایک خاندان میں۔ خاص ملک میں۔ خاص زمانے میں پیدا ہوتا اور ایک خاص وقت تک خاص حالت میں زندہ رہ کر آخر کو دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ انسان پر جو حالتیں گزرتی ہیں اُن میں سے بہت سی باتیں ہیں جن میں انسان کے ارادے۔ انسان کی رائے انسان کی تدبیر کو کچھ دخل نہیں۔ ایسی ہی باتوں میں اِس معنی کر تقدیر کا قائل ہونا پڑتا ہے جو لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں بندگی و بیچارگی۔ فطرت اللہ میں نکتہ چینی کرنا فسادِ عقل اور گریزی کی دلیل ہے۔ مثلاً یہ کہ آدمی کو پرندوں کی طرح پرواز کی قدرت کیوں نہیں دی۔ یا جیسا کہ تیز خردبین میں دیکھا جاتا ہے کہ مکھی کے چھوٹے سے بھٹے میں ہزاروں آنکھیں ہیں آدمی کس لیئے اِس نعمت سے محروم رکھا گیا۔ پس اِس صورت میں تقدیر پر ایمان لانے کے یہ معنی ہیں کہ مخلوقاتِ عالم کو خدا نے جیسا چاہا بنایا اور بہت درست بنایا۔ أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ[2]۔ لیکن اس میں تو کچھ جھگڑا نہیں جھگڑے کی بات تو یہ ہے کہ انسان کے

[1] ہم نے تمام چیزوں کو ایک اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے ۱۲۔ [2] ہر مخلوق کو اُس کی (خاص طرح کی) بناوٹ عطا فرمائی پھر اُس کو (اُن اغراض خاص کے پورا کرنے کی) راہ دکھائی ۱۲

اپنی ذات سے کچھ بھی نہیں - جو کچھ کرتا ہی خدا کرتا ہی یہی وہ عقیدہ ہی جس میں پانی مرتا ہی - اسی عقیدے نے مسلمانوں کی دنیا کو تباہ اور برباد کیا - ایک وقت تھا کہ مسلمان روئے زمین پر کوس لمن الملک الیوم بجاتے تھے اور تہذیب اور شائستگی اور فضائل میں کوئی قوم اُن کو لگا نہیں کھاتی تھی یا اب یہ وقت ہی کہ دوسروں کے غلام ہیں اور غلام بھی ہیں تو نکمے نکھٹو -

اَبْکَمُ لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ وَّھُوَ کَلٌّ عَلٰی مَوْلٰہُ اَیْنَمَا یُوَجِّھْہُّ لَا یَاْتِ بِخَیْرٍ -

گونگا (اور گونگا ہونے کے علاوہ پرایا غلام کہ خود کچھ نہیں کر سکتا اور (گونگے ہونے کی وجہ سے) وہ اپنے آقا کا بارِ خاطر بھی ہی کہ جہاں کہیں اُس کو بھیجے اُس سے کچھ بھی ٹھیک بن نہیں آتا -

برائے نام معدودے چند سلطنتیں بھی ہیں تو اگر "ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند" یہ سب اس لیئے کہ مسلمان تقدیر پر بھروسا کر کے حسب اقتضائے وقت اپنے تئیں سنبھالنے کی کوشش نہیں کرتے - اور عقیدۂ تقدیر نے اُن کو مایوس اور اپاہج اور از کار رفتہ کر دیا ہی - اگلے مسلمان جو معراج الکمال ترقی پر پہونچ گئے تھے وہ بھی تقدیر کے قائل تھے مگر کوشش کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ کامیابی اُن کی تقدیر میں ہی اور تقدیر ہی اُن سے کوشش کرا رہی ہی - اس پر بھی احیاناً اگر اُن کی سعی نامشکور ہوتی تھی - تو نامشکوریِ سعی محرّک ہوتی تھی سعیِ مزید کی - غرض وہ کسی حالت میں ہمت نہیں ہارتے تھے -

اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُہٗ ط وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ لا

اگر تم کو (اس لڑائی میں شکست کی) کھٹر پینچ لگی تو بے دل مت ہو کیونکہ جنگِ بدر میں) طرفِ ثانی کو بھی اس طرح کی کھٹر پینچ لگ چکی ہی اور یہ اتفاقاتِ وقت ہیں جو ہمارے حکم سے نوبت بہ نوبت (سب) لوگوں کو پیش آتے رہتے ہیں -

اب کے مسلمان پہلے ہی سے آس توڑ بیٹھے اور بے ہاتھ پاؤں ہلائے سمجھے ہوئے ہیں کہ خدا ہی ان کی بہتری نہیں چاہتا ؎

مزن فالِ بد کا ورد حالِ بد مبادا کسے کو زند فالِ بد

مولانا نے مدتوں اِس کو سوچا کہ مسلمانوں نے تقدیر کا محلِ غلط کہاں سے لیا تو یہ بات اُن کی سمجھ میں آئی کہ قرآن میں ایسی بھی آیتیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہی کہ ہدایت اور ضلالت دونوں خدا کی طرف سے ہیں - آدمی کے اختیار کی بات نہیں جیسے [۱] انّک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء - اور - [۲] یضل من یشاء و یھدی من یشاء - اور - [۳] فمن یھدیھم من اضلّ اللہ - اور - [۴] ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ - اور - [۵] اولٓئک الذین لعنھم اللہ فاصمھم واعمیٰ ابصارھم -

اسی طرح ایسی بھی آیتیں ہیں جن سے آدمی کا با اختیار ہونا پایا جاتا ہی جیسے [۶] ان تکفروا انتم ومن فی الارض جمیعًا فان اللہ لغنیٌّ حمید - اور - [۷] ونفسٍ وما سوّٰھا فالھمھا فجورھا وتقوٰھا

---

[۱] (اے پیغمبر اپنی خواہش کے مطابق) تم جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہی ہدایت دیتا ہی ۱۲ [۲] جس کو چاہتا گمراہ کرتا اور جس کو چاہتا ہدایت دیتا ہی ۱۲ [۳] تو جس کو خدا گمراہ کرے اُس کو کون راہ راست پر لا سکتا ہی ۱۲ [۴] اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر اللہ نے مُہر لگا دی ہی اور اُن کی آنکھوں پر پردہ (پڑا) ہی ۱۲ [۵] یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی اور اُن کو (حق بات کے سننے سے) بہرا اور (راہِ راست کے دیکھنے سے) اُن کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہی ۱۲ [۶] اگر تم اور جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں وہ سب کے سب مل کر بھی) خدا کی ناشکری کرو تو خدا کو ذرا بھی پروا نہیں کیونکہ وہ) بے نیاز (اور ہر حال میں) سزاوارِ حمد (وثنا) ہی ۱۲ [۷] اور انسان کی اور (اُس ذات کی قسم) جس نے اُس کو (ایسا) درست بنایا پھر اُس کی بدکاری اور پرہیزگاری (دونوں باتیں) اُس کو سمجھا دیں ۱۲

اور - اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا - اور - فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ - اور بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ -

دونوں قسم کی آیتوں کے ملانے سے انسان کی اصلی حالت ظاہر ہوتی ہی جس کا خلاصہ یہ ہی کہ انسان فاعلِ با اختیار ہی - مجبوری ہی تو یہ ہی کہ نہ وہ اپنے ارادے سے پیدا ہوا اور نہ اُس نے اختیارات کی جیسے کچھ بھی ہیں درخواست کی - دوسرے یہ کہ آدمی ارادے کا اختیار رکھتا ہی - ارادہ کا نافذ کرنا اُس کے بس کی بات نہیں نتیجہ جو وہ چاہتا ہی ہو بھی اور نہ بھی ہو - مثلاً آدمی نے چوری کی نیت سے ایک گھر کو تاکا - آلاتِ سرقہ لے کر چلا وہاں جاکر دیکھا کہ لوگ جاگ رہے ہیں - ناکام واپس آیا - حاکمِ ظاہر اُس کو سزا نہیں دے سکتا کیوں کہ چوری نہیں ہوئی مگر وہ چوری کا ارادہ کرنے سے عند اللہ چور ٹھیرا - یہ ہیں معنی

اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ

(لوگو) جو تمھارے دل میں ہی اگر اُس کو ظاہر کرو یا اُس کو چھپاؤ اللہ تم سے اُس کا حساب لے گا پھر دل کے کھوٹ پر) جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے عذاب دے -

ایک شکل خدا کے عالم الغیب ہونے کی ہی کہ وہ اُس سے پہلے کہ آدمی عرصۂ ہستی میں آئے ایک ایک فردِ بشر کے جزو کل حالات سے واقف ہی کہ فلاں آدمی فلاں جگہ فلاں خاندان میں فلاں وقت پیدا ہوگا اور اتنے دن جیئے گا اور اُس کو یہ یہ واقعات پیش آئیں گے اور آخرکار قانونِ الٰہی یعنی قرآن کی رو سے جنتی ہوگا یا دوزخی - یہ تو ظاہر ہی کہ خدا کا علم غلط نہیں ہوسکتا - ضرور ہی کہ ایک ایک بات خدا کے علم کے مطابق واقع ہو اس سے بھی لوگ انسان کی مجبوری استنباط کرتے ہیں ایک بھلے تن ہندو نے ایک دوہا کہا ہی -

نیا وَنہ کیں کیں ٹھکرائی　　　بن کینے لکھ لیں جرائی

لیکن یہ استنباط غلط ہی - ایک طبیب حاذق بھی ایک مریض کی نسبت جانتا ہی کہ وہ بدپرہیزی ضرور بدپرہیزی کرے گا اور مرے گا اور وہ بدپرہیزی کرتا اور مرتا بھی ہی - لیکن طبیب نے اُس کو بدپرہیزی کرنے اور مرنے کا حکم نہیں دیا - غرض تقدیر کی بحث ہی بڑی دقیق اور اسی وجہ سے شارع نے اُس میں کرید کرنے کی مناہی بھی فرمائی ہی - مولانا نے قرآن مجید کا ترجمہ کرتے وقت تین مقام پر تین فائدے بھی لکھے ہیں اُن تینوں کو اس جگہ نقل کئے دیتے ہیں - شاید فہمِ مطلب میں ان سے کچھ مدد ملے -

پارۂ تلک الرسل کے آغاز کی آیۂ ولو شاء اللہ ما اقتتلوا ولکن اللہ یفعل ما یرید کے ذیل میں لکھا ہی -

---

(بقیہ صفحہ گزشتہ) (ایسا) درست بنایا پھر اُس کی بدکاری اور پرہیزگاری (دونوں باتیں) اس کو سمجھادیں -

۵۱ (پھر ہم نے) اُس کو (دین کا) رستہ (بھی) دکھایا (پھر اب دو قسم کے آدمی ہیں) یا تو شکر گزار رہیں (یعنی مسلمان) یا ناشکر (یعنی کافر)

۵۲ پس جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے - ۵۳ بلکہ (خود) انسان اپنے مقابلے میں حجت ہی گو وہ (اپنے تئیں) بے قصور ثابت کرنے کے لئے کتنے ہی بہانے پیش لایا کرے - ۵۴ اور اگر خدا چاہتا تو (یہ لوگ) آپس میں نہ لڑتے مگر اللہ جو چاہتا ہی کرتا ہی ۱۲

مطلب یہ ہی کہ خدا چاہتا تو تمام بنی آدم کی طبائع ایک ہی طرح کی ہوتیں تو اُن میں اختلاف بھی نہ ہوتا لیکن اُس نے حق و باطل دو چیزیں بنائیں آدمی کو حق و باطل کی تمیز دی اور تمیز کے علاوہ اختیار کہ حق کا رستہ اختیار کرے، یا باطل کا۔ آدمی کا با اختیار پیدا کرنا خدا کا فعل ہی اور حق و باطل کی تمیز کرنا اور ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑنا آدمی کا۔"

دوسرا فائدہ پارہ والمحصنٰت کی آیۂ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ [51] کے متعلق لکھا ہی اور وہ یہ ہی "اِس سے پہلی آیت میں فرمایا کہ (نفع ہو یا نقصان) سب اللہ کی طرف سے ہی۔ اور یہاں فرماتے ہیں کہ فائدہ اللہ کی طرف سے اور نقصان بندے کی طرف سے۔ ظاہراً اِن دونوں باتوں میں مخالفت سی معلوم ہوتی ہی اور کلام الٰہی میں یہ ہو نہیں سکتا۔ کہ ایک سانس میں کچھ اور دوسرے سانس میں کچھ۔ چناں چہ تھوڑی دُور آگے چل کر فرماتے بھی ہیں وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا [52] سو جو لوگ اِنسان کو فاعلِ مختار نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ آدمی بُرا یا بھلا جو کچھ بھی کرتا ہی خدا کے کرانے سے کرتا ہی یہ لوگ اِن دو مخالف باتوں میں اِس طرح وجہِ توفیق پیدا کرتے ہیں جیسے حافظِ شیراز کہہ گئے ہیں۔

گناہ اگرچہ نبود اختیارِ ما حافظ　　تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہِ من است

یعنی نفع ہو یا نقصان۔ ہی تو سب کچھ خدا کی طرف سے مگر ادب کا تقاضا یہ ہی کہ بندہ نقصان اور گناہ کو اپنی طرف منسوب کرے اور باوجود بے اختیاری کے قصور کا معترف ہو۔ لیکن یہ بات ہمارے دل کو تو لگتی نہیں۔ ہم تو آدمی کو فاعلِ مختار اور نیک و بد کا ذمّہ دار مانتے اور اِس قاعدے کو دنیا اور دین دونوں کے انتظام کا مدار سمجھتے ہیں۔ اِن دو مخالف باتوں میں واقعی وجہِ توفیق پوچھو تو یہ ہی کہ خدا نے دنیا کے انتظام کا ایک قاعدہ ٹھیرا دیا ہی ہر چیز اور ہر واقعے کا ایک سبب ہوتا ہی اور ہر سبب کا ایک نتیجہ۔ اور اسی سے یہ جہان عالمِ اسباب کہلاتا ہی جیسے مثلاً حاکمِ ظاہر نے ایک قانون بنا دیا۔ اور اُس میں چوری کی سزا تجویز کر دی۔ اتنے برس قید۔ زید نے چوری کی اور جیل خانے بھیجا گیا۔ کہنے میں تو یوں آتا ہی کہ حاکم نے قید کیا۔ مگر حقیقت میں زید نے آپ اپنے کو قید کیا۔ نہ چوری کرتا نہ جیل خانے جاتا پس حاکم کا زید کو قید کرنا اور زید کا خود اپنے تئیں قید کرنا اپنی اپنی جگہ دونوں باتیں ٹھیک ہیں۔"

تیسرا فائدہ سورۂ انعام کے رکوع ۱۸۔ آیۂ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ [53] کے ذیل میں لکھا ہی کہ "کفارِ مکہ جب دلیل سے عاجز آتے تو مشیتِ الٰہی کی بحث نکال کھڑی کرتے لیکن وہ مرضی اور مشیت میں فرق نہیں کرتے تھے خدا نے اِس آیت میں مرضی اور مشیت کا فرق نہایت عمدہ طور پر دکھایا ہی کہ جو خدا کی مرضی تھی وہ پیغمبروں کے ذریعے سے ظاہر کر دی گئی اور لوگوں کو اختیار دیا گیا کہ نیک راہ اختیار کریں یا بُری راہ چلیں۔ بُروں نے پیغمبروں کو جھٹلایا اور دیدہ و دانستہ بُری راہ اختیار کی تو وہ ملزم ٹھیرے اور خدا کی حجّت اُن پر تمام ہوئی مشیتِ الٰہی سے اور اُس سے کچھ تعلق نہیں

---

[51] (اے بندے حقیقت الحال تو یہ ہی کہ) تجھ کو کوئی فائدہ پونہچے تو (سمجھ کہ) اللہ کی طرف سے ہی اور تجھ کو کوئی نقصان پونہچے تو (سمجھ کہ) تیرے نفس کی طرف سے ہی ۱۲

[52] اور اگر (قرآن) خدا کے سوا (کسی اَور) کے پاس سے (آیا) ہوتا تو ضرور اُس میں بہت سے اختلاف پاتے ۱۲

[53] (اے پیغمبر اِن سے) کہو کہ (تم ہارے اوپر) اللہ کی حجّت (ذم بہ) تمام ہوئی پھر اگر وہی چاہتا تو تم سب کو (دینِ حق کا) رستہ دکھا دیتا ۱۲

مشیتِ الٰہی بالکل دوسری چیز ہی۔ اِس میں شک نہیں کہ خدا چاہتا تو سب راہِ راست پر چلتے۔ مگر اُس نے چاہا کہ لوگ اپنے ارادے سے راہِ راست اختیار کریں تو لوگوں کے افعال سے مشیتِ الٰہی متعلّق نہیں ہی۔ بلکہ اُن کی اپنی مشیت متعلّق ہی یعنی مشیتِ الٰہی تھی کہ لوگ اپنی مشیت سے بُرا یا بھلا کریں۔

اب اِن سب باتوں کے اخیر میں مولٰنا ناظرین کو ایک نہایت ضروری بات کی طرف متوجّہ کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ ایمان اور اسلام دو لفظ ہیں بولنے میں مرادفِ یک دگر بولے جاتے ہیں۔ یعنی ایک ہی معنی میں اُن کا استعمال ہوتا ہی مگر جو فرق ایمان اور اسلام میں ہی وہ اِس آیت سے ظاہر ہوتا ہی۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (عرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے (اے پیغمبر ان سے) کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے (ہاں) یوں کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے اور ایمان کا تو ہنوز تمہارے دلوں میں گزر تک بھی نہیں ہوا") اِسلام اعمالِ ظاہر سے تعلّق رکھتا ہی اور ایمان دل سے پس جو شخص ظاہر میں مسلمانوں کے سے کام کرتا ہی۔ مثلاً ہمارے قبلے کی طرف نماز پڑھتا ہی ہمارا ذبیحہ کھاتا ہی یعنی اُس کا ظاہر مسلمان ہی چاہیئے کہ ہم اُس کو مسلمان سمجھیں۔ یہی مضمون شیخ سعدی نے نہایت عمدگی سے اِس قطعے میں ادا کیا ہی۔

قطعہ

هر کرا جامه پارسا بینی | پارسا دان و نیک مرد انگار
ور ندانی که در نهانش چیست | محتسب را درونِ خانه چه کار

اور اِسی مضمون کی توضیح مولٰنا کی اُس تحریر سے بھی ہو سکتی ہی جو اُنھوں نے آیۂ قالت الاعراب اٰمنّا الخ کے فائدے میں کی ہی جہاں چہ ہاں لکھا ہی کہ "ایمان دل سے علاقہ رکھتا ہی اور خدا کے سوا دوسروں کو اُس کی خبر نہیں ہو سکتی اور اسلام افعالِ ظاہر سے تعلّق رکھتا ہی۔ ایک شخص مسلمانوں کی سی وضع رکھتا اور مسلمانوں کے ساتھ کھاتا پیتا اور اپنے تئیں مسلمان کہتا ہو۔ شرع جو ظاہر پر حکم کرتی ہی اُس کی رُو سے وہ مسلمان سمجھا جائے گا۔ مگر ممکن ہی کہ اُس کے دل میں ایمان نہ ہو"

سخت افسوس ہی کہ آج کل کے مسلمانوں میں یہ فساد کثرت سے شائع ہو گیا ہی کہ بات بات میں مسلمانوں کو کافر بنا دیتے ہیں حال آں کہ شریعت کی رُو سے کسی کو حق نہیں کہ مسلمان بھائی کو گروہِ اسلام سے خارج کرے۔ جناب پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ساری عمر مسلمانوں کے گروہ کے بڑھانے کی تدبیروں میں لگے رہے اور وہ مسلمانوں کے گروہ میں داخل کرنے کے لیے حیلے ڈھونڈتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے اُبَاهِيْ بِكُمُ الْاُمَمَ کہ تمام پیغمبروں میں میں ایسا پیغمبر ہوں جس کی امت آخرت میں سب امتوں سے زیادہ ہو گی۔ اِس کے برخلاف اب مسلمانوں کو گروہِ مسلمانوں سے خارج کرنے کے لیے حیلے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ ع ببیں تفاوتِ رہ از کجا ست تا بکجا۔ خدا کے نزدیک مسلم سے مومن کا درجہ بڑا ہی کیوں کہ اعمالِ ظاہر کبھی دکھاوے کے لیئے بھی ہوتے ہیں اور ہمارے اِن وقتوں میں بہت سے لوگ ایسے ملیں گے جو جتھے اور برادری کے خوف سے مسلمانوں کا سا ظاہر رکھتے ہیں مگر جس کو ایمان کہتے ہیں وہ اُن کے دل میں نہیں۔ ان کے برخلاف کچھ لوگ ظاہر خراب باطن آباد بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن چوں کہ شریعت ظاہر پر حکم کرتی ہی ہم تو لوگوں کے ظاہرِ حال ہی پر فیصلہ کر سکتے ہیں اور باطن کی خبر خدا کو ہی۔ جس طرح ایمان اور اسلام دو چیزیں ہیں اِسی طرح کفر بھی دو طرح کا ہی۔ کفرِ ظاہر اور کفرِ باطن۔ غرض کسی کے ظاہر کو شعارِ اسلام کے خلاف دیکھ کر اُس کو کافر سمجھنا یا کافر کہہ دینا بڑی خطرناک بات ہی۔ والسلام علی من اتبع الہدیٰ۔

مولانا کے اِن تمام مذہبی عقائد اور دلائل سے یہ بات عجب نہیں کہ لوگوں کے دل میں کھٹکے کہ دنیا کے پردے پر بس فقط وہی ایک مسلمان ہیں اور باقی برائے نام۔ لیکن اس کے جواب میں مولانا کی وہ چند سطریں جو ہمارے نزدیک اُن کی بخشائش کے لئے بطور وثیقے کے ہیں ذیل میں درج کرتے ہیں۔

خدا مجکو اپنی پناہ میں رکھے کہ ایسا واہمہ بھی میرے دل میں خطور کرے لَا تُزَکُّوْٓا اَنْفُسَکُمْ[1] هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی (النجم) ہاں اعتقاداً میں اپنے تئیں ضرور مسلمان سمجھتا ہوں۔ رہا عملاً میری ساری عمر نامسلمی میں گزری۔ میں نے بے شمار حقوق اللہ اور حقوق العباد تلف ہونے دیئے اور اب کہ میری عمر ستّر سے متجاوز ہوئی۔ مجھ میں عملاً مسلمان ہونے کی صلاحیت ہی باقی نہیں۔ عصمتِ بی بی است از بے چادری۔ یا ؎

گر بعصیاں در نمی آویزم از بے قوتی است
ویں بعینہ چوں حریصِ شہوت است و ضعفِ باہ

عمر تو ساری کٹی عشقِ بُتاں میں مومن ؎
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

حقوق جو مجھ سے تلف ہوئے ہیں اُن کی تلافی میرے اختیار سے خارج۔ الغریق یتشبث بالحشیش[2] توبہ کے خیال سے میں نے دل کو تسلّی دینی چاہی اس سے بھی پوری تشفی نہیں ہوئی۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ

اللہ توبہ (تو) قبول کرتا (ہی) ہی مگر اُن ہی لوگوں کی جو نادانی سے کوئی بُری حرکت کر بیٹھے۔ پھر جلدی سے توبہ کرلی تو اللہ (بھی) ایسوں کی توبہ قبول کرلیتا ہی اور اللہ (سب کا حال) جانتا (اور دنیا اور دین کی مصلحتوں سے) واقف ہی اور اُن لوگوں کی توبہ (قبول) نہیں جو (عمر بھر) بُرے کام کرتے رہے یہاں تک کہ اُن میں سے جب کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو تو لگے کہنے

[1] (لوگو!) بہت اپنی پاکیزگی نہ جتایا کرو۔ پرہیزگاروں کو وہی خوب جانتا ہی ۱۲ [2] ڈوبتا تنکے کا سہارا پکڑتا ہی ۱۲

تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَلَا الَّذِیۡنَ یَمُوۡتُوۡنَ وَھُمۡ کُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعۡتَدۡنَا لَھُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ۝ (النساء)

کہ اب میری توبہ اور (اسی طرح) اُن کی (توبہ) بھی (قبول) نہیں جو کافر ہی مرگئے۔ یہی ہیں جن کے لیے ہم نے عذاب دردناک تیار کر رکھا ہی۔ (النساء)

صرف قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ۔ کی آس پر جیتا ہوں۔ سو جب حقوق العباد کا خیال آتا ہی طبیعت بہت ہی پریشان ہوتی ہی کہ خدا تو اپنے حقوق چھوڑ بھی دے گا بندے کیوں چھوڑنے لگے پھر خیال آتا ہی کہ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا کا وعدہ کیا ہی تو وہی بندوں کے مواخذے سے بھی بچانے کی کوئی تدبیر کرے گا ع کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند۔ دنیا میں بعضے رحم دل مجسٹریٹوں نے ایسا کیا ہی کہ عدل کے تقاضے سے مجرم پر جرمانہ کیا اور اپنے پاس سے بھر دیا۔ خدا بھی میرے ساتھ ایسا کرے تو اُس سے کیا بعید ہی۔ غرض میری حالت یہ ہی کہ بیم و رجا میں پڑا جھول رہا ہوں ؎

شنیدم کہ در روزِ امید و بیم ۔۔۔ بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

الٰہی تو گر دانیم رُو سفید ۔۔۔ بضاعت نیاوردم اِلّا اُمید

؎ (اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہہ دو کہ اے ہمارے بندو جنھوں نے (گناہ کرکے) اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں اللہ کی رحمت سے نا امید نہ رہو کیوں کہ اللہ تمام گناہوں کو معاف فرماتا ہی (اور) وہ بے شک بڑا بخشنے والا مہربان ہی۔

حصہ ہفتم

ضمیمہ جاتِ حیاۃ النذیر

ضمیمہ نمبر ۱

سر سیّد کے بعض معرکۃ الآرا معتقدات کے ساتھ اختلاف یا اتّفاق

حیاۃ النذیر حصّہ ششم کو راقم الحروف جب ختم کر چکا تو اُس نے بزعم خود یہ سمجھ رکھا تھا کہ سوانح میں جو کچھ لکھنے کے قابل باتیں تھیں وہ لکھی جا چکیں۔ مگر اسی کے ساتھ مولنا کا ایک فقرہ یاد آگیا جو انھوں نے ایک مقام پر سر سیّد کے معتقدات کی نسبت فرمایا تھا کہ وہ سر سید جنھوں نے ہندوستان میں اس طرح کی نباشی (کفن کھسوٹی) کو رواج دیا۔ جیسی چاہو بدگمانی کر لو۔ میں سر سید احمد کا بھاٹ نہیں۔ وہ اگر پیر ہوں تو اُن کا مرید نہیں اُستاد ہوں تو اُن کا شاگرد نہیں۔ مرثیہ خوان ہوں تو اُن کا بسوریا نہیں۔ امیر ہوں اور مجکو معلوم ہو کہ نہیں ہیں لیکن اگر امیر ہوں تو اُن کا دست نگر نہ کبھی تھا نہ اب ہوں۔ اور نہ ان شاء اللہ مدۃ العمر رہوں گا۔ مگر ہی کیا۔ آدمی ہوں۔ دوست دشمن میں تمیز کرنے کی قومی حالۃ اور قومی ضرورتوں کی شناخت کی عقل رکھتا ہوں۔ تمھارے اِس لاہور میں اور لاہور کیا چیز ہی علی گڑھ میں اور علی گڑھ کے شہر میں بھی نہیں نیچر گڑھ میں یعنی محمدن کالج میں خود سر سید اور اُن کے حواریین کے رُو در رُو مَیں نے اِس بات کے کہنے میں مطلق باک نہیں کیا اور کیوں کرتا کہ میں اُن کے سب نہیں بعض معتقدات کو غلط سمجھتا ہوں۔ لیکن جیسا مجھ کو اُن کی غلطیوں کا تیقّن ہو اِس بات کا بھی تیقّن ہو کہ وہ شخص منافق نہیں۔ بزدل نہیں۔ مکّار نہیں۔ اور قومی خیر خواہی میں ایسا سرشار ہو کہ اُس کا بس چلے تو اپنی تو پہلے ہی سے اُتار رکھی ہو دوسروں کی پگڑی بھی اُتار کر مسلمانوں کے حوالے کر دے۔ وہ جو کہتے ہیں حُبُّكَ الشَّئَ یُعمی ویصم[۱] - سید احمد خاں کو دنیاوی اصلاح کی دُھن میں آگا پیچھا کچھ نہیں سُوجھتا۔ افراط تو ہر ایک چیز میں مذموم ہو پس میرے نزدیک سید احمد خاں میں عیب ہی تو یہ ہو۔ میری رائے سید احمد خاں کی نسبت اگر صحیح ہو تو مَیں کسی سے اُس کی تائید نہیں چاہتا۔ اور اگر غلط ہو تو اصلاح کے لیئے میں کسی کے روبرو پیش نہیں کرتا۔

---

[۱] کسی چیز کی محبت تجھے اندھا اور بہرا کر دیتی ہی ۱۲

میں نے سید احمد خاں کے ساتھ کسی امر میں مخالفت کی ہو تو سب سے زیادہ مجھی کو اس کا افسوس ہے۔ اگر مجھ سے اس میں کسی طرح کی بے تہذیبی سرزد ہوئی ہو۔ اُن کو خدا نے شرف دیا ہے باعتبار عمر کے۔ شرف دیا ہے باعتبار نسب کے شرف دیا ہے باعتبار تعزّز دنیاوی کے۔ بہت بڑا شرف دیا ہے باعتبار خیر خواہی قومی کے۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے۔ من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منا۔ مولٰنا کا یہ فقرہ یاد آتے ہی اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ سرسید کے بعض معرکۃ الآرا معتقدات کے ساتھ مولٰنا کے اعتقادات کا موازنہ کیا جائے تو خالی از منفعت نہ ہوگا چناں چہ ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ سرسید اور مولٰنا کے مختلف فیہ یا متّفق علیہ معتقدات درج کیے جاتے ہیں۔

تحریفِ کتب آسمانی

(۱) سرسیّد:۔ عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کی کتابوں میں تحریفِ لفظی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ صرف تحریفِ معنوی ہوئی ہے مگر اسی کے ساتھ اُن کا اول سے آخر تک الہامی ہونا اور غلطی سے پاک ہونا غیر مُسلّم ہے۔

(۱) مولٰنا۔ یہ جو پچھلی آسمانی کتابوں یعنی توراۃ انجیل وغیرہ پر مسلمان تبدیل و تحریف کا الزام لگاتے ہیں بادی النظر میں یہ الزام مخاصمانہ معلوم ہوتا ہے کیوں کہ انسان کا اتنا بدنفس ہونا بھی قرینِ قیاس نہیں کہ وہ ایک کتاب کو کتاب اللہ بھی کہے اور پھر اُس میں دیدہ و دانستہ تبدیل و تحریف بھی کرے۔ لیکن مسلمانوں نے بڑی کاوش سے اس الزام کو منزل تک پہنچایا ہے۔ یہاں تک کہ خود یہود و نصاریٰ کے علماء کو بمجبوری تسلیم کرنا پڑا ہے کہ واقع میں صُحفِ سماوی اِنسانی تصرفات سے محفوظ نہیں۔ لوگوں نے دیدہ و دانستہ تبدیل و تحریف نہ بھی کی ہو تاہم ترجمہ خود ایک طرح کی تبدیل و تحریف ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص اس گناہ کا مرتکب ہوا ہے وہ بے تامّل اس کو تسلیم کرے گا۔"

شرعی لونڈی غلام

(۲) سرسیّد۔ اِسلام نے غلامی کو ہمیشہ کے لیئے موقوف کر دیا ہے۔ اور آیہ من وفدا جو سورۂ محمدؐ میں ہے وہ نہایت صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے۔

(۲) مولٰنا۔ ہم رعیت ہونے کو بھی ایک طرح کی غلامی ہی سمجھتے ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف لفظوں کا ہے۔ بہتیرے بادشاہ ایسے ہو گزرے ہیں اور اب بھی ہیں جو رعیّت کو ایسا ایسا ستاتے ہیں کہ کوئی وحشی مالک بھی لونڈی غلاموں کو ایسا نہ ستاتا ہوگا۔ اِن باتوں کے معلوم کرنے کے بعد کوئی ہے جو اسلامی غلامی پر ٹھنڈے دل سے اعتراض کر سکے۔ غلامی کی تمام اقسام کو موقوف کر کے اسلام نے صرف ایک ہی قسم کی غلامی کو جائز رکھا ہے۔ کہ مذہبی لڑائی میں جو دشمن پکڑے آئیں وہ لونڈی غلام ہیں۔ اور مذہبی لڑائی یہ ہے کہ دشمن ظلماً مسلمانوں کو ترکِ اسلام پر مجبور کریں۔ اور مسلمانوں کو دفعِ دشمن کی قوّت رکھ کر لڑنا پڑے۔

اجماع

(۳) سرسیّد۔ اجماع حجّتِ شرعی نہیں ہے۔ قیاس حجّتِ شرعی نہیں ہے۔ (حیاۃ جاوید صفحہ ۲۵۶)

ف جو چھوٹے پر مہربانی نہ رکھے اور بڑے کا ادب نہ کرے وہ ہم میں کا نہیں ۱۲

(۳) **مولٰنا** - عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ محمدی شریعت کا قانون صرف قرآن ہے - یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے - مگر عملاً تین چیزیں اُس کا ضمیمہ قرار پا گئی ہیں - سنت - قیاس - اجماعِ امت اس لیئے کہ بے اِن کی مدد کے فصلِ خصومات کا کام چل نہیں سکتا - مگر پھر بھی قرآن شریعتِ محمدیہ کا اصل قانون ہے جامع - سنت کے معنی ہیں پیغمبر صاحب کا قول اور فعل یا کسی اَور کا جو پیغمبر صاحب کی موجودگی میں ہوا اور پیغمبر صاحب نے اُس کو جائز رکھا - تو سنت کو قرآن سے وہی نسبت ہے جو مثلاً ضابطۂ فوجداری کو قانونِ مجموعۂ تعزیراتِ ہند سے - یعنی سنت کی کوئی بات خلافِ قرآن مقبول نہیں - پس سنت کی حدود میں کہار ہا قرآن کی تفسیر و توضیح - مثلاً قرآن مطلق نماز کا حکم دیتا ہے - سنت بتاتی ہے تعداد رکعات تسبیح جو رکوع و سجود میں کہی جاتی ہے - قراءۃ - قعدہ - یا مثلاً قرآن مطلق زکوٰۃ کا حکم دیتا ہے - سنت نصاب اور حولِ کامل کی تعیین کرتی ہے - اس صورت میں قرآن ہی اصل قانون رہا - بعض صورتیں ایسی بھی پیش آ سکتی ہیں کہ نہ قرآن میں مذکور ہیں نہ سنت میں تو قرآن میں ویسی ہی صورت تلاش کرنی پڑتی ہے اور اُس کے قیاس پر بمتابعتِ قرآن و حدیث حکم دیا جاتا ہے اور یہ کام ہے مجتہد یعنی عالمِ راسخ فی العلم کا جو اس زمانے میں عنقا صفت معدوم ہے - تو سوائے استفت قلبک اور کیا ہو سکتا ہے - اور جہاں قیاس کو بھی مَساغ نہ ہو آخری درجہ ہے اجماعِ امت کا - سو امتِ محمدیہ اس قدر منتشر ہے کہ اجماع صورت پذیر ہو نہیں سکتا - اور یہاں بھی انتم اعلم بامور دنیاکم کی رُو سے وہی استفت قلبک راہ نمائی کر سکتا ہے - اور جب قرآن و حدیث نے آدمی کے معتقدات اور خیالات کی اصلاح کر دی - بس بسوے امید کی جا سکتی ہے کہ اُس کا دل اُس کو راہِ حق ہی دکھائے گا - غرض قرآن باوجودے کہ اس میں نہ کمی بیشی کی ضرورت ہے اور نہ ہو سکتی ہے - اپنی موجودہ حالت میں بانضمامِ سُنّت و قیاس و استفت قلبک کہ اِن کا ماخذ بھی وہی قرآن ہے ساری دنیا میں امن و عافیت قائم کرنے کے لیئے جو مذہب کی اصلی غایت و غرض ہے بخوبی کفایت کرتا ہے -

تقلید

(۴) **سرسید** - تقلید واجب نہیں ہے (حیاۃ جاوید صفحہ ۲۵۶)

(۴) **مولٰنا** - اصل میں تقلید کا قوام بگڑا ہوا ہے - اور تقلید کے ساتھ ثبات و استقامت کا - ایک وہ ہیں جو سلطنت کو تمام خوبیوں کا معیار قرار دیتے ہیں ایک وہ ہیں جو پچھلوں کی لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں اور اَوَلَو کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ کی طرف ملتفت نہیں ہوتے - ثبات و استقامت کی تعیین تدبیر ہے خذ ما صفا ودع ما کدر مگر صاف اور کدر کی تمیز کے لیئے چاہیئے عقلِ سلیم اور راسی کا ہم مسلمانوں میں توڑا ہے - مطلق آزادی اور مطلق تقلید دونوں افراط تفریط کے درجے ہیں اور عافیت بین بین میں ہے - اس واسطے کہ آدمی کی بناوٹ ہی اس طرح کی واقع ہوئی ہے اس کو پیدا ہوئے پیچھے پہلے گھر کی پھر مکتب کی پھر اُستاد کی پھر کارفرما کی پھر حکومۃ کی چند در چند پابندیاں کرنی پڑتی ہیں - یعنی مطلق آزادی اُس کو ساری عمر نصیب نہیں ہوتی - ایک نہایت عمدہ مضمون کو ایک شاعر نے کیسے بھونڈے پیرایے میں باندھا ہے کہتا ہے - ۵

۵ بھلا اگر ان کے بڑے کچھ بھی نہ سمجھتے اور نہ راہ راست پر چلتے رہے ہوں تو بھی وہ اُن ہی کی پیروی کیئے چلے جائیں گے؟

اِسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہی کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخی دوراں سے

پابندی آدمی کے لیئے شرطِ زیست ہی۔ من جملہ اَور پابندیوں کے ایک پابندی تقلید کی بھی ہی۔ اور افعال کی کون کہے تقلید کے بدون بولنا بات کرنا تک بھی تو آدمی کو نہیں آسکتا۔ پس تقلید سے چارہ نہیں جس طرح غذا سے چارہ نہیں مگر جس طرح بہت کھانے سے آدمی اپھر کر مر جاتا ہی افراط تفریط بھی آدمی کو خوار کرتی ہی ۵

لطفِ حق با تو مواسا ہا کند چوں کہ از حد بگذرد رُسوا کند

افراطِ تقلید کا بدترین نتیجہ تو یہ ہی کہ ترقّی کی سدِّ راہ ہی اور آدمی کو اُس شرف سے محروم رکھتی ہی۔ جس کا مادّہ اُس میں ودیعت رکھا گیا ہی۔ نفسِ تقلید میں تو ہم کو کچھ بھی اعتراض نہیں کیوں کہ تقلید انسان کا ایک فعلِ اضطراری ہی اور وہ ایک اعتبار سے ترقّی کی محرّک اور ہادی اور مصلح ہی۔ اعتراض جو کچھ بھی ہی اعمالِ فکر اور اُس نمونے کے انتخاب میں ہی جس کو ہم تقلید کے لیئے اختیار کرتے ہیں ۵

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس بہر دستے نباید داد دست

سب سے زیادہ مکروہ تقلید جو عام و خاص سب سلمان کرتے ہیں اور شاید ہی کوئی متنفس اِس سے بچا ہو گا رسم و رواج کی تقلید ہی۔ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک بلکہ مرے پیچھے تک ایسی کون سی حالت ہی جو محکومِ مراسم نہیں اور مراسم بھی وہ جن کی اسلامی شریعت میں کہیں اصل نہیں۔ اور اکثر تو خلافِ شرع منجر بمعصیت اور داخلِ اسراف ہیں۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا[۱] اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوْرًا۔

شیطان یا ملائکہ

(۵) **سرسیّد**۔ شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہی اُس سے کوئی وجود خارج عن الانسان مراد نہیں ہی بلکہ خود انسان میں جو نفسِ امّارہ یا قوتِ بہیمیہ ہی وہ مراد ہی۔

(۵) **مولٰنا**۔ ملائکہ سے جو انکار کیا جاتا ہی تو صرف اِتنی بات پر کہ دکھائی نہیں دیتے سو خدا کرے کہ ابھی نہ دکھائی دیں۔ یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِکَۃَ لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ وَیَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا[۲]۔ تاویل یہ کرتے ہیں کہ ملائکہ سے مناسب مقام کابلیوں کی طرح کے قوی ہیکل لوگ یا اللہ کے نیک بندے یا انسان کی وہ روحانی قوتیں جو نیک کام کرنے کی داعی ہوتی ہیں مراد ہیں۔ لیکن ہم فرشتوں کو اسی طرح کا مخلوق مانیں جیسا کہ عام مسلمان مانتے ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کیا قباحت لازم آجائے گی۔ کوئی بدعقل جو خدا ہی کا قائل نہیں اِس قسم کے اعتراضات اور اشتباہات کرے تو ایک بات بھی ہی بڑا تعجّب اور افسوس تو اُس وقت ہوتا ہی جب کوئی آدمی خدا کو مان کر کہتا ہی کہ فرشتوں اور جنوں اور شیطان کا ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اسی لیئے مجھے اِن کا ہونا تسلیم نہیں یا میں کسی معجزے کے وقوع کو باور نہیں کرتا۔ یا میں کسی دعا کا معتقد نہیں کہ وہ حصولِ مدّعا کا سبب ہو سکتی ہی۔ یا یہ کہ گناہ نزولِ عذاب

[۱] بے شک دولت کے بے جا اُڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکر ہی ۱۲

[۲] جس دن لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے اُس دن گنہ گاروں کو کوئی خوشی (نصیب) نہ ہوگی اور (فرشتوں کو دیکھ کر) کہیں گے کہ دور دفان ۱۲

کا سبب ہوا ہی یا ہو سکتا ہی یا جنت اور دوزخ اور قیامت کی وہی حقیقت ہی جو مذہبی کتابوں میں بیان کی جاتی ہی یا آفرینش کا سلسلہ اُسی طرح پر شروع ہوا ہی جیسا آسمانی کتابوں میں لکھا ہی۔ اگر ان میں سے کوئی بات اُس کی سمجھ سے باہر ہی اور اسی وجہ سے اُس کو انکار ہی تو ہم نہیں سمجھتے کہ خدا کو اس نے کیوں کر سمجھ لیا اور خدا کو سمجھ لیا تو پھر اُس کو کسی چیز کسی بات پر تعجب اور انکار کا کیا حق باقی رہا۔ گُڑ کھاؤں گلگلوں سے پرہیز۔

مُنخَنِقہ

(۶) سرسید۔ طیورِ منخنقہ جن کو نصاریٰ نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہو مسلمانوں کو اُن کا کھانا حلال ہی۔

(۶) مولٰنا۔ میتہ[۵۱] ۔ منخنقہ[۵۲] ۔ موقوذہ[۵۳] ۔ متردیہ[۵۴] ۔ نطیحہ[۵۵] ۔ پس خوردۂ درندہ مسلمانوں کے لیے حرام ہیں۔

وضع ولباس

(۷) سرسید۔ وضع ولباس وغیرہ میں کفار کے ساتھ تشبہ شرعاً ممنوع نہیں ہی۔

(۷) مولٰنا۔ ایک حدیث مَنْ تشبه بقوم فهو منهم[۵۶] ۔ جس پر ان دنوں بڑا غل مچا ہوا ہی لوگوں نے انگرکھا۔ پائجامہ چھوڑ کر کوٹ پتلون اختیار کر لیا ہی اور ایک کوٹ پتلون پر کیا موقوف ہی تمام تر تمدن انگریزوں کا سا ہو گیا ہی۔ اور ہوتا جاتا ہی۔ اس پر پُرانی وضع پُرانے خیال کے مسلمان اتنا تشدد کرتے ہیں کہ فهو منهم سے کفر و ارتداد کا استنباط کرتے ہیں۔ حال آں کہ وضعِ ظاہر کو اسلام سے کچھ تعلق نہیں۔

دوزخ وجنّت

(۸) سرسید۔ "قرآن یا احادیث میں معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہی وہ سب بطریقِ مجاز و استعارہ و تمثیل کے بیان ہوا ہی جیسے بعث ونشر۔ حساب وکتاب۔ میزان۔ صراط۔ جنت۔ دوزخ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب مجاز پر محمول ہی نہ حقیقت پر"

(۸) مولٰنا۔ نہ جنت کو دیکھا نہ دوزخ کو۔ ہاں اس سے جو پیغمبر صاحب سے سُنا۔ دوزخ کا تو دیکھنا تک بھی گوارا نہیں۔ جنۃ کی تمنا ہی۔ سو وہاں جانے کی جو شرائط ہیں ادا نہیں ہوتیں۔ نیچری کہتے ہیں لوگوں کے سمجھانے کو تمثیل کے طور پر جنۃ کے مزے اور دوزخ کی تکلیفیں بیان کر دی ہیں۔ رنج وراحۃ آخرۃ میں بھی ہی مگر ہم اُس کی کیفیت کے سمجھنے کے لائق نہیں۔ ناک اُسی جگہ ہی۔ سامنے سے بتاؤ تو اور گدی کے پیچھے ہاتھ لے جا کر بتاؤ تو۔ ہم تو چھوٹتے ہی جواب دیتے ہیں کہ دوزخ ہو یا جنۃ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے مرے پیچھے واسطہ پڑے گا۔ وحی کے سوائے ہم کو کوئی ذریعہ اُن کی حقیقت دریافت کرنے کا نہیں اور جو کچھ وحی میں ہی ہم اُس سے نہ ایک حرف کم کہہ سکتے ہیں اور نہ ایک حرف زیادہ اور نہ تاویل کرتے ہیں بلکہ سکوت اور زیادہ تفتیش کرنے کو اپنے حق میں بالکل غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

---

۵۱ مرا ہوا جانور ۱۲ ۵۲ گلا گھونٹا ہوا جانور ۱۲ ۵۳ چوٹ سے مرا ہوا جانور ۱۲ ۵۴ اُوپر سے گر کر مرا ہوا جانور ۱۲

۵۵ کسی جانور کا سینگ لگ کر مرا ہوا جانور ۱۲

۵۶ جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ اُن ہی میں سے ہی ۱۲

آسمان وزمین کا چھ دن میں پیدا کرنا

(۹) سرسید - قرآن میں جو خدا کا زمین و آسمان کا چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے اس سے کسی واقعے کی خبر دینی مقصود نہیں ہے - بلکہ صرف یہودیوں کے اس اعتقاد کی تردید مقصود ہے کہ خدا تعالی نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام لیا - اور اسی لیے جو کچھ اُن کا عقیدہ خلق زمین و آسمان کی نسبت تھا اُس کو قرآن میں اسی طرح بیان کر کے فرمایا کہ وما مسنا من لغوب کیوں کہ شارع کا مقصد حقائق اشیا سے بحث کرنا یا جو باتیں حقائق کے برخلاف ہوں اُن پر رد و قدح کرنا نہیں ہے - بلکہ جو خیالات لوگوں کے دل میں خدا کی وحدانیت اور قدرت و عظمت کے خلاف تہ نشین ہوں اُن کا زائل کرنا ہے -

(۹) مولانا - آسمان کا بھی قرآن میں بہت ہی جگہ مذکور ہے اور جس کی نظر قرآن پر ہے وہ کبھی اس بات کو تسلیم کر نہیں سکتا - کہ قرآن میں چھ دن کی تعیین پر زور نہیں دیا گیا - بے شک کچھ آیتیں ایسی بھی ہیں جن کا مخاطب بتکلف یہود کو بنایا جا سکتا ہے مگر ایسی بھی آیتیں ہیں جن کا سیاق و سباق پڑا پکار رہا ہے کہ چھ دن پر زور ہے - اور مخاطب بلا تخصیص یہود کل افراد بشر ہیں جیسے سورہ ق میں - و لقد خلقنا السموات والارض وما بینھما فی ستۃ ایام وما مسنا من لغوب - وما مسنا من لغوب کا اس کے سوائے اَور کیا محمل ہو سکتا ہے کہ قائل کا مطلب چھ دن پر زور دینا ہے - غرض اپنی اپنی سمجھ ہے تو ہے ہم کو تو اس تاویل کے تسلیم کرنے سے دنیا کا چھ دن میں پیدا ہونا مان لینا زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے -

بعض قدیم قوموں پر نافرمانی کی وجہ سے عذاب نازل ہونا

(۱۰) سرسید - قرآن میں جو جا بجا قدیم قوموں میں بدیاں اور بد اخلاقیاں پھیل جانے کے بعد اُن پر طرح طرح کے عذاب کا نازل ہونا اور کسی قوم کو آندھی اور طوفان سے کسی کو زلزلے سے - کسی کو ٹڈیوں اور دیگر حشرات کے مسلط کرنے سے اور کسی کو عذاب سے برباد کرنا بیان ہوا ہے - اُس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ در حقیقت اُنکے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث ہوئے تھے -

(۱۰) مولانا - قرآن میں پچھلی اُمتوں کے بہت سے حالات بیان کیے گئے ہیں جن پر اُن کی نافرمانیوں کی وجہ سے وقتاً فوقتاً عذاب الٰہی نازل ہوتے رہے - گناہ اور عذاب میں جو خدا نے علت و معلول کا تعلق رکھا ہے بہت لوگ اس میں اشتباہات کرتے ہیں سبب یہ کہ اُنھوں نے اپنے نزدیک علت و معلول کے علاقے کی کوئی وجہ نہ پائی اور لگے شبہہ کرنے - حال آنکہ آدمی کوئی سی دو چیزوں میں بھی علاقہ علیت و معلولیت کی وجہ نہیں سمجھ سکتا - مثلاً یہ تو ہم جانتے ہیں کہ مقناطیسی سوئی کا ایک سرا ضرور شمال کی طرف رہتا ہے جیسا کہ قبلہ نماؤں میں دیکھتے ہو مگر اس کی وجہ کے جاننے سے ہمارا فہم قاصر ہے - اور یہی حال علیت اور معلولیت کے تمام علاقوں کا ہے - ہر وزنی چیز زمین پر تو گرتی ہے - مگر کیوں گرتی ہے؟ نہ ہم اس کی وجہ جانتے ہیں اور نہ بیان کر سکتے ہیں - ظاہرا یہ اشتباہات جو لوگوں کو پیدا ہوتے ہیں - ان کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ اپنی معلومات کو جامع اور اپنی عقل کو

رسا خیال کرتے ہیں - ہر کس را عقلِ خود بکمال اور ما اوتیتم من العلم الا قلیلا کی طرف اُن کا ذہن منتقل نہیں ہوتا - اور ایک بات یہ بھی ہے کہ بسا اوقات کسی مصلحت سے دنیا میں گناہ کا نتیجہ واقع نہیں بھی ہوتا اور آخرۃ پر ملتوی رکھا جاتا ہے وَاُمْلِیْ لَہُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ - لیکن گناہ اور عذاب میں جو علاقہ ہے تاخیرِ عذاب سے اُس علاقے میں کچھ ضعف لازم نہیں آتا - دنیا میں ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک بدکرداری کا نتیجہ بدکئی کئی پشتوں کے بعد ظاہر ہوا ہے مگر ہوا ہے ضرور جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ چیچک قبر تک نکل کر رہتی ہے -

فصاحت و بلاغتِ کلامِ اللہ -

(۱۱) سرسید - قرآن میں جو کفار سے بطور معارضے کے کہا گیا ہے کہ اگر تم کو اس کتاب کے من عند اللہ ہونے میں شک ہو تو اس کی مثل کوئی سورۃ یا چند آیتیں تم بنا لاؤ - اِس سے جیسا کہ اکثر اہلِ اسلام خیال کرتے ہیں یہ مراد نہیں ہے کہ ایسا فصیح کلام تم نہیں بنا سکتے - بلکہ یہ مراد ہے کہ ایسا کلام جو عالم اور فلسفی اور حکیم سے لے کر جاہل صحرا نشین بدّوؤں اور اونٹ چرانے والوں تک سب کی ہدایت کے لیئے یکساں مفید اور سب کی سمجھ اور علم کے موافق ہو بنا لینا تمھاری طاقت اور قدرت سے باہر ہے -

(۱۱) مولٰنا - معجزات میں ایک قرآن کا معجزہ البتہ لاجواب ہے - جن دنوں قرآن نازل ہوا عرب میں فصاحت و بلاغت کا بڑا چرچا تھا - اُنھوں نے اپنی زبان کو معراج الکمال پر پونہچا دیا تھا - اور اپنے سوا سب لوگوں کو عجم یعنے گونگے کہتے تھے - فصحائے عرب نے قوتِ گویائی سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر رکھا تھا - گویا شعراء ملک میں حکمرانی کر رہے تھے - سارے کمالاتِ گویائی اور زباں آوری کے آگے ہیچ تھے ایسے وقت میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا - وہی عربی بولی تھی مگر خدا پیغمبر صاحب کی زبان سے بولتا تھا تو اُس کے الفاظ اور اُس کے مضامین کا کیا کہنا - اگر کلامِ خدا فصحا کے کلام سے کسی بات میں اُنیس بیس کے فرق سے بھی گرا ہوا ہوتا تو عرب کے لوگ جن کو اپنے حُسنِ کلام پر بڑا فخر و ناز تھا اُس کو چٹکیوں میں اُڑاتے مگر باوجودے کہ الحق مرٌ شرک اور بت پرستی کی مذمت ہوتی تھی یا پند و نصیحت کی ناگوار باتیں اور وہ بھی نثر میں مگر پیرایہ کچھ ایسا دل چسپ ہوتا تھا کہ جو سنتا تھا لٹو ہو جاتا تھا اور سرآمدِ شعراء اپنی جگہ لوہا مان گئے تھے - غرض خدا نے اہلِ عرب کو اُسی داؤ سے پچھاڑا جو اُن کو خوب رواں تھا - اور ہر سے بار بار تحدّی ہوتی تھی کہ وان کنتم فی ریب مما نزلنا الخ - اور قل لئن اجتمعت الانس والجن الخ اور اُدھر سب کو سانپ سونگھ گیا تھا کچھ جواب نہیں کیا معجزے کے سر میں سینگ ہوتے ہیں - اس سے بڑھ کر اور معجزہ کیا ہو سکتا ہے - قرآن یہ ایک ایسا زندہ معجزہ ہے کہ روزِ نزولِ قرآن سے الی ساعتنا ھذہ برابر تحدّی ہو رہی ہے اور جب تک قرآن پڑھا پڑھایا جائے گا یعنی روزِ قیامت تک ہوتی رہے گی کسی نے تحدّی کے جواب کی ہامی بھری؟ کیا عربی زبان روئے زمین پر سے معدوم ہو گئی؟ یا جن مُلکوں میں عربی بولی جاتی ہے مخالفانِ اسلام نہیں بستے؟ سوا تیرہ سو برس کے عرصے میں کسی نے تو جواب کی جرأت کی ہوتی -

حضرت عیسٰیؑ

(۱۲) سرسید - حضرت عیسٰیؑ کا بن باپ کے پیدا ہونا قرآن کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا -

(۱۲۷) مولٰنا - اس سے بڑھ کر سلف کنسٹیٹ[۵۱]۔ کون ہوگا جو ذری سی عقل کے برتے پر ملکوت السمٰوت والارض کے رازمیں دخل دے۔ جیسے گولر کے اندر کا بُھنگا فضائے دہر پر معترض ہو - یا برساتی پتنگا زمانے کے حدوث وقدم میں رائے زنی کرے - جو شخص اپنی پیدائش کے بھید کو دریافت نہیں کرسکا جس نے نہیں سمجھا کہ درختانِ ثمردار کیوں کرنر و مادہ دونوں کا کام دیتے ہیں جو نہیں بتا سکتا کہ ابتدا میں مرغی بے انڈے کے پیدا ہوئی یا انڈا بے مرغی کے - اُس کو بے شارکتِ پدر علیسیٰؑ کے پیدا ہونے میں چون وچرا کرنے کا کیا حق ہے "

دعا -

(۱۳۳) سرسید - دعا ایک قسم کی عبادت ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے - الدعاء ھوالعبادۃ - پس دعا کے مستجاب ہونے سے اُس کا مطلب جس کے لیئے دعا کی جاتی ہے حاصل ہونا مراد نہیں ہے بلکہ جو معنی عبادت کے قبول ہونے کے ہیں وہی معنی دعا کے مستجاب ہونے کے ہیں -

(۱۳۴) مولٰنا - اب ہا نفسِ دعا - اس کے بارے میں ہمارے ابنائے زمانہ خاص کر جو لوگ انگریزی خوان ہیں بہت سے شکوک کرتے ہیں اُن کا خیال یہ ہے کہ دنیا میں اسباب کا سلسلہ قائم ہے - کوئی نتیجہ بدون سبب کے ظاہر نہیں ہوسکتا - اور نہ اسباب کے سلسلے میں کسی طرح ردّ وبدل ہوسکتا ہے - یعنی دعا کرنا فعلِ عبث ہے - پھر یہ بحث تقدیر میں جا پڑتی ہے کہ خدا نے اچھا بُرا جو کچھ بھی کسی کی تقدیر میں لکھ دیا ہے ہو کر رہتا ہے - اس طرح پر بھی دعا کا کرنا فعلِ عبث ہوا - تیسری بات یہ ہے کہ دعائیں بُہتیری قبول بھی نہیں ہوتیں - ان باتوں کا ماحصل یہ نکلا کہ دعا ایک فعلِ عبث ہے اور سلسلۂ اسباب میں دعا کو کچھ دخل نہیں - تمام شکوک کا جواب ہم نے تو یہ سمجھ رکھا ہے کہ آدمی کی فطرت اسی طرح کی واقع ہوئی ہے کہ جب کبھی اُس کو کوئی ضرورت پیش آتی ہے اور کوئی تدبیر رفعِ ضرورت کی اُس کو نہیں سوجھتی تو وہ ایسی ہستی کی طرف رجوع کرتا ہے - جس کو وہ اپنے ذہن میں سمجھا ہوا ہے - کہ اُس کی ضرورت کے دفع کرنے پر قادر ہے - یہ بات دوسری ہے کہ جس کو وہ رفعِ ضرورت پر قادر سمجھا ہے - واقع میں بھی رفعِ ضرورت پر قادر ہے یا نہیں - یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ وہ حاجت مند خدائے برحق کی طرف رجوع کرتا ہے - یا باطل کی طرف مگر بہرکیف وہ اپنے سے برتر کی طرف رجوع کرتا ہے -

فطرتِ انسانی تو یہ ہے اور یہ فطرۃ تمام بنی آدم میں شہری ہوں یا دیہاتی - عالِم ہوں یا جاہل بچے ہوں یا جوان یا بوڑھے - مرد ہوں یا عورت - خواندہ ہوں یا ناخواندہ - مشرق کے رہنے والے ہوں یا مغرب کے سب میں یکساں پائی جاتی ہے -

اب ہا دعا کا مقبول ونامقبول ہونا تو بے شک خدا کا فرمودہ ہے ادعونی استجب لکم اول تو قبول کرنے کے وہ معنی نہیں جو لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں بلکہ یہ آیت اُن لوگوں کی ردّ میں نازل ہوئی معلوم ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے بوجہ من الوجوہ مایوس تھے - اور ایسا اتفاق ایک بڑے خداشناس کو پیش آچکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت بوڑھے ہوگئے تھے توالد وتناسل کی عمر سے متجاوز اور اُن کی بی بی بوڑھی ہونے کے علاوہ بانجھ بھی تھیں - اور اس پر حضرت ابراہیم کو اولاد کی تمنا تھی - حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قصہ قرآن کی آیتوں میں مذکور ہے - تو مطلب یہ ہے کہ بتقاضائے بشریت پیغمبروں تک کو بعض وقت یاس و ناامیدی ہوتی ہے ایسی حالت کی اصلاح کے لیئے آیۂ ادعونی استجب لکم نازل ہونا قرینِ قیاس ہے - دوسرے یہ کہ شاید اُن لوگوں کا ردّ منظور ہو جو حاجت پڑے پر خدا کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں تو آیتِ قرآن کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم سے دعا کرو کہ ہم دعائیں قبول کرتے ہیں یعنی قبول کرنے کی قدرت رکھتے ہیں - پھر اگر آیۂ ادعونی استجب لکم کو وعدۂ قبولِ دعا بھی سمجھا جائے

تو پیرایۂ قبولِ دعا کی صراحت نہیں۔ ممکن ہو کہ کوئی مفلس تونگری کی دعا کرے اور جب خدا اُس کو مال و دولت دے تو وہ تونگری اُس کے حق میں وبالِ جان ہو جائے۔ غرض آدمی علم غیب نہ ہونے کی وجہ سے مفاد کی جگہ مضرت کی بھی خواہش کرنے لگتا ہو۔ جیساکہ فرمایا ہو ویدع الانسان بالشر دعاءہ بالخیر وکان الانسان عجولا۔ تو ایسی صورتوں میں خدا تعالیٰ بتقاضائے رحمتِ کاملہ دعائے بد کو قبول نہیں فرماتا لیکن اس کو نامقبولیت نہیں سمجھنا چاہیے۔ یا ایسا بھی ہوتا ہو کہ کسی مصلحت سے دعا قبول نہیں ہوتی تو خدا تعالیٰ دین یا دنیا میں بندے کو اُس کا عوض کر دیتا ہو اور کم سے کم عوض یہ تو ضرور ہوتا ہو کہ دعا سے دل کو تسکین ہو جاتی ہو الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (اور) سن رکھو کہ خدا کی یاد سے دلوں کو تسلی ہوتی ہو۔)

تعدّدِ ازواج

(۱۴) سر سیّد۔ اگر مرد کو یہ احتمال بھی ہو کہ وہ متعدد ازواج میں عدالت نہ کر سکے گا تو اس کو ایک سے زیادہ جورو کرنے کی اجازت نہیں ہو۔

(۱۴) مولٰنا۔ صرف ایک اسلامی شریعت ہو جو اس بات کا دعویٰ کر سکتی ہو کہ اُس نے زن و شو کے تعلق کے بارے میں جو فیصلہ کیا ہو وہ بالکل مطابقِ فطرۃ ہو اور اُس میں دونوں کے حقوق کی واجبی رعایۃ ہو۔ لیکن مولوی روم نے ٹھیک فرمایا ہو

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد
صد ہزاران پردہ سوی دیدہ شد

فیصلۂ قرآن کی دو آیتیں ہیں جو ترجمے سمیت ذیل میں لکھی جاتی ہیں۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ (النساء ع ۱)

اور اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں (کے بارے) میں انصاف قائم نہ رکھ سکو گے تو اپنی مرضی کے مطابق دو دو اور تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کر لو ف۱ لیکن اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (کئی بیبیوں میں) برابری (کے ساتھ برتاو) نہ کر سکو گے تو (اس صورۃ میں) ایک ہی (بی بی کرنا) یا جو (لونڈی) تمھارے قبضے میں ہو (اُسی پر) قناعت کرنا ف۲ نامنصفانہ برتاو سے بچنے کے لیے) یہ تدبیر زیادہ ترقرین مصلحۃ ہو۔

ف۱ اور آدمی جس طرح (اپنے حق میں) بہتری کی دعا مانگتا ہو اسی طرح (دل گیر ہو کر کبھی) بُرائی کی بھی دعا مانگنے لگتا ہو اور انسان بڑا جلد باز ہو ۱۲

ف۱ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کرنے کی صورۃ یہ تھی کہ یتیم لڑکی کسی کی سرپرستی میں ہوتی اور وہ اُس کے مال و جمال کی وجہ سے اُس کے ساتھ نکاح تو کر لیتا لیکن نکاح کے بعد اُس کے حقوقِ مہر وغیرہ کی چنداں پروا نہ کرتا۔ کیوں کہ اُس بےچاری کا کوئی ولی وارث نہ تھا کہ ٹھوک بجا کر اُس کے حقوق لیتا اللہ نے فرمایا کہ جب تم انصاف نہیں کر سکتے تو تم اُن سے نکاح ہی مت کرو کسی اَور عورت سے کر لو عورتوں کا دنیا میں کال نہیں ۱۲

ف۲ شرع کی رُو سے صرف وہ کافر لونڈی غلام ہیں جو جہاد یعنی مذہبی لڑائی میں پکڑے آئیں۔ پھر گرفتار ہوئے پیچھے مالِ منقولہ کی طرح اُن کی خرید و فروخت بھی ہوتی رہتی ہو۔ اس سرے سے اُس سرے تک سارے ہندوستان میں کہیں لونڈی غلام نہیں اور حاکمِ وقت کی طرف سے بھی اس کی بڑی سخت ممانعت ہو اور یہ جو لوگ قحط میں بچے پال لیتے یا دوسرے خدمت پیشہ یہ ہم سب کی طرح آزاد ہیں ان کے ساتھ لونڈی غلام کا سا برتاو کرنا گناہ ہو خدا کا اور جرم ہو حاکم کا ۱۲

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ط (سورۂ نساء ع ۱۹)

اور تم (اپنی طرف سے) بہتیرا چاہو لیکن یہ تم سے ہو نہیں سکے گا کہ (کئی کئی) بیبیوں میں (پوری پوری) برابری کر سکو تو بالکل (ایک ہی کی طرف) مت جھک پڑو کہ دوسری کو (اس طرح) چھوڑ بیٹھو گویا ادھر میں لٹک رہی ہے۔

ہم نے تو دونوں آیتوں کو ملا کر یہ مطلب سمجھا ہے کہ مسلمان مرد کو وقتِ واحد میں چار بیبیوں تک کے جمع کرنے کی اجازت ہے بشرطے کہ وہ متعدد بیبیوں میں برابری قائم رکھ سکے ورنہ ایک پر قناعت کرے۔ یا لونڈیوں پر۔ برابری میں ایک طرح کا ابہام تھا تو اس کو آیۃ (۲) سے رفع کر دیا کہ پوری برابری تو تم کر نہ سکو گے تو ایسا بھی نہ کرنا کہ بالکل ایک ہی کے ہو رہو یعنی وہ برابری جس پر تکثیرِ ازواج کی اجازت موقوف ہے اس قدر ہے کہ آدمی ایک ہی بی بی کا نہ ہو رہے۔ کہ دوسری کی بالکل خبر تک نہ لے۔ آیۃ (۱) نے تکثیرِ ازواج پر برابری کی بڑی سخت قید لگا دی تھی اور اُس کے ظاہر سے ایسا سمجھا جاتا تھا کہ کامل برابری مراد ہے کہ مُرادفِ ممانعت ہے۔ آیۃ (۲) نے اس قید کو ڈھیلا کر دیا جس سے معلوم ہوا کہ تکثیرِ ازواج مقدورِ بشر ہے آیۃ (۲) سے تکثیرِ ازواج کا رستہ تو کھلا مگر کہیں اس کی صراحۃ نہیں کہ مردوں کو تکثیرِ ازواج کی کش مکش میں پڑنے کی ضرورۃ ہے مگر جن کو خدا نے ذہن رسا دیا ہے وہ نساؤکم حرث لکم سے ضرورۃ مستنبط کر سکتے ہیں اور ہم اُس کی تصریح اوپر کر بھی چکے ہیں کہ عورۃ تو تکثیرِ ازواج کی محل ہی نہیں مرد ہے تو مرد تکثیر کا حق دار ٹھیرا۔ عورۃ کا محل نہ ہونا اور مرد کا ہونا یہی مرد عورۃ میں فساد کا موجب ہے۔ عورتیں چاہتی ہیں کہ مرد تکثیر سے مطلقاً مستفید نہ ہوں۔ مرد تکثیرِ نامحدود کے دعویدار ہیں اسلام نے مردوں کو تکثیرِ محدود کی ڈگری دی۔ اہلِ عرب اسلام سے پہلے تکثیرِ نامحدود ہی پر عمل کرتے تھے اسلام نے تکثیر کو محدود کر کے عورتوں پر احسان کیا۔ اس پر بھی عورتیں اسلام کے فیصلے سے خوش نہیں۔ ان کی ناخوشی کی ایک وجہ اور بھی ہے اور معقول ہے کہ مرد کئی بیبیوں میں سے کسی ایک کے حُسنِ صورۃ یا کسی اور ادا کے مفتون ہو کر اُسی کے ہو رہتے ہیں یعنی آیۃ (۲) کا ممکن عدل کرنا بھی اُن سے ناممکن ہو جاتا ہے۔ پس اذا فات الشرط فات المشروط کی رو سے مردوں کو تکثیر کی اجازۃ سے مستفید ہونے کا کوئی حق نہیں

قطعِ ید۔

(۱۵) سر سید۔ سارق کے لیئے قطعِ ید کی سزا جو قرآن میں بیان ہوئی ہے لازمی نہیں ہے کیوں کہ اگر لازمی ہوتی تو فقہا اُس کو مالِ مسروقہ کی ایک خاص مقدار کے ساتھ مشروط نہ کرتے اور نیز صحابہ کے وقت میں متعدد موقعوں پر سارق کو صرف قید کی سزا دی جاتی

(۱۵) مولانا۔ بات یہ ہے کہ شریعتِ محمدیہ نے انسانی فطرت کے تمام پہلوؤں پر احاطہ کر لیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ فطرت مختلف افراد سے مختلف اوقات میں مختلف طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ شارع نے مثال کے طور پر کوئی جزوی صورت لے کر اُس کی نسبت فرما دیا کہ ایسی صورت میں یوں کرنا چاہیئے۔ پس نہ فطرت کا اُسی صورت میں انحصار ہے نہ حکم کا۔ اُس کی توضیح کے لیئے میں ایک مثال دیتا ہوں کہ چوری کی سزا چور کا ہاتھ کاٹ ڈالنا ہے۔ اور مالِ مسروقہ کی مقدار کی کچھ صراحت نہیں جیسی چوری راکھ کی ویسی چوری لاکھ کی۔ تو یہ حکم ویسا ہی ہوا جیسے مولی کے چور کو سولی۔ شارع کا مقصودِ اصلی تو یہ ہے کہ چوری سے امن و عافیتِ خلائق میں خلل آتا ہے۔ اس کا انسداد ہو۔ سزا کی سختی اور نرمی موقوف ہے ایک طرف مالِ مسروقہ کی

مقدار پر اور دوسری طرف چور کی حالت پر- تھوڑی سی چوری بعض صورتوں میں مسروق منہ کو شاید زیادہ تکلیف دہ نہ ہو- اور بڑی چوری ممکن ہو کہ مسروق منہ کو تباہ و برباد کر دے- اسی طرح بعض چور ایسے ہوں گے جو مجرد انکشافِ جرم اور فضیحت سے ڈر کر آگے کو توبہ کریں- اور بعض کو شاید چوری کا ایسا لپکا پڑا ہوگا کہ بے ہاتھ کاٹے کسی طرح باز آنے والا نہیں- عجب نہیں نزولِ قرآن کے وقت عرب کے چور ایسے ہی سخت ہوتے ہوں گے کہ بے ہاتھ کاٹے نہ مانتے ہوں گے پھر جیسے جیسے تہذیب اور شائستگی کے ساتھ لوگوں میں غیرت اور حمیت آتی گئی- عالموں نے کہ وہی اُن دنوں دیوانی اور فوجداری کے حاکم ہوتے تھے شارع کی اصلی غرض کا خیال کر کے دس درم سے کم میں قطعِ ید کو جائز نہیں رکھا- اور آبرو دار چور کو یہ سزا دی کہ اُس کو مردود الشہادۃ ٹھیرا دیا"

آنحضرت صلعم کا معجزہ قرآن میں

(۱۶) سرسیّد- قرآن میں آنحضرت صلعم سے کسی معجزے کے صادر ہونے کا ذکر نہیں-

(۱۶) مولانا- قرآن میں کہیں صاف لفظوں میں پیغمبر صاحب کے معجزوں کا مذکور نہیں- بلکہ بعض مقامات میں تو معجزے سے صریح انکار کیا گیا ہے- معراج اور شقِ صدر دو معجزوں کا حوالہ قرآن میں دیا جاتا ہے تو بعض مفسرین نے اُن کے الفاظ کی ایسی توجیہہ کی ہے کہ معجزہ گیا گزرا ہو جاتا ہے- اور پھر میں کہتا ہوں کہ معجزہ رسول کے اختیار کا تو نہیں-

ربا

(۱۷) سرسیّد- جس ربا یعنی سود کی حرمت قرآن میں بیان ہوئی ہے اُس سے اُسی قسم کا ربا مراد ہے جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب میں جاری تھا- اور جس کی مثال ہمارے ملک کے سود خواروں اور رہٹیوں میں جن کا پیشہ سود خواری ہے پائی جاتی ہے مگر اس سے اُس منافع کی حرمت جو پرامیسری نوٹوں پر لیا جاتا ہے ثابت نہیں ہوتی- اس کے سوا کسی گورنمنٹ یا کمپنی کو جو ملک کی ترقی کے لیئے روپیہ قرض لے اُس کو سود پر روپیہ دینا یا کسی جماعت کا جو کسی رفاہِ عام کے کام کے لیئے چندہ جمع کرے اُس روپیہ کا سود میں لگانا اور اُس کے منافع سے رفاہِ عام کا کام کرنا یہ بھی ربا میں داخل نہیں ہے-

(۱۷) مولانا- انسانی فطرت اور اسلامی شریعۃ کی سہولت کے ساتھ ممانعتِ سود کی سختی پر نظر کرتے ہیں تو سوا اس کے اَور کوئی پہلو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم ممانعۃِ سود کی کوئی ایسی توجیہہ کریں کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے- اضطرار اور شرعی ممانعۃ کے دوہرے دوہرے شکنجوں سے بچے رہنے کی سب سے آسان تدبیر جو سوجھ پڑتی ہے وہ یہی ہے کہ ہم اپنی خاص حالۃ کی وجہ سے اپنے تئیں حکم ممانعۃِ سود کا مامور بہ اور مخاطب ہی قرار نہ دیں- یہ اُس سے بدرجہا بہتر ہوگا کہ مامور بہ اور مخاطب بن کر بیباکی اور شوخ چشمی کے ساتھ خلافِ حکم کریں- قرآن میں ایک جگہ تو اضعافاً مضاعفہ یعنی سود در سود کی مناہی ہے اور دوسری جگہ مطلق سود کی تو جس صورت میں مطلق سود منع تھا سود در سود بدرجۂ اولیٰ منع ہوگا اس کے لیے حکمِ خاص کی کیا ضرورۃ تھی یہ اشتباہ تو امام رازی کی تفسیر سے رفع ہو جاتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ عرب کے لوگوں میں صرف سود در سود کا رواج تھا- اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن میں جہاں مطلق سود کی مناہی ہے وہاں بھی سود سے سود در سود مراد ہے اور چوں کہ مطلق سود کو الربوا معرف باللام فرمایا ہے نحو کے قاعدے سے وہی ربوا سمجھا جائے گا معہود فی الذہن جو عرب میں مروّج تھا- سود کے معاملے میں کسی طرح کا اخلاقی گناہ تو سمجھ میں نہیں آتا پھر جو سود کے بارے میں ایسا سخت وعید قرآن میں ہے کیوں ہے- ہو نہ ہو وہ وعید سخت سود در سود کے بارے میں ہے کہ سود در سود آخر قرض لینے والے کو تباہ و برباد کر دیتا ہے-

ضمیمہ (۲)

اہل و عیال

اگر یہ بات صحیح ہی کہ مرد اور عورۃ دونوں اپنی اپنی جگہ ناقص الخلقۃ ہیں اور جب تک وہ زن و شو کی حیثیت سے آپس میں نہ ملیں پورے اور کامل الخلقۃ انسان یا آدمی نہیں ہو سکتے۔ تو یہ بات بھی صحیح ہی کہ ہمارے مولانا کی لائف بغیر اُن کی اہلیہ کے حالات کے نامکمل اور ناقص اور اَدھوری رہ جاتی۔ اگر راقم مرحومہ کے حالات حیاۃ النذیر میں بطور ضمیمے کے شامل نہ کرتا۔

مولانا نے سچ کہا ہی کہ زن و شو کی مثال شربت کی سی ہی کہ اُس کے دو جزو ہیں جداگانہ۔ شکر اور پانی۔ دونوں گھُل مل کر ایک ذات ہو جائیں تو شربت بنتا ہی۔ یہ بات اِسی رشتے میں دیکھی جاتی ہی کہ اِس کی وجہ سے مال و متاع۔ اولاد۔ رنج و راحت۔ آب رو۔ ہر چیز اور ہر حالت میں مرد اور عورۃ کی لازمی شرکت قائم ہو جاتی ہی۔ پس یہ بڑی نامناسب بات تھی کہ مرحومہ کے حالات حیاۃ النذیر میں نہ ہوتے۔ اور صرف مولانا ہی کے حالات پر کتاب ختم کر دی جاتی۔ میں اِس خصوص میں اپنے مکرم دوست مولوی بشیر الدین احمد صاحب کا زیادہ احسان مند ہوں کہ اُنھوں نے اپنی والدۂ ماجدہ کے حالات میں مجھے اتنی مدد دی جتنی کہ ناظرین دیکھ رہے ہیں۔ پس مجھے اور ناظرین کو مولوی بشیر الدین احمد صاحب کا زیادہ شکر گزار ہونا چاہیئے۔

مولانا کی اہلیہ صفیۃ النساء مولوی عبد القادر صاحب مرحوم دہلوی کی اولادِ اکبر تھیں۔ جس طرح یہ سب اولاد میں باعتبارِ عمر بڑی تھیں۔ اسی طرح لیاقت۔ متانت۔ علم و فضل اخلاق۔ خوش نصیبی۔ تمول اور سر بر آوردگی غرض ہر اعتبار سے فخرِ خاندان تھیں۔ ان کے زمانے میں مستورات کی تعلیم کا چرچا اس قدر نہ تھا کہ جیسا اب ہی۔ بلکہ سچ پوچھیئے تو کچھ بھی نہ تھا۔ اب جو ہی وہ بھی کیا ہی برائے نام ہی۔ پھر اِس ترقی کو پچاس ساٹھ برس پیچھے ہٹایئے تو صفر ہی رہ جائے گا۔ بالعموم عورتوں کو لکھانا پڑھانا بے ضرورت بلکہ عیب سمجھا جاتا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ لکھنا پڑھنا ذریعۂ اکتساب ہی اور پردہ دار عورت کو اِس کی کیا ضرورۃ ہی۔ البتہ مولویوں اور مشائخوں کے گھرانوں میں مذہباً اور اعتقاداً قرآن مجید اور چند مذہبی رسائل مثل راہ نجات وغیرہ پڑھا دیئے جاتے تھے۔ بس یہی عورتوں کا مبلغِ علم تھا۔ اس سے زیادہ تعلیم دینا عورتوں کا دیدہ ہوائی کرنا سمجھا جاتا تھا بہو بیٹیوں کو گھروں کی چار دیواری کے اندر قید رکھنا ہی ایک بڑی اعلیٰ درجے کی تعلیم تھی۔ لکھوانے کا تو قطعاً رواج نہ تھا۔ عورت کا قلم پکڑنا ہی عیب میں داخل تھا۔ چاروں طرف سے انگلیاں اُٹھنے لگتی تھیں۔ خیالات اس قدر پست تھے کہ عورتیں اگر لکھنے لگیں گی تو اُن کی آزادی عصمت و عفت میں ہارج ہوگی۔ اسی وجہ سے مولانا کی اہلیہ بھی اِس عموم سے مستثنیٰ نہ تھیں۔ لکھنا تو اُن کو آتا نہ تھا مگر قرآن شریف مع ترجمہ اور اردو کی سب کتابیں بآسانی پڑھ سکتی تھیں۔ بلکہ خطِ زشت بھی پڑھ لیتی تھیں۔ چوں کہ مولویوں کے گھرانے میں کلام مجید پڑھنے پڑھانے کا ہمیشہ چرچا رہا کرتا تھا اور محلّے کی لڑکیاں

سب اگر بڑی اُستانی (مولانا کی ساس)، کے پاس پڑھا کرتی تھیں اور ان لڑکیوں میں ہمارے مولانا کی اہلیہ سب سے بڑی تھیں لہٰذا یہ اس مکتب کی خلیفہ تھیں۔ یہ بھی لڑکیوں کو پڑھایا کرتی تھیں۔ صدہا لڑکیاں اِن کی شاگرد اب بھی موجود ہیں بہت سے لڑکوں کو بھی پڑھایا تھا۔ رمضان علی اور سبحان بخش کو اتنا پڑھایا کہ اول الذکر داروغۂ جیل حیدرآباد ہو کر مر گئے اور ثانی الذکر اب تک زندہ ہیں۔ اور اب یہ مولوی عبدالسبحان پکارے جاتے ہیں۔ اور دہلی میں وعظ و پند کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان دونوں کی تعلیم میں ہمارے مولانا کا بڑا حصہ ہے۔

جس طرح کوئن وکٹوریا ملکہ معظمہ مرحومہ کو بلحاظ اُن کے اوصافِ حمیدہ کے وکٹوریا دی گڈ کا خطاب پبلک کی طرف سے ملتا تھا اسی طرح مولانا کی اہلیہ کو ہر کہ ومہ بیوی صاحب کے لقب سے پکارتا تھا۔ اُن کا اصلی نام کوئی جانتا بھی نہ تھا۔

عورت کا بڑا فریضہ اطاعتِ شوہر ہے۔ یوں تو ہر عورت کہتی ہے کہ میں اپنے میاں کو اپنا سرتاج سمجھتی ہوں اور اطاعت کرتی ہوں۔ مگر عملاً اکثر جگہ اس کے برعکس نتیجہ نظر آتا ہے۔ مولانا کے مزاج میں فطرۃً تند مزاجی سختی ہے اور وہ جلد برافروختہ ہو جاتے ہیں۔ اس سختی اور برافروختگی پر بیوی صاحب نے مولانا کی جیسی اطاعت اور فرماں برداری اور رضاجوئی کی اور اُن کے مزاج کی اونچ نیچ کو جس عمدگی سے سنبھالا اُس کی مثال غالباً ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ وہ بڑی باحیا اور شرمیلی بیوی تھیں۔ نہ بہت بک بک کرتی تھیں نہ بالکل گم سُم تھیں۔ طرزِ گفتار نہایت متین تھا۔ کبھی اُن کو ٹھٹا مار کر ہنستے ہوئے کسی نے نہیں سنا۔ شرم اس قدر تھی کہ سر پر سے اُن کا دوپٹہ کبھی کھسکتا نہ تھا۔

اس واقعے سے وہ عورتیں جو دوپٹے کو اپنے گلے میں بتّی بنا کر ڈالے رکھتی ہیں سبق لیں۔ دوپٹے کا کام ستر پوشی ہی وہ تو گیا گزرا ہوا اب تو منجملۂ اور سامانِ زینت و آرائش اور بناؤ سنگھار کے وہ بھی ایک بانکپن کی چیز ہے۔ لباس اُن کا ہمیشہ صوفیانہ رہتا تھا۔ کبھی شوخ اور چھچھورا رنگ اُنھوں نے استعمال نہیں کیا۔ ہلکے اور نفیس رنگ استعمال کرتی تھیں۔ گوٹا کناری اور مسالے کے جگمگاتے کپڑوں سے ہمیشہ متنفر تھیں۔ اس میں بھی سادگی ملحوظِ خاطر تھی۔ یہ تو جوانی کا حال ہے اور جب سے کہ بڑی لڑکی کا انتقال ہوا اُنھوں نے اپنے کو بالکل خاک میں ملا دیا تھا۔ گویا زندہ درگور تھیں۔ کبھی پلنگ پر بچھونا بچھا کر نہ سوئیں بلکہ کھرّی چارپائی پر بغیر تکیے کے سوتی تھیں۔ رنگین اور ریشمین کپڑے پہننے بالکل چھوڑ دیئے تھے معمولی اور بالکل معمولی لباس استعمال کرتی تھیں۔ نہ اس خیال سے کہ کفایت شعاری ہو بلکہ طبیعت ہی میں کچھ دنیا کی بے ثباتی اور فقر جم گیا تھا۔ دوسروں کو اچھا پہنا کر دوسروں کو اچھا کھلا کر خوش ہوتی تھیں۔ اپنا حال یہ تھا کہ جو بیش قیمت کپڑے تحفے اور سوغات میں آتے کبھی اُس میں سے خود ایک کترن نہ لیتیں۔ بچوں کو یا دوسروں کو دے دیتیں ہمیشہ یہ کہتیں میں پہن کر کیا کروں گی تم پہنو۔ تمھاری عمر ہے تمھارا پہننا اچھا بھی معلوم ہوگا۔ مجھے دیکھو اور ان کپڑوں کو یہی حال زیور کا تھا۔ بتدریج اُنھوں نے سب بڑھا دیا صرف ہاتھوں میں ایک سونے کا چوڑا مرتے دم تک تھا۔ کہ وہ انتقال کے بعد کاٹ کر نکالا گیا۔ اِس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اُتر نہ سکتا تھا۔ ورنہ وہ اُسے بھی خیرباد کہتیں۔ اپنی زندگی ہی میں بہت سے زیور اُنھوں نے اپنی بہو بیٹیوں کو دے دلا دیئے تھے۔ جو کچھ بچ رہا وہ اُن کے مرنے کے بعد بطورِ ترکہ اولاد

میں تقسیم نہیں ہوا۔ کیوں کہ اللہ کے فضل سے اُن کی اولاد مستغنی تھی۔ اولاد کی رضا مندی سے جوں کا توں مولانا کو دیدیا
گیا۔ مولانا نے فروخت کر کے کسی کار خیر میں لگا دیا۔

اتنا بڑا کنبہ کہ کئی کئی مامائیں کھانا پکاتی تھیں۔ مگر اُن کی عادت یہ تھی کہ مسالا خود دیتی تھیں کئی کئی دفعہ پتیلی منگوا کر
آب و نمک چکھتی تھیں۔ سب سے پہلے مولانا کو کھانا نکال کر دیتی تھیں۔ بعدہ بچوں اور نوکروں کو اور سب سے آخر خود۔
کبھی کھانا نہیں بچا یا بچا اور کوئی فقیر آگیا تو اُنھوں نے ویسا ہی اُٹھا دیا۔ اور خود بھوکی رہیں۔ یا یہ کہ پتیلی پونچھ کر
ایک آدھ ٹکڑا کھا لیا۔ کہنے کو سب کہتے ہیں لیکن عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ ہر شخص اپنی آسائش کو مقدم رکھتا ہے۔ مگر یہ نیک
بی بی دوسروں کی آسائش کو اپنی ذات پر ہمیشہ مقدم رکھتی تھیں۔ بڑی صابر اور بڑی متحمل تھیں۔ یوں تو چھوٹے بڑے
ملا کر اُن کے بیس بائیس بچے ہوئے لیکن یکے بعد دیگرے سب آغوش لحد میں جا سوئے۔ سب سے آخری صدمہ بڑی لڑکی
کے انتقال کا تھا جو مولوی حاجی حافظ سید احمد حسن صاحب دہلوی اول تعلقہ دار کی اہلیہ تھیں۔ حاجی صاحب مولوی سید نذیر حسین
صاحب محدث دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ مولوی نذیر حسین صاحب ہی نے یہ نسبت کرائی تھی۔ بیوی صاحب
کی بڑی لڑکی کا انتقال زچگی میں یکا یک بمقام لنگسگور ۱۸۸۹ء میں ہوا۔ ایسی حالت میں کہ بیوی صاحب کے سوا کوئی نہ تھا
بیوی صاحب ہی نے نہلایا دُھلایا اور غسل دیا۔ کفن پہنایا۔ مگر صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ اتنی بات البتہ ہوئی کہ اُن کے
مرنے کے بعد ہمیشہ افسردہ خاطر اور مغموم رہنے لگیں۔ اور عجب نہیں کہ اُسی صدمے نے اُن کی زندگی کو قبل از وقت
تمام کیا۔ مرحومہ بیوی صاحب صرف دو اولادیں چھوڑ گئی ہیں ایک لڑکی جو خان بہادر مولوی شرف الحق صاحب (یہ صاحب
مولانا شاہ عبدالحق صاحب دہلوی کے خاندان میں ہیں) مددگار بندوبست دکن سے منسوب ہیں۔ اور ایک لڑکا (مولوی
بشیر الدین احمد صاحب) جو ریاست نظام میں دوم تعلقہ دار ہیں۔ یوں تو سب مائیں اولاد کی دیوانی ہوتی ہیں۔ مگر ماں ماں
میں بھی فرق ہی بعض ایسی سخت مزاج اور درشت ہوتی ہیں کہ بچوں کو گھرکنا جھڑکنا حتیٰ کہ مارنا آئے دن کا شیوہ ہے مگر
بیوی صاحب نے اپنی اولاد کو باوجود لاڈ پیار کے بھی بہت اچھا اُٹھایا۔ نہ وہ ضدی اور چڑچڑے اور نافرماں بردار ہوئے
نہ ماں نے کبھی ان کو اُنگلی لگائی۔ اولاد تو اولاد وہ کبھی کسی نوکر سے بھی سختی کا برتاؤ نہیں کرتی تھیں۔ نہ اس بات کی روادار
تھیں کہ کوئی نوکروں چھوکروں اور چھوکریوں پر سختی کرے۔ مارنے پیٹنے کا تو نام نہ تھا۔ گھُرکنے جھڑکنے سے بھی وہ ناراض
ہوتی تھیں۔ مخیر حد درجہ کی تھیں۔ خفیہ طور پر خیرات بہت کرتی تھیں۔ جاڑوں میں لحاف گرمیوں میں جوڑے۔ قحط میں
اناج ہمیشہ بانٹا کرتی تھیں۔ بہت سی بیواؤں پردہ نشین عورتوں اپاہجوں اور محتاجوں کی تنخواہیں مقرر تھیں۔ جن کی کانوں کان
کسی کو خبر نہ تھی۔ نہ کبھی کسی کو وے کر منت اور احسان رکھتی تھیں نہ کبھی اس کا اظہار کرتی تھیں۔ غرض جو کچھ کرتی تھیں خالصۃً لوجہ اللہ۔
بہت سی غیر مستطیع لڑکیوں کی شادیاں کرا دیں۔ مولوی عبدالرب صاحب واعظ کی مسجد کا حوض اور صحن پختہ کرا دیا۔ اپنے محلے
کی مسجد کی پوری مرمت کرا دی۔ یہاں تک کہ صحن بھی پختہ بنوا دیا۔ علی گڑھ کالج کی مسجد میں بارہا چندہ دیا ہے۔ غرض کار خیر میں اُن
کا ہاتھ ہمیشہ پیش قدمی اور سبقت کرتا تھا۔ لوگوں کو قرض حسنہ بہت دیا کرتی تھیں۔ رقیق القلب اور منکسر المزاج حد سے بڑھ کر تھیں
غریب سی غریب بیوی کو اپنے پاس بٹھاتیں۔ اپنی پٹاری میں سے پان بنا کر دیتیں۔ ایک عزیزہ کو انھوں نے دو سو روپے قرض حسنہ

دیئے۔ اُن کے کئی وعدے ٹل گئے۔ مگر یہ چیں بجبیں نہ ہوئیں۔ وہی آ آکر عذر معذرت کر جاتے تھے اِس طرح کئی برس گزر گئے
ایک دفعہ وہ آئے اور دروازے پر بیوی صاحب کو بُلا کر اپنی بے استطاعی اور وعدہ خلافی اور نادہندی پر پشیمان ہو کر رونے
لگے اور اپنے ہاتھ جوڑ کر پردے کے اندر کر دیئے۔ بیوی صاحب یہ دیکھ کر لرز گئیں اور خیال کیا کہ اللہ اکبر ہیں تو ہم اور یہ ایک ہی
کنبے کے اور یہ یوں پیسے پیسے کو محتاج عاجز اور مجبور خود بھی رونے لگیں اور نہ صرف تمام قرض معاف کر دیا بلکہ ان کو اُور کچھ بھی دیا۔

چوں کہ وہ شدت سے نیک مزاج تھیں بعض نالائق کنبہ وار سرزوری کر کے اُن سے لیتے بھی تھے اور اُن کو تکلیف
بھی دیتے تھے۔ پھر بھی وہ اپنے کرنے کا کام کیئے ہی جاتی تھیں۔ نیکی کن و بدریا انداز۔

ایک دفعہ کا ذکر ہی کہ ایک قریب کے عزیز نے جن کے سامنے وہ ہوتی تھیں دو بدو اُن کو سخت و سست کہا۔ اور اِن
الفاظ سے کوسا کاٹا کہ ابھی لیا ہی ایک لڑکی تو جوان مر چکی ابھی اور مرے گی اور نعوذ باللہ بے ایمان کا لفظ بھی کہا۔ جس کو
سُن کر وہ سرتاپا کانپ اُٹھیں۔ اور مُونہ سُرخ ہو گیا۔ مگر زبان سے اُف نہ نکالی۔ اور کہا تو یہ کہا کہ ہاں بیٹا تم سچ کہتے ہو۔ میں
اُس سے بھی بدتر ہوں جو تم نے کہا۔ پھر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک دن وہی صاحب دوڑے دوڑے آئے اور بیوی صاحب کے
گلے لگ گئے۔ اُنھوں نے یہ بھی نہ خیال کیا کہ میں اِس شخص کو کیوں کر گلے لگاتی ہوں۔ جو مجھے اس طرح کوس کاٹ گیا ہی نہیں
بالکل خالی الذہن جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہ تھی۔ انھیں گلے لگا لیا اور کہا کہ بیٹا تم میرے بچے ہو جیسے میاں بشیر۔ بھلا میں
کیا تمھاری بات کا بُرا مانتی۔ اور پھر اِس طرح صاف ہو گئیں گویا کچھ بات ہی نہ تھی۔ الکاظمین الغیظ والعافین
عن الناس۔ ایسی صدہا مثالیں ہیں کہ جن لوگوں نے اُن کی بدگوئی کی ہی اُن کو طرح طرح کی تکلیفیں دی ہیں۔ اُنھیں سے وہ
زیادہ سلوک کرتی تھیں ع دہنِ سگ بہ لقمہ دوختہ بہ۔

بیوی صاحب کی ایک بھاوج ہیں مولوی حافظ عبدالواجد صاحب کی بیوی وہ بہت طرار اور ہوشیار ہیں۔
عبدالواجد صاحب کے انتقال کے بعد لوگوں نے بیوی صاحب کو بہت کچھ بھڑکایا۔ بیوی صاحب ہمیشہ اُن کی خبرگیری
کرتی رہتی تھیں۔ عبدالواجد صاحب اُبالی آدمی تھے۔ بیوی صاحب بھائی سے کہہ کہہ کر بھاوج کو تنخواہ دلواتی تھیں۔ اور ہر طرح
ان کی بہی خواہی کرتی تھیں۔ جب متواتر اُنھوں نے سنا کہ بھاوج نے بھلائی کا بدلا بُرائی سے کیا تو بمقتضائے بشریت بیوی
صاحب بھی کشیدہ ہو گئیں۔ ان کا ہاتھ کھنچنا تھا کہ بھاوج صاحب چند ہی روز میں پریشان ہو کر بہت تنگ حال ہو گئیں۔
لوگوں کو مزہ آنے لگا۔ کیوں کہ بیوی صاحب کو برہم کر کے اُنھوں نے اِن بیچاری پر ستم ڈھایا۔ جو کچھ وہ سلوک کرتی تھیں
وہ بند ہو گیا۔ اور ان کو اِس کے سوا سہارا ہی کیا تھا۔ بیوی صاحب دل سے چاہتی تھیں کہ کوئی ایسا اللہ کا بندہ درمیان
میں آجائے کہ میرے اُن کے صفائی ہو جائے میں نہیں چاہتی کہ مجھ سے کوئی رنجیدہ رہے۔ لیکن کسے غرض پڑی تھی کہ میل
ملاپ کراتا اِسی طرح کئی سال گزر گئے مگر بیوی صاحب ہمیشہ ان کی تکلیف اور عُسرت کا حال سُن کر متاثر ہوتی تھیں۔ آخر ان سے
نہ رہا گیا اور خود ڈولی چڑھ اُن کے گھر پونہچیں وہ بیچاری بیوی صاحب کو اچانک آتے دیکھ بدحواس ہو گئیں۔ اور دل میں
کہنے لگیں کہ دیکھیئے اب کیا نیا گُل کھلتا ہی۔ لیکن بیوی صاحب نے اُن کی حد سے زیادہ طمانیت کی اور خود اُن کے سامنے
ہاتھ جوڑ کر اپنا قصور معاف کرایا اور کہا کہ لوگوں نے مجھے تمھاری طرف سے غلط طور پر بدگمان کر دیا تھا۔ تم للہ میرا قصور

معاف کرو۔ وہ بے چاری اس قدر شرمندہ ہوئیں کہ زمین میں گڑ گئیں۔ اول تو بیوی صاحب سارے کنبے میں بڑی اور پھر محسنہ غرض کہ اُن کی زبان سے کچھ نہیں نکلا اور ایسی حالت میں کیا نکل سکتا تھا۔ اس تاریخ سے بیوی صاحب نے دس ۱۰ روپے ماہوار تنخواہ اُن کی مقرر کر دی۔ لیکن یہ بات اُس وقت تک لوگوں کو نہیں معلوم ہوئی جب تک کہ بیوی صاحب کا انتقال نہیں ہو گیا اُن کے انتقال کے بعد اُن کی بھاوج نے یہ سارا قصہ بیان کیا ایسے ایسے سیکڑوں واقعات ہیں جن کی وجہ سے اُن کے انتقال کے بعد سارے محلے میں کہرام مچ گیا بیسیوں عورتیں صرف اُن کے مرنے کو روتی تھیں بلکہ اپنے ذریعہ پرورش کے اٹھ جانے سے بے یار و مددگار رہنے کی وجہ سے روتی تھیں مولانا کے مزاج کو دھیما اور ٹھنڈا کرنا۔ موقع پا کر اعزہ و اقربا کی سفارش کرنا۔ ہر شخص کی مالی مدد کرنا یہ اُن کا اہم فریضہ تھا۔ اُن کی زندگی تک بیٹا بیٹی کسی نے علیحدہ گھر نہیں کیا۔ سب کا خرچ برچ انھیں کے ذمے تھا۔ خود کسی سے ایک حبہ کسی پہلو سے نہ لیتی تھیں۔ بلکہ ہزار ڈھنگوں سے ان لوگوں کو اُور دیتی رہتی تھیں۔

مولوی بشیر الدین احمد صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں جب رخصت لیکر جایا کرتا تھا تو اپنا روپیہ پیسہ سب ماں کے پاس رکھ دیا کرتا تھا۔ اور بالائی خرچ کے لئے ایک تھیلی میں چند روپے اور پیسے الگ رکھ دیا کرتا تھا۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ باوجود مہینوں رہنے اور سیکڑوں روپیہ خرچ کرنے کے بھی وہ تھیلی والے روپے کم نہ ہوتے تھے جب پوچھو تو وہ یہی جواب دیتی تھیں کہ توبہ تم کو کیسی پرچول ہے۔ بیٹا تمھاری تھیلی الگ رکھی ہے جو تم لیتے ہو میں نکال دیتی ہوں۔ لیکن درحقیقت وہ وقتاً فوقتاً اُس میں اُور ملا دیا کرتی تھیں۔ یہ طریقہ اُن کو اس وجہ سے اختیار کرنا پڑا تھا کہ بیٹا نہیں چاہتا تھا کہ ماں پر اپنا بوجھ ڈالے۔ لیکن ماں کی محبت اور مامتا اسی کی مقتضی تھی۔

دیانت دار اور امین ایسی تھیں کہ کسی کی کوڑی ادھر کی اُدھر کرنا وہ گناہ کبیرہ سمجھتی تھیں۔ بعض عورتوں کا خیال ہے کہ خاوند کا روپیہ اپنا روپیہ ہے اور یہ ہے بھی سچ اس کی چوری چوری نہیں ہے۔ لیکن بیوی صاحب کا معاملہ ہی اُور تھا۔ وہ دوسرے کے روپے کو سانپ بچھو خیال کرتی تھیں۔ خواہ اس میں خاوند کا روپیہ ہو یا بیٹے کا یا بیٹی کا۔ خواہ اور کسی کا۔ چناں چہ خود مولانا ناقل تھے کہ ایک مرتبہ ردی کاغذوں کی ٹوکری میں اُنھوں نے بھولے سے ردی کاغذات کے ساتھ پانسو روپے کا ایک نوٹ ڈال دیا۔ وہ اتفاق سے بیوی صاحب کے ہاتھ لگ گیا انھوں نے اُٹھا کر رکھ لیا۔ اور کچھ ذکر نہیں کیا۔ چند روز کے بعد جب تلاش کی نوبت ہوئی اور ہل چل مچی تو اُنھوں نے دے دیا۔ اور کہا کہ تم نے اس طرح ڈال دیا تھا میں نے اُٹھا لیا۔ اور اس خیال سے فوراً ہی نہیں دیا کہ دیکھوں تم کب تک خیال نہیں کرتے۔

اسی طرح کا ذکر ہے کہ ایک دن وہ مولانا کے کپڑوں کا صندوق جھاڑ رہی تھیں اُس میں ایک روپیہ پڑا ملا۔ چوں کہ مولانا کا صندوق تھا اور بظن غالب وہ اُن ہی کا روپیہ ہو گا۔ بیوی صاحب نے لا کر مولانا کو دے دیا۔ مولانا یہ نقل اُن کی غایت درجے کے امین ہونے کی رو کر بیان فرماتے تھے۔

بیوی صاحب مولانا کے ساتھ جہاں جہاں مولانا رہے سب جگہ پھریں۔ لیکن مولانا کے خانہ نشین ہونے کے سال دو سال اول ہی دہلی چلی آئی تھیں اور یہیں مستقل رہنے لگی تھیں۔

لوگوں کا عام عقیدہ تھا کہ بیوی صاحب کے ہاتھ میں غیر معمولی برکت ہے۔ اور واقعی تھی بھی یہی بات۔ مولانا جو ماہانہ

خرچ کو دیتے تھے وہ تو ایسا بہت نہ تھا۔ نہ بیوی صاحب کے مکانات اور جائداد کے کرائے کی آمدنی وو ڈھائی سو روپیہ ماہوار سے زیادہ تھی۔ تاہم ان کو کبھی خرچ سے تنگ نہ سنا۔ اُن کی زبان سے بھی کبھی اس کی شکایت نہیں سنی۔ بیوی صاحب نے اُس روپے میں سے جو اُن کو خرچ کے لیئے ماہوار ملتا تھا پس انداز کر کے اتنی جائداد پیدا کی جس کا کرایہ ڈھائی سو روپے ماہوار تھا۔ یہ بھی اُن ہی کا کام تھا کہ خرچ بھی چلایا اور پس انداز بھی کیا۔

چوں کہ بیوی صاحب کا ہاتھ متبرک سمجھا جاتا تھا کنبے کے لوگ اپنا روپیہ پیسہ اُن ہی کے پاس جمع کر دیا کرتے تھے۔ برکت تو خیر جو ہوگی وہ ہوگی مگر ظاہرا برکت تو یہ تھی کہ اُن کی مثال اُس صندوقچی کی سی تھی کہ جس میں روپیہ ڈالنے کو تو ڈال دو مگر ایک خاص تعداد پر پہنچے بغیر نکل نہیں سکتا تھا۔ یعنی وہ جمع کرنے کو تو جمع کر لیتی تھیں۔ مگر واپس بہت کم دیتی تھیں اگر احیاناً لینے والوں کو ضرورت پڑ جاتی تو اپنے پاس سے دے دیتی تھیں مگر امانت والی تھیلی میں ہاتھ نہ لگاتی تھیں۔ اُن کا مقولہ تھا کہ بھئی وہ روپیہ تو تم رہنے دو۔ مجھ سے قرض کے طور پر لے لو۔ تو قرض کا بوجھ تم پر رہے گا ادا کر دو گے۔ ورنہ اُسے ہاتھ لگاؤ گے تو تانتا ٹوٹ جائے گی۔ پھر تم جمع نہ کر سکو گے۔ چناں چہ اس طرح چھوٹے بڑوں سبھوں کا روپیہ اُن کے پاس جمع تھا۔ لکھنا تو اُن کو آتا نہ تھا۔ نہ کسی کا حساب کتاب اُن کے پاس تھا۔ البتہ ہر شخص کے نام کی تھیلیاں تھیں۔ اُسی میں وہ روپیہ جمع رہتا تھا۔ اور لوگوں کو بھی ایسا اطمینان تھا کہ وہ اُلٹ کر بھی نہیں پوچھتے تھے کہ کس قدر روپیہ جمع ہوا۔ جب کبھی کوئی روپیہ لایا اُس نے اپنی تھیلی میں ڈال دیا۔ اور اطمینان سے گھر چلا گیا۔ لیکن بعض اوقات وہ کہتی تھیں کہ بھئی اپنا اپنا روپیہ گن لو سنبھال لو۔ لکھ کر چٹھی ڈال دو کہ کتنا روپیہ ہوا۔ کیوں کہ زندگی کا ٹھیک نہیں موت کا اعتبار نہیں معلوم نہیں کس وقت زبان بند ہو جائے۔ اور میں کچھ نہ کہہ سکوں۔ جب بیوی صاحب کا انتقال ہو گیا تو صندوقچے یہی معمولی مٹی کے تیل کے پیپے تھے۔ اور اُن میں اعزہ واقربا کا روپیہ اُن کے پاس بھرا پڑا تھا۔ کنجیاں اُن کے سرہانے رہا کرتی تھیں۔ اُن کے مرنے کے بعد یہ صندوق کئی مہینے اسی طرح بند پڑے رہے۔ جب تک کہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب حیدر آباد سے آئے۔ ان کو تردد ہوا کہ معلوم نہیں کس کا کس قدر روپیہ ہے۔ نہ کسی کا حساب ہے نہ کتاب نہ رسید نہ پرزہ۔ دیکھیے کیا جھمیلا پڑتا ہے۔ تاہم احتیاطاً اُنھوں نے اپنے ماموں ممانی اور خالاؤں اور جن جن کا روپیہ تھا سب کو جمع کیا اور اُن کے سامنے وہ صندوق کھولے۔ اور جس کی جو تھیلی تھی اُس کے سامنے رکھ دی کیوں کہ تھیلی میں نام کی چٹھی پڑی ہوئی تھی۔ چناں چہ سب نے اپنا اپنا روپیہ سنبھال لیا۔ بعض تھیلیوں میں دوئنیاں چوئنیاں اور پیسے تھے۔ غرض بعض کو توقع سے زیادہ روپیہ ملا۔ کیوں کہ وہ بتدریج جمع کرتے تھے اور اُن کو یاد نہیں رہتا تھا کہ کس قدر روپیہ جمع ہو گیا ہے۔ نہ بیوی صاحب خبر کرتی تھیں کہ زیادہ روپیہ جمع ہونا معلوم ہو گا تو پھر اَور جمع نہ کریں گے نہ یہ اُلٹ کر اُن سے پوچھ سکتے تھے۔ اس طرح جمع ہوتے ہوتے بعض کے بیسیوں سے لے کر سیکڑوں اور سیکڑوں سے ہزاروں ہو جاتے تھے۔ چناں چہ اس طرح جمع کرتے کرتے مولوی عبد الحامد صاحب کی لڑکیوں کی شادیوں کے وقت معتدبہ رقم نکلی جس سے مولوی عبد الحامد صاحب کا بہت کچھ بار ہلکا ہو گیا۔ ماہوار سو پچاس روپیہ نکال دینا اُن کو آسان تھا مگر وقت پر تین چار ہزار روپیہ مل جانا بہت مشکل تھا۔ یوں وہ جمع نہ کر سکتے نہ ایک دم

سے اتنا روپیہ نکال سکتے۔

ایک تھیلی میں تین سو روپے کے نوٹ نکلے جس میں کوئی چھٹی نہ تھی۔ مگر ایک گلے کا طلائی توڑا جو اُن کا ذاتی مال تھا وہ بھی اُسی میں تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اُن مرحومہ کا ذاتی روپیہ ہے اور یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ وہ ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ میں نے اپنے حج کے روپے علیٰحدہ رکھے ہیں۔ پس یہ وہی روپیہ تھا اور الحمد للہ کہ اُن کی خواہش اور وصیت کے موافق اُس روپے سے اُن کا حج بدل بھی کرا دیا گیا۔ ع این بار گراں بود ادا شد چہ بجا شد۔ غرض روپے کا معاملہ اور پھر اس کا نہ حساب نہ کتاب مگر اللہ رے امانت داری اور اللہ رے ساکھ کہ ہر شخص کو بھروسا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیوی صاحب کسی کی دمڑی ادھر کی اُدھر نہ ہونے دیں گی۔ کسی نے مونہ سے بھاپ نہ نکالی اور اپنا اپنا روپیہ لے لوا کر چل دیا۔

بعض اوقات اُن کو کسی دوست کو قرض دینے کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ بھی وہ اُس زر مجتمعہ میں سے اُس وقت تک نہ دیتی تھیں۔ جب تک کہ مالک سے اجازت نہ لے لیتیں۔ اس لحاظ سے ہماری رائے میں اگر مرحومہ کو صفیہ امینہ کا لقب دیا جاتا تو بہت موزوں تھا۔

مولوی عبد القادر صاحب کے انتقال کے بعد جب ترکہ تقسیم ہوا تو مولوی عبد الحامد صاحب اور تین لڑکیاں وارث تھیں۔ سب نے حصہ بخرہ کر لیا۔ بیوی صاحب کی نسبت کہا کہ وہ تو خود متموّل ہیں۔ اُن کو ترکے میں سے کسی مکان کی کیا ضرورت اور سب کو مکان اور نقد روپیہ ملا اور ان کو صرف پانسو روپیہ۔ بیوی صاحب کو یہ بھی کچھ ناگوار نہ ہوا۔ بلکہ اُن کو اس بات کی خوشی ہوئی کہ پاس کے پاس جن کو مکانات مل گئے وہ میرے ہی پاس رہیں گے۔ میں مکان لے کر کیا کروں گی۔ اور مجھے اس روپے کی بھی سردست ضرورت نہیں۔ بھائی سے کہا کہ تم اپنے پاس رکھو۔ جب ضرورت ہوگی لے لوں گی۔ جب تک وہ زندہ رہیں اُنھوں نے کبھی نام بھی نہ لیا۔ اُن کے مرنے کے بعد بھی وہ روپیہ مولوی عبد الحامد صاحب کے پاس رہا۔ ایک دفعہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب سے اُنھوں نے کہا کہ بھئی اپنی ماں کا ترکہ لے لو جو میرے پاس امانت ہے۔ میاں بشیر نے کہا کہ جب ہماری ماں نے نہیں لیا تو ہم لے کر کیا کریں گے۔

اِسی طرح محلے میں جب کوئی مکان بکتا خود نہ لیتیں۔ بھائی بہنوں نواسے نواسیوں کو دلوا دیتیں۔ حتیٰ کہ اپنا ایک مکان جس کے ملحق دوسرا مکان تھا اور جس میں اُس کے ملانے سے صحن کشادہ ہوتا تھا اپنی ضرورت پر مولوی برکت اللہ صاحب اپنے ماموں کی ضرورت کو مقدم رکھا۔ ان کو دلوایا اور خود نہ لیا۔ ایسے ہی مواقع پر سچی ہمدردی کا امتحان ہوتا ہے کہ دوسرے کے معاملے میں اپنا نقصان گوارا کر لیں۔

کُنبے میں ایک مرتبہ ایک عزیز قریب پر ڈگری ہوئی۔ بہ تعمیل ڈگری اُن کو کشاں کشاں جیل جانا پڑا۔ بھلا بیوی صاحب کہاں متحمل ہو سکتی تھیں۔ جھٹ ہزار روپیہ نکال حوالہ کیا اور اُن کو جیل میں نہ جانے دیا۔

ایک مرتبہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے حیدر آباد میں ایک شکرم مع جوڑی نرگاواں چار سو روپے کو خرید کی۔ اتفاقاً مرحومہ حیدر آباد میں موجود تھیں۔ اُنھوں نے سنا۔ سنتے ہی بے چین ہو گئیں۔ فرمانے لگیں میرے ہوتے اور تم اپنے پاس سے سواری لو ہرگز نہیں۔ اور چار سو روپیہ نکال کر حوالے کیا۔ ایسی صدہا مثالیں ہیں جن کا بیان کرنا طولِ عمل ہوگا

بیوی صاحب کے لکھنے پڑھنے کا حال ہم دکھا چکے ہیں کہ پڑھنا خوب جانتی تھیں۔ لکھنا کیوں کر آتا سکھایا ہی نہیں گیا۔ سینے پرونے کاڑھنے میں ان کو دست گاہ کامل تھی۔ ٹانکا ان کا بہت باریک اور سجل تھا۔ اُن کے ہاتھ کا بخیا مشہور تھا۔ اُن کے زمانے میں سیونگ مشین کہاں تھی۔ اب اِس مشین نے سینے کی مشق کو بھی بٹھا دیا۔ مختلف قسم کے کشیدے اور کاڑھنا خصوصاً دیکھت[51] بھولی کی کڑھن خوب آتی تھی۔ مولانا کے عمدہ کپڑے وہی سیا کرتی تھیں عل پتّی کی سلائی اُن کی بہت صاف ہوتی تھی۔ رفو ایسا نفیس کرتی تھیں کہ دہلی کے رفوگر شاید مقابلہ کر سکیں تو کر سکیں۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مولانا کے ایک دوشالے میں جا بجا کیڑا لگ گیا تھا۔ جب اُنھوں نے دیکھا تو ڈریں کہ ایسا نہ ہو کہ وہ خفا ہوں۔ اس لیے کئی مہینے بیٹھ کر اُنھوں نے اُسے رفو کیا اور ایسا رفو کیا کہ مولانا کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور دیکھنے والا جب تک غور سے نہ دیکھے معلوم نہیں کر سکتا کہ اس میں رفو کیا ہوا ہے۔

کھانے پکانے میں انھیں اس سے بھی زیادہ دست گاہ تھی۔ اُن کو اِس قدر شوق تھا کہ وہ ہمیشہ مسالا خود دیکھ کر دیا کرتی تھیں۔ ماما مسالا پیس کر ایک رکابی میں رکھ سامنے لائی اور اُنھوں نے چاقو سے نشان کر دیا کہ اتنا اتنا ڈالو۔ اور خود بھی دو تین پھیرے باورچی خانے کے کرتی تھیں۔ بعض وقت خود سالن بگھار دیتی تھیں۔ بعض وقت خود دو دو تین دفعہ دیکھ لیتی تھیں۔ جو ماما اُن کے ہاتھ کے نیچے رہتی تھی چند روز میں اول درجے کی مشاق ہو جاتی تھی۔ خود بیوی صاحب کے ہاتھ کا سالن بہت بامزہ اور خوش رنگ ہوتا تھا۔ خصوصاً اُن کے ہاتھ کی اروی اور آلو کہ جس میں جگر تک مسالا پیوست ہو جاتا تھا نہ یہ کہ دھوئے ہوئے کپڑے کی طرح آلو اور اروی سفید، شوربا الگ اور گوشت جدا۔ تیلی کا نمونہ بنا کر کے ایک سالن پکاتی تھیں جو اشٹو کہلاتا تھا۔ وہ تو بس ایسا ہوتا تھا کہ پیٹ بھر جائے مگر نیت نہ بھرے۔ اُنگلیاں چاٹتے رہ جاؤ۔ پلاؤ۔ بریانی۔ زردہ۔ شامی کباب۔ سیخ کے کباب۔ کھیر۔ نان خطائیاں۔ حلوا سوہن۔ سب چیزیں اِن کے ہاتھ کی بہت نفیس اور خوش ذائقہ ہوتی تھیں۔ معمولی چپاتیاں بیوی صاحب کے ہاتھ کی بہت بڑی اور گول اور صاف ہوتی تھیں۔ علیٰ ہذا برئی روٹی جس کے دونوں پرتوں کے درمیان چنے کی دال بھری جاتی ہے۔ بیسنی روٹی اور پراٹھے یہ سب چیزیں ایک سے ایک بڑھ کر ہوتی تھیں۔ یہ پرانے زمانے کی بیویاں تھیں جن کو کھانے پکانے سینے پرونے کا اِس قدر شوق تھا ورنہ اِس زمانے کی لڑکیاں تو اس کو کسرِ شان سمجھتی ہیں۔ اِن کا مقولہ ہے کہ کون اپنی جان ہلکان کرے اور کون بلا میں پھنسے۔ ماما جانے اور چولھا۔ کون جھنکے۔ جس درزی کی ناک پر ٹکا رکھ دیا وہ اچھے سے اچھا سی دے گا ہم کو کیا غرض جو ہم اپنا پِتّا ماریں۔ ماما موجود اللہ نے باورچی دیا ہماری بلا کو غرض پڑی ہے کہ چولھے میں مونہ اوندھائے جان کو جلائیں۔ آج کل کی لڑکیوں کو اس بات کی کب پروا ہے کہ میاں کا آرام و آسائش سب پر مقدم ہے۔ اُسے عمدہ کھانا کھلانا اور عمدہ کپڑا پہنانا سلیقہ مند بیویوں کا کام ہے اور ایک شوہر ہی کے دم سے ساری بہار ہے۔ بیوی کی سلطنت کا یہی بادشاہ ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات ایک ایسا معاملہ ہے کہ اس پر بحث کرنا ہمارے مبحث میں داخل نہیں تاہم اتنا جانتے ہیں کہ مولانا کی کامیابی میں بیوی صاحب بٹرہاف[52] کی یاوری

---

۵۱ یہ ایک قسم کی شکل کڑھن ہے جس کے خانے ایسے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ اِدھر دیکھا اُدھر بھولے۔ اِسی واسطے اُسے دیکھت بھولی کہتے ہیں ۱۲

۵۲ انگریزی میں بٹرہاف یعنی بہترین نصف بی بی کو کہتے ہیں۔ یعنی انسان کے دو حصے ہیں نصف مرد نصف عورت اِس میں بہترین نصف عورت ہے ۱۲

مصداق تھیں۔ کُنبہ پروری میں اُن کی نظیر نہیں۔ اطاعت و فرماں برداری میں اُن کا مثل نہیں۔ جب ہی مولانا بہ مصداق قدرِ مردم بعدِ مردم اب اُن کو یاد کر کرکے روتے ہیں اور بجا روتے ہیں اور ایک وہ کیا روتے ہیں ہم نے تو بیوی صاحب کے تمام اعقاب کو روتے دیکھا۔

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو — ہمہ خنداں بُدند و تو گریاں
آں چناں زی کہ وقتِ مُردنِ تو — ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

بڑھاپے میں بیوی کا مرجانا گھر کی تباہی کا باعث ہی وہ ایک تیلیوں کا بندھن تھیں سب یکجا تھے۔ اُن کا مرنا تھا کہ تیلیاں بکھر گئیں۔ جس کے جدھر سینگ سمائے چل دیا۔ اب کوئی پوچھنے والا نہ رہا وہی گھر جس میں اس قدر چہل پہل اور جمگھٹا رہتا تھا اب بھائیں بھائیں کرتا ہی۔ بلکہ خالی پڑا ہی اور نہ صرف خالی پڑا ہی بلکہ بند ہی جس کی جھاڑو بہارو بھی نہیں ہوتی۔ ع
اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔

بیوی صاحب پر سوکن

بیوی صاحب کو اپنی زندگی میں موافق و ناموافق سب ہی قسم کے معاملات پیش آئے لیکن سب سے زیادہ صدمہ دنیا میں سوکن کا ہوتا ہی وہ بھی اُن پر آخر حصۂ عمر میں گزر گیا۔ کہتے ہیں چون کا شریک بُرا ہوتا ہی۔ اللہ میاں کو بھی شرکت پسند نہیں۔ ایک ریختہ گو نے کیا خوب کہا ہی ؎

یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں — کروں کیا کہ پتھر کی چھاتی نہیں

ناظرین سے زیادہ بیوی صاحب پر سوکن کا لانا ہم کو تعجب میں ڈالتا ہی۔ اور ہم کو مولانا کا وہ مشہور شعر یاد آجاتا ہی جو اُنھوں نے محصنات کے ٹائٹل پیج پر لکھا ہی ؎

میری سنو اگر نہیں سمعِ قبول کر — دو بیبیاں نہ کیجیو زنہار بھول کر

لیکن تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ بجنور والوں کی کاوش سے یہ سب کچھ ہوا۔ اِن لوگوں کو شروع ہی سے کاوش تھی۔ اِن کا خیال تھا کہ دلی والوں نے بجنور کی دولت کو لوٹ لیا۔ اور ہم ایمان کی بات کیوں کر نگل جائیں یہ بات سچ بھی تھی۔ مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم کی غلطی تھی کہ اُنھوں نے پردیسی لڑکے کو بیٹی کیوں دی۔ اِن کو چاہیئے تھا کہ مولانا کی ماں سے مشورہ کرتے۔ لیکن اِسی کے ساتھ یہ بات بھی تو تھی کہ مولانا کی ماں کو بھلا کب گوارا ہوتا کہ بیٹا پردیس میں بیاہا جائے۔ خصوصًا وہ کہ دیہات کی رہنے والی تھیں۔ جہاں شہری تہذیب اور شایستگی کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی۔ لیکن مشتے کہ بعد از جنگ اب کیا ہوسکتا تھا۔ بیوی صاحب بیچاری کا اِس میں کیا قصور تھا۔ ہمارے ملک میں شادیاں ماں باپ کی مرضی پر ہوتی ہیں۔ جہاں لڑکی کا ہاتھ پکڑا دیا لڑکی وہیں کی ہوگئی۔ لیکن دیہاتیوں کی کوڑھ مغزی اور ہٹ اور پھر تریاہٹ کچھ نہ پوچھیئے۔ بیوی صاحب نے تو سسرال والوں کی وہ آؤ بھگت کی کہ بجنور والی تا حشر نہ کرتی۔ تمام بجنور یوں کی سفارش کر کر کے نوکر رکھوا دیا ہر متنفس سے سلوک کیا۔ چناں چہ مولوی علی احمد صاحب اور ضمیر احمد صاحب اور دوسرے لوگ تو بیوی صاحب کے گرویدہ اور شرمندۂ احسان رہے۔ لیکن مولانا کی والدہ جن کو خدا زندہ رکھے جیسا کہ بہو سے صاف ہونا چاہیئے تھا بیوی صاحب کے مرتے دم تک صاف نہیں ہوئیں۔ اور کس طرح ہوتیں کہ دونوں میں سوائے مہمان اُٹھل

کبھی یک جائی بھی نہیں رہی۔ تاہم ساس صاحب جب دہلی آتیں تو مہینوں رہتیں۔ بیوی صاحب غیروں کی خاطر و مدارات کرتی تھیں۔ مہمان نواز تھیں۔ یہ تو ساس تھیں ہر طرح ان کی خاطر تواضع کرتیں مگر ان کے دل سے دہلی اور بجنور کی مغایرت نہ گئی۔ نصف صدی کے قریب کے فصل نے بھی اس ابرِ غلیظ کو نہ پھاڑا۔ کالی گھٹا چھائی تھی سو چھائی رہی۔ آخر وہ ۱۸۸۸ء میں برسی پر برسی۔ یعنی مولانا کی والدہ نے نہیں معلوم کیا کچھ اُلٹی پٹی پڑھاوی کہ نکاحِ ثانی با این پیرانہ سالی کروا ہی دیا۔ اور ہم نے سُنا کہ انھوں نے فرمایا کہ بجنور بھی تو کسی طرح آباد ہو۔ لیکن وہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔ چند ہی روز میں خود بخود قطعِ تعلق ہوگیا۔ لیکن بیوی صاحب نے اِس کی بھی پروا نہیں کی۔ نہ وہ روئیں نہ پیٹیں نہ واویلا کی نہ تُو تُو مَیں مَیں ہوئی۔ بلکہ جب کسی نے کہا بھی تو انھوں نے اُٹھ کر کے ٹال دیا وہ دنیا کی ساری نعمت اپنی اولاد کو سمجھتی تھیں۔ اور اُنھیں کو دیکھ دیکھ جیتی تھیں۔ قاعدے کی بات ہے کہ زن و شُو کے تعلقات بڑھاپے میں کم زور ہو جاتے ہیں اور دونوں کی محبت آل اولاد میں آجاتی ہے۔ یہ زمانہ نہ مرد کے لیئے نکاحِ ثانی کا ہے نہ عورت کے لیئے اِس پر تاسّف کا۔ وہ تعلقات خود بخود ضعیف ہو جاتے ہیں۔ یہ تو وہ زمانہ ہوتا ہے کہ کنبہ بھرا پُرا ہے۔ نانا نانی دادا دادی بلکہ نواسیوں کے بچے ہو گئے۔ دنیا کی آخری بہار ہے۔ جو دن گزرے غنیمت۔ پس اِس فانی زندگی اور یہاں کے فانی رنج و غم کر کے کُڑھنا اور گھٹنا بے سود و لا حاصل ہے۔

غمِ دنیا مخور کہ بیہودہ است ہیچ کس در جہاں نیا سودہ است
غمِ دین خور کہ غم غمِ دین است ہمہ غم ہا فرو ترِ زین است

غرض سنا ہے کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد بیوی صاحب کی سوکن کو طلاق دیدی گئی۔ بیوی صاحب کے دباؤ کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ فرمایشی نکاحوں کا یہی حال ہوتا ہے۔

بہر حال بیوی صاحب بڑی عابدہ زاہدہ اور مرتاضہ تھیں۔ نماز روزے کی سخت پابند تھیں۔ زکوٰۃ بھی دیا کرتی تھیں۔ تہجد گزار بھی تھیں۔ قرآن شریف بالالتزام پڑھا کرتی تھیں۔ اور بہت سی سورتیں اُن کو اَزبر تھیں۔ رمضان بھر شب بیداری کیا کرتی تھیں۔ فرماتی تھیں کہ ایک رات میں نے شبِ قدر بھی دیکھی تھی۔ مگر گھبرا گئیں۔ الٰہی خیر الٰہی خیر ایمان کی سلامتی۔ میرے بچّوں کی خیر۔ اِس کے سوا اَور کوئی لفظ اُن کی زبان سے نہیں نکلا۔ چوں کہ مذہبی عنصر اُن میں بہت غالب تھا اس لیئے بہت رقیق القلب تھیں۔ کسی کی مصیبت سے جلد متاثر ہو جاتی تھیں۔ خدا سے بہت ڈرا کرتی تھیں۔ ہر وقت ان کو اپنی موت پیشِ نظر تھی۔ ہمیشہ موت کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ اور اکثر روتی رہتی تھیں۔

بیوی صاحب آل اولاد۔ دولت و ثروت۔ غیرت و آبرو۔ خوش اقبالی سب کی زندہ مثال تھیں۔ پھر بھی اُن کو ایک غمِ نہانی تھا۔ انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے میاں بشیر کی شادی بڑے ارمان اور چوچلوں سے کی۔ دہلی کے اعلےٰ سے اعلیٰ خاندان کی بیٹی لائیں یعنی نواب قطب الدین خاں مرحوم کی پڑپوتی۔ صورت شکل کی بہت پر چول تھی وہ چاہتی تھیں کہ بہو بہت ہی خوب صورت لاؤں۔ چناں چہ کئی جگہ باتیں ٹھیریں لیکن جہاں مقدّر ہوتا ہے وہیں ہوتا ہے۔ آخر حسبِ منشاءِ دلی نواب قطب الدین خاں مرحوم کی پڑپوتی سے عقد ہوا۔ وہ دہلی کے رئیس اعظم امیر ابن امیر بڑے بھاری مولوی محدث ادیب و فقیہ تھے۔ لیکن دریں ہر خندہ آخر گریہ ایست۔ اولاد اُن سے نہ ہوئی۔ دنیا کی خاک چھان ڈالی۔

علاج معالجے۔ گنڈے تعویذ۔ جو جس نے بتایا کیا۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ اسی طرح اٹھارہ سال گزر گئے۔ تاہم لاولد بہو کو بیٹی سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ ان کی خاطر عزیز کو میلا نہ ہونے دیتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے۔ قصور سمجھو یا فتور یہ سب ہمارے مقدر کا ہے۔ جب کبھی پوتا یا پوتی کا ذکر آیا تو بیوی صاحب نے ایک آہ سرد بھری۔ مگر زبان سے یہی کہا کہ اے بی یہ تو اللہ کی دین ہے۔ اس کی مصلحت وہی خوب جانتا ہے۔ اگر دے ہمارے سر آنکھوں پر۔ نہ دے تو شکایت کیا۔ میرے بچے کو اللہ رکھے جب میں اسے زندہ چھوڑ کر جاؤں گی جب بات۔ سو بات۔ رہا بشیر کا بچہ اس کی بشیر کو ہوگی۔ میں تو بے قرار ہو کر دعا بھی نہیں مانگتی۔ نہیں معلوم پاک پروردگار کی کیا مرضی ہے۔

بیوی صاحب کے مزاج میں تھوڑا سا وہم بھی تھا۔ بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ بہت دنوں کے بعد اولاد ہوئی تو ماں باپ پر بھاری ہوتی ہے۔ یہ بھی کھٹکا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ پوتے تشریف لائیں تو میرا لڑکا ہی نہ چل بسے۔ گو یہ بات انھوں نے صاف طور پر نہیں کہی۔ مگر ان کے طرز کلام سے مترشح ہوتا تھا۔ جوان لڑکی کے مرنے کا دھاکا دل میں بیٹھ چکا تھا۔ مثل مشہور ہے دودھ کا جلا چھاچ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ چناں چہ اسی قسم کے خیال سے وہ میاں بشیر کے پاس حیدرآباد جا کر نہیں رہیں ورنہ ان کو ان سے بڑھ کر کوئی تھا؟ دہلی میں ان کا کیا دھرا تھا۔ جوان لڑکی کی جدائی کے صدمے سہ سہ کر اور گھل گھل کر مر گئیں۔ ان کے دل میں یہ دھاکا بیٹھ گیا تھا کہ ایک مرتبہ میں دکن گئی تو بڑی لڑکی گزر گئی۔ ایسا نہ ہو کہ پھر جاؤں تو کوئی بات پیش آئے۔ اس وہم سے انھوں نے دہلی نہ چھوڑی۔ کنبے قبیلے کے لوگ نکاح ثانی کے لیے بہت کچھ کہتے رہتے تھے۔ لیکن وہ سُنی کی اَن سُنی کر دیتی تھیں۔ لیکن جب اٹھارہ سال گزر گئے۔ علاج معالجے سے مایوسی ہو گئی ادھر مولانا نے بھی تقاضا کیا ادھر بیوی صاحب نے بھی اپنی عمر کا آخر دیکھا تب وہ بھی راضی ہو گئیں۔ اور قصہ مختصر میاں بشیر کا دوسرا نکاح بلا کسی قسم کی دھوم دھام کے بادلِ ناخواستہ کرا لائیں۔ یہ نکاح اس قسم سے ہوا کہ بیوی صاحب خود بھی نہیں گئیں۔ لیکن تقدیر دیکھیے تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ ان سے بھی اولاد نہ ہوئی۔ ان کا بھی علاج معالجہ سب ہی کچھ ہوا۔ حکم قضا و قدر یہی تھا۔ کہ بیوی صاحب میاں بشیر کی اولاد نہ دیکھیں چناں چہ اس نکاح کے بعد چار پانچ سال بیوی صاحب زندہ رہیں اور میاں بشیر کی اولاد کی حسرت دل کی دل ہی میں لیے گئیں ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بیوی صاحب کی وفات کے پانچ سال بعد میاں بشیر کا نخل مراد بار آور ہوا یعنی ۱۷ ستمبر ۱۹۰۳ء کو مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے ہاں ہزار ہا ارمان اور ہزار ہا آرزو کے بعد پہلا لڑکا پیدا ہوا جس کا نام دادا کے نام پر منذر احمد رکھا گیا۔ اور اس کے بعد خدا کے فضل سے جس کی نعمتیں بے شمار ہیں ہر سال کا بچہ ہو رہا ہے۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب سے جب کبھی اس کا ذکر ہوا تو کہنے لگے کہ شکر نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو۔ اب اللہ کے فضل سے چار لڑکے اور ایک لڑکی ہے جن کے نام علی التسلسل یہ ہیں منذر احمد۔ شاہد احمد۔ بشریٰ بیگم۔ سراج الدین احمد۔ اللھم زد فزد جس گھر میں چوہے کا بچہ نہ تھا وہاں اب یہ نعمت ہے۔ ویرانے کی جگہ آبادی ہے۔ دن عید رات شب برات ہے اگر حسرت ہے تو صرف یہی ہے کہ جو سچی خوش ہونے والی تھیں انھوں نے یہ بہار نہ دیکھی۔ اس میں بھی کچھ مصلحت الٰہی مضمر تھی۔

مرض الموت

بیوی صاحب کی تن درستی کبھی اچھی نہیں رہی۔ جس عورت کے اس قدر بچے ہوں وہ کس طرح تن درست رہ سکتی ہے اور یوں بھی ان کے قویٰ کچھ اچھے نہ تھے۔ رہی سہی طاقت بڑی لڑکی کی جوان مرگی نے سلب کر دی۔ وہ غم ان کو کھا گیا۔ چند روز سے ہلکا ہلکا بخار آتا تھا جو ہڈیوں میں جم گیا تھا۔ ساتھ ہی کھانسی کا بھی کھٹکا تھا۔ علاج کی طرف سے

وہ ہمیشہ بے پروا رہیں۔ اپنی بیماری کو بیماری نہیں سمجھتی تھیں بلکہ کسی پر ظاہر نہ کرتی تھیں۔ بخار آیا مونہہ لپیٹ کر پڑ گئیں۔ اُتر گیا اُٹھ بیٹھیں اِس کو اُنھوں نے ایک معمولی بات سمجھ رکھا تھا۔ یونانی مسہل ہو کے وہ بگڑ گئے۔ حالت خطرناک ہوگئی۔ جب اوپر والوں کی آنکھیں کھلیں۔ مولانا نے میاں بشیر کو خط لکھا کہ تمھاری ماں کی حالت اچھی نہیں۔ بیوی صاحب کو جب اِس خط کا حال معلوم ہوا تو بہت بگڑیں کہ اتنی دور بیٹھے ہوئے بچے کو تم نے پریشان کیا۔ فوراً خود خط لکھوایا کہ تمھارے باپ نے جو کچھ لکھا ہے تم پریشان نہ ہونا۔ میں اچھی ہوں معمولی شکایت ہے۔ لیکن حالت روز بروز ردی ہوتی گئی مولوی بشیر الدین احمد صاحب تو نہ پہونچ سکے۔ مگر مولوی شرف الحق صاحب کی اہلیہ مرنے سے دو تین دن پہلے حیدر آباد سے دلی پہونچ گئیں۔ تو اُنھوں نے بیٹی اور نواسوں کو پہچانا بات چیت کی۔ پیار کیا دعائیں دیں اور میاں بشیر کو پوچھا کہ وہ کب آئیں گے۔ اِن کی تسلی کے لیے کہہ دیا کہ وہ بھی صبح و شام میں آیا ہی چاہتے ہیں۔ غرض دروازے پر نگاہ تھی۔ جب اُن کی بے قراری حد سے بڑھ گئی اور سینے میں دم اٹکنے لگا تو ناچار اُن کو ایک خط یہ کہہ کر دیدیا کہ میاں بشیر کا خط آیا ہے وہ اُنھوں نے دیکھا اور سرھانے رکھ لیا۔

به لبم رسیده جانم تو بیا که زنده مانم — پس ازاں که من نه مانم بچه کار خواهی آمد
کششے که عشق دارد نگزاردت بدینساں — به جنازه گر نیائی به مزار خواهی آمد

شام کو اُن سے کہہ دیا کہ میاں بشیر آگئے ہیں ذرا لیٹ گئے ہیں کہیئے تو جگا لائیں۔ کہا نہیں۔ اللہ اللہ ماں کی مامتا ذرا سی تکلیف اپنی اولاد کی گوارا نہ ہوئی۔

شروع شروع دلی کے مشہور ڈاکٹر ہیم چندر کا علاج رہا۔ آخر وقت میں حاذق الملک حکیم عبد المجید صاحب معالج تھے۔ قصہ کوتاہ بارھویں اور تیرھویں ذی الحجہ ۱۳۱۵ھ کی شب درمیانی کو دو بجے رات کے بعارضۂ ذات الجنب بیوی صاحب نے انتقال کیا۔ چھوٹی بہن جو حافظ و قاری ہیں سرھانے کھڑی یٰسین شریف پڑھ رہی تھیں۔ ایک سسکی آئی روح پرواز کر گئی اور جان خالقِ حقیقی کے سپرد کی۔

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

محلے میں ایک کہرام مچ گیا۔ مولانا نذیر حسین صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور درگاہِ حضرت شاہ خواجہ باقی باللہ میں اُس گنج شایگان کو تہِ خاک کیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جس جگہ اب دفن ہیں وہ سرداہ بیوی صاحب کی والدہ ماجدہ نے لے رکھا تھا مگر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جو بطورِ حفظِ ماتقدم زمین لیتے ہیں وہ اُس میں نہیں جاتے دوسرا ہی کوئی جاتا ہے۔ چناں چہ یہ بھی اُسی کی عبرت انگیز مثال ہے کہ ماں بیٹھی رہیں اور جوان بیٹی چلی جائے۔

لوگ کہتے ہیں کہ وہ عورت بڑی خوش نصیب ہے جو اپنے خاوند کی زندگی میں مرے۔ اِس کے سوا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس کی ماں زندہ ہو اُس کے لیئے درِ دعائے اجابت کھلا رہتا ہے۔ یہ دونوں باتیں بیوی صاحب کو نصیب ہوئیں اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهَا وَأَدْخِلْهَا جَنَّةً مِنَ الْجِنَانِ وَأَفْرِغْ عَلَيْهَا شَآبِيبَ الرِّضْوَانِ[۵۱] خدا کے فضل و کرم سے بیوی صاحب اولاد در اولاد اور در اولاد تقریباً ۴۰ ممبر اپنی گود پیٹ کے چھوڑ کر جنت کو سدھاریں۔ بیٹے اور بیٹی کی طرف سے اُنھوں نے ۴ پشتیں دیکھ لیں۔

ایک روز راقم بھی دورانِ قیام دہلی میں بیوی صاحب کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیئے خواجہ باقی باللہ کے مزار پر گیا تھا۔ بیوی صاحب کی قبر سنگ سرخ کی پکی سلوں کی قبر ہے۔ بیچ میں کچی ہے۔ اور مزار پر یہ قطعہ عربی کا جو مولانا کی تصنیف ہے نہایت خوش خط لگا ہوا ہے۔

ماتت[۵۲] وانجعت القلوب بموتها — عظم المصاب ویومنا یوم عسر
من[۵۳] للعافاة وللارامل بعدها — صرعی کما اعجاز نخل منقعر

[۵۱] الٰہی اُن کو بخش دے اور جنتوں میں سے کسی عمدہ جنت میں لے جا داخل کر اور اُن پر اپنی خوشنودی کی پکھالیں اُنڈیل دے [۵۲] مر گئیں اور بہت سے دلوں کو اپنے مرنے سے دردمند کر دیا اُن کا مرنا بڑی مصیبت ہے اور ہمارا آج کا دن بڑا مشکل دن ہے [۵۳] اُن کے بعد سائلین اور بیوگان کے لیے کون پرداخت کنندہ ہے کہ یہ لوگ اُن سے بچھڑے پڑے ہیں جیسے اُکھڑے ہوئے کھجور کے بوتے ۱۲

ولنصبرنّ علی الفراقِ لعلمنا ۔ ان المماۃ لکل حی قد ری[1]

وطلبت عام وفاتھا فی جملۃٍ[2] ۔ فسمعت باکیۃً تقول لہا غفر ۱۳۱۵ھ

مولانا کے سوا ہمارے مرحوم دوست مولوی سید محمد عبد الغفور صاحب شہباز نے بھی بیوی صاحب کے انتقال کی تاریخ کہی ہے۔ اُس کا مادہ بھی یہی ہے مگر ذرا اُلٹ دیا ہے۔ یعنی غفر لہا ۱۳۱۵ھ

بیوی صاحب کو سارے کنبے بلکہ سارے محلے بلکہ سارے شہر میں سب یاد کرتے ہیں۔ جن کے لیے وہ بظاہر ذریعۂ معاش تھیں وہ بے یار و مددگار ہو گئے۔ غرض ایک فیضِ جاریہ کا چشمہ تھا جو سب کو سیراب کرتا تھا۔ ہر ایک کی اڑی میں کام آتا تھا وہ بند ہو گیا ؎

تمھیں کہتا ہے مُردہ کون تم زندوں کی زندہ ہو ۔ تمھاری نیکیاں باقی تمھاری خوبیاں باقی

میاں بیوی کا برتاؤ

مولانا کا مزاج ایک خاص قسم کا واقع ہوا ہے۔ غصہ غالب ہے۔ لیکن دل کینہ و حسد و بغض سے مثل آئینہ کے صاف۔ اِدھر جوش آیا اُدھر ندارد۔ میاں بیوی کے تعلق بہت نازک ہوتے ہیں۔ جب دو برتن آپس میں کھٹک جاتے ہیں تو یہ تو دو ذی روح ہیں۔ تاہم بحیثیتِ مجموعی مولانا نے اپنی اہلیہ سے عمدہ اور بہت عمدہ برتاؤ کیا۔ بہت اچھا سلوک کیا۔ وہ بیوی اُن بیویوں کی طرح نہ تھیں کہ جہاں بیٹھیں سوائے شوہر کی شکایت کے دوسری حکایت ہی نہ کریں۔ بیوی صاحب کے مونہ سے کبھی مولانا کی بُرائی نہیں سنی گئی۔ علیٰ ہذا مولانا کو بھی بیوی صاحب کا کلمہ پڑھتے پایا۔ خصوصاً بیوی صاحب کے مرنے کے بعد مولانا کو معلوم ہو گیا کہ گھر والی کے جانے کے بعد گھر کی کیا حالت ہوتی ہے۔ گویا ایک سلطنت تھی جس کا بادشاہ نہیں۔ یا ایک فوج تھی جس کا کمانڈر نہیں۔ اکثر عورتوں کو دیکھا ہے کہ وہ شوہروں کی ناشکری کیا کرتی ہیں یہ بات بھی بیوی صاحب میں نہ تھی وہ حد سے زیادہ قانع اور سیر چشم تھیں ذرا سے سلوک کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ شوہر کی ازحد مطیع اور فرماں بردار تھیں۔ بیوی صاحب کی نیک بختی فروتنی سلیم الطبعی کی عام شہرۃ دہلی میں ہے۔ جب کبھی کسی سے بیوی صاحب کا تذکرہ ہوا تو اُس نے تعریف ہی تعریف کی کبھی کوئی عیب نہیں نکالا۔ عیب ہوتا تو کوئی نکالتا۔ غرض جس طرح مولانا اپنے خاندان میں لاجواب نکلے بیوی صاحب اپنے گھرانے میں اسی طرح ایک ہی ہو کر رہی تھیں۔

لڑکے لڑکیوں کے مختصر حالات

مولانا کے دو لڑکیاں تھیں سکینہ۔ صغریٰ۔ بڑی لڑکی مولوی سید احمد حسن صاحب کے عقدِ نکاح میں تھیں اُن کا عین عالمِ شباب میں بمقام لنگسگور ملکِ دکن زچگی کے زمانے میں ۲۰۔ جولائی ۱۸۸۹ء کو انتقال ہوا۔ وہ ایک لڑکا اور تین لڑکیاں چھوڑ کر مریں۔ اِن کے بعد دو لڑکیاں اور اپنی ماں سے جا ملیں اب ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے دونوں کی شادیاں ہو گئی ہیں لڑکی صاحبِ اولاد ہے۔ مولانا کی بڑی لڑکی اپنی ماں کی طرح عابدہ زاہدہ اور مخیر تھیں۔ وہ دفعۃً انتقال کر گئیں۔ یہ بھی اپنے حج کے لیے روپیہ چھوڑ گئی تھیں۔ اِن کا حج بدل مولوی احمد حسن صاحب نے کروا دیا۔ اب مولانا کی صرف ایک لڑکی زندہ ہے یعنی خان بہادر مولوی شرف الحق صاحب کی اہلیہ۔ یہ بھی عابدہ زاہدہ اور مخیر ہیں۔ انھیں کے دو لڑکے اشرف الحق صاحب اور مشرف الحق صاحب ڈاکٹری پاس کرنے کے لیے ولایت گئے تھے دونوں کے دونوں پاس کر کے آ گئے۔ بڑے صاحب ریاستِ حیدر آباد میں فوجی ڈاکٹر ہیں۔ خان بہادر صاحب کے دو لڑکیاں اور نواسے نواسیاں اور ایک پوتی ہے دونوں لڑکیاں تعلیم یافتہ اور لکھی پڑھی ہیں سینے پرونے پکانے ریندھنے میں اپنی ماں کے قدم بقدم ہیں۔

مولوی بشیر الدین احمد صاحب

یوں گنتی کو تو مولانا کے تقریباً ایک درجن لڑکے ہوئے لیکن سب چھوٹی ہی عمر میں چل بسے ایک سات برس کا لڑکا ظہیر دہلی میں ہیضے سے چٹ پٹ ہو گیا۔ جس کا عربی مرثیہ مولانا نے لکھا ہے۔ اور جس کو راقم نے مجموعۂ نظم بے نظیر

[1] ہم جدائی پر ضرور صبر کریں گے کیوں کہ ہم کو معلوم ہے کہ ہر زندہ کے لیے موت مقدر ہے ۱۲

[2] اور میں نے اُن کی وفات کا برس ایک جملے میں طلب کیا تو میں نے کسی رونے والی کو سنا کہ وہ کہہ رہی تھی لہا غفر ۔ اُن کی تو مغفرت ہو گئی

ہیں چھپوا بھی دیا ہے۔ دوسرا بھی ہیضے سے عظیم گڑھ میں چٹ پٹ ہو گیا۔ یہ دونوں بچے غیر معمولی طور پر ذہین تھے۔ دونوں کی موہنی مورتیں ابھی تک لوگوں کی نظروں میں گھومتی ہیں۔ اُن کی پیاری باتوں کو لوگ ابھی تک یاد کیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جان ہار بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہم کو مولانا کا ایک خط ملا ہے جس میں اُنھوں نے اپنی اہلیہ صاحبہ کو مضامینِ تعزیہ لکھے ہیں۔ اِس خط سے ہم اولاد کی محبت اور اُن کے مرنے کے غم کا پورا اندازہ کر سکتے ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں۔

بیوی صاحب کو سلام کے بعد معلوم ہو۔ یہ بھی ایک دنیا کا دستور قرار پا گیا ہے کہ جب کسی کا کوئی عزیز قریب مر جاتا ہے لوگ اُس کی ماتم پُرسی کرتے ہیں۔ میں تم کو یہ خط اُس دستور کے مطابق نہیں لکھتا۔ کیوں کہ مصیبت تنہا تم پر نہیں مجھ پر بھی ہے۔ میاں بی بی کا عجب رشتہ ہے کہ مرد و عورت نکاح ہو جانے سے دنیا کی سب چیزوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ بات کسی اَور رشتے میں نہیں پائی جاتی۔ میرا تمھارا مال مشترک۔ گھر مشترک۔ کھانا پینا مشترک۔ اولاد مشترک۔ آبرو مشترک۔ خوشی مشترک۔ رنج و غم مشترک۔ اگر وہ لڑکی جیتی تو کیا تمھاری اکیلی کی بیٹی ہوتی۔ نہیں میری تمھاری دونوں کی پس اب اگر مر گئی تو کیا تمھاری اکیلی کی بیٹی مری۔ نہیں میری تمھاری دونوں کی۔ پھر بھی میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ تم کو اُس سے بڑا قوی تعلق تھا لیکن روحانی تعلق کی وجہ سے شاید جس دن وہ مری ہے میرا دل خود بخود بے قرار تھا اور میں نے اسی گھبراہٹ میں میاں بشیر کو خط بھی لکھا۔ تاریخ ملا کر دیکھو غالب ہے کہ خط کی تاریخ اور اُس کے مرنے کی تاریخ ایک ہو گی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ظہیر۔ نصیر وغیرہ کے مرنے سے تو یہ بخوبی تجربہ کر چکے کہ موت پر انسان کا کچھ اختیار نہیں چلتا۔ رہا رنج وہ بھی رفتہ رفتہ کم ہو جاتا ہے۔ میں تم پر الزام نہیں لگاتا اپنا حال بیان کرتا ہوں کہ نصیر کو کس قدر پیار کرتا تھا۔ اُس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے ہے اور میں سوتا بھی ہوں ہنستا بولتا بھی ہوں۔ دنیا کا کوئی کام مجھ سے نہیں چھوٹا۔ تو جب ظہیر۔ نصیر کے رنج کو ہم نے چند سال میں بھلا دیا تو یہ لڑکی بے چاری کے دن کی تھی۔ آخر پھر دنیا اور دنیا کے کام۔ کتابوں میں بہت ٹھیک لکھا ہے کہ دانا اور احمق صبر دونوں کرتے ہیں مگر فرق اتنا ہوتا ہے کہ احمق رو دھو کر چپ کرتا ہے اور دانا شروع سے خدا پر نظر کر کے چپ ہو رہتا ہے۔ غرض صبر تو آخر کرنا ہی پڑے گا۔ پس کیا فائدہ کہ اپنا ثواب ضائع کریں۔ دل کو مضبوط کرو آنسو پونچھ سنبھل بیٹھو۔ خدا ہمارا مالک ہے۔ اُس نے دیا۔ اُس نے لیا۔ خدا کو ہم سے عداوت نہیں۔ بیر نہیں۔ جو کچھ کرتا ہے ہمارے نفع کے لیے کرتا ہے لیکن اپنی کم فہمی کی وجہ سے ہم اُن مصلحتوں کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ دنیا کے انتظام پر نظر کرو تو تن درستی۔ مال۔ اولاد۔ حکومت۔ شرافت۔ دین داری ہزاروں طرح کی نعمتیں ہیں اور یہ نعمتیں خداوند کریم نے اپنی مرضی کے مطابق لوگوں میں تقسیم کی ہیں فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ ہم کو بھی اُس نے اپنی رحمتوں میں سے بہت بڑا حصہ عطا فرمایا ہے تو کیا ہم ٹھیکہ دار ہیں کہ خدا کی سب نعمتیں اپنے گھر میں گھسیٹ کر بھر لیں۔ اور پھر اولاد سے بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے ہم محروم نہیں اُن کی عمر میں خدا برکت دے۔ اُن کو دین و دنیا کی فلاح ہو۔ کافی ہیں۔ اب یا وہ اولاد لے کر کیا کرو گے۔ انھیں پر اپنی محنت صرف کرو۔ اِن کے حق میں خدا سے دعائیں مانگو اور مصیبت پر صبر کرو۔ کہ خدا کی مرضی۔ شاید عاقبت میں انھیں مصیبتوں کے طفیل سے ہم پر رحم ہو۔ کسی استاد کا کیا اچھا قطعہ ہے۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسّامِ ازل نے — جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا — غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

اے خدا ہم کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔ آمین۔ آدمی کو چاہیے کہ جب اُس پر کوئی مصیبت نازل ہو دوسرے بندگانِ خدا کے حال پر نظر کرے تو پائے گا کہ ہزاروں آدمی اُس سے بدتر حالت میں مبتلا ہیں۔ تم گھر کے گھر میں بے چاری . . . کو دیکھو۔ بڑی ناشکری کی بات ہے کہ ہم توکروں احسان اور کروڑوں سلوک بھول جائیں اور ایک تنکے بھر رنج کی برداشت نہ کریں۔ بشیر بچہ ہے۔ تم کو روتے دیکھ کر سہما جاتا ہوگا۔ اُس کے حال پر رحم کر دیکھو کیا تمھاری حالت ہو گئی ہے۔ آخر یہ کالبدِ خاکی سدِ سکندر تو نہیں ہے۔ اسی طرح رنجوں کے مارے اِس کو تحلیل کر ڈالو گی تو کیا انجام ہوگا۔ ہم۔ جون ۱۸۷۶ء

غرض لے دے کر اب صرف ایک لڑکا ہی جو عموماً میاں بشیر کے نام سے موسوم ہی۔ اُن کا پورا نام بشیر الدین احمد ہی جو ۲۸ اگست سنہ ۱۸۶۱ء کو پیدا[۱] ہوئے۔ مولانا نے اُردو فارسی عربی انگریزی سب کچھ خود ہی پڑھایا لکھایا انھیں کے لئے چند پند اور ما یغنیک فی الصرف تصنیف کی۔ کسی اسکول میں شروع شروع اس واسطے نہیں بٹھایا کہ گھر کی سی نگرانی نہ ہوگی۔ پس مولانا نے اُردو اور قدرے فارسی کے بعد عربی شروع کرادی۔ کافیہ شرح ملّا تک پڑھا کر ادب کی دو ایک کتابیں پڑھائیں۔ پھر قرآن مجید کے چند جزو سبقاً سبقاً مع معنی و تفسیر و ترکیب صرف و نحو کے پڑھائے۔ اس طرح عقیدے کی بنیاد مستحکم ہوگئی۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کی نوشت و خواند بھی جاری رہی۔ صرف دو برس کے لئے دہلی گورنمنٹ اسکول میں داخل کردیا تھا۔ چوں کہ شروع سے مولانا نے لٹریچر پر زیادہ زور دیا تھا میاں بشیر ہمیشہ انگریزی اور عربی لٹریچر میں سر برآوردہ رہے۔ لیکن اِس مناسبت سے وہ ریاضی میں اتنے ہی کم زور تھے۔ اور اِسی وجہ سے مدرسہ قبل از وقت چھوڑنا پڑا۔ مدرسہ چھوڑ کر دکن گئے۔ مولانا نے سر سالار جنگ کی خدمت میں عرضی لکھی۔ معاً ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ کار آموزی مقرر ہوا۔ اور ایک ہی سال کے بعد دو سو روپیہ ماہوار کے سوم تعلقہ دار ہوگئے۔ اور اب بتدریج پانسو تک پونہچے ہیں۔ ریاست کے ملازموں میں نیک نام ہیں ہم چشموں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اُن بیٹوں سے لاکھ درجہ بہتر ہیں جن کے پاس نہ ماں کا ادب ہی نہ باپ کا لحاظ۔ ہمارے مولانا اُن کی سعادت مندی۔ فرماں برداری۔ خوش چلنی سے خوش ہیں۔ وہ اب تک باپ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتے۔ جن لوگوں نے موعظۂ حسنہ پڑھی ہی وہ دیکھ چکے ہوں گے کہ میاں بشیر کی زبان میں کس قدر لکنت

[۱] مولوی بشیر الدین کی ولادۃ کے متعلق ایک یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہی کہ وہی کنچمن صاحب پنڈت جنھوں نے مولانا کا فسٹ جنم پتر بنایا تھا اور مولانا کو سنسکرت بھی پڑھائی تھی اُنھوں نے ایک وحشت ناک پیشین گوئی بھی کی تھی۔ وہ یہ تھی کہ مولانا کے دو لڑکیاں پیدا ہو چکی تھیں لڑکے کا ارمان تھا۔ پنڈت جی کو کہیں معلوم ہوگیا تھا کہ مولانا کے لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں لڑکا کوئی نہیں۔ غرض ایک روز مولانا سے پنڈت جی نے اثنائے گفتگو میں یہ پیشین گوئی کی کہ اب کی دفعہ آپ کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا۔ لیکن اِسی کے ساتھ پنڈت جی نے یہ بھی بے پر کی اُڑائی کہ لڑکا باپ پر بھاری ہوگا اور عجب نہیں کہ آپ سال کے اندر اندر رخصت بھی ہوجائیں۔ اگرچہ مولانا ان واہیات باتوں کے قائل نہ تھے۔ مگر ایک شخص اس طرح برملا کہے تو دل پر ضرور اثر ہوتا ہی چناں چہ یہی ہوا کہ اس خبر نے مولانا کی ساری خوشی کو خاک میں ملا دیا۔ اور اِس جان فرسا پیشین گوئی سے مولانا کے دل میں ایک دہلا کا سا بیٹھ گیا پنڈت جی نے یہ بھی پیشین گوئی کی تھی کہ لڑکے کے کان کے پاس ایک مسّہ بھی ہوگا۔ بہر حال ۲۸۔ اگست سنہ ۱۸۶۱ء کو مولانا کے ہاں میاں بشیر تشریف لائے۔ غرض اُن کے پیدا ہوتے ہی مسّہ کی تلاش ہونے لگی مسّہ تو واقعی تھا اور اب بھی ہی۔ لیکن اُس وقت چھوٹا سا لال لال بچّہ اس میں ذرا سا مسّہ کیوں کر محسوس ہو سکتا تھا۔ دیکھنے والوں نے تو دیکھ لیا مگر مولانا سے کہہ دیا کہ محض غلط ہی کوئی مسّہ وسّہ نہیں ہی۔ یہ اِس لئے کہا گیا کہ مولانا کا وہم دُور ہو جائے تاہم پنڈت جی کے کہنے کا اتنا اثر تو ضرور ہوا کہ تین مہینے کے قریب مولانا سخت علیل اور صاحب فراش رہے اور لوگوں کو اس امر کا خدشہ ضرور رہا کہ کہیں پنڈت جی کی پیشین گوئی صحیح نہ اُترے۔ غرض وہ پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی۔ اور اِسی وجہ سے مذہب اسلام میں حکم ہی کہ مستقبلات کا علم خداوند تعالیٰ کے سوا اَور کسی کو نہیں ہی۔ مگر لوگ ہیں کہ جان بوجھ کر کہنے سننے میں آہی جاتے ہیں ۱۲

ہی - جس کو مولنا نے تمنائے شرافت سے تعبیر کیا ہی۔ کہا جاتا ہی کہ یہ لکنت پیدایشی نہیں ہی۔ بلکہ چار سال کے سن و سال میں بحالتِ تپ شدید سرد پانی پلا دینے سے لکنت پیدا ہو گئی ہی۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہی کہ لکنت وراثۃً ملی ہی۔ کیوں کہ مولوی علی احمد صاحب اور اُن کی صاحبزادی دونوں کی زبان میں لکنت تھی۔ اور اب میاں بشیر کے لڑکے مُنذر احمد سلمہ میں بھی ہی۔ چار سال پہلے یہ لڑکا بھی صاف صاف بات چیت کرتا تھا۔ چوتھا سال ختم ہوتے ہی اُسے بھی دفعۃً لکنت شروع ہو گئی۔ میاں بشیر کی لکنت گو بچپنے میں زیادہ رہی ہو مگر اب تو بالکل نامعلوم ہی۔ دس پانچ جملوں میں ایک آدھ جگہ اُلجھ جاتے ہیں مگر ایک لمحے کے لیئے اور پھر سلجھ جاتے ہیں۔ اب آج کل مولوی بشیر الدین احمد حیدرآباد دکن کے ضلع لنگسگور میں اول درجے کے دوم تعلقہ دار ہیں۔ حال میں اُنھوں نے دو کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں ایک کا نام اقبال دلہن ہی اور دوسری کا حرزِ طفلاں۔ دونوں کتابیں قابلِ دید ہیں۔ دعا ہی کہ باپ کی طرح یہ بھی نامور ہوں۔

خدا کا شکر ہی کہ پانسو ساٹھ میدانِ صفحات طے کر کے راقم کے قلم سے یہ آخری چند سطریں اور ٹپک رہی ہیں۔ لیکن وہ بے چارہ اِس اُمید و بیم میں پڑا جھول رہا ہی کہ اُس کی سعی مشکور بھی ہوئی یا نہیں۔ خداوندا حیاۃ النذیر کو تاجِ قبولیت عطا فرما کہ مؤلف کو ہم چشموں میں سرنگوں اور شرمندہ ہونا نہ پڑے۔ آمین ثم آمین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضمیمہ آخر نمبر (۳)

کہنے کو کہہ دیجیے کہ حیاۃ النذیر کا یہ آخری ضمیمہ ہے۔ خدا صاحبِ سوانح کی حیات میں برکت دے۔ ان شاء اللہ حیاۃ النذیر کی زنجیر کے ضمیموں میں ہر سال ایک نہ ایک کڑی کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ بہر حال اِس وقت ہم کو یہی آخری ضمیمہ سمجھنا چاہیئے۔ جس میں مولانا کی شاعری اور اُن کے خطاباتِ حرف کا ذکر ہوگا۔

مولانا کی شاعری کے متعلق دورانِ تالیفِ حیاۃ النذیر میں ایک واقعہ گزرا ہے جس کو راقم مجموعۂ نظمِ بے نظیر[۱] میں بطور تمہید کے درج کر چکا ہے۔ وہ اگر تھوڑے تغیر و تبدل کے ساتھ یہاں درج کر دیا جائے تو بہت مناسب ہوگا۔

مولانا کی شاعری اور اُس پر ریویو

ایک جلسے میں جناب شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی کے لٹریچر فر کا ذکر خیر ہو رہا تھا۔ حاضرینِ جلسہ جناب ممدوح کی بذلہ سنجیوں کو بیان کر کے لطفِ صحبت میں گرمی پیدا کر رہے تھے کہ اتنے میں وہاں راقم بھی پونہچا۔ یارانِ طریقت کے اصرار پر مولانا کے دو چار لطیفے بیان کیے۔ ایک نے کہا اس وقت مولانا کی کوئی تصنیف منگائیے۔ اُن کی مصنفات کی ہر سطر ایک لطیفہ ہے اور ہر لطیفے میں ایک نصیحت ہے اور ہر نصیحت میں گلستاں کا مزہ آتا ہے اس فرمایش کی اَور لوگوں نے بھی تائید کی۔ شایقین کو جب راقم نے ہمہ تن اشتیاق دیکھا تو کتاب منگائی۔ منگائی تھی توبۃ النصوح۔ لانے والا مجموعۂ لکچر اُٹھا لایا اور مکین کے حوالے کیا۔

مکین اگرچہ نوجوان تھے مگر بالکل پُرانے خیال کے وہ جس طرح نئے عمدہ خیالات کی نثر کو ناپسند کرتے تھے اُسی طرح بلکہ اُس سے زیادہ نئی شاعری کو نظرِ حقارت سے دیکھتے تھے اور اِس کی خاص وجہ یہ بھی کہ وہ بھی شاعر تھے مگر ایشیائی[۲] ٹکسال کے۔ حُسنِ اتفاق کہ لانے والے نے اُنھیں کو مجموعۂ لکچر دے دیا۔ اُنھوں نے اُس کو کھولا مگر پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ مشغلے کے طور پر ورق گردانی کے لیے۔ ورق گردانی کرتے کرتے ایک جگہ اُن کا ہاتھ رُکا تو یہ نظم نکلی ؎

خدا غارت کرے اِس اختلافِ دین و مذہب کو ؛ نچا مارا ہے یکسر کیا عرب اور کیا عجم سب کو ؛

چُپکے چُپکے اُس کے دو تین شعر پڑھے تو دل میں مزہ پیدا ہوا۔ پہلا تنفر مجرم غلام کی طرح دماغ سے نکل کر الگ کو نے

[۱] مجموعۂ نظمِ بے نظیر کے نام سے اول اول سر سید نے مولانا کی صرف دو نظمیں بڑے اہتمام سے چھپوائی تھیں۔ راقم نے مولانا کی کُل اُردو اور عربی مطبوعہ و غیر مطبوعہ نظمیں چھپوا کر یہی نام رکھ دیا ۱۲

[۲] وہ شاعر جس کا مبالغہ جھوٹ سے زیادہ بڑھ گیا ہو اور صرف گل و بلبل اور وصال و ہجر ہی کو مضمونِ شعر سمجھتا ہو ۱۲

میں جا کھڑا ہوا۔ شوق والفت اور دل چسپی نے لپک کر دل و دماغ مکین کو سرفراز کیا۔ چشم انصاف کھل گئی۔ عقل پر جو پردۂ تعصب پڑا تھا اُٹھ گیا۔ پڑھتے پڑھتے زبان سبحان اللہ و ماشاء اللہ و جزاک اللہ کہنے لگی۔

راقم کو حیرت تھی کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ کس کی زبان سے ایسے الفاظ سُن رہا ہے۔ کل تک یہ بندۂ تعصب ان نئے خیالات والوں کے جہاں اُور عقائد سے متنفر تھا وہاں اُن کے لٹریچر نظم و نثر کی بھی مٹی پلید کیا کرتا تھا۔ یا آج اُس کی زبان سے نعوذ باللہ و استغفر اللہ کی جگہ سبحان اللہ سُن رہا ہے۔

یہ عالم دیکھ کر راقم نے کہا کہ حضرت کتاب مجھے دیجئے یا آپ ہی ذرا بلند آواز سے پڑھیے کہ حاضرین بھی سُنیں مکین نے یہ سُنتے ہی بے تکلف پڑھنا شروع کر دیا مگر ذرا لَے کے چٹخارے کے ساتھ۔ آدمی تھے خوش گلو تو نظم اُور سونے میں سُہاگا ہو گئی۔ نظم پڑھی گئی تو شوخیِ کلام پر لوگ اُچھل اُچھل پڑے۔ خوبیِ بندش پر لوگوں کے دل شگفتہ ہو گئے لطافت معنوی نے دماغ کو منور کر دیا۔

غرض ایک نظم کے بعد دوسری نظم پڑھی جانے لگی۔ سامعین ہمہ تن گوش ہو رہے تھے۔ راقم اپنی جگہ خاموش بیٹھا ہوا استعجاب کے عالم میں یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس موقع پر جو نظمیں پڑھی گئی تھیں وہ یہ ہیں۔

(۱)

بچارا ہے یکسر کیا عرب اور کیا عجم سب کو
خدا غارت کرے اِس اختلافِ دین و مذہب کو

عجب بد عقل ہے انساں کہ بااین دعویِ دانش
ہزاروں سال سیکھا پر نہ سمجھا اصل مطلب کو

اگر تعلیم دیں یہ ہے تو آخر کار سُن لینا
کہ خود مکتب کے لڑکوں نے کیا برباد مکتب کو

زمانے نے بہت سفاکیاں مذہب کی دیکھی ہیں
اگر شک ہو تو تم بھی آزما دیکھو مجرّب کو

خدا محفوظ رکھے اِس کی زد سے یہ وہ گولا ہے
نہ پیادے ہی کو چھوڑے اور نہ راکب کو نہ مرکب کو

یہ وہ آتش ہے عالم سوز جس کی ایک چنگاری
جلا دے ایک دم میں خشک و تر کو دُور وا قرب کو

ڈسا ہو جس کو اس موذی نے وہ بھٹکا نہیں کھاتا
خدا را تم نہ چھو لینا کہیں اِس نیشِ عقرب کو

مُصیبط کس لیے بنتے ہو لوگوں کے کہ یہ منصب
نہ حاصل تھا نہ حاصل ہے مقرب سے مقرّب کو

نہ اُس آواز کو کانوں میں آنے دینا سُن رکھو
نہ ایسی بات سے زنہار کرنا آشنا لب کو

نظر کچھ مقتضائے وقت پر بھی چاہیئے کرنی
کہ دن کو کام میں مصروف ہو آرام میں شب کو

مگر تم جھونپڑوں میں دیکھتے ہو خواب محلوں کے
ذرا سوچو تو کیا نسبت گئے وقتوں سے ہے اب کو

مزاج اسلام کا ناساز ہے اچھا نہیں لگتا
کسی کا بولنا آواز سے جانِ معذّب کو

و لے تم لوگ یوں بیگانہ وار آپس میں لڑ لڑ کر
بالآخر وق بنانا چاہتے ہو عارضی تپ کو

پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑو چھوڑ دو حق پر
وہ خود پہچان لے گا بے ادب کو اور مودّب کو

(۲)

بچایا ڈوبنے سے کشتیِ دینِ محمد کو
الٰہی نوحؑ کی سی عمر دے سر سید احمد کو

مگر ہیں پورے ساڑھے نو سو شمسی سال گن لوں گا — کہ کوئی نیچری کچھ کم نہ کر دے وقتِ ممتد کو

ہمیں احسان شناسی شکر پر مجبور کرتی ہے — وگرنہ ہم کمینہ پن سمجھتے ہیں خوشامد کو

تعصب ہی ترقی میں مسلمانوں کی حارج تھا — جزاک اللہ کس خوبی سے سرکایا ہے اس سد کو

کسی ڈھب سے انھیں تعلیم کے رستے پہ لا ڈالا — اگر اب بھی نہ سمجھیں یہ تو روئیں قسمتِ بد کو

کیا تھا پاک اس کے جدِ امجد نے سنا ہوگا — بتوں کی گندگی سے خانۂ کعبہ کے معبد کو

سو اس نے بھی دلوں سے دھو دیا اوہامِ باطل کو — کہ اس کا فرض تھا پھر زندہ کرنا سنتِ جد کو

مسلمانوں نے آپ اسلام کو ایسا بگاڑا تھا — کہ ہم اس کی بدولت آخر آ پونہچے ہیں اس حد کو

کہ ہم کو آج دنیا میں ہے وہ رسوائی و ذلت — جو ہونی چاہیئے انجام میں کافر کو مرتد کو

جو عالم تھے انھوں نے صرف دستارِ فضیلت کی — بنا کر دھجیاں اُس پاک پیغمبر کی مسند کو

عوام الناس فہمِ رازِ دیں سے عاجز و قاصر — لیئے بیٹھے تھے رسم و راہ و تقلیدِ شدآمد کو

خدا ہی جانے کیا اسلام کو لوگوں نے سمجھا تھا — چلے آتے تھے سب تکذیب کو ابطال کو رد کو

ادھر سائنس کا پتھراؤ کہتا تھا کوئی دم میں — کیئے دیتا ہوں چکنا چور اس شیشے کے گنبد کو

سو اس نے اپنے زورِ عقل سے وہ پائداری دی — کہ اب جنبش نہیں تا حشر اس قصرِ مشید کو

خدا کی شان ہے وہ اب بیچلر آف آرٹس ہوتے ہیں — جو کفر و زندقہ کہتے تھے انگریزی کی ابجد کو

بہت سنتے رہے ہو جزرِ اسلامی سمندر کے — اب آگے دیکھنا طغیان و جوش و شورشِ مد کو

یہ کنکوے ہیں ان میں قوتِ پرواز خلقی ہے — انھیں تعلیم کی دریائی پونہچائے گی فرقد کو

عزیزو یہ عملداری بڑی رحمت خدا کی ہے — غنیمت بس غنیمت جانو اُس کے فضلِ بیحد کو

نہ کچھ تخصیص مذہب کی نہ کچھ تعیین ملت کی — جو اسود کو وہ ابیض کو جو ابیض کو وہ اسود کو

باطمینان اسبابِ ترقی جمع ہیں سارے — اگر تم کام میں لاؤ طلب کو جہد کو جد کو

علی گڈھ ہو کے سیدھی راہ نکلی ہے ترقی کی — ہمارے ساتھ ہو لو جلد تر پونہچو گے مقصد کو

بچو ٹکر سے حتی الوسع وقتِ نامساعد کی — اُٹھایا ہے کسی نے یا اُٹھا سکتا ہے اس زد کو

اب آزادی نے اپنا سکہ عالم میں بٹھایا ہے — نکالو مطلقاً فرہنگ سے لفظِ مقید کو

کسی کی بات بھی مانا کرو ضد کی بھی اک حد ہے — خدارا چھوڑ دو اس جاہلانہ کاوشِ کد کو

اگر اب بھی نہ تم نے قدر و قیمت وقت کی جانی — تو بس پتھر پہ کھدوا رکھنا اِس قولِ موکد کو

کہ مٹ جاؤ گے اور برباد ہو جاؤ گے بالآخر — پکڑ پاؤ گے کیا تم ناتواں اس چودھویں صد کو

بس اپنی شاعری موقوف کر بر خود غلط مت ہو — اگرچہ روکنا مشکل ہے مضمونوں کی آمد کو

کہیں اس شاعری کے خبط میں عادت نہ کر لینا — خلافِ وضع وصفِ خطّ و خالِ عارضِ خد کو

نظم

کچھ نہ پوچھو آج ہم لکچر میں کیا کہنے کو ہیں
قوم کو خود قوم کے مُونہ پر بُرا کہنے کو ہیں

اُن کو اُن کے عیب اُن کے سقم دکھلانے کو ہیں
اُن سے اُن کی داستانِ ماضی کہنے کو ہیں

الغرض اسلام پر جو کچھ کہ گزرا نیک و بد
اِس کو ہم از ابتدا تا انتہا کہنے کو ہیں

مدتوں ہم اِن کو چُپکے چُپکے سمجھایا کیے
اب جو کچھ کہنے کو ہیں سو برملا کہنے کو ہیں

ذیل کی دو نظمیں منشی نصیر الدین صاحب خوش نویس مطبع سلطانی بھوپال نے دی ہیں جو مجموعۂ نظم بے نظیر میں چھپنے سے رہ گئیں۔ منشی صاحب موصوف جب دہلی میں تھے تو اُنھوں نے یہ دونوں نظمیں مولوی نذیر احمد صاحب کی زبان سے سنی تھیں۔ ہم ان دونوں نظموں کو شکریے کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

(۱)

سُن تو سہی جہاں میں ہی تیرا فسانہ کیا
کہتی ہی تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

از خود نہیں کہے سے تو سوچا کرو کبھی
کیا کر رہے ہو چاہ رہا ہی زمانہ کیا

انگریزی شرطِ زیست ہی اور حفظِ زیست فرض
پڑھنے میں اس کے مذہب و دیں کا بہانہ کیا

بے طرح آج گھُور رہے ہیں جو مولوی
تکفیر کا بنائیں گے ہم کو نشانہ کیا

بلبل سے کوئی پوچھے کہ جب آئے گی خزاں
رہ جائے گا چمن میں ترا آشیانہ کیا

ایک نوکری ہی وجہِ معیشت سو منعدم
دنیا سے اُٹھ گیا ہی مگر آب و دانہ کیا

قانع کو مال و دولتِ دنیا کی کیا خبر
کس کو ذخیرہ کہتے ہیں اور ہی خزانہ کیا

سیری میں سو جھتے ہیں مضامینِ عشق بھی
لکھّے گا اب کوئی غزلِ عاشقانہ کیا

حاجت نہیں ہی گورِ غریباں کو سایہ کی
بہتر ہی آسمان سے بھی شامیانہ کیا

ہوتی ہی انحطاط کی رفتار آپ تیز
مہمیز چاہیئے اُسے کیا تازیانہ کیا

کہتے ہو تم نے دردِ دل اپنا کہا نہ کیوں
کیا کہتے بے کہے ہوئے تم سے سُنا نہ کیا

پونہچیں گے آپ پہلے تقاضائے شوق سے
اپنی روانگی کا کریں خط روانہ کیا

(۲) عزیزو اک سخن ہم تم سے استفسار کرتے ہیں
کہ واصل خاں کے ہوتے کس لیئے بیمار پڑتے ہیں

مگر ہوتے ہیں جرمِ خود کُشی کے مرتکب از خود
جو یاں آتے نہیں الزام ناحق طب پہ دھرتے ہیں

خدا کی نعمتیں بے حصر ہیں پر ہم بنی آدم
غضب ہی جانتے پہچانتے ہیں اور مکرتے ہیں

اگر صحت نہ ہو شیرازۂ مجموعۂ ہستی
نہ ہم پاشیدہ ہو کر آج سب اجزا بکھرتے ہیں

ہی تقلیل غذا تدبیرِ شکمی حفظِ صحت کی
نہ کیوں بیمار ہوں جو بکریوں کی طرح چرتے ہیں

جنھیں جھَلی کی عادت ہی اُنھیں کب چین پڑتا ہی
عجائب پیٹ ہیں اُن کے نہ کھانے سے اُبھرتے ہیں

اگر ذ لیس للانسان الا ماسعیٰ برحق
تو ہم اپنے ہی کرنے سے بگڑتے اور سنورتے ہیں

خدا جانے وہ کیا حکمت ہے کیا جادو کا پانی ہے — کہ جس سے بوتلوں کو شہر کے عطّار بھرتے ہیں
حذاقت چار دانگِ ہند میں اُن کی مسلّم ہے — جو طبّی مدرسے کی جانچ میں پورے اُترتے ہیں
سناتے ہیں اُسی کو لوگ جس سے فیض پاتے ہیں — جلاتے کس لیئے ہیں شمع کو کیوں گُل کترتے ہیں
ہماری شاعری کس طرح لوگوں کو پسند آئے — کہ ہم الحق مُرٌّ بے تامل کہہ گزرتے ہیں
لگی لپٹی نہیں رکھتے کسی کے پاس خاطر سے — وہ کوئی اَور ہوتے ہیں جو حق کہنے سے ڈرتے ہیں

مولنا راقم کو معاف فرمائیں گے اگر وہ کہے کہ اس جلسے کے قبل اُس کے دل میں مولنا کی نظموں کی اتنی زیادہ وقعت نہ تھی جتنی کہ نثر کی۔ مگر اُسی کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اُس نے نظموں کو کبھی اس خیال سے پڑھا بھی نہ تھا کہ اُن کی حُسن وخوبی کو دیکھے۔ اب اِس جلسے کے منظر نے اُس کے دل میں گُدگُدی پیدا کی اور اُس نے بہ نظرِ غائر مولنا کے ہر شعر کو پڑھا تو بے ساختہ زبان سے ان من الشعر لسحرًا کی جگہ کل شعرٍ سحرٌ نکلا۔

جلسہ ختم ہوتے ہی ایک نے فرمائش کی کہ فلاں نظم مجکو نقل کر دیجئے۔ دوسرے نے کہا کہ مجھے مسدس کی ضرورت ہے تیسرے نے کہا کہ یہ بیچارے کہاں تک نقلیں کریں گے۔ لکچروں کی جلدیں ہی کیوں نہ منگالو۔ فرمائشیں سنتے ہی راقم کے دل میں بجلی کی طرح یہ خیال چمکا کہ تمام متفرق نظموں کو مجموعۂ بے نظیر کے نام سے چھپوا دیا جائے تو بہتر ہے۔ لوگ شوق کے ہاتوں سے خریدیں گے اور ذوقِ دل سے پڑھیں گے نظموں میں جو کچھ نصیحتیں ہیں لوگ اُن کو پندِ پیرِ دانا سمجھ کر اپنا معمول بنائیں گے۔ لیکن ان نظموں کا چھپنا بغیر مصنف کی اجازت کے مشکل تھا آخر اوسے اجازت مانگی تو مولنا نے شفقت و مہربانی سے استدعا قبول فرمائی۔

ارادہ تو یہ تھا[۵۱] کہ مولنا کی سوانح عمری حیاۃ النذیر میں جہاں شاعری کا تذکرہ کیا جائے وہیں کلام منظوم پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ مگر حُسن اتفاق سے حصۂ نظم سوانح عمری سے الگ ہو رہا ہے اِس لیے مناسب ہے کہ مولنا کی شاعری کے متعلق جو کچھ ریمارک ہوں وہ یہیں ہوں۔ حیاۃ النذیر میں اگر ضرورت ہوگی تو دیکھا جائے گا یا مجموعۂ نظم بے نظیر کا حوالہ دے دیا جائے گا۔

پس مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نفسِ شاعری کے متعلق جناب مولنا کے جو کچھ خیالات ہیں اوّل اُن کو اقتباس کر کے لکھا جائے تاکہ ناظرین کو کافی طور پر رائے قائم کرنے کا موقع ملے۔ اب ہم وہ اقتباسات نمبروار ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) فن زبان دانی ہر زمانے میں ہر سرزمین میں ہر دل عزیز رہا ہے۔ اب بھی ہے اور آیندہ بھی رہے گا۔ لیکن ہر دل عزیز ہونا اَور چیز ہے اور قوم اور ملک کے حق میں مفید ہونا اَور چیز۔ بے شک ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بعض اوقات شاعروں کو ایک ایک قصیدے پر لاکھ لاکھ روپیہ ملا ہے۔ مگر یہ شخصی فائدے تھے اور وہ بھی شاذ و نادر اور اتفاقی۔ اِن گئے گزرے وقتوں میں بھی ۱۸۵۷ء کے غدر کے پہلے تک دلی میں ایسے ایسے شاعر موجود تھے کہ ہر شخص اپنی طرز کا استاد تھا۔ مگر بے چارے محتاج مفلس تنگیِ معاش کی وجہ سے پریشان اور جتنے نامی اور مستند شعراء متقدمین و متاخرین ہندی اور عجمی ہو گزرے ہیں سبھی کے کلام سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ شاعروں کو گویا کسی فقیر کی بددعا ہے کہ ہمیشہ تنگ رہیں۔ ہمارے مُلک میں کلب حسین خاں ایک شاعر تھے اُن کے شعر سے

---

[۵۱] دونوں ارادے پورے ہو گئے۔ سوانح عمری سے الگ بھی شاعری پر لکھا گیا اور اب سوانح عمری میں بھی لکھا جا رہا ہے یہ دوسری بات ہے کہ وہاں تمام نظموں کے ساتھ اور یہاں انی گنی چند نظموں کے ساتھ۔ اُس کو اگر کل نظموں پر فخر ہے تو اس کو نقّادی پر ۱۲

اِس کی تصدیق ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں ؎

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شعر گوئی نحس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہوگیا

خیر بدوعا تو کیا ہوگی مگر اس کا سبب یہ ہے کہ شاعری کی ایسی بُری چاٹ ہے کہ آدمی کو دنیا اور دین دونوں جہان کے کاموں سے معطّل کر دیتی ہے۔ ناچار شاعروں کو امیروں کا بھاٹ بننا پڑتا ہے جو ایک طرح کی گداگری ہے غرض خود شاعروں کے ذاتی فائدے کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو شعر و سخن امیروں کے پیٹ بھرے کا مشغلہ تھا۔ اب نہ پہلے سے امیر رہے نہ اگلی سی فراغتیں ع آن قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ کس توقع پر کوئی خونِ جگر کھائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے کوئی نیا شاعر بڑے نام و نمود کا سننے میں نہیں آیا۔ لکھنؤ والوں میں کسی قدر رگدگدی ہے۔ سو وہ بھی یوماً فیوماً گھٹتی چلی جارہی ہے۔ پُرانی تعلیم سے معاش میں مدد نہیں ملتی وہ آپ ہی آپ اس سے دست کش ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے لٹریچر (علم ادب یا انشا پردازی) کی ترقی مسدود ہوگئی۔ آپ صاحبوں میں سے کوئی صاحب ایسا نہ سمجھیں کہ میں لٹریچر کا نوحہ پڑھ رہا ہوں۔ نہیں نہیں۔ میں تو اس خیال کا آدمی ہوں کہ علوم قدیمہ کو مسلمانوں کی ترقی کا سدِّ راہ جانتا ہوں۔ اور علوم قدیمہ میں سے بھی خاص کر لٹریچر کا سخت مخالف ہوں۔ مسلمانوں میں ایز اے نیشن بحیثیت قومی جتنی خرابیاں ہیں کل تو نہیں اکثر اسی لٹریچر نے پیدا کی ہیں۔ یہ لٹریچر جھوٹ اور خوشامد سکھاتا۔ یہ لٹریچر واقعات اور موجودات کی اصلی خوبی کو دباتا اور مٹاتا۔ یہ لٹریچر متوہمات اور مفروضاتِ بے اصل کو فیکٹس (واقعات) بناتا۔ یہ لٹریچر نالائق ولولوں کو شورش دلاتا۔ اگر کسی نے اِس زہر کو چکھا ہے تو میں نے پیا ہے۔ اگر کسی نے اس سانپ کو کھلایا ہے تو میں نے اپنے تئیں اس سے کٹوایا ہے۔ اگرچہ بڑی عمر میں میں نے بوڑھے طوطوں کی طرح آپ ہی آپ تھوڑی سی انگریزی بھی پڑھ لی تھی۔ لیکن میری طبیعت میں ایشیائی تعلیم کا رنگ رچ چکا تھا۔ انگریزی پڑھنے سے اتنا تو ہوا کہ مجکو اپنے ہاں کے لٹریچر کے عیوب معلوم ہونے لگے مگر میں وہی کا وہی رہا۔ اب بھی اگر کوئی برجستہ شعر سُن پاتا ہوں چاہے اُس میں کتنا ہی مبالغہ خلافِ قیاس کیوں نہ ہو بے اختیار پھڑک اُٹھتا ہوں۔ یہ ساری کم بخت بلا فارسی کی پھیلائی ہوئی ہے۔ خیالات اور مضامین کے اعتبار سے تمام دنیا کے لٹریچروں میں اس زبان کے لٹریچر سے بدتر اور کوئی لٹریچر نہیں۔ اس نے قومی مذاق کو ایسا بگاڑا اور اس قدر تباہ کیا کہ ہم لوگوں کو واقعات میں مزا نہیں ملتا۔

(۳) میں نے ساری عمر شعر گوئی کو اپنا مشغلہ نہیں بنایا۔ یہاں تک کہ ہنوز اپنا کوئی تخلص بھی نہیں رکھا اور طبیعت کے موزوں ہونے کی وجہ سے کبھی کوئی شعر موزوں کر لیا ہو تو اس کی قسم بھی نہیں کھاتا۔ مگر اتنا کرنے سے میں شاعر نہیں ہوگیا۔ اور نہ میں شاعر ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ اور شاعر نہیں اور شاعری کا دعویٰ نہیں تو مدح کی توقع کیوں ہو ؎ نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا ٭ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی ٭ مدح و ستایش نہ سہی تاہم یہ فائدہ کیا کم ہے کہ مجھ جیسے اناڑی عطائی کی وجہ سے خواجہ الطاف حسین حالی جیسے کلاونت کی حق قدرہ قدر کی جائے گی۔ وبضدہا تتبین الاشیاء۔

(۴) شاعری ہمیشہ اسلام کی نظر میں مبغوض رہی ہے اور وہ ہے بھی اسی قابل۔ میں بھی اس کو سخت ناپسند کرتا ہوں نہ اس لئے کہ

ط ایک شاعر اور کہتا ہے ؎ عمریست کہ تیر چرخ را آماجم۔ بر تارک افلاس و فلاکت تاجم ٭ یک شمہ زماجرائے خود عرض دہم۔ چنداں کہ خدا غنی است من محتاجم ٭ ۱۲ ط ؎ چیزوں کا حال مقابلے سے ظاہر ہوتا ہے ۱۲

اس کو اپنے لیئے دون مرتبت سمجھتا ہوں بلکہ اس لیئے اور صرف اس لیئے کہ اس کی چاٹ سریش کی طرح چمٹ جاتی ہی۔ ع
چھٹتی نہیں ہی مونہ سے یہ کافر لگی ہوئی - اسی نے تو قومی مذاق کا ستیاناس کیا ہی - پھر بھی جس طرح کڑوی دوا شربت اور خمیرے کے ساتھ دی جاتی ہی لوگوں کو نصیحت بھی نظم کے پیرائے میں کرنی پڑتی ہی - اور نوجوانوں کے حق میں تو میں شاعری کو سمّ قاتل سمجھتا ہوں - اس پر بھی فرمائشوں سے مجبور رہوں -

(۴) جو کیفیت اُن بزرگ کی تھی کہ مریدوں کے بھرّے میں آ کر نفلیں پڑھاتے چلے جاتے تھے وہی کیفیت میری ہی مگر افسوس صد افسوس عبادت میں نہیں بلکہ شعر کہنے میں کہ میری اتنی عمر ہونے آئی میں نے کبھی شاعری کا شوق نہیں کیا - اور شاعری کا شوق کیا ہوتا تو میں نوکری کر سکتا نہ کوئی کتاب تصنیف یا تالیف کر سکتا - اور نہ کلام مجید کا ترجمہ کر سکتا - اور نہ لکچر دے سکتا - نہ میرا کوئی تخلص ہی اور نہ مجکو اس لایعنی شغلے کے لیئے کبھی فرصت ملی اور صاف بات یہ ہی کہ ہمارے ہاں کی شاعری کا مذاق ایسا بگڑا ہی کہ جہاں قومی تنزل کے اَور اسباب ہیں اُن میں میرے نزدیک ایک بڑا سبب یہ کم بخت ایشیائی شاعری بھی ہی - اس میں شک نہیں کہ ہمارے وقتوں میں مولوی حالی نے نظمی مذاق کی بہت کچھ اصلاح کی ہی - مگر اب بھی میں نوجوان لڑکوں کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں - اور میں نہیں دیکھنا چاہتا کہ اُن میں شاعری کا مذاق پیدا کیا جائے - اِن کو شاعری کی چاٹ لگی اور انھوں نے جان صاحب کا دیوان خریدا اور جان صاحب کا دیوان ہاتھ میں لیا اور خود جان صاحب ہوئے - وہ جان صاحب جن کی نسبت فرمایا ہی والجان[1] خلقناہ من قبل من نار السموم - یہ لوگ جو خلافِ اخلاق شاعری کرتے ہیں - جو دین کا استخفاف کرتے ہیں - جو بزرگانِ دین کی ہنسی اُڑاتے ہیں پورے پورے مصداق ہیں اس آیت کے لیحملوا اوزارھم کاملۃ یوم القیامۃ ومن اوزار الذین یضلونھم بغیر علم الا ساء ما یزرون ۵

اب لاؤ اس شاعری کے بیان کو ختم کریں - تو غرض یہ ہی کہ جس طرح وہ شب زندہ دار بزرگ مریدوں کے بھرّے میں آ کر ہزار پانسو نفلیں پڑھنے لگے تھے میں بھی لوگوں کے کہنے میں آ کر شعر کہنے لگا مگر جیسی اُن کی نفلیں ہوتی ہوں گی ویسے ہی میرے شعر ہوتے ہیں

(۵) شاعری جس سے زیادہ موثر کوئی عمل نہیں ایشیائی ملکوں میں مدتوں سے ایسی بُری طرح سے اس کا استعمال کیا جا رہا ہی کہ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں لٹریچر کی خرابی کو ایشیائی قوموں کے تنزل میں بڑا دخل ہی - جھوٹ اور مبالغے اور بے اصل خیالی باتوں پر تو اس کی بنیاد ہی - اور مضامین جن میں شعرا طبع آزمائی کرتے ہیں اکثر گندے - تو ایسی شاعری قومی اخلاق کو بگاڑا ہی چاہے

حاصل کلام یہ کہ شاعری یعنی ایشیائی طور کی شاعری شرعاً مذموم ہی - اُس نے قوم کے اخلاق پر بہت ہی بُرا اثر کیا ہی اور جب شاعری ایسی بد بلا ہی کہ مستمع کے اخلاق کو تباہ کر دیتی ہی تو خود شاعر جو مبدا ان تمام خیالاتِ فاسد کا ہی اس کے اثر بد سے کب محفوظ رہ سکتا ہی - اس محل پر شاعروں کے دوسرے عیوب کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں - شاعر ہیں کم سے کم عجب اور خود پسندی کا عیب تو ضرور ہی پیدا ہو جاتا ہی - وہ اپنے ہم پیشوں کا حسد کرنے لگتا ہی جس کو ام الذمائم کہنا چاہیئے - اور اگر توقع کی قدر اُس کو داد یا صلہ نہ ملے تو وہ ہجو سے لوگوں کی دل آزاری کرتا ہی -

[1] اور جنوں کو ہم نے پیدا کیا لُو کی گرمی سے ۱۲ [2] (ان کے کہنے کا ضروری) نتیجہ یہ ہی کہ قیامت کے دن اپنے (گناہوں کے) سارے بوجھ اور جن لوگوں کو بے سمجھے بوجھے گمراہ کرتے ہیں - ان کے (گناہوں کے) بوجھ بھی انھیں کو اُٹھانے پڑیں گے دیکھو تو (کیا) بُرا بوجھ یہ لوگ اپنے اوپر لادتے چلے جاتے ہیں ۱۲

(۶) ایشیائی شاعروں کے وصل و ہجر۔ گل و بلبل۔ شوق و انتظار جہاں اور معمولی مضامین ہیں اُن میں سے ناصح یا شیخ یا زاہد کو بُرا کہنا اور آسمان کو اُلاہنا دینا بھی ہی۔ شیخ و زاہد کو بُرا کہنا دین کے ساتھ استہزا کرنا ہی اور آسمان کو اُلاہنا دینا وعیدِ لاتسبوا الدہر میں داخل ہی ۵ از آسمان و زمیں شکوہ می کنی شب و روز۔ چہ دادہ بہ زمیں زآسماں چہ می خواہی ÷

مولٰنا نے بعض نظموں میں اپنی شاعری اور اُس کی حقیقت کے متعلق دو دو چار چار شعر بھی کہے ہیں۔ چوں کہ وہ بہت مزے کے ہیں اس لیئے درج کیئے جاتے ہیں۔

(الف) ذرا ٹھہر اے طبیعت کس بلا کی تیری آمد ہی — کوئی حد بھی ہی اُس باقی کی آخر تا کجا باقی
یہ جو کچھ سُن چکے ہو اب تلک تمہیدِ مطلب تھی — ابھی ہی نثر میں کہنے کو اصلِ مدّعا باقی

(ب) اگر لوگوں کے خوش کرنے کی حاجت ہی تو اُن کو ہی — کہ جو امیدوارِ بخشش و انعام و خلعت ہو
یہاں تحسین تک اور داد تک کی بھی نہیں پروا — سخن بے قدر و کاسد ہی اگر شاباش قیمت ہو
دلوں کو موہ لے لیتے ہیں ہم لطفِ مضامیں سے — مگر دل حق پسند و شیوۂ انصاف طینت ہو

(ج) بس اپنی شاعری موقوف کر بر خود غلط مت ہو — اگرچہ روکنا مشکل ہی مضمونوں کی آمد کو
کہیں اس شاعری کے خبط میں عادت نہ کر لینا — خلافِ وضع وصفِ خط و خال و عارض و خد کو

(د) ہر چند ہوں کمال و فضیلت سے بے نصیب — پر شکر ہی کہ طبع میں جودت ہی اور اُمنگ
کہتا نہیں مگر مجھے قدرت ہی نظم پر — لیکن نہیں ہوں دوسروں کی طرح سے ونبگ
لوہا نہیں ہی ذہن کی تلوار کا خراب — ہاں بے مہارتی کے سبب سے چڑھا ہی زنگ
الماس ہی نتیجۂ فیضانِ تربیت — ہی ورنہ اصلِ وضع میں اس کی سرشت سنگ

(ہ) گرچہ ہی شعر و سخن سے مجھے کلّی نفرت — اک مصیبت ہی مگر طبع کی موزونیّت
اونگھتے کو ہوا کرتا ہی بہانہ جس طرح — ٹھیلنے کا۔ یہی حالت یہی۔ کیفیت
اک تقاضائے طبیعت ہی دوم فرمائش — محسن الملک کا کہنا نہ کروں کیا طاقت
ہاں میں ہاں جو نہ ملائے وہ ٹرسٹی کیسا — نیچری کیا۔ نہ کرے ان کی اگر تبعیت
ایک مشکل ہی بڑی اَور کہ اِس مجمع میں — نظم کا نام اگر لوں نہیں پڑتی ہمّت
لکھنؤ ہی یہ اور اِس خطّے کے رہنے والے — رکھتے ہیں شاعری و حُسنِ بیاں میں شہرت
پشتہا پشت سے شغل اُن کا ہی تحسینِ زباں — یہی معیارِ فضیلت ہی یہی علمیّت
قابلیت جو تھی سب صرف ہوئی لفظوں میں — اور مضامیں کی اگر پوچھو تو بس خیریّت
وہی اک عشق کا رونا ہی ہر اک صورت سے — نہ لگائے کسی بندے کو خدا اِس کی لت

(و) میں کہاں اور شاعری کا مشغلہ بے سودِ محض — یہ وہ کرتا ہی جو محفل سے ہو خواہاں داد کا
انجمن کے واسطے میں بھی ہوں خواہاں داد کا — دادِ تحسیں کا نہیں داد و دہش کی داد کا

(ن) سنیں جتنا سنا ؤ پر نہ پونہچیں اصل مطلب کو — طبیعت کیا دکھائے خاک پھر اپنی جولانی
تم اپنی نثر لو اور نظم کو چھوڑو نذیر احمد — کہ اُسکے واسطے موضوع ہیں حالی[۵۱] و نعمانی[۵۲]

غرض جس شاعر کے ایسے خیالات ہوں اُس کے اشعار میں گل و بلبل کی کھال یا شیریں فرہاد کا قصہ یا وصال کی مسرت یا ہجر کا جھینکنا کوئی کیوں کر دکھا سکتا ہے۔ یہ تو یہ وہاں تو کوئی جھوٹے استعارات کو بھی اشارۃً کنایۃً بندھا ہوا نہیں دکھا سکتا اور نہ کوئی لغو اور بیہودہ تشبیہات کی کوئی مثال ڈھونڈھے مل سکتی ہے۔ نہ وہاں اُن معاشیق کی جلوہ گری نظر آئے گی جن کے دہن نہیں۔ دہن ہے تو کمر نہیں اور اگر بالفرض والمحال ہے بھی تو بال سے زیادہ باریک۔ نہ اُن کے اشعار میں زلفِ سیاہ کا وہ سلسلۂ نا متناہی نظر پڑے گا۔ جس کا سرا اس دنیا میں ہے نہ اُس عالم میں۔ نہ وہاں استخفافِ دین ہی ہے نہ استہزائے بزرگانِ مقدس۔ نہ معاملہ بندیاں ہیں نہ پھبتیاں اور یہی وجہ ہے کہ مصنف ممدوح[۵۳] الشعراء یتبعہم الغاوٗن الم ترا نہم فی کل وادٍ یھیمون وانہم یقولون مالا یفعلون کے ارشاد کی فہرست سے خارج ہیں۔ بلکہ جناب کا نام نامی الشعراء تلامیذ الرحمٰن کے رجسٹر میں داخل ہے۔

ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ مولانا نے شاعری پر ریمارک کرتے ہوئے جا بجا اس امر کا اقبال کیا ہے کہ نہ وہ شاعر ہیں اور نہ انھیں شاعری کا دعوٰی نہ اُن کا کوئی تخلص اور نہ اس لایعنی مشغلے کے لیے کبھی اُنھیں فرصت ملی۔ ان فقروں کو دیکھ کر بعض نادان اور ناسمجھ یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ مولانا شاعر نہیں بلکہ ناظم ہیں۔ اور اس کی تائید میں ایک بات یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ اُن کی نظموں میں کوئی غزل نہیں اور جب غزل نہیں تو شاعر نہیں گویا معترض کے نزدیک صرف وہی شاعر ہو سکتا ہے جو غزل گو ہو اور غزل میں بھی وہی سخن بازناں گفتن ہو اور اُس نے کوئی اپنا تخلص بھی مقرر کیا ہو۔ پس مولانا کی طرف سے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور راقم کی طرف سے اس کا یہ جواب ہے کہ اگر شاعر کے یہی معنی ہیں تو وہ پکارے کہتا ہے کہ مولانا ہرگز شاعر نہیں اور اگر شاعر کی یہ تعریف ہے کہ وہ صادق البیان ہو۔ اُس کی نظم کا سوز آہ و بکا پیدا کرے۔ دلوں میں اُس کے اشعار کا اثر بیٹھ جائے۔ اشعار کا جذب دل کو پکڑ کر کھینچ لے اور دل میں درد پیدا کرے۔ اُن میں جو نصیحت ہو کارگر ہو۔ واقعاتِ نفس الامری اُن سے معلوم ہوں۔ احساساتِ شعری مشاہدات کا کام دیں تو کس کی مجال ہے کہ مولانا کو زمرۂ شعراء سے خارج کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ راقم کے نزدیک تو جس شاعر کے کلام میں جھوٹا ہجر اور جھوٹا وصل۔ جھوٹی مے اور جھوٹا مینا۔ جھوٹا معشوق اور جھوٹا عاشق۔ جھوٹا گل اور جھوٹا بلبل۔ جھوٹی بہار اور جھوٹی خزاں۔ جھوٹا کرشمہ اور جھوٹا حسن۔ جھوٹا جنوں اور جھوٹا سودا۔ جھوٹی شوخی اور جھوٹی عیاری۔ بیہودہ جھوٹ اور بیہودہ مبالغے کے خس و خاشاک کے انبار اور غیر مفید مزخرفات مضامین ہوں وہ بھی شاعر ہے۔ اور وہ بھی شاعر ہے

[۵۱] شمس العلماء مولانا حالی سے مراد ہے ۱۲ [۵۲] شمس العلماء علامہ شبلی سے مراد ہے ۱۲ [۵۳] اور (جیسا کہ کافر خیال کرتے ہیں) پیغمبر شاعر بھی نہیں کیونکہ شاعر (خود گمراہ ہوتے ہیں اور گمراہی کی تعلیم کرتے ہیں اور) اُن کی پیروی (بھی) گمراہ (ہی) کرتے ہیں (اے مخاطب) کیا تونے اس بات پر نظر نہیں کی کہ یہ (شاعر لوگ خیالی باتوں کے) ہر ایک میدان میں سرگرداں پڑے پھرا کرتے ہیں اور ایسی باتیں کہا کرتے ہیں جو خود نہیں کرتے ۱۲

جس کے کلام میں راست گوئی کے ساتھ نصیحتیں حکمتِ الٰہی اور مسائل عرفان اور موعظت اور ترغیب نیک اور واقعات اور قصصِ بزرگانِ دین وغیرہ ہوں۔

لیکن ان دونوں قسموں کے شعر ہیں سے ایک قسم ملک اور قوم اور مذہب اور لٹریچر اور دیگر تمام باتوں کے لیئے از حد مفید ہی جیسے ہمارے مولانا کی قسم۔ اور دوسری قسم کا شاعر ملک اور قوم اور مذہب اور لٹریچر اور تمام باتوں کے لئے نامفید ہی نہیں بلکہ مضر ہی۔ جیسے کس کس کا نام لیا جائے

پس مولانا ممدوح کی شاعری چوں کہ مبالغہ۔ جھوٹ۔ دُور از قیاس اشعاروں اور گندے خیالوں اور لغو قیاسوں اور فتنہ انگیز شورشوں سے پاک ہی اس لیئے ضرور وہ اِس قابل ہی کہ ہر کہ ومہ اُس سے فائدہ اُٹھا سکے باپ اپنے بیٹے کو سُنائے اور بیٹا اپنے باپ کو۔ بڑوں سے سُن کر چھوٹے فائدہ اُٹھائیں اور چھوٹوں سے بڑے۔

اب رہی یہ بات کہ مولانا کی نظمیں شاعری کے شکنجے میں بھی ٹھیک کسی ہوئی ہیں یا نہیں۔ زبان کے لحاظ سے وہ ٹکسالی اور کھرا سکہ ہی یا زرِ ملتبس۔ طرز بندش میں فصاحت و بلاغت کے موتیوں کی لڑیاں ہیں یا کنکر پتھر۔ اس کا جواب یہ ہی کہ راقم نے جب اُن کی نظموں کو تنقیدی نظر سے دیکھا تو اُن میں بعض غلطیاں ضرور نظر پڑیں۔ مثلاً مناجات میں آنحضرت صلعم کو مخاطب کر کے ایک شعر لکھا ہی ؎

تم کو سب اختیار حاصل ہی آپ کو سہل مجھ کو مشکل ہی

نثر کی ایک سطر یا نظم کے ایک شعر میں کہیں مخاطب کو آپ اور کہیں تم کہیں تو یا متکلم کو کہیں ہم کہیں میں لکھنا عیب ہی جس کو شتر گربہ کہتے ہیں۔ استادانِ سخن کہتے ہیں کہ نوآموز بچّوں سے ابتدا میں اسی قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مولانا نے اپنے زمانۂ طفولیت میں یہ مناجات لکھی ہی اور اسی وجہ سے اُس میں اس قسم کی غلطیاں واقع ہو گئی ہیں۔ مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ مولانا کی حمد و نعت اور مناجات کے اشعار خود اپنی زبان سے بیان کر رہے ہیں کہ وہ اگرچہ مولانا کے زمانۂ طفولیت کے اشعار نہیں ہیں۔ مگر ابجدِ سخن یا مشق اوّل کے ہونے میں کلام نہیں۔ کیوں کہ نعت و مناجات کے اشعار کی بندشیں اور ترکیبیں سُست اور ڈھیلی واقع ہوئی ہیں۔ اور مخصوص مناجات کی بات یہ ہی کہ فریاد اور جذبے اور گریہ وبُکا کے وقت انسان پر ایک دوسری قسم کی حالت طاری ہوتی ہی۔ جوش کی حالت میں جب دلی جذبات کا اظہار ہوتا ہی تو فصاحت و بلاغت اور زبان کی ترکیبیں اکثر مغلوب ہو جاتی ہیں۔ اِس لیئے اِس قسم کی نظموں پر اعتراض کے ہیچ کو زیادہ کسنا نہیں چاہیے ؎

فریاد کی کوئی لئے نہیں ہی نالہ پابندئے نہیں ہی

یا مثلاً مولانا کی ایک نظم کا مطلع ہی ؎

عزت نہیں ہنر نہیں پیٹ ٹکا نہیں دنیا میں اب تو جینے کا مطلق مزا نہیں

اِس نظم میں ایک شعر ہی ؎

ہاں اک سبیل ہی کہ علی گڈھ چلے چلو اس وقت اِس سے ہند میں بڑھ کر جگہ نہیں

خزا - سزا - قبا کا قافیہ جگہ نہیں ہو سکتا - جگہ میں ہائے مظہرہ ہے - جگہ کو جگھا یورپ کے بعض اضلاع میں بولتے ہیں جہاں مولانا اکثر رہے ہیں - کچھ عجب نہیں کہ وہیں کا تلفظ یا لب و لہجہ اُن کی زبان پر چڑھ گیا ہو -

مندرجۂ ذیل اشعار پر بھی لوگوں کے اعتراض ہو سکتے ہیں -

یہ طامات و دعوے ہیں دھوکے کی ٹٹی
اگر زہد ہے بھی تو زہدِ مزوّر

گر علم کی طلب ہو صادق اُنھیں تو جانیں
ورنہ نمایشی یہ سب جوش و ولولے ہیں

ہم بھی کبھی با سر و سامان تھے
ہم بھی کسی وقت میں انسان تھے

دولت مدارِ رونقِ باغِ جہان ہے
زر ہو۔ بلا سے رنگ نہ ہو گل میں بو نہ ہو

وگرنہ دین داری بس حقیقت اس کی اتنی ہے
کہ ہم جیسے گنہ گاروں کا ہے پردا ڈھکا باقی

اشعار مذکورۂ بالا میں بعض لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ طامات و دعوے - جوش و ولولے - باسر و سامان - رونقِ باغِ جہان - دین داری - کی جگہ طامات دعوی - جوش و ولولہ ہونا چاہیئے - اور باسر و سامان رونقِ باغِ جہان اور دین داری میں اظہار نون ناجائز ہے -

لیکن راقم کے نزدیک اردو زبان میں فارسی کے ایسے قواعد جاری کرنا جن کی وجہ سے زبان میں تنگی پیدا ہو بالکل بے جا ہے - یہ عجیب بات ہے کہ نثر کو اِن قیود سے پاک دیکھا جاتا ہے - مثلاً معترض کے نزدیک " اصول و آئین منضبط تھے " " اجتماع النقیضین ہو گیا " " حضرات سامعین سُنئے " کے نونوں کا اظہار نہیں ہونا چاہیئے کیوں کہ فارسی ترکیب میں اظہار نون جائز نہیں - لیکن معترض اگر ان فقروں کو اُردو میں استعمال کرے گا تو بغیر اظہار نون کے چارہ نہ ہوگا اور اگر ضد کے مارے اظہار نون نہیں کرے گا تو لوگ اُس پر ہنسیں گے - اسی طرح اگر " وہ سبزہ و لالے پر نسیم سحری ناچ رہی تھی " " وہ تشبیہ و استعارے سے کلام میں وسعت اور زور پیدا ہو جاتا ہے " وغیرہ وغیرہ میں ایک اہل زبان سے کبھی لالہ اور استعارہ نہیں نکل سکتا - وہ جب بولے گا تو اِس موقع پر لالے اور استعارے ہی بولے گا - خواہ اُس کا بولنا فارسی ترکیب سے غلط ہو - مگر اُردو کا فصیح لہجہ تو یہی ہے - اگر نظم میں کہیں ایسی ترکیبیں آ جاتی ہیں تو لوگ ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں - ہمارے نزدیک تو یہ دونوں ترکیبیں درست ہیں ! بعض مواقع پر اظہار نون بُرا معلوم ہوتا ہے اور بعض جگہ بغیر اعلانِ نون - بولنے میں فصاحت و روانی نہیں رہتی - پس جہاں جیسا موقع ہو وہاں ویسا ہی بولنا چاہیئے -

مندرجۂ ذیل اشعار پر جو اعتراض ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ان میں بعض متروک الاستعمال الفاظ باندھ دیئے گئے ہیں - مثلاً

دیا اُس کے ہاں بھی کوئی کونسل ہے
تم اُس کونسل کے آراکین و ممبر

گاتے تھے چند لڑکے نظمِ نذیر احمد
اِن ہاس یا الٰہی ارگن ہیں یا گلے ہیں

دکھاتا ہے قدرت کے اپنے نمونے
مگر بھید پایا نہ اُس کا کسو نے

مسلمان کہتے ہیں ہانکے پکارے
کہ تعلیم کے نام جلتے انگارے

مندرجۂ بالا اشعار میں اگرچہ دیا - اِن ہاس - کسو - انگارے بلا تشدید بالکل متروک الاستعمال الفاظ ہیں - جو بول

میں تو فی الواقع اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ مگر مولانا کی زبان سے سننے کی حالت میں خدا معلوم کیوں اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ شاید یہ جناب موصوف کے پڑھنے کا اثر ہوگا کہ ایسے الفاظ اُن کی زبان سے اَور بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

پُرانی اُردو میں بہت ایسے الفاظ اور ترکیبیں ہیں جو اب متروک ہیں۔ مثلاً جاتی کی جگہ جاتیاں اور اُٹھتی کی جگہ اُٹھتیاں وغیرہ وغیرہ بولتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہی کہ داغ مرحوم حیدر آباد میں ایک مرتبہ کسی قصور پر اپنی چھوکریوں پر خفا ہونے لگے اُس غصے کے عالم میں ایک فقرہ اُن کی زبان سے یہ بھی نکلا تھا کہ "حرام زادیاں دن بھر مفت کی روٹیاں ٹھونستیاں رہتیاں ہیں اور کام کاج کے لیئے جگہ سے ہلتیاں نہیں ہیں" یہ ظاہر ہی کہ اہل زبان ایسے الفاظ کو متروک کر چکے ہیں۔ اور اب کانوں کو اچھے بھی نہیں معلوم ہوتے۔ مگر جس وقت داغ کے لب و لہجے میں یہ فقرہ میرے خیال میں آتا ہی تو جتنا مزہ اُن کی زبان سے سُن کر آیا تھا اُتنا ہی اچھا اس وقت معلوم ہوتا ہی۔

یہ سب کچھ تو ہوا مگر جب شاعری کے متعلق مولانا کی رائے کو ہم غور سے پڑھتے ہیں تو ہمارا دل چاہتا ہی کہ اپنے اعتراض واپس لے لیں۔ اور ایک حرف بھی مونہ سے نہ نکالیں۔ مگر چوں کہ یہ اصول سوانح نگاری کے خلاف تھا اس لیئے صرف خانہ پُری کی گئی ہی۔ ورنہ ہمارا تو یہ خیال ہی کہ ع نہ بر حرفِ او جائے انگشت کس۔

خطابات

گورنمنٹ ہند نے اپنے اصولِ سلطنت میں ایک امر یہ بھی ملحوظ خاطر رکھا ہی کہ جب کوئی شخص ملک اور قوم کے لیئے کوئی دیرپا فائدہ رساں کام کرتا ہی یا اپنے ملک اور وطن کی بہبودی میں سرگرم ہو کر فائدہ پونہچاتا ہی یا علوم کی روشنی پھیلاتا ہی یا اَور کوئی جواں مردی اور دلیری کا کام کرتا ہی تو وہ خطابات و خلعت سے سرفراز کیا جاتا ہی۔ لیکن تجربے سے یہ بات بھی ثابت ہوئی ہی کہ بعض لوگ صرف نام و نمود کی خاطر زرِ کثیر خرچ کر کے بلا استحقاق خطابات حاصل کرتے ہیں۔ ایسے خطاب یافتہ ہندوستان میں بہت ہوں گے۔ لیکن مولانا نذیر احمد صاحب کو جتنے بھی خطابات ملے ہیں وہ سب کے سب بلا خواہش اور باستحقاق ملے ہیں۔ نہ اُن خطابوں کے حاصل کرنے کے لیئے اُنھوں نے کبھی حکام کی خوشامدیں کیں نہ ڈالیاں پیش کیں۔ نہ پہاڑوں پر دوڑ دوڑ کر گئے اور نہ کبھی ایک پیسہ خرچ کیا خدا نے اُن کے دل و دماغ کو علم و فضل کی روشنی سے ایسا منور کیا ہی کہ گھر بیٹھے وہ ملک اور قوم کی بہبودی میں مستغرق رہتے ہیں۔ اور اُن کے انوار کی شعاعیں ہندوستان کے چاروں کھونٹ میں پھیل کر روشنی پونہچاتی رہتی ہیں۔ اور لوگ اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

شمس العلماء سب سے پہلے جناب ممدوح کو گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ رجون ۱۸۹۷ء مطابق ۱۸ر محرم ۱۳۱۵ھ روز سہ شنبہ کو شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا تھا۔ جس وقت شمس العلماء کا خطاب و خلعت کپتان ڈیوس صاحب ڈپٹی کمشنر دہلی کے ہاتھ سے ملا تو مولانا نے اُس جلسے میں یہ اشعار پڑھے تھے۔

کیوں کر کہیں کِس سے کہیں ہم کون ہیں کیا ہیں
اِک ذرہ ہیں اور نام کے شمس العلماء ہیں

انسان کو کہتے ہیں کہ بندۂ احساں	یعنی کہ ہم آوازۂ گنبد کی صدا ہیں
گر شاہ کرے لطف و عنایت تو رعایا	تسلیم و اطاعت میں غلاموں سے سوا ہیں
خود تم کو نہیں مال و زر و سیم کی پروا	اور ہم بھی ادھر مفلس بے برگ و نوا ہیں
لیکن دل و جاں رکھتے ہیں اور دونوں کے دونوں	سچ مانو قربان ہیں اور تم پر سے فدا ہیں
کیا ہو سکے احسان گورنمنٹ کا بدلا	بس جہد مقل یہ ہی کہ مصروف دعا ہیں
جس عہد میں ہم امن سے بیٹھے ہیں الٰہی	قائم رہے جس وقت تلک ارض و سما ہیں
ڈیوس کو خدا لاٹ کرے سب کہو آمین	اس کشتی طوفاں زدہ کے ناؤ خدا ہیں

ایل ایل ڈی

۲ر اپریل ۱۹۰۲ء کو ایل ایل ڈی کی سند عطا ہوئی - ۱۱ر اپریل ۱۹۰۲ء کو ایڈنبرا یونی ورسٹی میں باقاعدہ طور پر عطائے ڈگری کی تقریب منعقد ہوئی - مولانا نے سر ولیم میور سابق لفٹنٹ گورنر کو قرآن مجید کا ترجمہ بھیجا تھا - غالباً ترجمۂ قرآن مجید نے سر ولیم میور سے اس ڈگری کی سفارش کی ہوگی -

ڈی - او - ایل

۲۸ر دسمبر ۱۹۱۰ء کو پنجاب اوبزرور میں اس ڈگری کے متعلق ایک نوٹ چھپا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پینتیسویں کانووکیشن پنجاب یونی ورسٹی کا اجلاس بروز جمعہ ہوا - چینسلر (لفٹنٹ گورنر پنجاب) صاحب صدر نشین جلسہ تھے - اس جلسے میں بہت سی ڈگریاں تقسیم ہوئی تھیں من جملہ اُن کے شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کو ڈی - او - ایل کی ڈگری دی گئی - ڈگری دیتے ہوئے جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے ارشاد فرمایا -

"بتعمیل ریزولیشن سینٹ جو ابھی پڑھا گیا ہے اور نیز اُن اختیارات کی رو سے جو بحیثیت چینسلر یونی ورسٹی مجھے حاصل ہیں میں مولوی حافظ نذیر احمد خاں - شمس العلماء - ایل ایل ڈی کو ڈگری آف اورینٹل لرننگ میں شامل کرتا ہوں - اور جس کے لیے میں حکم دیتا ہوں کہ یہ سند صاحب موصوف کو دی جائے - اور میں صاحب موصوف کو مجاز کرتا ہوں کہ اس ڈگری کے متعلق جو لباس مقرر ہے اُس کو زیب تن کریں - ہز آنر نے یہ بھی ارشاد کیا کہ میرے لیے یہ وقت خاص امتنان کا ہے کہ میں ایسے موقع پر بہ حیثیت ایک چینسلر کے صدر نشین ہوں - جب کہ یونی ورسٹی کی تاریخ میں ایک تھوڑا سا جدید طرز عمل اختیار کیا گیا ہے یعنی یہ کہ ڈاکٹر آف اورینٹل لرننگ کی اعزازی ڈگری ایک ایسے شخص کو دی گئی ہے جو نہ یونی ورسٹی کا ممبر ہے نہ وہ اس یونی ورسٹی کا کوئی بڑا عہدہ دار ہے - بایں ہمہ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ کانووکیشن اس امر پر بالکل متفق ہوگی کہ اس سے بہتر اور کوئی انتخاب اس معزز ڈگری کے عطا کرنے کا مولوی صاحب موصوف کے سوا نہیں ہو سکتا تھا - مجھے کامل یقین ہے کہ زبان اُردو کی ترقی میں مولوی صاحب موصوف کے سوا کسی اور شخص نے اتنی کوشش کی ہو - ان کی تصانیف کا حال آپ سب لوگوں کو معلوم ہے اور مجھے یقین ہے کہ بالائی حصۂ ہند میں عام طور پر یہ خیال ہے کہ وہ بہترین کتابیں ہیں جو زبان اُردو میں لکھی گئی ہیں - مجھے بہت مسرت ہے کہ یہ عزت ایسے وقت دی جا رہی ہے جب کہ میں چینسلر ہوں - اگر مجھے افسوس ہے تو صرف اس امر کا ہے کہ مولوی صاحب موصوف بہ نفس نفیس ڈپلوما لینے کے لیے خود تشریف نہ لا سکے -

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ضمیمہ بعد الوفات

ہم نے ضمیمۂ ماقبل کو اس فقرے سے شروع کیا تھا" کہ کہنے کو کہہ دیجئے کہ حیاۃ النذیر کا یہ آخری ضمیمہ ہی خدا صاحبِ سوانح کی حیات میں برکت دے ان شاء اللہ حیاۃ النذیر کے ضمیموں کی زنجیر میں ہر سال ایک نہ ایک کڑی کا اضافہ ہوتا رہے گا" مگر ہم کو کیا کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ حیاۃ النذیر کے ضمیموں کی زنجیر میں صرف ایک وفات کی آخری کڑی اور باقی ہی۔

جس وقت مولانا کی بیماری کی حالت ہم نے اخباروں میں پڑھی تو ہمارا دل اُسی وقت کھٹکا تھا اور خیال گزرا تھا کہ اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند کے آثار ہیں۔ خدا رحم فرمائے۔ یہ موذی فالج مولانا کو ہرگز جاں بر نہ ہونے دے گا۔ ایک مرتبہ خود مولانا نے بھی اپنی موت کی نسبت یہ پیشین گوئی کی تھی کہ نذیر احمد اگر مرے گا تو فالج سے مرے گا۔ آخر وہی ہوا یعنی ۲۷ اپریل ۱۹۱۲ء کی شب کو بارہ بجے مولانا استنجا کرنے کے لیئے اُٹھے تو یکایک فالج نے آدبوچا۔ فالج نے گرتے گرتے مرحوم کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں بالکل بے کار کردیا اور وہ زمین پر گر پڑے خدمت گار کو آواز دی۔ دو آوازیں تو ذرا بلند تھیں مگر تیسری آواز بالکل ڈوبی ہوئی کنوئیں کی سی آواز تھی۔ غرض یہ آواز سُن کر چاروں طرف سے اعزہ اقربا جو اس وقت وہاں موجود تھے پریشان ہو کر جمع ہو گئے۔ مرحوم کو زمین سے اُٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ زبان اُسی وقت موٹی پڑ گئی تھی۔ بولنے میں مرحوم کو جو ایذا ہوتی ہوگی اُس کا اندازہ مرحوم ہی کو ہوا ہوگا۔ مگر بعض اعزہ مرحوم سے زیادہ پریشان نظر آتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کچھ وصیت فرمائیں مگر افسوس زبان نے یاری نہ دی صبح ہوتے ہی علاج شروع ہو گیا۔ یونانی اور ڈاکٹری دونوں قسم کا علاج ہوا مگر موت کی دوا کسی کے پاس نہ تھی۔ بالآخر جمعے کے دن رات کو آٹھ بجے کے قریب مرحوم نے انتقال کیا۔ اُسی رات کو غسل میت اور کفن وغیرہ سے لوگ فارغ ہو گئے۔ مگر کنبے قبیلے کے بزرگوں نے کہا کہ میاں بشیر ابھی حیدرآباد سے نہیں آئے ہیں۔ اُن کو تار دیا گیا ہی آتے ہی ہوں گے۔ اُن کے آنے کے بعد دفنانا چاہیئے۔ جب صبح تک بھی وہ نہیں آئے تو لوگوں کی رائے ہوئی کہ اب میت کے دفنانے میں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ چناں چہ ہفتے کے روز صبح سے لوگ جوق جوق جمع ہونے شروع ہو گئے۔ دس بجے کے بعد نئے بانس کے محلّے میں سے ہو کر حضرت خواجہ باقی باللہ میں جنازہ پہونچایا گیا۔ اور ایک درخت کے سایے میں رکھ کر مولوی عبد السلام صاحب نبیرۂ شمس العلما مولوی سید نذیر حسین صاحب مرحوم نے نماز جنازہ پڑھائی اور گورستانِ خواجہ باقی باللہ میں اُس آفتابِ علم وفضل کو سپردِ خاک کر کے لوگوں نے دعائے مغفرۃ کی۔ اور بصد اندوہ وحرمان اپنے اپنے گھر واپس گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ثم انا للہ

وانا الیہ راجعون ثم انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کی وفات کی خبر تمام انگریزی اور اردو اخباروں میں گشت کر گئی۔ ایڈیٹروں نے بڑے بڑے ماتمی لیڈنگ لکھے۔ نامہ نگاروں نے تعزیتی مضمون بھیجے۔ ہندوستان کے اکثر شہروں میں ماتمی جلسے ہوئے تعزیتی رزولیوشن پاس کرکے اُن کے سارے خاندان اور مخصوص میاں بشیر کے ساتھ ہمدردی کی گئی۔ انگریزی حکام کے سوا ہندوستان کے ہر صوبے سے میاں بشیر کے نام تعزیۃ اور ہمدردی کے خطوط اور تاروں کا ایک سلسلہ بندھ گیا اور ابھی تک کوئی دن ایسا خالی نہیں جاتا جو ہمدردی کے خطوط نہ آتے ہوں۔

اِس بات پر تمام ملک کے اخبار اور تعزیتی جلسے متفق ہیں اور بجا متفق ہیں کہ مولانا کی وفات اُن کے خاندان کے لیئے اگر ایک مصیبت ہی تو تمام مسلمانوں کے لیئے ایک غیر معمولی اور ناقابلِ تلافی مصیبت ہی۔ کیوں کہ ایسے جامع کمالات کا دنیا سے اُٹھ جانا اگرچہ اُس زمانے میں بھی مسلمانوں کے لیئے ایک حادثۂ عظیم ہوتا جب کہ اربابِ فضل و کمال کی کثرت تھی۔ مگر ایسے زمانۂ قحط الرجال میں جب کہ چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا نظر آتا ہی ایک حادثۂ اعظم الاعظم ہی مگر ہم تو یہی کہیں گے کہ ؎

ہرگز نمیرد آن کہ دلش زندہ شد بعلم　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

بے شک اُن کی روح اعلیٰ علیین میں پہونچ گئی بے شک اُن کا جسد فنا ہو گیا۔ بے شک عناصر اربع جو مرحوم کو ایک صورت و شکل میں قائم کیئے ہوئے تھے ٹوٹ ٹوٹ کر منتشر ہو گئے۔ بے شک مرحوم کی آنکھیں بند ہو گئیں بے شک اُن کے ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑا۔ بے شک اُن کی زبان بند ہو گئی۔ بے شک نہ اب وہ ایک حرف بول سکتے ہیں نہ ایک حرف لکھ سکتے ہیں۔ مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے علم و فضل کا چشمۂ شیریں چھوڑ گئے ہیں جو ہمیشہ قوم اور ملک کی تشنگی کو بجھاتا رہے گا۔ اور لوگ اُس سے سیراب ہوتے رہیں گے۔ اِس لحاظ سے اگر ہم مرحوم کو ایک حد تک غیر فانی کہیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

راقم کی آخری چند ملاقاتیں گزشتہ دہلی دربار کے زمانے میں ہوئی تھیں۔ انھیں ملاقاتوں میں ایک دفعہ مرحوم کے پاس ایک صاحب تشریف لائے۔ میں اُن کا نام نہیں جانتا۔ مگر باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دہلی یا نواحِ دہلی کے کوئی غیر معروف حکیم صاحب ہیں۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے وہ مرحوم کو علاج معالجے کی لاگ پر لگانا چاہتے تھے۔ بات بات میں وہ یہی کہتے تھے کہ میرے پاس آپ کے امراض کے لیئے ایسے ایسے نسخے ہیں کہ حاذق الملک اور شفاء الملک کو اُن کی ہوا تک نہیں لگی۔ مولانا مرحوم اس کے جواب میں یہ ارشاد فرماتے کہ حکیم صاحب کیسی بیماری اور کیسی دوا۔ مجھے تو آپ کوئی ایسا نسخہ مرحمت کیجئے کہ احتضار یعنی جاں کنی کے وقت میری روح آسانی سے پرواز کر جائے۔ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے جان نکل جائے۔ میری بیماری سے میرے عزیزوں کو تکلیف نہ ہو۔ یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگے اور اُسی درد آمیز آواز میں ایک جوش کی حالت میں پڑھنے لگے۔

یا رسول الالٰہ خذ بیدی　　ما لعجزی سواک مستندی

یا من اشکلت مصیبۃ و احاطت بہ خطیئتہ

بار باران اشعار کو پڑھتے جاتے تھے اور آنکھوں سے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔ اور کہتے جاتے تھے کہ اگرچہ اعمال پر نظر کرتے ہوئے اس کی امید نہیں مگر خدا کی رحمت پر نظر کرتے ہوئے کیا بعید ہے کہ وہ مجھ پر رحم فرمائے اس کے بعد مندرجۂ ذیل اشعار پڑھے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ | گر کافر و رند و مے پرستی باز آ
این درگہ ما درگہِ نومیدی نیست | صد بار اگر توبہ شکستی باز آ
الٰہی بحقِ بنی فاطمہ | کہ بر قولِ ایماں کنم خاتمہ
اگر دعوتم رد کنی ور قبول | من و دستِ و امانِ آلِ رسول

بہر حال اب رونے پیٹنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا۔ ہم کو رضینا برضاء اللہ رہنا چاہیئے۔ اگر ہم مرحوم و مغفور کے حق میں کچھ کر سکتے ہیں تو صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ خدا کی درگاہ میں نہایت عجز و انکساری کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر یہ دعا مانگیں۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ واغسلہ بالماء والثلج والبرد ونقہ من الخطایا کما نقیت الثوب الابیض من الدنس وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ و زوجا خیرا من زوجہ وادخلہ الجنۃ واعذہ من عذاب القبر ومن عذاب النار یعنی الٰہی اُس کے گناہ بخش دے اور اُس پر رحمۃ کر اور اُسے نجات دے اور اُس کی خطا معاف فرما اور اُس کا ٹھکانا عمدہ بنا اور اس کی قبر کشادہ کر اور اس کو پانی اور برف اور اولے سے پاک صاف کر دے جیسا کہ تو کپڑے کو میل کچیل سے صاف کر دیتا ہے۔ اور اُس کو دنیا کے گھر سے بہتر گھر اور اہل سے بہتر اہل اور دنیا کی بی بی سے اچھی بی بی بدل دے اور اُسے بہشت میں لے جا داخل کر اور عذابِ قبر اور عذابِ دوزخ سے بچا لے۔ آمین۔

ضمیمۂ آخر

نوشتۂ خاکسار بشیر الدین احمد خلف جناب مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم و مغفور

حیات النذیر | یہ کتاب مولوی سید افتخار عالم صاحب مارہروی نے کئی برس ہوئے کہ لکھنی شروع کی تھی جب مجھے خبر لگی تو میں خود مارہرہ گیا اور چند دن وہاں رہ کر بہت کچھ مواد سید صاحب کو دیا۔ کتاب کئی برس پیشتر مکمل ہو گئی تھی اور اگر اہتمام کیا جاتا تو مرحوم کی زندگی میں نکل کر شائع ہو کر اب تک پرانی بھی ہو جاتی مگر کل امر مرہون باوقاتہا مشیتِ الٰہی یوں تھی کہ مولوی نذیر احمد صاحب کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد نکلے سو وہ ہو کر رہا مصنف صاحب کی عدم توجہی مطبع والوں کی ڈھیل دونوں باتیں مل ملا کر کتاب کھٹائی میں پڑ گئی +

یہ کتاب تو قریب قریب مکمل کے والدِ مرحوم کی زندگی ہی میں چھپ چکی تھی۔ ہاتھی نکل گیا تھا مگر دُم اٹک رہی تھی۔ دیباچہ۔ خاتمہ۔ فہرستِ مضامین باقی رہ گئے تھے۔ پھر مصنف صاحب نے تصاویر ڈیڈیکیشن یوگو ضمیمہ جات اور اسی طرح مصنف صاحب اب تک برابر کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے رہے میری دلی خواہش اور خیال یہ تھا کہ مرحوم کی وفات سے تین مہینے کے اندر کتاب پبلک کے سامنے پیش کر دی جائے گی لیکن کچھ ایسے جھمیلے پڑ گئے کہ اب تک کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اس میں جس کسی کا بھی قصور ہو مگر یہ تاخیر ضرور حدِ الزام تک پہنچتی ہے اور میں اس کہنے پر مجبور ہوں کہ اگر میرا تقاضا اور میری لگاتار کوشش نہ ہوتی اور میں اپنی ذات سے سیکڑوں روپیہ اس میں نہ لگاتا تو کبھی ممکن نہ تھا کہ یہ کتاب اب بھی نکلتی +

مرض الموت | والدِ مرحوم کے قویٰ بہت اچھے تھے وہ کھانے پہننے میں از حد احتیاط کرتے تھے مشی بھی روز کرتے تھے غسل بھی روز کیا کرتے تھے۔ غرض اپنی عمر کے اعتبار سے ہر طرح اچھے تھے سب سے پہلے اُن کو ہاضمے کی شکایت ہوئی۔ نہ بھوک لگتی تھی نہ غذا برابر ہضم ہوتی تھی نشست و برخاست میں تکلف ہونے لگا۔ باہر آنے جانے میں دوسرے کی مدد کا سہارا ڈھونڈنے لگے۔ دانت سب گر گئے تھے پان برسوں ہوئے کہ چھوڑ دیا تھا ہاں حقہ آخر دم تک جاری تھا۔ اب غذا گھٹتے گھٹتے برائے نام رہ گئی تھی۔ باہر آنا جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ دن بھر پلنگ پر پڑے رہتے تھے ضعفِ بصارت بھی ہو گیا تھا آدمی کو اچھی طرح پہچانتے نہ تھے ثقلِ سماعت بھی تھا جس دن سے بصارت میں کمی ہوئی تب سے اُن کی حالت روز بروز ردی ہوتی گئی۔ کیونکہ بڑا مشغلہ اُن کا پڑھنا لکھنا تھا۔ رعشے کے سبب سے خود تو بہت کم لکھتے تھے ہاں بول کر لکھواتے تھے البتہ پڑھنا برابر جاری تھا سو آنکھوں کا جواب دینا کیا تھا گویا زندگی نے خیر باد کہی۔ پڑھنا ہی اُن کی زندگی کا سہارا تھا جب وہ ہی نہ رہا تو اب کون سا مشغلہ باقی رہا۔

دن بھر بے کار پڑے پڑے گھبراتے تھے ہمیشہ موت کی تمنّا ظاہر کیا کرتے تھے کہ اب میرے زندہ رہنے کی کیا ضرورت ہی واللہ اعلم اس میں خداوند تعالےٰ کی کیا مصلحت ہی دُکھ بیماری میں مطلق علاج نہ کرتے تھے۔ ہم لوگ جب مصر ہوتے تو کہتے۔ بٹیا! ۔ تم کیا دوا دارو کرتے ہو یہ عمارت کہنہ ہو گئی ہی جا بجا سے گر گئی ہی بھلا کہیں ایسے پُرانے گھر آڑ و اڑ لگانے سے رُک سکتے ہیں ایک دن خود بخود بیٹھ جائے گی۔ ہر وقت چشم پُر آب رہتی تھی۔ موت کو بار بار یاد کرتے اور روتے تھے۔ زبان پر ہر لحہ کلام مجید کی آیات جاری تھیں۔ بعض وقت ہوش و حواس میں بھی فرق آجاتا تھا پہچنوانے سے بھی کسی کو نہیں پہچانتے تھے۔ پھر تھوڑی دیر میں سنبھل جاتے تھے اور اچھی خاصی طرح باتیں کرنے لگتے تھے۔ ۲ر جنوری سنہ ۱۹۱۲ء کو میں دہلی سے حیدر آباد روانہ ہوا جب تک کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مجھے گلے لگا کر بہت روئے ایسا روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ کہتے تھے کہ تم اب نہ جاؤ پنشن لے کر یہیں رہو کہ میرا آخری وقت ہی لیکن دنیا بہ امید قائم ہم پر غفلت کا پردہ پڑا ہوا تھا ہم یہی سمجھتے تھے کہ باپ ابھی بہت دنوں جئیں گے۔ ۲۹ر اپریل کو دس بجے دن کے حیدر آباد میں میرے پاس تار آیا کہ شب گزشتہ خفیف سا شکوہ فالج کا ہوا ہی لیکن کوئی خطرہ نہیں ہی۔ تار پڑھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے سمجھا کہ اس پیرانہ سالی میں فالج کا شکوہ بچنا محال ہی میں نے فوراً تار سے پوچھا کس جانب فالج ہوا ہی معلوم ہوا کہ داہنی جانب۔ خود ہمارے گھرانے میں میرے خالو اور ماموں دونوں فالج میں مبتلا ہیں اور سالہا سال سے زندہ ہیں ممکن تھا کہ یہ بھی جاں بر ہو جاتے۔ پھر تو دن میں کئی کئی تار آتے تھے آخر کار میں ۱ر مئی کو ۹ بجے شب کے دہلی روانہ ہوا ۳ر کو پانچ بجے شام کے منماڑ پونہچا پنجاب میل کے آنے میں چھ گھنٹے کا وقفہ تھا دل بے قرار تھا ارجنٹ تار دیا سرِ مغرب جواب ملا کہ حالت بہت خطرناک ہی میرا دل وہیں بیٹھ گیا اور میں سمجھا کہ کام تمام ہو گیا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ۳ر مئی یوم جمعہ کو پونے آٹھ بجے شب کے روح پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پنجاب میل بد قسمتی سے ۳ گھنٹہ لیٹ تھی میں ۴ر مئی کو دو بجے شب کے پونہچا اور اُسی دن دوپہر کو وہ درگاہِ حضرت خواجہ باقی باللہ میں سپردِ خاک ہو چکے تھے۔ افسوس صد افسوس کہ مجھ بدنصیب کو آخری دیدار بھی نصیب نہ ہوا۔ ۲۷ و ۲۸ اپریل کے شب درمیانی میں پچھلی رات کو رفع حاجت کو اُٹھے لیکن وہیں گر پڑے اُٹھ نہ سکے۔ خدا بخش ملازم کو آواز دی وہ کوٹھے پر گیا اُٹھایا اور پلنگ پر لٹا دیا۔ پہلے بھی کئی مرتبہ ایسا ہو چکا ہی کہ غسل خانے یا پاخانے میں بیٹھ کر اُٹھ نہ سکے یہی خیال اس وقت بھی ہوا فالج کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ صبح کو حسبِ معمول اُٹھے ناشتہ سامنے آیا پراٹھے کا نوالہ توڑنا چاہا تو توڑا نہ گیا کیوں کہ ہاتھ میں رعشہ پہلے ہی تھا۔ آدمی نے مُنہ میں بنا کر نوالہ دیا کھایا نہ گیا حلق میں پھنس گیا۔ ناشتہ چھوڑ دیا مگر بات چیت اچھی طرح کرتے رہے۔ زبان میں لغزش تھی زبان موٹی پڑ گئی تھی۔ میری بہن سُنتے ہی دوڑی گئیں یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئیں خود فرمایا کہ گھبرانے کی کیا بات ہی کیا صغریٰ! تم اب تک یہی دعا کیے جاتی ہو کہ باپ جیئے جائے۔ بیٹا! دنیا میں سدا کسی کے ماں باپ نہیں جیئے۔ دعا کرو کہ اللہ تعالےٰ جلد میری مشکل آسان کرے اور مجھے کسی کا محتاج کر کے نہ جلائے۔ علاج کے واسطے پوچھا کہ یونانی علاج ہو گا یا ڈاکٹری تو ہنس کر کہا کہ مردہ بدستِ زندہ حکیم شفاء الملک رضی الدین خاں صاحب کا علاج ہوا۔ پھر ڈاکٹری۔ لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ باتیں کرتے تھے مگر بہ تکلف۔ بات صاف سمجھ میں نہ آتی تھی۔ زبان کو یارائے گفتگو نہ تھا۔ اہنا ہاتھ اور داہنی ٹانگ مفلوج ہو گئی تھی یکم مئی کو زبان بند ہو گئی مطلق بات نہ کر سکتے تھے۔ زبان کی طرف اشارہ کرتے تھے اور کلّوں پر گھونسے مارتے تھے۔ اشاروں سے کچھ بات کرنی چاہتے تھے مگر سمجھ میں

نہ آتی تھی۔ ۲ مئی کو تنفس اس شدت کا شروع ہوا کہ گھر کے باہر آواز آتی تھی اور بیہوشی طاری تھی کہ اُسی حالت میں ۳ مئی کو پونے آٹھ بجے دہلی کا آفتاب علم غروب ہو گیا۔ رات کو ہی نہلا دُھلا دیا۔ دس بجے دن کے جنازہ روانہ ہوا۔ کسی کو خبر ہوئی کسی کو نہیں کچہری کا وقت تھا لوگ پونہچ نہ سکے بریں ہم ہزار آدمی کے قریب جنازے کے ساتھ تھے بعد دوپہر دفن ہوا۔

حالاتِ بعد الممات مرحوم کے مرنے کی خبر تمام ہندوستان میں بجلی کی طرح کوند گئی۔ عمر کے اعتبار سے وہ پچھے پان تھے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے لیکن مسلمانوں میں قحط الرجال ہی جو مرتا ہی اُس کا کوئی بدل نہیں صدہا تار ہزارہا خط آنے شروع ہو گئے۔ اُردو۔ انگریزی کوئی اخبار ایسا نہ تھا جس میں مرحوم کی وفات کا لیڈنگ آرٹکل نہ ہو+

(۱) عالیجناب سر لوئی ڈین صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر پنجاب

(۲) مسٹر مرٹیتھ صاحب بہادر کمشنر دہلی

(۳) میجر بیڈن صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر دہلی

(۴) ریوانڈ اینڈ روز پرنسپل سینٹ سٹیفنز کالج دہلی کے تعزیتی خطوط خاکسار کے نام آئے جن میں مرحوم کی وفات کو ایک قومی مصیبت تحریر فرمایا تھا اور بہت کچھ حوصلہ افزا کلمات تھے۔ اور قریب دو سو تاروں کے مختلف سوسائٹیوں انجمنوں اور احباب کے آئے جن کی فہرست درج کرنا باعثِ طوالت ہی+

رزولیوشن درباب وفات حسرت آیات فاضل اجل شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب متوفیٰ ۳ مئی ۱۲ء

ہم جملہ مدرسین وطلاب عربک سکول کو خبر وحشت اثر انتقال پُرملال جناب فاضل اجل کامل اکمل شمس العلماء مولوی حافظ ڈپٹی نذیر احمد صاحب سے سخت صدمہ پونہچا ہی واقعی ایسے قابل ولائق شخص کا مرنا جو قومی لیڈر ہو قوم کا مرنا ہی اس لیے عقلاً ہر انسان کا فرض ہی کہ ایسے وقت متاثر ہو۔ ہم مرحوم مبرور کے لیے دعا کرتے ہیں کہ خدا تعالےٰ اُنھیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کے ساتھ اس جانکاہ غم میں شریک وہمدرد ہیں نیز اُن کے لیئے درگاہِ ایزدی سے صبرِ جمیل کے داعی ہیں یا ہم اُس قومی الم کو محسوس کر کے اپنے مدرسہ کو اسوقت بند کرتے ہیں+

آپ کا نیازمند
محمد فضل الدین ہیڈ ماسٹر

عربک سکول دہلی کے جلسۂ غیر معمولی منعقدہ ۹ مئی ۱۲ء کی رُوداد

یہ جلسہ شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی (ایڈنبرا) ڈی او ایل (پنجاب) کی وفات حسرت آیات پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہی اور اُن کی قومی وعلمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کی رحلت کو قوم کے لیے بڑی مصیبت تصور کرتا ہی اور اُن کے پس ماندگان بالخصوص اُن کے فرزند ارجمند مولوی بشیر الدین احمد صاحب تعلقہ دار حیدر آباد دکن سے ہمدردی ظاہر کرتا ہی اور دعا کرتا ہی کہ خداوند تعالےٰ مولانا مرحوم کو غریقِ رحمت فرمائے اور اُن کے لائق صاحبزادے کو اپنے پدرِ بزرگوار کا سچا جانشین ثابت ہونے کی توفیق عطا فرمائے+

از دفتر ینگ محمڈنز ڈبیٹنگ سوسائٹی حیدر آباد دکن مورخہ ۶ مئی ۱۲ء

اراکین "ینگ محمڈنز سوسائٹی" نہایت افسوس کے ساتھ فخرِ قوم حامیِ اسلام شمس العلماء جناب مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ کے وفات حسرت آیات پر اظہارِ رنج و ملال کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خداوند تبارک و تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگاں کے ساتھ نہایت خلوص سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں +

از انجمنِ تادیب الاسلام گورداسپور مورخہ ۸ مئی ۱۲ء

جناب کے والد بزرگوار کی وفات حسرت آیات کا احوال پڑھ کر سخت افسوس ہوا۔ اس بزرگ قوم نے جو خدمات قوم کی کی ہیں ان سے کوئی شخص بھی جو اپنے جسم میں ایک منصف دل رکھتا ہے انکار نہیں کر سکتا۔ اس وقت ملک کے مسلمانوں کے سر سے ایک اعلیٰ چراغ گل ہو گیا چنانچہ اظہارِ افسوس کے لیئے انجمنِ تادیب الاسلام گورداسپور کا عام جلسہ بہ صدارت شیخ نبی بخش صاحب وکیل ہوا جس میں عام مسلمانانِ شہر رونق افروز تھے اس میں جو رزولیوشن پاس ہوئے اُن میں ایک یہ بھی تھا کہ جناب کی خدمت میں عرض کی جائے کہ صبر و استقلال سے کام لیویں۔ اس وفات سے نہ صرف آپ کو رنج پونہچا ہے بلکہ تمامی مسلمانان نالاں اور نوحہ کناں ہیں۔ اس کی کاپی اسلامی اخباروں میں بھیج دی گئی +

ترجمہ رزولیوشن جلسہ تعزیت منعقدہ ۶ مئی از جانب سینٹ سٹیفنز کالج دہلی

ایک جلسہ تمامی اسٹاف اور طلبار کا منعقد ہوا جس میں پروفیسر عبد الرحمٰن نے ایک رزولیوشن اظہارِ غم و الم و تعزیت کا پیش کیا اور صاحب موصوف نے حالاتِ زندگی ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد شمس العلماء۔ ایل ایل ڈی۔ ڈی او ال اور اُن کے کیرکٹر اور ہمارے کالج کے ساتھ جو اُن کے تعلقاتِ دوستانہ تھے اُن پر ایک مفصل تقریر کی۔ پروفیسر رگھو بر دیال نے رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے خاص کر ڈاکٹر مرحوم کی اُن کارروائیوں کا تذکرہ کیا جو سوشل رفارم اور قومی ترقی کی ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ پروفیسر مکرجی اور ایون حبیب (طالب العلم سکنڈ ئیر) نے بھی تقریریں کیں اور اس کے بعد قائم مقام پرنسپل نے جو صدر نشین تھے چند ریمارک کیئے۔ رزولیوشن میٹنگ میں پیش کیا گیا اور سب نے کھڑے ہو کر اُسے عالمِ سکوت اور خاموشی میں منظور کیا +

رزولیوشن جو شمس العلماء حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی۔ ڈی او ایل کی وفات حسرت آیات کے جلسۂ تعزیت میں بزمِ اُردو نے بہ تاریخ ۱۰ مئی پاس کیا

اوّل۔ انجمنِ بزمِ اُردو لاہور کا یہ جلسۂ عام شمس العلماء مولانا ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی۔ ڈی او ایل۔ کی وفات حسرت آیات پر دلی افسوس اور حسرت کا اظہار کرتا ہے اور بوجہ اُن بیش قیمت علمی اور ادبی خدمات کے جو ڈاکٹر صاحب مرحوم مدت العمر انجام دیتے رہے ہیں اُن کے انتقال کو ملک اور قوم کے لیئے صدمۂ عظیم تصور کرتا ہے +

دوم - کہ بزم اردو لاہور کی طرف سے اس صدمۂ روح فرسا میں مولانا مرحوم کے خلف اکبر مولوی بشیر الدین صاحب تعلقہ دار دکن اور دیگر متعلقین کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کیا جائے اور رزولیوشن اول کی نقل صاحب موصوف کے پاس اور ملک کے نامی اخباروں میں ارسال کی جائے +

رزولیوشن پاس کردۂ انجمن کشمیری مسلمانان لاہور

انجمن کشمیری مسلمانان لاہور نے نہایت رنج و اندوہ سے مولانا حافظ نذیر احمد صاحب شمس العلماء ایل ایل ڈی کے انتقال کی دردناک خبر کو سنا ہے - اور اس وفات کو ایک قومی صدمہ اور اس ماتم کو ایک قومی ماتم تصور کیا ہے اس لیے انجمن نے ۹ مئی کی منعقدہ مینجنگ کمیٹی میں جو ریزولیوشن اظہار افسوس کا پاس کیا ہے اُس کی نقل انجمن کی ہدایت کے مطابق آپ کی خدمت میں ارسال ہے - وہو ہذا

انجمن کشمیری مسلمانان لاہور شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی کی حسرت ناک وفات کو ایک قومی ماتم تصور کرتی اور اُن کی بے نظیر اسلامی خدمات کا اعتراف کرتی ہوئی دعا کرتی ہے - کہ اللہ تعالے مرحوم کو جنت الماویٰ میں جگہ عطا کرے اور آپ کو صبر جمیل کی توفیق بخشے +

رزولیوشن پاس کردۂ انجمن ہدایت الاسلام مالیگاؤں مورخہ ۱۸ مئی ۱۲ء

کمال رنج و قلق سے سنا گیا ہے کہ آنجناب کے پدر بزرگوار عالیجناب شمس العلماء مولانا مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل - ایل ڈی دہلوی نے - دنیائے فانی سے انتقال فرمایا ہے -

مدرسۂ انجمن ہدایت اسلام مالیگاؤں کی طرف سے آج کی مجلس تعزیت فاتحہ خوانی کے ساتھ افسوس ظاہر کرتی ہے اور دعا کرتی ہے کہ خداوند جلیل آنجناب کو اور کل متعلقین کو صبر جمیل اور ثواب جزیل عطا فرماوے اور مرحوم کو جوار رحمت و باغ جنت مرحمت کرے آمین ثم آمین +

آبزرور لاہور ۸ مئی ۱۲ء

اخباروں کے اقتباس | ۲۳ ماہ حال کی شب درمیانی میں شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد ایل ایل ڈی - ڈی او ایل کی وفات کی خبر جو دہلی میں واقع ہوئی ہم کمال افسوس سے درج کرتے ہیں - اس وفات سے ایک ایسا مشہور شخص صفحۂ دنیا سے گزر جاتا ہے جس کی علمی قابلیتوں پر ایک تفوّق تھا تو صرف اُن ہی کی فصیح البیانی کو اور جن کی تصانیف زبان اردو کے لیے ایک بیش قیمت قومی متروکہ ہے جب سرسید مرحوم نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا بگل پھونکا تو اُن کو حافظ نذیر احمد کے جیسا قابل نائب ملا جنھوں نے جی توڑ کر کوشش کی کہ جس تحریک کے بانی سرسید تھے وہ مقبول عام ہو - اپنے پیش رَو کے نقش قدم پر چل کر مرحوم نے اپنی قوم کی معرکۃ الآرا خدمات کی ہیں - وہ نثر اُردو میں ایک نئے طرز کے موجد تھے جس کی دل آویزی اور سادگی اوروں پر اثر ڈالنے والے طرز کی نقل کرنا اُن کے ہم عصر کے لیے کوئی آسان کام نہ تھا - مرحوم کچھ عرصے سے گوشہ نشین ہو گئے تھے لیکن اُن کی موت

کا ماتم ہر جگہ ہوگا جہاں کہیں کہ اردو نثر پڑھی اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے اور ان کے کلام کے شیدائیوں میں اُن کی وفات کا سخت رنج و الم ہوگا۔ مرحوم کی عمر ۸۰ سال کی تھی +

کامریڈ کلکتہ مطبوعہ ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد ایل ایل ڈی کے اُٹھ جانے سے اردو لٹریچر کا ایک ایسا رکنِ رکین گزر جاتا ہے جنھوں نے اپنی بڑی دانشمندانہ جانفشانیوں سے پُرانے اور نئے سلسلۂ اسباب میں ایک رشتۂ تعلق پیدا کر دیا تھا۔ پیدا اور پرورش پائی ایسی سوسائٹی میں جن کے توقّعات اور خدشات عقلی اور اخلاقی معیار سب کے سب لامحالہ پُرانے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ بڑے ہوئے تو اپنے سامنے ہی اس پولیٹیکل طاقت کے آخری زوال کو بھی دیکھا اور دنیا نے جو لٹریچر۔ بالکلس خیالات اور تمدنی حالات میں دفعۃً پلٹی کھائی اُس کو بھی دیکھا ان دو متضاد حالتوں کی ٹکّر سے بہت سے انقلابات واقع ہوتے ہیں۔ جو لوگ اسی لیل و نہار میں پیدا ہوئے ہوں اُن کے طرزِ ماندو بود اور عقل پر بڑا زور پڑتا ہے اور ایک بہت سخت امتحان میں پھنس جاتے ہیں جو کمزور ہوتے ہیں وہ ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں اور اُن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا لیکن جو لوگ اچھے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں اور جن کی قوائے عقلی وسیع اور جو راسخ الاعتقاد ہوتے ہیں وہ فوراً زمانے کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور طوفان خیز تلاطم کا خوب مقابلہ کرتے ہیں۔ دہلی جس میں پُرانی طرزِ زندگی نے نشو و نما پایا تھا وہی اُس کے خاتمے کی جگہ بھی تھی یعنی ابتدا انتہا دونوں وہیں ہوئیں اور دلّی والوں نے اِسے خوب نبھایا۔ سرسید کا قومی پیغام سات کروڑ مسلمانوں کے لیئے ایک امید افزا پیغام تھا جن لوگوں نے سرسید کے پیغام کو دور و نزدیک پھیلایا بڑے لوگ اور امیروں غریبوں اور کم مقدرتوں کے کانوں تک اُس صدا کو پہنچایا اُن میں نذیر احمد ہی سب کے آگے تھے۔ قدرت نے اُن کو عجیب غیر معمولی دل و دماغ دیا تھا۔ اُن کا تبحرِ علمی۔ ظرافت۔ وسیع قوت زباں دانی۔ سُلجھے ہوئے خیالات اور طرزِ ادا جس طرح مشہور تھے۔ اُسی طرح اُن کا طرزِ بیان جس میں وہ مضامین ڈھالتے تھے وہ بھی مشہور تھا اور زبان پر جو قدرتِ کاملہ اُن کو حاصل تھی اُسی کی بدولت وہ ہمیشہ عام مجالس میں سرِ ہر آوردہ رہتے تھے۔ جب کبھی اُن کو غصّہ آجاتا تھا تو پھر لتاڑ کی کچھ کمی نہ تھی اور مخالفین کو اُن کے مذاق اور طنز اور چُبھتے ہوئے فقروں کا ڈر ہی لگا رہتا تھا۔ ڈاکٹر نذیر احمد طرزِ جدید کے صرف واعظ اور لکچرار ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک بڑے پائے کے شاعر بھی تھے لیکن اِن سب سے بڑھ کر وہ ایک بڑے پائے کے مصنّف تھے جن کی تصانیف آج اردو کی مستند کتابیں مانی جاتی ہیں جتنے اُردو خواں ہیں اُنھوں نے ایک دفعہ نہیں بارہا توبۃ النصوح۔ بنات النعش۔ مرأۃ العروس۔ رویائے صادقہ وغیرہ کو پڑھا ہوگا اور جب پڑھا ہوگا تو پسندیدگی کے علاوہ اُن کو مسرت بھی ہوئی ہوگی۔ ان کتابوں نے زبانِ اُردو میں ایک نیا طرز اختیار کیا ہے اور ہر کتاب کا مضمون اور بندش ایک نیا مضمون بتلاتی ہے اور پُرانے خیالات سے نکال کر نئی امیدوں اور کوشش کے میدان میں لاتی ہے۔ یہ کتابیں اس زمانے کے ناول نہیں ہیں کیوں کہ اُن کا مقصود خود ظاہر ہے بلکہ ان کتابوں سے اردو فسانہ نگاری کی بُنیاد پڑی ہے جو طرز افسوس ہے کہ اب تک ایک جداگانہ فن میں داخل نہیں ہوا۔ ان کتابوں کی بدولت مصنف کو نہ صرف اُردو لٹریچر میں بلکہ ہندوستانی مستورات کے دلوں میں بھی ایک بلند پایہ مستقل جگہ ملی ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے گروہِ مسلماناں کے لیئے ایک بڑا بھاری کام کیا جو اُنھوں نے قرآن شریف کا بامحاورہ ترجمہ اُردو میں کر دیا۔ ترجمے ہیں کچھ نقص طرزِ بیان کا ہے بعض جگہ ترجمہ اصلی برتری کلام سے گرا ہوا ہے لیکن مجموعی طور پر یہ

بڑا ابکار آمد کام ہوا کہ کلامِ آلہی آسان زبان میں ہندوستانی مسلمانوں تک جو عربی نہیں جانتے تھے پونہچا دیا گیا - ڈاکٹر نذیر احمد علی گڈھہ کالج کے سب سے پُرانے ٹرسٹی تھے - محمدن ایجوکیشنل کانفرنس ابتدائی کامیابی اور تعلیم کے مفید ہونے کے لیئے اُن کی بہت زیر بارِ احسان ہی - پنجاب میں اُن کا نام بہت چمک گیا تھا اور اُن کا نام بطور تبرک کے لیا جاتا تھا - سر سید کے بہادر گروہ کے چند باقی ماندہ اشخاص میں وہ بھی ایک تھے جن کے کان میں سر سید کا منتر پڑا ہوا تھا اور جنھوں نے اپنی ساری زندگی اپنی قوم کی خدمت گزاری میں تمام کی - مرحوم زمانۂ سابق اور حال کے مابین ایک بہت ذی عقل واسطہ تھے - اُن کی زندگی ایک نمونہ تھی - دُنیا سے وہ ایسے وقت میں رخصت ہوئے کہ جس طرح وہ اعزازوں سے لدے ہوئے تھے اُسی طرح وہ عمر میں بھی بڑھے ہوئے تھے - اُن کا انتقال اُردو علمِ ادب اور ذی علم اشخاص کے لیئے ایک نقصانِ عظیم ہی بلکہ تمام مسلمانوں کے گروہ بلکہ درحقیقت تمام ملک کا ایک نقصانِ عظیم ہی - اُنھوں نے اپنی تمام عمر میدانِ جد وجہد میں صرف کی اور اپنی قابلیتوں کا پورا استعمال کیا گو اُنھوں نے خود کوئی نئی بات نہ نکالی ہو لیکن اُنھوں نے سر سید کے مرکوزات میں جان تو ضرور ڈال دی - ہم مرحوم کے خاندان کے ساتھ دلی تعزیت کرتے ہیں +

علالت کی خبر اخبار پیسہ ہفتہ وار مورخہ ۹ مئی سنہ ۱۹۱۲ء میں

ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب افسوس کے ساتھ دہلی سے معلوم ہوا ہی کہ مولانا مولوی ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب ایل - ایل ڈی شمس العلماء پر ایک ہفتے سے دائیں طرف فالج گرا ہی جس سے اُن کی زبان بند ہو گئی ہی حکیم شفاء الملک صاحب کا یونانی علاج اور تجربہ کار اشخاص کا ڈاکٹری علاج شروع ہی خداوند تعالےٰ افضل کرے +

مجوزہ اسلامی کالج دہلی شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی شدید خطرناک علالت نہ صرف اس وجہ سے ملک کے تعلیمی و لٹریری حلقوں میں رنج و تشویش کی نظر سے دیکھی جائے گی کہ مولانائے ممدوح نے ادب اُردو کی شاندار و لاثانی خدمت انجام دی ہی اور تعلیم کے ضروری مقصد کو آپ سے قیمتی مدد ملی ہی - بلکہ ایک خاص وجہ آپ کی ناسازیِ مزاج کو اس وقت جملہ ہمدردانِ قوم کے لیئے عموماً اور مسلمانانِ دہلی کے لیئے خصوصاً سخت رنج دہ و حسرت انگیز بنانے والی یہ ہی کہ اینگلو عربک ہائی سکول دہلی کو کالج کے سورجہ تک ترقی دینے کی جو تحریک سب سے پہلے پیسہ اخبار میں شروع ہوئی تھی - وہ اب بفضلِ خدا بحث کی منزل سے گزر کر عملی کوشش کے میدان میں آگئی ہی - اور وہاں کے معزز و باا‌ثر اصحاب مجوزہ اسلامیہ کالج کے قیام سے نئے دار السلطنت کا سر آغاز کرنا چاہتے ہیں جس میں ان کو کئی سمتوں سے امداد کے وعدے ملے ہیں اور سب سے زیادہ گراں قدر عطیّہ کی امید جناب مولانا حافظ نذیر احمد صاحب کی طرف سے بندھی ہی - جس کی تکمیل بظاہر مولانائے ممدوح کی صحت یابی پر منحصر ہو گی - لہٰذا جملہ ہمدردانِ قوم حامیانِ تعلیم کو بارگاہِ ایزدی میں دست بدعا ہونا چاہیئے کہ وہ مولانا نذیر احمد صاحب کو شفائے عاجل اور صحتِ کامل عطا کرے اور مجوزہ اسلامیہ کالج دہلی کو آپ کی فیاضی سے مستفید ہونے کا موقعہ ملے +

مرحوم کی نسبت اخبار پیسہ روزانہ کی رائے مطبوعہ ۸ مئی سنہ ۱۲ء

مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مغفور افسوس ہی کہ جناب شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل - ایل - ڈی

(ایڈنبرا) ڈی او ایل (پنجاب) نے چھپی روز نامہ مرضِ فالج میں مبتلا رہ کر ۳ مئی کی رات کو اپنے وطنِ مالوف دہلی میں انتقال فرمایا مولانائے مرحوم فارسی و عربی کے ایک جلیل القدر فاضل اور زبانِ اردو کے لاثانی و زبردست ادیب ہونے کے علاوہ زبان انگریزی میں بھی اچھی مہارت اور علوم قدیمہ و جدیدہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اور ابتدائے سن تمیز سے اپنا وقت ہمیشہ علوم و ابنائے جنس کی خدمت و اعانت میں صرف کرتے تھے۔ رسالہ انتخاب لاجواب نے ۲۵ جولائی ۱۹۰۶ء کے پرچے میں بہ سلسلۂ مشاہیر عہد آپ کے جو حالات شائع کیے تھے ان میں مندرج ہے۔ کہ مولانا نذیر احمد صاحب مغفور نے گو قدیم دار السلطنت دہلی میں ہوش سنبھالا اور سابق دہلی کالج میں اُس زمانے کے موافق اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائی۔ اور اب آپ کا جسم بھی وہیں پیوند خاک ہوا۔ لیکن آپ کا آبائی وطن ضلع بجنور ہے جہاں موضع رہڑ میں آپ کی ننھیال کے کچھ لوگ اس وقت تک موجود ہیں۔ مولانا کی ولادت کا زمانہ بظن غالب ستمبر ۱۸۳۱ء ہے اور آپ کا شجرۂ نسب یہ ہے مولوی نذیر احمد ابن مولوی سعادت علی ابن سید نجابت علی۔ ابن سید فیض اللہ ابن مفتی نصر اللہ ابن شیخ ابو الفضل ملقب بہ پیر فضل ابن شاہ حاتم ابن شاہ مبارک ابن شاہ ابو اسحٰق ابن شاہ عبد الغفور اعظم پوری۔ شاہ عبد الغفور کی نسبت شاہ عبد الحق صاحب نے تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ وہ شاہ عبد القدوس صاحب گنگوہی کے خلفاء میں سے ایک بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے اعظم پور ضلع بجنور ہی کا ایک موضع ہے۔ اور وہاں سے خاص بجنور کو آپ کے نقل مکان کرنے کی یہ وجہ ہوئی کہ قاضی عبد الغنی بجنوری نے اپنی اکلوتی بیٹی کی حضرت شاہ حاتم سے شادی کر دی تھی اور اپنے نواسے شیخ ابو الفضل کو اپنا جانشین بنا دیا تھا چونکہ شیخ ابو الفضل پیری مریدی کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ خود پیر فضل اور اُن کے بیٹے پیرزادے کہلائے۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے نانا قاضی غلام شاہ بڑے آسودہ حال اور خوش گزران تھے۔ اور مولوی سعادت علی کو موضع رہڑ میں خانہ داماد بنا کر رکھا تھا۔ قاضی غلام شاہ کے بعد جائداد کے اوپر خاندان میں نزاع ہو گیا۔ اور مولوی نذیر احمد صاحب کے والد کو پھر بجنور آنا پڑا۔ اگرچہ مولانائے مغفور کے ددھیال میں سلطنت دہلی کی طرف سے بڑی بڑی معافیاں تھیں۔ مگر وہ سب ۱۸۳۴ء کے آئین نہم کی رُو سے ضبط ہو گئیں۔ مولوی صاحب اپنے والد کے منجھلے بیٹے ہیں ابتدائی تعلیم عربی فارسی کی اپنے والد ہی سے جو اوسط درجے کی استعداد رکھتے تھے حاصل کی۔ اس کے بعد مولوی نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر بجنور جنھیں مولوی صاحب کے خاندان سے خاص اُلفت تھی مولوی صاحب کو تعلیم دینے لگے۔ مولوی نصر اللہ کے بجنور سے مظفر نگر تبدیل ہونے پر بھی وہ ان ہی کے ساتھ رہے مگر ابھی تعلیم پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ان کے والد نے انھیں دہلی بلا لیا۔ یہاں جن مولوی صاحب کے درس میں یہ شامل ہوئے وہ انھیں زیادہ تر گھر کے کام کاج میں لگائے رکھتے تھے اور بہت مفلسی میں گزران کرتے تھے۔ اس لیے عمر کا اتنا حصہ مفت میں ضائع ہوا۔ اور مجبوراً دہلی کے اورنٹیل کالج میں داخل ہونا پڑا ان کو علوم ادبیہ سے خاص مناسبت تھی کالج میں انھیں وظیفہ بھی ملتا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد انھوں نے پڑھنے لکھنے کی طرف خاص طور پر توجہ کی تعلیم سے فارغ ہو کر سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے۔ اور سر رچرڈ ٹمپل نے گجرات (پنجاب) میں سلسلۂ تعلیم قائم کرنے کے لیے جن چھ لوگوں کو منتخب کیا تھا ان میں ایک مولانا نذیر احمد صاحب بھی تھے۔ یہاں سے ایک سو روپے کی تنخواہ پر آپ مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہو کر کانپور چلے گئے۔ پھر ۱۸۵۷ء کے زمانے میں آپ نے کچھ انگریزوں کو پناہ دی جس کے صلے میں آپ انعامات سے سرفراز کیے گئے۔ غدر کے بعد الہ آباد میں انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ اسی زمانے میں انگریزی کا شوق ہوا۔ اور ذاتی محنت سے خوب ترقی کی۔ اگرچہ اس وقت انگریزی کی استعداد بہت زیادہ نہ تھی۔ مگر چونکہ افسروں کو ان کی جانب حسن ظن تھا اس لیے تعزیرات ہند کے ترجمے میں انھیں بھی شریک

کردیا گیا- اور اُنھوں نے اس کام کو ایسی خوبی سے انجام دیا- کہ بطور انعام ایک قیمتی گھڑی حاصل کرنے کے علاوہ ڈپٹی کلکٹری کے لیے بھی نامزد ہو گئے- اول تحصیل دار ہوئے- اور اس زمانہ میں ضابطۂ فوجداری کا ترجمہ کرکے ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر پہونچ گئے- بورڈ آف ریونیو کے حکم سے قانونِ انکم ٹیکس اور قانونِ اسٹامپ کا بھی ترجمہ کیا- ملازمت ہی کے زمانے سے تصانیف کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا- اور اپنی اولاد کی تعلیم اُنھوں نے اپنی ہی تصانیف سے شروع کی متعدد کتابوں پر آپ کو گورنمنٹ سے بیش قرار انعامات ملے اور ملک میں ان کو ایسی مقبولیت و ہر دل عزیزی حاصل ہوئی جس کی مثال بہت ہی کم ملتی ہی- آپ کی تصنیف کردہ بڑی بڑی کتابوں کے نام یہ ہیں (۱) تعلیم امورِ خانہ داری- مراۃ العروس (۲) عورتوں کے لیے دلچسپ معلوماتِ عامّہ- بنات النعش (۳) خدا پرستی اور اصلاحِ خاندان- توبۃ النصوح (۴) منطق- مبادی الحکمت (۵) علم ہیئت- سمٰوات- یہ کتاب ابھی تک چھپی نہیں (۶) صرف عربی مایغنیک فی الصرف (۷) نصائح- چند پند- (۸) اخلاق منتخب الحکایات (۹) صرف فارسی صرفِ صغیر- (۱۰) قبائح کثرتِ ازدواج- محصنات (۱۱) قبائح وضعِ انگریزی ابن الوقت (۱۲) تطبیق فطرت و اسلام- رویائے صادقہ (۱۳) قواعد املا- رسم الخط (۱۴) مسلمانوں کی تباہی کا مرثیہ- اتمام حجت- علاوہ ازیں حقوق و الفرائض اور امہات الامہ بھی آپ نے لکھی جس میں سے آخری کتاب پادری شائق صاحب کی کتاب امہات المؤمنین کے جواب میں تھی- مگر خود مولانائے مرحوم کی طرف سے اس میں بعض ایسی آرا کا اظہار کیا گیا- کہ دیگر علما کو وجہِ شکایت و اختلاف پیدا ہوئی اور اُن کی حجت و اصرار پر آخر کار مولانا مرحوم نے کتاب مذکور کی ساری جلدیں علمائے دہلی کے حوالہ کردیں- جو شاید تلف کرڈالی گئیں- ان کتابوں کے علاوہ مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کا بامحاورہ اُردو ترجمۂ قرآن بے حد مقبول ہوا- اور اس کے مختلف سائز و مختلف ہدیوں کے متعدد اڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے- یہ احسان مولانائے مرحوم کا زبان اردو کے علاوہ مسلمانانِ ہندوستان کی موجودہ و آیندہ نسلوں پر اتنا بڑا ہی جس کے شکریئے سے وہ کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتے سرکاری ملازمت میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر بڑی نیک نامی حاصل کرنے کے بعد مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم سر سالار جنگ اعظم کے آخری زمانے میں ریاست حیدر آباد بھی گئے- اور وہاں صدر تعلقہ داری و صوبہ داری کمشنری کے منصب تک آپ نے ترقی پائی- اور آخر میں حسنِ خدمت کا بیش قرار وظیفہ لے کر ریٹایر ہوئے- جو مرتے دم تک آپ کو ملتا رہا- زمانۂ قیام حیدر آباد ہی میں آپ کو کلام مجید حفظ کرنے کا خیال آیا- اور فرائض منصبی کی ادائیگی کے ساتھ جس کی خاطر آپ کو ہر وقت دورے میں رہنا پڑتا تھا صرف ایک ششماہی میں آپ نے سارا کلام مجید حفظ کرلیا- اور ایسا زبردست استحضار اس میں بہم پونہچا دیا کہ تقریر کے وقت بڑے بڑے علما اظہارِ حیرت کرتے تھے- مولانائے مرحوم سر سید مغفور کے ابتدائی اور گہرے دوستوں میں تھے جنھوں نے آپ کو شروع ہی میں علیگڈھ کالج کا ٹرسٹی بنایا- اور مولانائے موصوف عمر بھر محمدن کالج- محمدن کانفرنس اور تعلیمی تحریک کے حامی رہے- اور کانفرنس و انجمن حمایت اسلام لاہور کو آپ کے لکچروں سے بہت ہی قیمتی مدد ملی- کیونکہ مولانائے مرحوم کو تقریر پر غضب کی قدرت حاصل تھی- اور آپکے لکچر دلچسپی کا ایسا پہلو لیے ہوئے ہوتے تھے- کہ کانفرنس و انجمن کے پنڈال و مکان میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی تھی- آپ کے لکچروں کا ایک مجموعہ چھپا ہوا موجود ہی- اور اعلے التعلیم یافتہ اشخاص بھی محاسنِ مذہب اسلام اور خوبیٔ زبان کے پہلو سے ان کا مطالعہ کرکے فائدہ اُٹھائیں گے- لکچروں کے علاوہ مولانا صاحب علی گڈھ کالج کانفرنس و انجمن کو وقتاً فوقتاً مالی مدد بھی دیتے رہے اور مسلمان طلبا کے ساتھ پرائیویٹ طور پر بھی سلوک کرتے رہے- ایک بڑا وصف

مولانا نذیر احمد صاحب میں جس کی طرف اہل اسلام کو خصوصیت سے مائل ہونا چاہیئے۔ یہ تھا کہ آپ نے کفایت شعاری سے روپیہ پس انداز کیا اور پھر تجارت وغیرہ میں لگا کر اس کو بڑھایا یہاں تک کہ وفات کے وقت لوگ آپ کو دس بارہ لاکھ روپیہ کا آدمی سمجھتے تھے۔

مولانا صاحب کی اولاد میں ایک صاحب زادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب ریاست حیدر آباد دکن میں ایک اعلیٰ منصب پر سرفراز ہیں اور ایک صاحب زادی مولوی شرف الحق صاحب دہلوی اعلیٰ افسر مال ریاست حیدر آباد سے منسوب ہوئی ہیں جن کے ایک صاحب زادے ڈاکٹر مشرف الحق صاحب ایل ایل ڈی ڈھاکہ کالج میں پروفیسر اور دوسرے مسٹر اشرف الحق صاحب بی۔ اے ایم۔ ڈی ریاست حیدر آباد میں میڈیکل افسر ہیں۔ مولانائے مغفور کے صاحب زادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب علوم شرقیہ وغیرہ میں کافی دست گاہ رکھنے کے علاوہ تحریر اردو میں بھی ایک خاص مہارت رکھتے ہیں اور ان کے مضامین وقتاً فوقتاً وزانہ پیسہ اخبار اور بعض صحائف دکن میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اس کی قوی امید بندھتی ہے کہ مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کی دماغی کوششوں کے گراں قدر نتائج آپ کے ہاتھوں میں بخوبی محفوظ رہیں گے اور ملک کو اُن سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملیگا +

مشیر دکن روزانہ حیدر آباد دکن مطبوعہ ۵ مئی میں خبر وفات کی اشاعت

لوکل دو تین روز ہوئے مولوی بشیر الدین احمد صاحب جوڈیشل مددگار معتمد مال گزاری اپنے والد شمس العلمار مولوی نذیر احمد صاحب پر فالج گرنے کی خبر سُن کر تین ہفتہ کی رخصت لے کر دہلی تشریف لے گئے ہیں +

کل خان بہادر مولوی شمس الحق صاحب کے پاس دلی سے شمس العلمار حافظ مولوی ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے انتقال کا تار موصول ہوا مولوی صاحب ممدوح کے انتقال کی خبر تمام ملک میں نہایت رنج و افسوس کے ساتھ میں سُنی جائے گی کیونکہ آپ بڑے پایہ کے مصنف تھے۔ آپ کی کتابیں مرآۃ العروس۔ بنات النعش اور توبۃ النصوح وغیرہ ارد و داں لوگوں سے آپ کا پورے طور پر تعارف کرا چکی ہیں۔ چند سال ہوئے آپنے با محاورہ اردو میں قرآن مجید کا ترجمہ کر کے ارد و داں مسلمانوں پر جو احسان کیا تھا اس کی احسان ہندی مسلمانوں کے دلوں سے کبھی محو نہیں ہوگی۔ غرض باعتبار علم و فضل اور بہ لحاظ زبان دانی آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ کوئی تیس سال سے آپ کو سرکار عالی سے وظیفہ حسن خدمت مل رہا تھا۔ سر سالار جنگ اول کے وقت میں آپ صدر تعلقہ داری اور مجلس مال گزاری کی رکنیت پر کار فرما رہ چکے تھے سر سالار جنگ اول آپ کی بہت قدر کرتے تھے۔ غرض بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کو غریق رحمت فرمائے اور آپکے اکلوتے فرزند مولوی بشیر الدین احمد صاحب اور دیگر اعزہ کو صبر جمیل عطا کرے +

۷ مئی کے البشیر میں مرحوم کے حالات

شمس العلمار ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ہم نے دلی رنج اور افسوس کے ساتھ سُنا کہ جناب شمس العلمار ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب نے پچھلے جمعہ کو بوقت شب اپنے وطن دہلی میں انتقال فرمایا +

مولانا ممدوح اس زمانے کے مشاہیر اور اکابر قوم کے طبقۂ اولیٰ میں تھے۔ ان کی وفات سے قوم کو اور اردو زبان کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ اگرچہ ان کی عمر اسی برس کے قریب تھی اور اس زمانے کی عمروں کو اگر دیکھا جائے تو وہ عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے لیکن افسوس اس

امر کا ہی کہ اُن کی وفات پر جو جگہ خالی ہوئی ہی اُس کو حاصل کرنے والا کوئی دوسرا شخص قوم میں موجود نہیں ہی۔

مولانا نذیر احمد صاحب اُن بزرگوں میں تھے جنھوں نے خاص اپنی کوشش اور قابلیت سے یہ درجہ حاصل کیا تھا اُن کا اصلی وطن اگرچہ بجنور تھا لیکن اُن کی ننہال دہلی میں تھی۔ انھوں نے دہلی میں تعلیم پائی اور اپنی ننہال میں اُن کی شادی ہوئی ان کی ننہال میں دہلی کے نامور علما تھے۔ علاوہ اس کے کہ اُنھوں نے اپنی ننہال میں سلسلۂ نظامیہ کے درس کی تکمیل کی۔ انھوں نے عربی علم ادب فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم عربی کالج دہلی میں پائی تھی۔ اُس زمانے میں یہ کالج نہایت اعلےٰ درجے کا تھا اس کے تعلیم یافتہ عموماً نہایت لائق اور نامور گذرے ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ان کی ملازمت سررشتۂ تعلیم ممالکِ متحدہ میں جس کا نام اُس زمانے میں ممالک مغربی و شمالی تھا شروع ہوئی۔ یہ ضلع وزیٹر تھے۔ جس کو اس زمانے میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کہتے ہیں اسی زمانے میں ان کو تعزیراتِ ہند کے ترجمہ کرنے کی خدمت سپرد ہوئی۔ منشی عظمت اللہ صاحب جو اُس زمانے میں بریلی کالج میں پروفیسر تھے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرتے تھے اور یہ اُس ترجمے کو فصیح اُردو میں لکھتے تھے جس زمانے میں تعزیرات مرتب ہوئی ہی اور جو اصطلاحات تعزیراتِ ہند میں مقرر ہوئی ہیں اُردو میں اُن کا وجود نہ تھا۔ یہ مولوی نذیر احمد صاحب کی قابلیت تھی۔ کہ اُنھوں نے اُردو میں قانونی اصطلاحات خود تجویز کیں اور وہ اس قدر مقبول ہوئیں کہ آج بھی اُن سے بہتر اصطلاحات تجویز نہیں ہو سکتیں۔ ایک لیکچر میں خود مولوی نذیر احمد صاحب نے بیان کیا تھا کہ تعزیراتِ ہند کے ترجمے کی صحت کا گورنمنٹ کو اس قدر خیال تھا کہ ترجمہ کو پہلے مسٹر کمسن صاحب ایم۔ اے۔ جو اُس زمانے میں ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم تھے۔ اور عربی و فارسی کے عالم تھے۔ خود دیکھتے اُس کے بعد ترجمے کو سر ولیم میور صاحب لفٹنٹ گورنر جانچتے۔ سر ولیم میور بھی فارسی اور عربی زبان کے فاضل تھے۔ جب خود سر ولیم میور ترجمے کو پسند کر لیتے تھے تو ترجمہ طبع ہوتا تھا۔

تعزیراتِ ہند کے ترجمہ کرنے کے صلے میں ان کو پہلے تحصیل داری ملی اور چند دن کے بعد ڈپٹی کلکٹری۔ پہلے یہ بندوبست کے ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ اُس کے بعد ضلع کے ڈپٹی کلکٹری سے یہ ریاست نظام میں بُلائے گئے۔ اور بندوبست کا کام ان کی سپرد ہوا وہاں پر اگرچہ بندوبست کا کام ان کے سپرد ہوا تھا لیکن جس وقت سر سالار جنگ کو میر محبوب علی خاں صاحب سابق نظام کی تعلیم کے لیے سلسلۂ درس کی اچھی کتابوں کی تلاش ہوئی تو مولوی نذیر احمد صاحب کو حضور نظام کے لیئے نصاب کی کتب تصنیف کرنے کی خدمت سپرد ہوئی۔ جب یہ ضلع وزیٹر تھے اُس زمانے میں انھوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے ایک کتاب حکایات کی لکھی اُس کے بعد اُردو میں ایک رسالہ منطق کا لکھا۔ جب اپنے صاحب زادے بشیر الدین احمد کی تعلیم شروع کی تو عربی صرف و نحو کی ایک کتاب لکھی۔

بندوبست کی ڈپٹی کلکٹری کے زمانے میں انھوں نے مرأۃ العروس لکھی جو گورنمنٹ میں بھی مقبول ہوئی اور پبلک میں بھی۔ گورنمنٹ نے ایک ہزار جلدیں کتاب مذکور کی خریدیں۔ ایک ہزار روپیہ نقد انعام کا دیا۔ سر ولیم میور صاحب نے ایک سونے کی گھڑی اپنے پاس سے انعام میں دی۔ اس کتاب نے نہایت مقبولیت حاصل کی۔ ان کو اُس زمانے میں کتابوں کے خود چھاپنے اور اُن کو فروخت کر کے اُن سے نفع اُٹھانے کا خیال نہ تھا۔ لہٰذا مختلف مطابع نے اس کتاب کو بطورِ خود چھاپ کر فروخت کیا۔ اس امر کا اندازہ کرنا مشکل ہی کہ کتنی مرتبہ یہ کتاب طبع ہوئی اور کتنی تعداد میں فروخت ہوئی۔ لیکن اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں ہی کہ کم سے کم مسلمان شرفا میں کوئی گھر ایسا نہیں

جہاں یہ کتاب موجود نہ ہو۔ جس زمانے میں یہ کتاب پہلی مرتبہ طبع ہوئی ہے اُس زمانے میں تعلیمِ نسواں کا رواج کم تھا لیکن یہ حالت تھی کہ کتاب گھر گھر منگوائی جاتی تھی بے پڑھی مستورات یا تو خواندہ بی بیوں سے ورنہ لڑکوں سے کتاب پڑھوا کر سنتی تھیں۔ اس کتاب کی مقبولیت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہندوستان کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں اس کتاب کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ اور سوائے مرأۃ العروس کے ہندوستان کی کسی ایسی زبان کی کتاب کو یہ قبولیتِ عام حاصل نہیں ہوئی۔

دوسری کتاب انھوں نے بنات النعش لکھی۔ اس کتاب میں اگرچہ خاص خوبی یہ تھی کہ علمی مسائل کو عام فہم اردو زبان میں لکھا گیا تھا یہ کتاب اگرچہ مرأۃ العروس سے زیادہ مفید اور زیادہ قابلِ قدر تھی۔ لیکن بوجہ علمی مضامین ہونے کے زیادہ مقبول نہیں ہوئی۔ تاہم گورنمنٹ نے اس کتاب پر بھی انعام دیا۔

اس کے بعد انھوں نے توبۃ النصوح لکھی اس کتاب پر بھی ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔ اور اس نے بھی قبولیتِ عام کا درجہ حاصل کیا خصوصاً نصوح کا خواب جس زوردار عبارت میں لکھا گیا ہے۔ غالباً اردو نثر میں کوئی دوسری تحریر اس قدر پرزور اور اس قدر مؤثر اب تک نہیں لکھی گئی نصوح کے خواب کو خواہ جتنی مرتبہ پڑھا جائے لیکن ناممکن ہے کہ اس کو پڑھ کر انسان کا دل نہ بھر آوے اور آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہو جاویں۔ حیدرآباد کے قیام میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ بالکل بند رہا۔ جو کتابیں حضور نظام کی تعلیم کی غرض سے تصنیف کی تھیں وہ کسی مصلحت سے شائع نہیں ہوئیں۔ حیدرآباد میں چونکہ پولیٹکل انقلاب ہمیشہ رہتے ہیں لہٰذا وہاں کے انقلاب کی وجہ سے یہ پنشن لے کر دہلی واپس آئے۔ وہاں سے آنے کے بعد انھوں نے ابن الوقت لکھی۔ جس میں یہ ثابت کیا گیا کہ ہندوستانیوں کے لیے انگریزی تمدّن میں کس قدر دشواریاں ہیں۔ کتاب کے دیکھنے کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ جو پلاٹ کتاب کا تجویز کیا گیا ہے۔ وہ سر سید احمد خاں کی نسبت ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ مولوی نذیر احمد صاحب شروع سے محمڈن کالج کے حامی تھے۔ انھوں نے کالج کے لیے ابتدائی زمانے سے مختلف مدوں میں وقتاً فوقتاً اس کتاب کے لکھے جانے سے قبل چندہ دیا تھا۔ اس کے علاوہ حیدرآباد سے جو خطوط انھوں نے اپنے بیٹے مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے نام وقتاً فوقتاً لکھے انھوں نے ایک خط میں سر سیدؒ کی بہت کچھ تعریف لکھی ہے اور سر سید کے مخالفین کی نسبت بُرے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اور ایک موقع پر صاف الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ لوگوں نے سر سید کو نہیں پہچانا کہ وہ کس شان اور کس مرتبے کا شخص ہے۔ بہرحال ابن الوقت کی تصنیف کے بعد ایامیٰ فسانۂ مبتلا وغیرہ کتابیں لکھیں اور سب کی سب مقبول ہوئیں۔ ۱۸۸۸ء سے قبل مولوی نذیر احمد صاحب صرف تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف رہے تھے۔ پبلک اسٹیج پر وہ بحیثیت لکچرار یا واعظ کے کبھی نہیں آئے تھے۔ سب سے پہلے وہ دسمبر ۱۸۸۸ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں بمقام لاہور پبلک اسٹیج پر رونق افروز ہوئے۔ باوجودیکہ پہلی مرتبہ اسٹیج پر تشریف لائے لیکن اس شان سے آئے کہ لوگ حیرت میں رہ گئے۔ عرصے تک ان کی یہ حالت رہی کہ اپنے لکچر میں اُسی وقت لوگوں کو ہنساتے تھے اور اسی وقت رُلا دیتے تھے۔ آواز قدرتی طور پر بلند تھی۔ جلسے کو اپنے قابو میں رکھتے تھے اور بڑے سے بڑے شخص پر ان کا اثر پڑتا تھا اس کے بعد سوائے الہ آباد اور مدراس کے اجلاس کانفرنس کے لکھنؤ کے اجلاس ۱۹۰۱ء تک وہ برابر ہر ایک اجلاس کانفرنس میں شریک ہوتے رہے۔ لکھنؤ کے اجلاس میں چونکہ بعض باتیں اُن کے مزاج اور طبیعت کے خلاف ظہور میں آئیں۔ لہٰذا انھوں نے اسٹیج پر آنا بالکل چھوڑ دیا۔ ورنہ کانفرنس کے علاوہ وہ انجمنِ حمایت الاسلام لاہور کے اجلاس میں اور مدرسۂ طبیہ دہلی کے سالانہ اجلاس

ہیں اور دہلی کے خاص خاص جلسوں میں وہ برابر لیکچر دیتے تھے۔ اُن کے لیکچر سُننے کے سب لوگ مشتاق رہتے تھے۔ جب وہ اسٹیج پر آئے وہ شاعر نہ تھے جس کو اُنھوں نے مختلف موقعوں پر ظاہر بھی کیا ہے حتّیٰ کہ اُنھوں نے کبھی اپنا تخلص بھی نہیں رکھا اور نہ کسی نظم میں اُنھوں نے کوئی تخلص باندھا اور شاید سب سے پہلی اُن کی نظم مسدّس ہے جو فسانۂ مبتلا کے ساتھ بطور ضمیمہ کے شائع ہوا ہے لیکن علیگڈھ کے اجلاسِ چہارم محمڈن کانفرنس سے انھوں نے اپنا یہ طریقہ بھی اختیار کر رکھا تھا۔ کہ لیکچر سے قبل وہ ایک نظم لکھتے تھے۔ نظم بامحاورہ اور سلیس ہوتی تھی اور اُن کے نظم پڑھنے کا انداز اس قدر اعلےٰ ہوتا تھا کہ نظم کی خوبی اور بھی زیادہ ہوجاتی تھی۔ جو شخص یہ چاہتے ہیں کہ مثل مولوی نذیر احمد صاحب کے وہ بھی اعلےٰ درجے کے لیکچرار نہیں۔ ہم صرف اُن کے نفع کے خیال سے یہ لکھتے ہیں کہ مولوی نذیر احمد صاحب کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ لیکچر تیار کرنے کے بعد اُس کو متواتر پڑھتے تھے کہ لیکچر تمام و کمال قریب حفظ کے اُن کو یاد ہوجاتا تھا۔ جہاں اُن کو زور دینا ہوتا یا ہاتھوں کے اشارے سے سماں ظاہر کرنا ہوتا۔ اُس موقع پر ہاتھ کا اشارہ بھی کرتے رہتے اور جب تک کہ اُن کا لیکچر ختم نہ ہوجاتا وہ برابر اُس کو پیش نظر رکھتے تھے +

ہم کو کانفرنس کے چند اجلاسوں میں اُن کے ساتھ ہم سفر ہونے کی عزت حاصل ہوئی ہے اور ہم نے خود اُن کی اس حالت کو دیکھا ہے جس شخص کی آواز مولوی نذیر احمد صاحب کے مثل بڑی ہو اور وہ اُن کی طرح لیکچر کے تیار کرنے اور اُس کو حفظ یاد کرنے کی تکلیف اور محنت گوارا کرے وہ اُن کی مثل اعلیٰ درجے کا لیکچرار ہو سکتا ہے +

مولوی نذیر احمد صاحب کی زندگی کے کاموں میں سب سے زیادہ مہتم بالشان کام جو عرصۂ دراز تک زندہ رہے گا اور جس کا اُن کو قیامت تک اجر ملتا رہے گا۔ وہ ترجمہ قرآن شریف کا ہے۔ بوجہ زبان کے تبدیل ہوجانے کے شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ پڑھنے کا رواج نہ تھا لیکن مولوی نذیر احمد صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ جس قابلیت کے ساتھ کیا وہ خاص اُن کا حصہ تھا اس ترجمہ ہونے کے بعد تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اور شریف مستورات میں قرآن شریف کو باترجمہ پڑھنے کا رواج بہت کچھ ہوگیا ہے اور روز بروز زیادہ بڑھتا جاتا ہے اور مجھے اس بات کا فخر ہے کہ دہلی کے اجلاس کانفرنس ۱۸۹۲ء میں سب سے پہلے میں نے اُن کو اس نیک کام کی طرف توجہ دلائی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جبکہ بعض ایسے اشخاص نے جن کو عربی کی کچھ بھی قابلیت نہ تھی۔ شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجموں کو سامنے رکھ کر اُن کو بامحاورہ اُردو میں لکھ کر چھاپنا شروع کیا تھا۔ لیکن یہ کام چونکہ ناقابل ہاتھوں سے ہو رہا تھا اس وجہ سے قرآن شریف کے ترجمے کے نام سے ایسا ترجمہ ہو رہا تھا کہ جس کو ترجمۂ قرآن شریف سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اس قسم کے ترجموں کو دیکھ کر مجھے یہ خوف پیدا ہوا کہ اس طرح قرآن شریف کا انجام بھی کہیں توریت اور انجیل کے ترجموں جیسا نہ ہو لہٰذا میں نے مولوی نذیر احمد صاحب سے یہ کہا کہ خدا نے آپ کو عربی علم ادب سے مناسبت عطا کی ہے۔ عربی کی قابلیت بھی آپ کی اعلےٰ درجے کی ہے اردو زبان دانی میں بھی آپ کے ہم پلہ کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔ اس وقت اگر آپ نے ترجمہ قرآن شریف کا کام اپنے ہاتھ میں نہ لیا تو غلط ترجموں کی اشاعت سے جو نقصان اسلام کو پہونچے گا اُن کے مواخذے دار آپ ہوں گے۔ میری گفتگو پر اُنھوں نے وعدہ کیا کہ میں قرآن شریف کے ترجمہ کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھوں گا۔ چنانچہ اجلاس کے بعد وہ اس نیک کام میں مصروف ہوگئے اور ۱۸۹۶ء کے اجلاس کانفرنس کے زمانے میں ترجمہ کا پہلا اڈیشن شائع ہوگیا۔ قرآن شریف کا ترجمہ جس خوبی سے اُنھوں نے کیا ہے اُس پر ریویو کرنے کی اس وقت ضرورت نہیں ہے لیکن جگہ بہ جگہ اُنھوں نے ترجمے میں بریکیٹ کے اندر معنی لکھ کر مطلب

کو صاف اور واضح کرنے کے لیے جو عبارت لکھی ہو یا فائدہ کر کے حاشیہ پر جو نوٹ لکھے ہیں اُن میں اکثر اُن کے معتقدات کے خلاف ہیں بلکہ انھوں نے فوائد جو کچھ لکھے ہیں وہ جمہور اہلِ اسلام کے عقائد کے موافق لکھے ہیں۔ چونکہ میں مولوی صاحب کی خدمت میں زیادہ گستاخ تھا۔ میں نے ایک مرتبہ اُن سے یہ کہا کہ مجھے افسوس ہو کہ آپ جیسے آزاد خیال بزرگ نے بعض بعض جگہ اپنے معتقدات کے خلاف ترجمہ کیا یا بلا ضرورت آپنے اپنے معتقدات کے خلاف حواشی لکھے ہیں جس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہو کہ آپنے تجارتی اصول کو مدِّ نظر رکھا ہو جو آپ کے لیڈری اور ریفارمری کی شان میں بٹہ لگانے والا ہو یہ سن کر اُنھوں نے جواب دیا کہ تم ابھی ناتجربہ کار ہو چند اخلاقی مسائل کی وجہ سے جمہور اہلِ اسلام کو بھڑکانا کہ وہ ترجمہ قرآن شریف کا نہ پڑھیں اور جو فائدہ ترجمے کے پڑھنے سے ہوگا اُس سے محروم رہیں سخت غلطی ہو مسلمانوں میں تمام خرابی اس کی ہو کہ وہ ترجمہ قرآن شریف کا نہیں پڑھتے اگر وہ ترجمہ پڑھنے لگیں تو خود بہ خود اُن کی اصلاح ہو سکتی ہو چند اخلاقی مسائل کو اگر وہ اُسی طرح مانتے رہیں جس طرح اب تک مانتے رہے ہیں تو اُس میں کچھ نقصان نہیں ہو۔ دو سال ہوئے جب میں نے اُن سے یہ کہا تھا کہ آپ ایک ایڈیشن جدید خیال کے مسلمانوں کے معتقدات کے موافق بھی نکال دیجیے کیونکہ اب جدید خیالات کی روز بروز زیادہ اشاعت ہو رہی ہو اگر اُن کے ہاتھ میں آپ کا موجودہ ترجمہ جاوے گا تو اُن کے خیالات کی اصلاح نہ ہوگی مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کا خیال کروں گا معلوم نہیں کہ اُنھوں نے اس کام کو شروع کیا تھا یا نہیں

مولوی نذیر احمد صاحب نے جس طرح اپنی تعلیم میں ترقی کی اس زمانے کے نوجوانوں کو اُس سے سبق حاصل کرنا چاہیے اُنھوں نے خود ایک لیکچر میں بیان کیا تھا کہ میں نے مسجدوں میں رہ کر اور خیرات کی روٹیاں کھا کر تعلیم پائی ہو میں نے اپنے اُستاد کا مصالحہ پیسا ہو اُنھوں نے جوانی میں بہ حالتِ ملازمت قرآن شریف کو حفظ یاد کیا۔ انھوں نے جوانی میں بہ حالتِ ملازمت انگریزی پڑھی۔ اُن کی انگریزی پڑھنے کی وجہ یہ ہوئی کہ الہ آباد میں جب وہ ضلع ونزیٹر تھے اُن کا اسسٹنٹ ایک ہندو انگریزی تعلیم یافتہ تھا کسی موقع پر جبکہ انسپکٹر سررشتہ تعلیم دفتر کا معائنہ کر رہا تھا۔ اُس نے مولوی صاحب سے کچھ دریافت کیا قبل اس کے کہ مولوی صاحب انسپکٹر کو جواب دیں ان کے اسسٹنٹ نے انگریزی میں جواب دیا۔ انسپکٹر صاحب اُس سے مخاطب ہو گئے۔ یہ امر ان کو نہایت ناگوار گزرا اور اسی وقت اُنھوں نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا کہ میری موجودگی میں تم کو گفتگو کرنے کا کیا مجاز ہو کیا تم کو اپنی انگریزی دانی کا زعم ہو۔ اب انگریزی ملازمت کرنا اُس وقت تک مجھ پر حرام ہو جب تک کہ میں انگریزی نہ پڑھ لوں اور اسی وقت ۶ ماہ کی رخصت کی درخواست دی۔ انسپکٹر صاحب نے بہت کچھ سمجھایا کہ غلطی ہوئی۔ آپ معاف کریں لیکن انھوں نے ایک نہ سُنی اور رخصت لے کر رات دن انگریزی تعلیم کے حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے۔ چنانچہ ۶ ماہ میں معمولی انگریزی بولنے اور لکھنے لگے اُس کے بعد برابر انگریزی تعلیم کی تحصیل میں مصروف رہے اور آخرِ عمر میں ان کی انگریزی کی قابلیت ایسی اعلےٰ درجہ کی ہو گئی تھی کہ انگریزی علمِ ادب کی مشکل سے مشکل کتاب بہ خوبی سمجھ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی انگریزی تعلیم یافتہ نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ کو انگریزی کسقدر آتی ہو انھوں نے جواب دیا کہ جتنی تم کو اُردو آتی ہو اُس سے زیادہ میں انگریزی جانتا ہوں عربی علمِ ادب سے ان کو خاص شوق تھا۔ علمِ ادب کے شوق کی وجہ سے انھوں نے قرآن شریف حفظ کیا جس کو انھوں نے اپنے ایک لیکچر میں خود بھی بیان کیا تھا علمِ ادب کا شوق تھا کہ جس کی وجہ سے قرآن شریف کی تلاوت نہایت کثرت سے کرتے تھے قرآن شریف پر ان کو اس قدر عبور تھا کہ کوئی لفظ جو قرآن شریف کا آتا جس جس آیت میں جس جس حدیث میں اور عربی شعرا کے کلام میں جہاں کہیں وہ لفظ آتا وہ برابر قرآن شریف کی وہ آیتیں اور وہ حدیثیں جہاں وہ لفظ آتا اور

وہ اشعار پڑھنے لگتے۔ قرآن شریف کی تلاوت کا ایک خاص وقت مقرر تھا۔ قرآن شریف کی تلاوت کے بعد ان کی طبیعت میں خاص قسم کی ترقی پیدا ہو جاتی تھی اور اُس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ بعد تلاوت قرآن شریف کے ان سے جو بات کہی جاتی اُسے منظور کر لیتے تھے۔ یہ بنک اور پرامیسری نوٹوں کے سود کو ہمیشہ سے جائز سمجھتے تھے لیکن ایک مرتبہ انھوں نے خود مجھ سے کہا کہ اگرچہ میں پرامیسری نوٹ کے اور بنک کے سود کو جائز سمجھتا ہوں لیکن اکثر اوقات میری طبیعت میں ایک قسم کی خلش پیدا ہوتی ہے اور اس شک میں پڑ جاتا ہوں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز اسی وجہ سے میں نے اپنا روپیہ تجارت میں زیادہ تر لگا دیا ہے اور مجھے شک ہے کہ یہ سرمایہ جو تجارت میں لگایا ہے محفوظ حالت میں رہے گا یا نہیں۔ کیوں کہ جن لوگوں کو تجارت پر روپیہ دیا ہے اُن سے بے ایمانی کا اندیشہ ہے۔ یہ ابتدا عمر سے نہایت کفایت شعار تھے وضع نہایت سادہ رکھتے تھے۔ جزرسی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی حیدرآباد کی ریاست میں جہاں فیشن اور اسراف گویا لازمۂ شرافت اور قابلیت سمجھا جاتا ہے۔ جب تک حیدرآباد میں رہے وہاں بھی ان کی زندگی ہمیشہ سادہ رہی۔ قومی کاموں میں بھی یہ ہمیشہ امداد کرتے تھے۔ علی گڈھ کالج میں مختلف چندے ابتداءً دیئے اور جب سر سید کے زمانے میں غبن ہوا ہے تو سب سے پہلے انھوں نے ایک ہزار روپیہ خود دے کر اس بات کی تحریک کی کہ کالج پر بنک کا جو سترہ ہزار روپیہ ہوگیا ہے وہ خاص چندے سے ادا کر دیا جائے۔ وہ ہمیشہ اسلامیہ اسکول کی امداد بھی کرتے تھے پچھلے سال انھوں نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ میرا ارادہ ایک کثیر رقم کو کسی نیک کام میں وقف کرنے کا ہے لیکن ابھی تک میں نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ کس جگہ اس روپیہ کو دوں جو کام میں نے اپنے ذہن میں تجویز کیے ہیں اُن میں ایک اسلامیہ اسکول اٹاوہ بھی ہے۔ معلوم نہیں کہ اُنھوں نے آخر وقت تک اس روپے کو علحدہ کر دیا تھا یا نہیں اور کسی خاص کام کے لیے اس روپے کو صرف کرنے کی بابت کوئی وصیت کر دی تھی یا نہیں ان کی تحریر میں بلاغت اور ایک عالمانہ شان پائی جاتی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد افسوس ہے کہ ہماری قوم میں اس قدر بلیغ اور عالمانہ شان کی فصیح اور بامحاورہ اُردو لکھنے والا کوئی شخص باقی نہیں رہا۔ ان کی تحریر کا خاص انداز تھا جو ان کی ذات سے مخصوص تھا اور افسوس ہے کہ جو ان کی ذات کے ساتھ ختم ہوا۔ ان کے مزاج میں ظرافت اور شوخی بھی زیادہ تھی۔ یہ رنگ ان کی تحریر میں بھی تھا لکچروں میں بھی تھا اور زیادہ بات چیت میں بھی لیکن جب اس قسم کی شوخی علما کی شان میں یا کسی مذہبی معاملے میں ان سے ظاہر ہوتی تو لوگوں کو اعتراض کا موقع ملتا۔ بعض اوقات یہ شوخی اس قدر بڑھ جاتی کہ جو ان کی شان کے خلاف ہوتی تھی چنانچہ کلکتے کے اجلاس کانفرنس میں جو نقل انھوں نے سانڈ کی کی تھی۔ اُس کا اثر وہاں کے لوگوں پر اچھا نہ پڑا تھا چنانچہ جسٹس سید امیر علی صاحب جو اجلاس کے پریسیڈنٹ تھے۔ سانڈ کی نقل کے بعد کرسی صدارت چھوڑ کر جلسے سے چلے گئے تھے۔ لکھنؤ کے اجلاس کانفرنس سنہ ۱۹۰۱ء میں جو پھبتیاں انھوں نے اُن علما کی اُڑائی تھیں جنھوں نے کانفرنس کی تکفیر کی تھی اُس سے لکھنؤ کے اُن عمائدین کو بھی رنج ہوا تھا جو کانفرنس کے ہمدرد تھے اور اسی وجہ سے نواب محسن الملک اور آنریبل صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب کو ان کی تردید میں تقریر کرنے کی ضرورت ہوئی اگرچہ ان کے مزاج میں دوستوں کی قدر تھی لیکن طبیعت زود رنج واقع ہوئی تھی جو اُن کی شان لیڈری کے خلاف تھی۔ اور جب کسی دوست سے ان کو رنج پہنچتا تو مشکل سے رفع ہوتا تھا۔ بہرحال چند انسانی کمزوریوں سے اگر قطع نظر کر کے ان کی اعلے قابلیت ان کی قومی خدمات ان کی تصنیف و تالیف پر جس وقت نظر ڈالی جاتی ہے تو ہر شخص اس نتیجے پر پہنچنے کو مجبور ہوگا کہ مولوی نذیر احمد صاحب کے انتقال سے ہماری قوم سے ایک ایسا شخص اُٹھ گیا ہے جس کا نعم البدل

سُننے کی کوئی امید نہیں ہی زمانے کا جو رُخ ہی اور جس فہم کے آدمی زمانہ پیدا کر رہا ہی وہ ایک دوسرا رخ ہی افسوس ہی کہ اُس سے مولوی نذیر احمد صاحب جیسے برگزیدہ بزرگ پیدا نہیں ہو سکتے"۔ خدا اُن کی مغفرت کرے اور اُن کے نام نامی کو زندہ رکھے ہم نے یہ ارادہ کیا ہی کہ مولوی نذیر احمد صاحب کی یادگار میں اسلامیہ ہائی سکول اٹاوہ میں ایک کمرہ تعمیر کریں گے ہم کو خدا اس ارادے میں کامیابی عطا کرے +

وطن روزانہ ۷؍ مئی ۱۲؁ع

انا للہ وانا الیہ راجعون - یہ خبر حامیانِ تعلیم کے حلقے میں خصوصاً اور جملہ مسلمانانِ عالم میں عموماً نہایت حسرت وافسوس و دلی قلق و رنج کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ آج بتاریخ ۴؍ مئی ۱۹۱۲؁ع بوقتِ صبح شمس العلماء جناب مولانا مولوی ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب ایم او ایل نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون - قوم کی بدقسمتی ہی کہ اُس کے سرپرست و حقیقی راہ نما یکے بعد دیگرے اُس سے ہمیشہ کے واسطے علٰحدہ ہوے جاتے ہیں یوں تو ایک عرصۂ دراز سے اہل اسلام پر زمانہ نازک اور وقت تنگ ہو رہا ہی مگر ان دو ماہ میں چند اور مخدوم صفت خادمانِ ملت کے بعد اب مولوی حافظ نذیر احمد صاحب جیسے بزرگ کا قوم کی راہ نمائی کرنے سے ہمیشہ کے واسطے علٰحدہ ہو جانا قوم کو آٹھ آٹھ آنسو رُلاتا ہی ارحم الراحمین مولانا صاحب مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے ہم کو مولانا صاحب مرحوم و مغفور کے اعزہ و اقربا سے اس صدمۂ جانکاہ و واقعۂ جگر خراش میں دلی ہمدردی ہی۔ فقط رشید الدین احمد منیجر اسلامیہ بک ڈپو اخبار ایجنسی بازار بلی ماراں دہلی ۴؍ مئی ۱۹۱۲؁ع۔

افضل الاخبار دہلی مطبوعہ ۸؍ مئی ۱۲؁ع

۴؍ مئی کو شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب جو دہلی کے مشہور عالم و فاضل اور لیکچرار تھے۔ ۸۵ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون - جنازہ آپ کا خواجہ باقی باللہ میں دفن کیا گیا - مرحوم کو ...۶ روپے ماہوار حیدر آباد دکن سے وظیفہ ملتا تھا افسوس اب ایسے عالم و فاضل جو تبرک سمجھے جاتے ہیں دنیا میں مشکل سے پیدا ہوں گے۔ آپ نے اپنی عمر کو تالیف و تصنیف میں وقف کر رکھا تھا - چنانچہ آپ کی تصنیفات بہت ہیں جو قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں ایل - ایل - ڈی کی ڈگری سے مشرف تھے - یقین ہی کہ آپ کے بڑے صاحب زادے مرحوم کے نقشِ قدم پر چل کر اُن کے نام کو روشن رکھیں گے - خداوند کریم مغفور کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگاں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے +

کرزن گزٹ دہلی مطبوعہ ۸؍ مئی ۱۲؁ع

لوکل

ہائے ڈپٹی نذیر احمد

دہلی بھر میں علم و فضل کا ایک آفتاب رہ گیا تھا وہ بھی ۳ - ماہ حال پونے آٹھ بجے شب کے ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا یعنی شمس العلماء حافظ مولوی ڈپٹی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی بالقابہ کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کی عمر اگرچہ اٹھتر سال کی تھی مگر قوٰی بہت مضبوط تھے - آواز میں وہی کڑاکا تھا - معاملات کو برابر خوش اسلوبی سے کرتے تھے علاوہ عالم و فاضل ہونے کے آپ ایک بہت بڑے بزنس مین یعنی کاروباری آدمی تھے اور لاکھوں روپے کا کام کرتے تھے - یہ بات عجیب ترین تھی - عرصے سے آپ خانہ نشین ہو گئے تھے گاڑی میں سوار ہونے سے نفرت تھی اور پیدل چلنے کا شوق تھا مگر جب چلنے میں تکلف ہونے لگا تو قطعاً بند کر دیا - آپ جیسے فاضل تھے اُسی قدر زندہ دل اور بامذاق تھے - گفتگو میں علاوہ متانت کے لطافت اور مذاقِ علم و حکمت

کے ساتھ بھرا ہوا تھا۔ اخیر میں کانوں سے اونچا سننے لگے تھے۔ اور بصارت میں بھی فرق آگیا تھا۔ ہاتھوں میں رعشہ تو ایک عرصۂ دراز سے تھا۔ نماز کے بہت پابند تھے۔ صبح کی نماز کے بعد قرآن مجید کا دَور کیا کرتے تھے۔ میں اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر کہتا ہوں کہ وہ ایک نیک دل مسلمان تھے لیکن ملایانِ زمانہ نے اُن پر کفر کا فتویٰ اسی طرح لگا دیا تھا جیسے اور ائمہ مسلمین پر ان کے زمانے کے ملاؤں نے +

پبلک سے مرحوم کی تصانیف کا تعارف کرانا یا لیکچروں کا ذکر کرنا یا آپ کی آتش زبانی کا نقشہ کھینچنا محض فضول ہے کیونکہ ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ ان سب باتوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ ہمیں تو صرف آپ کی زندگی کا کچھ مختصر سا بیان کرنا ہے جو اُمید ہے کہ شوق سے پڑھا جائے گا +

آپ وقتاً فوقتاً مریض تو برابر رہتے تھے مگر اچھے ہو ہو جاتے تھے یہ مرض جس میں آپ کا انتقال ہوا ۲۷- اپریل ہفتہ کے دن اور اتوار کی شب کو بارہ بجے لاحق ہوا۔ آپ پیشاب کرنے کے لیے اُٹھے کہ یکایک فالج گرا جس نے ایک ہاتھ اور ایک پیر بیکار کر دیا۔ مگر گرتے ہی اپنے اسی کڑاکے کے لہجے میں دو بار ملازم کو آواز دی تیسری آواز ایسی ڈوب گئی گویا کوئی کوئیں میں بول رہا ہے۔ گھر میں آپ کی صاحبزادی تھیں انھیں کھٹکا ہوا کہ یہ اتنی کمزور آواز کیوں نکلی۔ غرض آدمی دوڑ پڑے آپ کو اُٹھایا اور پلنگ پر لا کے لٹایا۔ زبان اسی وقت سے موٹی پڑ گئی تھی اور وہ اچھی طرح گفتگو نہ کر سکتے تھے زبان کے بند ہونے سے بہت ہی گھبراتے تھے۔ ہوش اخیر تک قریب قریب رہا علاج بھی ہوا ڈاکٹر بھی آئے مگر چارہ کار کچھ نہ ہو سکا۔ ہفتہ کے دن مبتلائے مرض ہوئے۔ اور جمعہ کے دن انتقال کر گئے +

آپ پرانی وضع کے ایک مستقل مزاج بزرگ تھے۔ ایک سال جب اس محلے میں زیادہ طاعون پھیلا اور لوگ محلہ چھوڑ چھوڑ کے جانے لگے تو آپ کے رفقا اور رشتہ داروں نے آپ سے بھی کہا کہ چند روز کے لیے باہر چلے چلیئے آپ نے انقطاعی لہجے میں جواب دیا نذیر احمد تو اس مکان سے ایک ہی بار باقی باللہ کے گورستان میں جائے گا۔ اور یہی ہوا بھی سب سے زیادہ یہ تعجب کی بات ہے کہ آپنے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ نذیر احمد جب مریگا فالج سے مریگا اور کسی مرض میں اس کی موت نہیں آنے کی۔ وفات کے وقت مشرف الحق صاحب ڈاکٹر آف فلاسفی اور حال پروفیسر موجود تھے۔ اور ایک آپکے داماد مولوی احمد حسین صاحب۔ عورتوں میں ایک آپ کی صاحب زادی پروفیسر موصوف صاحب کی والدہ اور آپ کی نواسیاں موجود تھیں۔ آپکے صاحبزادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب کو حیدر آباد تار دیا گیا اگر وہ وقت پر پہونچ سکے جو تار اُن کے پاس سے آیا اُس سے معلوم ہوا کہ وہ ساڑھے گیارہ بجے شب کی گاڑی میں پہنچیں گے۔ اول یہ گفتگو ہوئی کہ انہی کا انتظار کیا جائے مگر کثرتِ رائے اس طرف ہوئی کہ یہ انتظار میت کیلئے مناسب نہ ہوگا۔ غسلِ میت اور کفن سے قرابت ہی کو لوگ فارغ ہو گئے تھے۔ مجھے شب کو دس بجے اس جانکاہ سانحہ کی اطلاع ہو چکی تھی۔ خود مشرف الحق صاحب ڈاکٹر آف فلاسفی نے کلاں محل میں آکے مجھے اطلاع کر دی تھی۔ میں حسب وعدہ صبح کو نو بجے کے قریب وہاں پہونچ گیا تھا تاکہ اُس فاضل اجل کو اُس کی دائمی منزل تک پہونچا دوں لوگ جوق جوق جمع ہونے شروع ہو گئے۔ شہر میں پوری خبر آپ کی وفات کی نہیں ہوئی تھی دوسرے دفتر کا وقت تھا ورنہ آدمی اور بھی زیادہ ہو جاتے سینکڑوں آدمی آرزو ہی میں رہ گئے دس بجے کے بعد جنازہ اُٹھا حسب دستور جنازے پر سفید چادر جوڑا اڑھا دیا گیا تھا۔ تعداد ساتھ والوں کی معقول تھی۔ جنازہ محلہ نے بانس سے ہو کے لاہوری دروازہ سے شاہ باقی باللہ پہونچایا گیا دھوپ بڑی شدت کی تھی۔ اخیر باقی باللہ کے پائیں میں ایک درخت کے سایہ میں رکھا گیا اور مولوی عبد السلام صاحب نبیرہ شمس العلما مولوی سید نذیر حسین صاحب مرحوم نے نماز جنازہ پڑھائی۔ نماز کے ختم ہونے پر حسب دستور

اُذنِ عام دیدیا گیا چند آدمی تو بیشک اذنِ عام سُن کے واپس چلے آئے باقی سب وہیں رہے اور اُس علم و فضل کے آفتاب کو دفن کرکے اور مٹّی دے کر واپس پھرے ✦

دہلی کی بدقسمتی ہی کہ قضا چُن چُن کے اُن لوگوں پر ہاتھ صاف کر رہی ہی جو اپنا ثانی ہندوستان بھر میں نہیں رکھتے۔ اب اُن کا سچا جانشین کوئی نہیں ہی۔ آپ دہلی کالج کے پرانے طلبہ میں سے تھے۔ گورنمنٹ سے اور حیدرآباد سے آپ کو پنشن قرار واقعی ملا کرتی تھی۔ آپ ہمیشہ اعلےٰ عہدوں پر ممتاز رہے مگر تالیف و تصنیف کا شوق زمانۂ ملازمت میں بھی برابر جاری رکھا۔ آپ کی معاشرت اس قدر سادی تھی کہ دیکھ کے پرانے علمار کی طرزِ زندگی کا نقشہ آنکھوں میں کھچ جاتا تھا ایک حجرے میں جو بالاخانہ پر بنا ہوا تھا آپ بیٹھے رہتے تھے جاڑوں میں ایک روئی دار فرغل اور گرمیوں میں لٹھے نین سُکھ کا پاجامہ کُرتا۔ نہ کسی قسم کا اثاث البیت اور نہ کسی قسم کا تکلف کچھ بھی نہیں یہ آرائش کی چیزیں کچھ اُن ہی لوگوں کو زیبا بھی ہیں جو دنیاوی زیب و زینت کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔ حالانکہ آپ اتنے دولت مند تھے کہ قیمتی سے قیمتی اثاث البیت اور عمدہ سے عمدہ مکان میں رہ سکتے تھے۔ مگر علمی مذاق اور تعلیم و تعلّم نے کبھی آپ کو اس طرف نہیں رجوع ہونے دیا کچھ عرصے سے تعلیمی سلسلہ بند تھا اور نہ فارغ التحصیل طلبہ برابر آپ سے عربی ادب کی تعلیم لینے آیا کرتے تھے اور آپ اپنا عزیز وقت بلا معاوضہ طلبہ کو تعلیم دینے میں صرف کرتے تھے۔ آپ کے سینکڑوں شاگرد موجود ہیں اور وہ شاگرد جو اس زمانے کے جید علمار میں شمار ہو سکتے ہیں۔ آپ صاف گو اور صاف باطن تھے۔ کہنے میں لگی لپٹی مطلق نہیں رکھتے تھے۔ عربی کے صدہا اشعار حفظ یاد تھے ادبیت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اس پایہ کا آدمی آج ہندوستان میں نہیں ہی۔ مجھ سے ابتدا میں قرآن مجید کے ترجمے میں اختلاف ہو گیا مگر بعد میں باہم ایسی صفائی ہو گئی تھی اور ہم دونوں اس طرح گلے مل لیے تھے کہ گزشتہ باتوں کو بالکل بھلا دیا تھا۔ آپ کو کرزن گزٹ پڑھنے کا بہت شوق تھا اگر اتفاق سے کبھی نہیں پہونچا تھا تو شکایت کہلا بھیجتے تھے حقیقت یہ ہی کہ دہلی میں ایک مرحوم ہی تھا جو کرزن گزٹ کے مضامینِ علمی کی داد دے سکتا تھا۔ میں نے شاہ اسمٰعیل شہید کی سوانح عمری لکھی مگر کوئی موزوں نام مجھے نہ مل سکا ڈپٹی صاحب سے کہا حضرت کتاب تو لکھ لی ہی مگر نام کی تلاش میں دم ناک میں ہو گیا ہی اس مشکل اڑی کو آپ ہی نکال سکتے ہیں آپ بے اختیار ہنسے اور کہا اچھا گھبراؤ نہیں میں نام تجویز کر دیتا ہوں آپنے فوراً حیاتِ طیبہ بتایا کہ یہ نام رکھ لو۔ میں سُنتے ہی باغ باغ ہو گیا اور میں نے کہا کہ یہ لاکھوں روپے کا نام ہی اس سے بہتر نہیں ہو سکتا آپ نہ صرف تعلیم ہی دیتے تھے بلکہ ہزاروں روپے خرچ کرکے مسلمان لڑکوں کو پڑھاتے بھی تھے چنانچہ اس کا نمونہ شیخ عبد الرحمٰن صاحب بی۔ اے بی ایل موجود ہیں۔ قومی چندوں کی فہرستیں بھی آپکے نام سے خالی نہیں ہیں۔ آپنے حال میں مشن اسکول کے طلبہ کو پانسو روپے دیئے تھے اور یہ بھی سُنا ہی کہ دہلی کالج میں بھی ایک معقول رقم دینے کا ارادہ تھا۔ عام طور پر تو یہ بات دیکھی جاتی ہی کہ جو شخص دولت مند ہی وہ عالم نہیں ہی اور جو عالم ہی وہ دولت مند نہیں ہی مگر خداوند تعالےٰ نے مرحوم میں دونوں دولتیں جمع کر دی تھیں۔ ہندو مسلمان اور عیسائی محض آپکے علم اور صاف گوئی کی وجہ سے برابر آپ کی عزت کرتے تھے۔ بڑے بڑے حکام کو آپ کی خاطر منظور تھی۔ سوائے ملایانِ زمانہ کے کوئی آپ کا مخالف نہ تھا۔ کیونکہ آپ ایک بافیض انسان تھے روپیہ اور علم سے پبلک کی خدمات کرتے رہتے تھے۔ اور اخیر دم تک اسی پر قائم رہے لباس جیسا سادہ تھا کھانا بھی ویسا ہی تھا۔ ٹھاٹھ سے بہت رغبت تھی۔ جب چلنا پھرنا جاری تھا تو جلسوں اور دعوتوں میں برابر شریک ہوتے تھے اور جب سے خانہ نشین ہوئے تھے ہر جگہ آنا جانا بند کر دیا تھا طبیعت میں بہت ہی

بھولپن تھا۔ آپ دیکھ لیتے تھے کہ فلاں شخص دل سے مجھے چاہتا ہی اُس پر پورا بھروسا کر لیتے تھے اور ہزاروں روپے کے کام اس کے سپرد کر دیتے تھے۔ ایک بار کسی حاکمِ ضلع کی طرف سے آپ کو آنریری مجسٹریٹی کی خدمت پیش ہوئی تو آپ نے جواب دیا مجھے گورنمنٹ سے اپنی خدمات کا ہمیشہ معاوضہ ملا ہی اور اب تک ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد پنشن مل رہی ہی خبر نہیں بلا معاوضہ لوگ کیونکر کام کرتے ہونگے اس کے علاوہ یہ میرے تعلیم و تعلّم اور تالیف و تصنیف کے اوقات ہیں ایسا اعزاز نہیں چاہتا جس سے میرے ان بیش بہا کاموں میں فرق پڑے لہذا شکریے کے ساتھ میں اس اعزاز کو واپس کرتا ہوں آپ کی عمر تو پوری ہو گئی تھی مگر دل گوارا نہیں کرتا تھا کہ یہ فاضل ہم میں سے اتنی جلدی جام جاودانی کا کوچ کر جائے۔ قضا و قدر کا کوئی علاج کسی کے پاس نہیں ہی۔ سچ پچ اپنے شہر کی بدقسمتی پر ہمیں آٹھ آٹھ آنسو رونا چاہیئے۔ یہ لوگ نہ صرف دہلی کی بلکہ ہندوستان کی ناک تھے۔ ابھی ہم منشی ذکاء اللہ کو رو چکے تھے۔ ڈپٹی مولوی ضیاء الدین ایل ایل ڈی پر ماتم کر چکے تھے کہ یکایک قدرت نے ہم سے ایسا فاضل چھین لیا جس کے مرتبے کو عام آدمی نہیں پہچان سکتے +

بوڑھے تھے۔ مگر اولو العزمی جوانوں کی سی رکھتے تھے۔ آواز میں اخیر دم تک کڑاکا موجود تھا تین تین گھنٹے تک بڑے کڑاکے کی آواز میں لکچر کہا کرتے تھے مگر ذرا نہ تھکتے تھے اسی طرح دلیر بھی بہت بڑے تھے۔ حال ہی میں جسے دو تین سال کا عرصہ ہوا ایک جدید تالیف پر جب ملایانِ زمانہ بگڑے تھے تو آپ کے پاس گمنام خطوں کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ ہر خط میں یہ لکھا جاتا تھا کہ تم قتل کر دیئے جاؤ گے اور تمھیں سرِ بازار پیٹا جائے گا۔ مگر آپ نے ان گمنام تخویفی تحریروں کا مطلق خیال نہ کیا اور اپنے قاعدے میں مطلق فرق نہیں آنے دیا۔ آپ کا یہ قاعدہ تھا کہ نمازِ عصر کے بعد چاندنی چوک میں شمس العارفین کی دکان پر روزمرہ آکے بیٹھ جاتے تھے۔ اور مغرب کی نماز پڑھ کے گھر واپس چلے جاتے تھے۔ یہ نشست و برخاست عرصے تک جاری رہی پھر آپ بجائے اس دکان کے سراج الدین کی دکان پر بیٹھنے لگے۔ ٹھیک وقت پر آنا اور ٹھیک وقت پر جانا۔ آندھی جائے مینہ جائے اس میں فرق نہ پڑتا تھا۔ پرانے باوضع لوگ ایسے ہی ہوتے تھے۔ مگر جب چلنے پھرنے سے عاجز آگئے۔ اور رفتار میں تکلف ہونے لگا تو آپ نے آنا جانا بالکل بند کر دیا ہمیں محمد مشرف الحق صاحب ڈاکٹر آف فلاسفی سے کامل امید ہی کہ اپنے پُرشان نانا کی سوانح عمری ضرور قلم بند کریں گے۔ کیونکہ آپ سے بہتر لائف اس فاضلِ اجل کی اور کوئی نہیں لکھ سکتا۔ اِدھر آپ کے قابل صاحب زادے محمد بشیر الدین احمد صاحب سے امید ہی کہ وہ مرحوم کی کوئی یادگار دہلی میں ضرور قائم کریں گے ہمارے خیال میں اس سے بہتر یادگار نہیں ہو سکتی کہ دہلی کالج کے قائم کرنے کے لیے لاکھ روپے دیدیئے جائیں جو مرحوم کے دلی منشا کے مطابق ہی۔ کوئی بُت بنا کے کھڑا کرنا یا کوئی عمارت بنانا کالج کے قیام میں مدد دینے سے زیادہ مستحسن نہیں ہو سکتا۔ مرحوم اتنا روپیہ چھوڑ گئے ہیں کہ اگر اس میں سے ایک لاکھ نکل جائے گا تو ایک کونہ بھی خالی نہ ہوگا۔ خیر جو کچھ خدا کو منظور ہوگا وہ ہوگا۔ اِس وقت تو ہمیں آپ کا ماتم کرنا ہی۔ کیونکہ آپ ہمیشہ کے لیئے ہم سے جُدا ہو گئے ہیں۔

آہ ایں چہ سیل بود کہ ما را ز سر گذشت تنہا ز سر مگو کہ ز دیوار و در گذشت

علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ
۸ مئی سنہ ۱۹۱۲ء

افسوس مولانا نذیر احمد:۔ نہایت افسوس ہی کہ ۳ مئی ۱۹۱۲ء کو شب کے آٹھ بجے شمس العلماء مولانا ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ایم۔ او۔ ایل۔ کا بعارضہ فالج دہلی میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون مرحوم بہت بڑے اور نہایت قابلِ فخر فردِ قوم تھے۔ اور آپ کے انتقال سے اسلامی جماعت کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا ہی۔ مولانا نے مدت العمر قوم کی اور ملک کی مختلف طریقوں سے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں

آپ علی گڈھ کالج کے ابتداہی سے حامی اور اب سے چند سال پیشتر تک ٹرسٹی بھی تھے اور آپ کی شخصیت سے کالج کو بہت سے فوائد حاصل ہوئے تھے۔ آپ اُردو زبان کے نہایت مقبول مصنف اور نثرِ اُردو میں گویا ایک خاص طرز کے موجد تھے۔ چند سال سے آپ پبلک لائف سے بالکل کنارہ کش ہو گئے تھے اور صرف کلام مجید کے ترجمے کے اہتمام ہی میں مصروف رہتے تھے جس کے کئی ایڈیشن پیشتر ہی شایع ہو چکے تھے۔ اور جو اُردو زبان میں کلام پاک کا بہترین ترجمہ تسلیم کیا جاتا ہی۔ ہم مرحوم کے لیئے دعائے مغفرت کرتے اور اُن کے فرزند جناب مولٰنا محمد بشیر الدین احمد صاحب اور دیگر اعزہ کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں ؛

زمیندار روزانہ لاہور ۸ مئی ۱۹۱۲ء

شمس العلما مولوی حافظ نذیر احمد دہلوی کا انتقال پُر ملال ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں یہ خبر کمال اندوہ و قلق سے پڑھی جائے گی۔ کہ ۳ مئی کی صبح کو شمس العلما مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی مصنفِ کتبِ متعددہ و مترجم القرآن نے طویل علالت کے بعد آخر میں مبتلائے فالج ہو کر اس دارِ فانی سے ملکِ جاودانی کو رحلت فرمائی۔ دہلی کی خاک پاک سے جو ذرّے شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے۔ اُن میں مولوی نذیر احمد کا نام بھی خصوصیت سے ذکر کیئے جانے کے قابل ہی شمس العلما ڈاکٹر ضیاء الدین شمس العلما مولوی ذکاء اللہ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد قریب قریب ہم سن۔ ہم رتبہ و ہم مکتب تھے۔ چاروں آفتاب مشرقِ دہلی سے اُٹھے اور نصف النہار پر اپنے علم و کمال کا جلوہ دکھا کر یکے بعد دیگرے غروب ہو گئے۔ مسلمانوں میں قحط الرجال کا یہ حال ہی کہ چرخ کمال سے جو ستارہ ایک مرتبے ٹوٹ جاتا ہی پھر اُس کی جگہ پُر نہیں ہوتی۔ شمس العلما مولوی نذیر احمد صرف مصنف و مؤلف ہی نہ تھے۔ بلکہ اپنے پہلو میں ایسا دل رکھتے تھے جس میں قوم کا درد تھا۔ اور وہ اس سے متاثر ہو کر قومی انجمنوں کو وقتاً فوقتاً معقول مالی مدد دیتے رہتے تھے۔ لاہور کی انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے میں اُن کے لکچر کے وقت ہجوم خلائق کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ جلسے کے صحن میں تل رکھنے کو جگہ نہ ملا کرتی تھی۔ مولانا کے جسم میں جب تک جان و توانائی باقی رہی۔ انجمن کے سالانہ جلسے میں برابر تشریف لاتے رہے۔ گزشتہ چند سال سے بوجہ اضمحلال و ضعفِ پیری اُنھوں نے قومی جلسوں میں آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ مگر وہ لاہور میں متواتر کئی سال تک آتے رہے۔ اور اس لیئے پنجاب کے علاقے میں شاید کوئی لکھا پڑھا شخص ایسا نہ ہوگا جس نے مولانا کا لکچر نہ سُنا ہو یا جو اُن کا روشناس نہ ہوا ہو۔ مولوی نذیر احمد مغفور نے ہندوستان میں زنانہ لٹریچر کی طرف سب سے پہلے توجہ کی اور معاملات خانہ داری پر متعدد کتابیں لکھ کر گورنمنٹ سے انعام و خلعت اور عوام الناس سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ مولانا نذیر احمد کی طرزِ تحریر میں یہ خاص خوبی تھی کہ وہ عربی الفاظ کو اُردو میں اس عمدگی و سلیقے سے استعمال کرتے تھے کہ گویا کسی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہی۔ اس کے بعد اُن کو قرآن مجید کے اُردو ترجمے کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس کام میں اُنھیں اُمید سے بڑھ کر کامیابی ہوئی۔ آخر زمانۂ عمر میں اُنھوں نے الحقوق والفرائض کے عنوان سے ایک وسیع کتاب لکھی۔ مگر افسوس ہی کہ کتاب امہات الامہ کی تصنیف نے اُنھیں اکثر مسلمانوں کی نگاہوں سے گرا دیا تھا۔ خدا اُن کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور اُنھیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ بخشے۔ ہمیں اس صدمۂ روح فرسا میں مولانا کے خلفِ اکبر مولوی بشیر الدین احمد صاحب تعلقہ دار ننگسگور دکن سے دلی ہمدردی ہی۔ خدا اُنھیں صبر عطا کرے۔ اور اپنے نامور والد بزرگوار کے نقشِ قدم پر چلائے۔ تاکہ ملک و قوم کو علمی و مالی فائدہ پہونچتا رہے۔ سُنا گیا ہی کہ مولوی نذیر احمد صاحب مجوزہ اسلامیہ کالج دہلی کے لیئے ایک معقول رقم عطیہ دینے والے تھے کیا اب قوم کو مولوی بشیر الدین احمد صاحب سے یہ توقع نہ رکھنی چاہیئے۔ نہیں رکھنی چاہیئے

کیونکہ مشہور مقولہ ہے ؎ اگر مدیر نتواند بسر تمام کند +

روزانہ پیسہ اخبار
۸ مئی ۱۲ء

مولانا نذیر احمد صاحب کا انتقال پُرملال - حیف! حیف!! کہ علوم شرقیہ و ادب اُردو کے آسمان کا ایک اور آفتاب ۳ مئی کی شام کو شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب دہلوی ایل - ایل - ڈی (ایڈنبرا) ڈی - او - ایل (پنجاب) کے رحلت فرمانے سے غروب ہوگیا - وہ آفتاب جو اپنے چمکنے اور چمکانے کے غیر معمولی اوصاف کی وجہ سے نیّر و منیر اعظم کے لقب کا پورا استحقاق رکھتا تھا اور نہ صرف اقطاع و جوانب میں قریباً نصف صدی سے بذریعۂ تحریر و تقریر علم و اخلاق کی روشنی پھیلا رہا تھا - بلکہ اپنی شعاعیں ہزارہا میل سمندر کے پار یورپ و برطانیہ تک پہونچا رہا تھا - سرزمین دہلی کی قسمت بھی عجیب و غریب ہے کہ ہر ایک طرف اس نے اعلیٰ حضرت ملکِ معظم قیصر جارج پنجم کے دل عشرت منزل میں گھر کر کے اپنی قدیم سیاسی عظمت کو واپس پایا ہے - اور امپیریل گورنمنٹ کا صدر مقام کلکتہ سے وہاں لایا جا رہا ہے اور دوسری جانب اس کے ارباب کمال جو اپنے اعلیٰ اوصاف ذہن و دماغ کی مدد سے ایامِ زوال میں بھی اس کو ملک کی تمدنی مجلسی اور لٹریری کوششوں کا مرکز بنائے رکھنے میں کامیاب ہوئے تھے اور اس طرح اس کی سیاسی عظمت کے بحال ہونے کی مضبوط بنیاد ڈال گئے تھے - ایک ایک کر کے اس سے رخصت ہو رہے ہیں اور خان بہادر شمس العلماء مولانا ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب دہلوی ایل - ایل - ڈی شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی - خان بہادر شمس العلماء منشی ذکاء اللہ صاحب دہلوی اور شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل ایل - ڈی - ڈی - او - ایل - قریباً سال ڈیڑھ ڈیڑھ سال کے فصل سے یکے بعد دیگرے وفات پا گئے ہیں جس کا دہلی و اہل دہلی کے علاوہ قدردانانِ اُردو و ہمدردانِ قوم کو جتنا بھی رنج و قلق ہو کم ہے - مذکورۂ بالا چاروں حضرات بمعیت جناب شمس العلماء ملک الشعراء مولانا الطاف حسین صاحب حالی مدظلہم العالی (جن کو خدائے قادر و قیوم صد دسی سال تک سلامت رکھے) گویا ہندوستان میں علومِ شرقیہ و زبانِ مشترکہ کی انشاء پردازی کے لیے حواس خمسہ کا حکم رکھتے تھے اور بالخصوص آخر الذکر تین صاحبان نے اردو زبان اور اسلامی تہذیب ہندوستان کی ایسی بیش بہا و عظیم الشان خدمات انجام دی تھیں - جن کے شکریہ احسان سے حامیانِ اردو و مسلمانانِ ہندوستان کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اس لحاظ سے مولانا ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی وفات ایک شدید قومی حادثہ ہے جس کا ملک کے تعلیمی و ادبی حلقوں میں عموماً اور اسلامی ہند میں خصوصاً بہت سخت ماتم کیا جائے گا +

مولانا ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مغفور کے حالات سے جو آج کے پرچے میں کسی دوسری جگہ اُن کی تصویر سمیت شائع کیے جاتے ہیں ظاہر ہو گا کہ نہ صرف مولانائے مغفور نے اپنی دماغی محنت کے شاندار و گراں قدر نتائج سے ملک و قوم کو فائدہ پہونچایا اور اردو لٹریچر کے ذخیرے میں جو ملکی ضرورتوں کے لحاظ سے نہایت مختصر ہے ایک مستقل و مفید اضافہ کیا - بلکہ اُن کی ساری زندگی اہل ملک کے لیے سبق آموز تھی اور سیلف ہلپ و کفایت شعاری سے اعلیٰ مدارج پر پہونچنے اور دولت مند بننے کی ایک ایسی شاندار و مؤثر مثال انھوں نے دکھائی جس پر تمام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو غور کرنے کی ضرورت ہے اور ایک لاکھ سے زیادہ اشخاص خود مولانائے مرحوم کی مدد سے اس پر کاربند ہو کر بہت بڑا فائدہ اُٹھا چکے ہیں +

اوائلِ عمر ہی میں مولانا صاحب کی روشن خیالی و عاقبت اندیشی کا زبردست ثبوت اس سے ملتا ہے کہ پیرزادوں اور مولویوں کے ایک خاندان سے تعلق رکھنے اور ریگولیشن ۱۸۳۱ء کے ماتحت اپنی ددھیال کی بہت بڑی جاگیر کے ضبط ہو جانے کا صدمہ اُٹھانے

کے باوجود فتنہ ۱۸۵۷ء کے نازک موقعے پر ان کا پائے ثبوت جادۂ صدق و وفا سے نہ ڈگمگایا اور نہ صرف انھوں نے سپاہیوں کی شورش میں حصہ لینے سے خود کو الگ رکھا بلکہ اپنی اور اپنے عزیزوں کی جان کو خطرے میں ڈال کر ایک انگریزی خاتون کو ہلاکت سے بچایا اور مہینوں انھیں اپنے گھر میں پناہ دے کر بعد میں بحفاظت تمام برٹش کیمپ میں پہونچایا جس پر منجانب گورنمنٹ خوشنودی کا اظہار ہوا۔ اور ان کو تمغہ و انعام سے سرفراز کیا گیا۔ اسی طرح اپنی مصلحت اندیشی و اخلاقی جرأت سے انھوں نے ایسے وقت میں سر سید مغفور کی اصلاحی و تعلیمی تحریک کا ساتھ دیا جب ہر طرف سے تکفیر کی آوازیں ان کے حق میں بلند ہو رہی تھیں اور ان کے مؤیدین کو وراثت و دیگر سوشل حقوق سے محروم کیا جا رہا تھا۔ مگر مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم نے اس مخالفت کی پروا نہ کی اور علی گڈھ کالج و محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو بہ حیثیت ایک ٹرسٹی کے برابر قلمے۔ قدمے۔ دامے۔ درمے مدد دیتے رہے اور اس امداد میں انھوں نے گورنمنٹ کی خوشنودی یا دوستوں کی رضامندی کا کوئی خیال نہیں رکھا۔ بلکہ جب صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ کے علی گڈھ کالج میں تعلیم عربی کی سکیم شروع کرنے سے بعض اصحاب کو یہ شبہہ پیدا ہوا کہ اس سے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی اشاعت کو ضعف پہونچے گا۔ تو ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم نے خود السنۂ شرقیہ کے ایک جلیل القدر فاضل ہونے کے باوجود اس سرکاری تجویز کی بہت زور سے مخالفت کی اور صاحب لفٹننٹ گورنر بہادر کی ناراضی اٹھائی۔ اسی طرح جب بعض علمائے فرنگی محل نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے گزشتہ اجلاس لکھنؤ کو صدمہ پہونچانے کی کوشش کی اور لوگوں کو اس سے باز رہنے کی ترغیب دی تو مولانائے مرحوم آگ بگولہ ہو گئے اور اپنے لیکچر میں اُن عالموں کی خبر لیتے ہوئے انھوں نے متانت و اعتدال کی ضروری حدود کو بھی ملحوظ نہ رکھا جس پر نواب محسن الملک مرحوم کو کانفرنس کے جلسے میں اظہارِ افسوس کرنا پڑا +

مولانا نذیر احمد صاحب کو مبدء فیاض سے عقلِ سلیم و فہمِ مستقیم کے علاوہ غیر معمولی جودتِ ذہن عطا ہوئی تھی اور ان کی قوتِ استحضار بہت کچھ بڑھی ہوئی تھی چنانچہ غدر کے بعد جب انھیں انگریزی دانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے زیادہ تر سیلف سٹڈی سے اپنی استعداد بہت کچھ بڑھالی اور ریاست حیدر آباد کی ملازمت کے دوران میں کلام مجید حفظ کرنے کا خیال آیا۔ تو بحیثیت افسر مال مسلسل دورے کی زحمت اٹھانے کے ساتھ چھ مہینے میں کلام مجید حفظ کر لیا اور اس کے مضامین پر ایسا قابو حاصل کیا کہ دوران گفتگو میں وہ ایک ہی مطلب کی مختلف آیات فی الفور سنا دیتے تھے اور ان کی تشریح و تفصیل میں بیسیوں حدیثیں پڑھ دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے لیکچروں میں پرانے علمار کے وعظ اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب کی اسپیچ کا ملا جلا لطف آتا تھا اور مولانائے مرحوم کے پُر مذاق چلتے ہوئے فقرے ان میں ایسی غضب کی دل چسپی پیدا کر دیتے تھے کہ کانفرنس یا انجمن کے پنڈال میں آپ کے لیکچر کے وقت تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی تھی اور اتنا بڑا مجمع گویا آپ کے دلآویز بیان کا مسحور نظر آتا تھا۔ مولانائے مرحوم کی اس سحر بیانی سے محمڈن کانفرنس مدرسۂ طبیہ دہلی اور خاص کر انجمن حمایت الاسلام لاہور کو اپنی بنیاد لوگوں کے دلوں میں مستحکم کرنے کے متعلق بڑی بیش قیمت مدد ملی ہے جس کے احسان سے انجمن اور اہلِ پنجاب کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے!

علاوہ ازیں مولانائے مغفور کی تصانیف سے ملک و قوم کو بہت بڑا فائدہ پہونچا ہے اور زبانِ اُردو کے لیے انھوں نے ایک مایۂ ناز و قابلِ رشک حصہ لٹریچر بہم پہونچایا ہے جس کو مغربی زبانیں بھی بذریعہ ترجمہ اپنے ہاں لینے کی کوشش کر رہی ہیں چنانچہ مراۃ العروس و توبۃ النصوح کا انگریزی فرانسیسی و جرمنی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور وہاں کی یونیورسٹیوں اور محکموں نے ان کتابوں کو اپنے امتحانات

ہیں رکھا ہی مگران سب سے بڑھ کر اور ان کی دماغی کوششوں کا گل سرسید مولانا کا بامحاورہ اردو ترجمۂ قرآن مجید ہی جس کا صلہ بارگاہ ایزدی ہی سے مولانا کو مل سکتا ہی اور مسلمان کسی طرح اس کا حقِ شکریہ ادا نہیں کر سکتے +

مخبر دکن مدراس ۸ر مئی ۱۲ء

افسوس ناک وفات:- ہم نہایت رنج و قلق کے ساتھ یہ خبر درج کرتے ہیں کہ شمس العلما ر حافظ ڈاکٹر نذیر احمد خاں بہادر ایل۔ ایل۔ ڈی۔ سابق صدر تعلقہ دار از علاقہ سرکار عالی نے دہلی میں بعارضہ فالج انتقال فرمایا۔ مولانا مرحوم اُن معدود بزرگوں میں تھے جنھیں قوم کا عطرِ مجموعہ کہا جاتا تھا۔ حدیث و تفسیر و فقہ میں توغل رکھنے کے علاوہ آپ عربی زبان کے بہت اچھے ادیب اور اردو میں طرزِ جدید کے زبردست انشار پرداز تھے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہی کہ اخلاق و ادب میں آپ ہندوستان کے معنوی استاد تھے۔ نہایت افسوس ہی کہ سرسید کی انجمن کے روشن چراغ یکے بعد دیگرے بجھ رہے ہیں اور اُن کے جانشینوں کی روشنی نظر نہیں آتی۔ اس ہمدردِ قوم اور جان نثارِ اسلام کی وفات مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ کی سچی مصداق ہی۔ خداوند کریم مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اُن کے اکیلے صاحب زادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب انڈر سکرٹری معتمدِ مال گزاری سرکار عالی و متعلقین کو صبرِ جمیل عطا کرے +

وطن روزانہ ۱۱ر مئی ۱۲ء

انتقال:- پر ملال شمس العلما ر مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی پر اظہارِ افسوس کے لیئے ۸ر مئی ۱۲ء کو جامع مسجد گورداسپور میں بعد ادائے نمازِ مغرب انجمنِ تادیب الاسلام گورداسپور کا عام جلسہ بصدارت واجب التعظیم بزرگ شیخ نبی بخش صاحب وکیل چیف کورٹ ہوا۔ جس میں صاحب صدر جلسہ اور منشی حسین بخش صاحب بسمل بٹالوی نے مناسب موقع تقریریں کیں۔ اخیر میں منشی محمد رشید صاحب سکرٹیری انجمنِ تادیب الاسلام نے تحریک کی کہ ایک ہمدردی کی چھٹی پس ماندگانِ مولوی صاحب کو برائے صبرِ جمیل لکھی جائے +

تہذیب نسواں لاہور ۱۱ر مئی ۱۲ء

یہ خبر بے انتہا رنج و قلق اور اندوہ و غم کے ساتھ سُنی جائے گی۔ کہ شمس العلما ر مولانا حافظ نذیر احمد خاں۔ ایل۔ ایل۔ ڈی نے عارضۂ فالج سے ۳ مئی ۱۲ء کو بوقتِ مغرب دہلی میں انتقال فرمایا

انا للہ و انا الیہ راجعون +

مولانا مرحوم کیا بلحاظ رئیسِ شہر ہونے کے کیا بہ لحاظِ معزز عہدے دار سرکاری ہونے کے اور کیا بہ لحاظ مشہور و نامور مصنف ہونے کے۔ تمام ہندوستان میں اعلےٰ درجے کی شہرت و عزت رکھتے تھے۔ مگر زمرۂ مصنفین میں تو وہ سچ مچ آفتابِ علم بن کر چمک رہے تھے مولانا مرحوم کے انتقال سے علمی ہندوستان اپنا ایک گوہرِ نایاب کھو بیٹھا ہی۔ مولانا کی قابلیت اور جامعیت کا سا فاضل تمام ہندوستان میں ایک نظر نہیں آتا۔ ہندوستان کے مسلمانوں اور ان کے علوم کے لیئے یہ بے انتہا عظیم نقصان ہی۔ ہمیں اس حادثۂ جانکاہ اور سانحۂ جانگزا پر اپنے معزز دوست مولوی بشیر الدین احمد صاحب معتمدِ مال گزاری حیدر آباد دکن کے ساتھ دلی ہمدردی ہی اور ہم بخوبی احساس کرتے ہیں کہ ایسے قابل۔ ایسے نامور۔ اور ایسے جلیل القدر باپ کی موت نے کیسا پہاڑ غم کا ان کے دل پر گرایا ہی۔ ہماری دعا ہی۔ کہ خداوند تعالیٰ مولانا مرحوم و مغفور کو اپنی جوارِ رحمت میں مدارجِ عالیہ عطا فرمائے۔ اور ان کے جملہ عزیزوں کو اس صدمۂ عظیم کے برداشت کی طاقت بخشے۔ ہم عاجز گنہ گار اس دعا کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں +

راقم آثم عصمت از علی

علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ
۱۵ مئی ۱۹۱۲ء

مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم: - گزشتہ ہفتے میں ہم شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد صاحب کی افسوس ناک وفات کی خبر لکھ چکے ہیں۔ چوں کہ اُن کی زندگی کئی پہلو سے نہایت پُرسبق تھی۔ اس لیئے اپنے ناظرین کی اطلاع کے لیئے ہم مختصراً اس کے متعلق بعض واقعات درج کرتے ہیں۔

مرحوم کا آبائی وطن ضلع بجنور (صوبجات متحدہ) تھا۔ آپ کی پیدائش تقریباً ۱۸۳۱ء میں ہوئی تھی۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا۔ جن کے وہ منجھلے بیٹے تھے۔ جب اُن کے خاندان کی معافی جو سلطنت دہلی کی جانب سے چلی آتی تھی۔ کسی وجہ سے ضبط ہو گئی تو اُن کے والدین دہلی چلے گئے جہاں مولانا کی ننہال تھی۔ آپ کی تعلیم کا سلسلہ خود آپ کے والد مرحوم نے شروع کر دیا تھا جو اُس کے بعد غیر منضبط طریقے سے جاری رہا۔ مگر جب وہ دہلی چلے آئے تو اُن کی باقاعدہ تعلیم اورینٹل کالج (حال عربک اسکول) دہلی میں شروع ہوئی۔ چوں کہ اُن کے سرپرست کچھ ایسے ذی استطاعت لوگ نہ تھے۔ اس لیئے مرحوم کو اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیئے کالج سے وظیفہ ملتا تھا جس کی مقدار بہت ہی قلیل تھی۔ اس طرح مولانا نے تعلیم نہایت مصیبت اور جفاکشی کے ساتھ حاصل کی تھی۔ ان واقعات کو مولانا نے اپنے متعدد لیکچروں میں نہایت فخر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو پنجاب کے سررشتۂ تعلیم میں ایک معقول عہدہ مل گیا۔ پھر وہاں سے ممالکِ مغربی و شمالی (حال صوبۂ آگرہ) کے سررشتۂ تعلیم میں آپ کی خدمات منتقل ہو گئیں اور یہاں کان پور میں ضلع وزیٹر (حال ڈپٹی انسپکٹر مدارس) مقرر ہوئے۔ اسی عرصے میں غدر کا ہولناک ہنگامہ پیش آیا۔ اس زمانے میں آپ نے سرکاری جو خدمات انجام دیں اُن کے جلدو میں آپ کو انعام کے علاوہ انسپکٹری مدارس پر ترقی دی گئی۔ یہ بات غالباً چند ہی لوگوں کو معلوم ہوگی کہ اس وقت اردو کی جو تعزیرات ہند مروّج ہے اُس کے ترجمے کی خوبی مولانا ہی کی قابلیت کی رہین منت ہے۔ اس کے علاوہ ضابطۂ فوجداری اور قانون انکم ٹکس کے ترجموں میں بھی آپ سے مدد لی گئی تھی۔ ان خدمات کے صلے میں آپ کو تحصیل داری۔ پھر ڈپٹی کلکٹری بندوبست اور اس کے بعد ڈپٹی کلکٹری ضلع کے درجے تک ترقی دی گئی۔ یہاں سے آپ کی خدمات ریاست حیدر آباد دکن کو منتقل ہو گئیں۔ جہاں آپ بندوبست کے کام پر متعین ہوئے۔ لیکن جب سر سالار جنگ اعظم مرحوم کو حضور نظام خلد مقام کی تعلیم کے لیئے ایک خاص سلسلۂ درس کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کی تالیف و ترتیب کا کام مولانا ہی کے سپرد ہوا۔ آپ کی متعدد دیگر تصانیف کا سلسلہ بھی اسی طرح شروع ہوا کہ اپنے بچوں کی تعلیم کے لیئے ابتدائی کتابیں خود مرتب کر کے اُن کو پڑھائیں۔ اُن کی تصانیف میں مندرجۂ ذیل کتابیں بہت مشہور و مقبول ہیں:

(۱) مرأۃ العروس۔ جس میں امور خانہ داری کی تعلیم کی گئی ہے۔ یہ کتاب آپ نے خاص کر اپنی صاحب زادی کی تعلیم کے لیئے لکھی تھی۔ اس کتاب کی کئی صوبوں کی گورنمنٹوں نے نہایت قدر کی۔ ممالک مغربی و شمالی کی گورنمنٹ نے اس کی ایک ہزار جلدیں خریدیں اور ایک ہزار روپیہ نقد مرحمت فرمایا اور اُس زمانے کے لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور نے ایک سونے کی جیبی گھڑی عطا کی۔ علی ہذا۔ (۲) بنات النعش۔ کی تصنیف کی بھی یہی غرض تھی۔ اس کتاب میں روزمرہ کے مظاہر قدرت کو نہایت سلیس عبارت میں اور عام فہم طریقے سے سمجھایا ہے۔ (۳) توبۃ النصوح۔ اس کے ذریعے سے خاندان کی اصلاح اور خدا پرستی کی تعلیم مقصود تھی (۴) مبادی الحکمت علم منطق کے ابتدائی اصول۔ (۵) مالابد منہ فی الصرف۔ صرف عربی میں۔ (۶) چند پند۔ نصائح آمیز خطوط جو اپنے صاحب زادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب کو اُن کے لوجہ طالب علمی قیام علی گڈھ کے زمانے میں لکھے (۷) منتخب الحکایات

بچوں کے لیے دلچسپ حکایات (۸) صرفِ صغیر صرفِ فارسی (۹) محصنات - قبائح کثرتِ ازدواج - (۱۰) ابن الوقت - ہندوستانیوں کے لیے یورپین طرزِ معاشرت اختیار کرنے کے بد نتائج (۱۱) رویائے صادقہ - تطبیق فطرت و اسلام (۱۲) فسانۂ مبتلا (۱۳) الحقوق والفرائض - ۱۸۹۳ء سے آپ نے قرآن شریف کا ترجمہ شروع کیا جس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا - اس کے بعد سے آپ کی توجہ برابر اس کارِ خیر کی جانب مائل رہی - یہ ترجمہ نہایت مقبول ہوا اور مختلف شکلوں میں اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ ہدیہ ہوتے رہے ہیں - آپ کو تعلیم سے خاص دلچسپی تھی - اور مدت العمر تعلم و تعلیم کا سلسلہ جاری رہا - باقاعدہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ملازمت کے زمانے میں آپ نے کلام اللہ کے حفظ کرنے کا ارادہ کیا اور چھ ماہ میں پورا قرآن اعلےٰ درجے کے استحضار کے ساتھ یاد کر لیا - اسی طرح انگریزی کی جانب توجہ کی - اور اس میں یہاں تک دستگاہ بہم پہونچائی کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ انگریزی لٹریچر میں مستعد سے مستعد گریجوایٹ سے پالا لینے کے لیے تیار ہوں - علمی خدمات کے صلے میں گورنمنٹ سے "شمس العلماء" کا خطاب اور ولایت سے "ایل ایل ڈی" کی ڈگری حاصل ہوئی تھی سر سید کے نہایت گہرے دوست تھے - اور علی گڈھ کالج کے ابتدا ہی سے حامی رہے تھے اور بہت قریب زمانے تک اُس کے ٹرسٹی بھی تھے - علی گڈھ کالج کے علاوہ دیگر قومی درسگاہوں کی بھی آپ بالواسطہ اور بلاواسطہ امداد کیا کرتے تھے - اور پرائیویٹ طور پر بھی طلبہ کے وظائف جاری کر رکھے تھے ۱۹۰۲ء تک کانفرنس کا کوئی اجلاس بمشکل ایسا ہوگا جس میں آپ شریک نہ ہوئے ہوں - تقاریر ایسے تھے کہ بڑے سے بڑے مجمع میں حاضرین کی طبیعتوں کو گویا بالکل مٹھی میں کر لیتے تھے - اگرچہ شاعری کا دعویٰ نہیں کرتے تھے اور زیادہ شعر کہتے بھی نہ تھے - مگر جو کچھ اور جب کبھی کہتے تھے اچھا کہتے تھے آخر میں یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ لکچر سے پہلے کوئی نظم ضرور ہوتی تھی - اور اس طریقے کی وجہ یہ بیان کیا کرتے تھے کہ نظم سے طبیعت کھل جاتی ہے - اول لکچر لکھ کر اُس کو یاد کر لیا کرتے تھے - آپ کی تحریر و تقریر میں ایک خاص قسم کی شوخی تھی جو افسوس ہے کہ بعض اوقات حد سے متجاوز ہو کر ناگوار نتائج پیدا کر دیتی تھی اپنی عادات و روش میں آپ شروع ہی سے نہایت سادہ اور بے تکلف تھے - کفایت شعار بھی اعلےٰ درجے کے تھے - اور یہی وجہ تھی کہ باوجود اس کے کہ آپ کی ملازمتیں بہت زیادہ بڑی نہ ملی تھیں - لیکن اُن ہی کے پس انداز سے آپ نے اس قدر سرمایہ اندوختہ کر لیا کہ خانہ نشینی کے بعد تجارت کا سلسلہ شروع کیا اور اس وقت آپ کا شمار لکھ پتیوں میں ہوتا تھا - آخر میں ہماری دعا ہے کہ خدا آپ کی مغفرت کرے - اور قوم کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے - آمین +

مسلم گزٹ لکھنؤ ۱۵ مئی ۱۹۱۲ء | شمس العلماء مولانا نذیر احمد مرحوم :- گزشتہ پرچہ جس وقت زیرِ طبع تھا ہمیں دہلی سے مولوی صاحب کے انتقال پُر ملال کی خبر موصول ہوئی - جسے خبر کے طور پر ہم نے درج اخبار بھی کر دیا تھا - یہاں پر ہم مختصراً اُن کی لائف درجِ اخبار کرتے ہیں +

مولانا کی عمر اس وقت غالباً (۸۰) سال سے متجاوز ہو چکی تھی اور کہیں آنے جانے سے معذور تھے - چنانچہ ایک عرصے سے لکچر و سپیچ کا سلسلہ جو بہت دنوں تک مولانا کا دلچسپ شغلہ تھا چھوٹ گیا تھا - پھر بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جیسا کہ مختلف لوگوں کے بیانوں سے معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں بھی جاری تھا +

مولانا کی لٹریری قابلیت ہندوستان کیا دور دور مسلم تھی اور اسی کے صلے میں انھیں ایڈنبرا اور پنجاب دو یونیورسٹیوں سے "ڈاکٹری" کے خطاب مل چکے تھے - مولانا نے جس طرح ایک معمولی حالت سے ترقی کر کے اس زینے تک رفتہ رفتہ اپنے کو پہونچایا وہ آجکل کے طلبا کے لیے

بہت زیادہ سبق آموز ہے +

مولانا کا وطنِ آبائی ضلع بجنور تھا۔ جہاں آپ کے بزرگوں کو سلاطینِ مغلیہ کی طرف سے کچھ معافی بھی ملی ہوئی تھی ۱۸۳۴ء میں یہ معافی معرضِ ضبطی میں آگئی اور مجبوراً آپ کے والد ماجد مولوی سعادت علی کو تلاشِ روزگار میں دہلی آنا پڑا +

مولانا نے ابتدائی تعلیم کچھ تو اپنے والد سے حاصل کی اور کچھ مولوی نصر اللہ صاحب سے جو بجنور میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور مولانا کے خاندان سے خاص الفت رکھتے تھے۔ بالآخر مولانا مستقل طور پر دہلی کے اورینٹل کالج میں داخل ہو گئے وہاں سے تکمیلِ تعلیم کے بعد سر رچرڈ ٹمپل نے آپ کو ایک سو روپیہ ماہوار پر ڈپٹی انسپکٹر مدارس کر کے گجرات میں مقرر کیا +

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سرکاری خیر خواہی کے صلے میں انعامات کے علاوہ آپ انسپکٹر مدارس کر کے الہ آباد بھیجے گئے۔ اُس وقت آپ نے کوشش کر کے تھوڑی بہت انگریزی میں بھی استعداد حاصل کر لی۔ مگر مولانا کی اصلی قابلیت کے جوہر اُس وقت ظاہر ہونا شروع ہوئے جب آپ کے سپرد تعزیراتِ ہند اور ضابطۂ فوجداری کا کام کیا گیا۔ جن لوگوں نے انگریزی اصل اور اُس کے ترجمے کو بالمقابل رکھ کر غور کیا ہوگا وہ بخوبی اُس کا اندازہ کر سکیں گے کہ مولانا کی علمی قابلیت اُسی زمانے میں کس پائے تک پہونچی ہوئی تھی +

اِس خدمت کے صلے میں علاوہ انعام کے آپ ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر مامور کیے گئے اور اُس وقت سے اب تک مختلف عنوانوں پر آپ کی کتابیں نکل چکی ہیں جن میں سے بعض بعض بہت ہی زیادہ مقبول ہوئیں +

مولانا کی تصنیفات کی فہرست حسبِ ذیل ہے:- (۱) مرأۃ العروس (۲) بنات النعش (۳) توبۃ النصوح (۴) محصنات (۵) ابن الوقت (۶) رویائے صادقہ (۷) الحقوق والفرائض (۸) اجتہاد (۹) امہات الامہ۔ ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل کتابیں بھی مولانا کی تصنیف سے ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف علوم پر مولانا نے لکھی ہیں۔ (۱) منطق میں مبادی الحکمت (۲) ہیئت میں سموات جو انگریزی کتاب "دی ہونز" کا ترجمہ ہے اور ابھی چھپی نہیں ہے (۳) قواعد میں۔ مالغنیک فی الصرف اور صرفِ صغیر (۴) اخلاق میں موعظۂ حسنہ منتخب الحکایات اور چند پند (۵) قواعدِ املا میں رسم الخط +

علاوہ ان کتابوں کے مولانا کی اسپیچیں اور نظمیں جو مختلف اوقات میں ایجوکیشنل کانفرنس۔ حمایت الاسلام یا دوسرے جلسوں کے موقعوں پر پڑھی گئی ہیں۔ بہ طورِ خود ایک جداگانہ سیریز ہیں جن سے مولانا کے ہر زمانے کے خیالات بخوبی ظاہر ہو سکتے ہیں +

مولانا کی جن (۹) تصنیفات کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے زمانۂ تصنیف کے لحاظ سے وہ کم و بیش اُسی ترتیب میں واقع ہیں جیسے وہ یہاں درج ہیں۔ ان کتابوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم و اصلاح کا خیال جو شروع میں اُمورِ خانہ داری کے متعلق مولانا کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ مذہبی رنگ اختیار کرتا گیا اور بالآخر مذہبی تحقیقات میں غلو کے باعث اُن میں وہ استغنا اور خود اعتمادی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جو کمالِ فن کا نتیجہ ہوتی ہے +

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اجتہاد تک لوگوں نے مولانا کی تصنیفات کو تقریباً یکساں وقعت کی نظر سے دیکھا البتہ امہات الامہ نے جو مولانا کی طبع شدہ تصنیف میں غالباً سب سے آخر کتاب تھی علما میں ایک ہل چل ڈال دی تھی اور اس حالت میں مولانا نے جس خندہ پیشانی اور کشادہ دلی کے ساتھ اُس کی تمام مطبوعہ جلدیں تلف کروانے کے لیے علمائے دہلی کے سپرد کر دیں وہ بے شک قابلِ ستائش ہے خصوصاً اس لحاظ سے کہ تمام عمر کی کفایت شعاری کے باعث کسی طرح کے نقصان اٹھانے کے عادی نہ ہونے کے علاوہ

مولانا کو اس کا بھی یقین تھا کہ جو کچھ اُنھوں نے لکھا تھا مذہباً روا اور تاریخاً صحیح ہے +

مذہبی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے ہم مولانا کے ترجمۂ قرآن مجید کا ذکر کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں جو بہت زیادہ ہندوستان میں مقبول ہو چکا ہے۔ اگرچہ قرآن پاک کے ترجمے اس سے تقریباً ایک صدی پہلے زبانِ اُردو میں ہو چکے تھے مگر وہ ترجمے ایسی بامحاورہ اور ٹھیٹھ زبان میں نہ تھے اور نہ اس قدر عام فہم تھے جیسا مولانا نے اُسے بنانے کی کوشش کی۔ مولانا کی تمام تصنیفات کو مجموعی حیثیت سے دیکھتے ہوئے ہم کو ہرگز اس کے اقرار کرنے میں تامل نہیں ہے کہ "مولانا کے احسانات زبانِ اُردو پر ایسے ہیں جن سے ہماری موجودہ اور آیندہ نسلیں کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتیں +

مولانا کی پبلک لائف سے قطع نظر کر کے اُن کی پرائیویٹ زندگی کچھ کم قابلِ غور نہیں ہے۔ یوں تو مولانا کے دیکھنے اور جاننے والے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں موجود ہوں گے جن سے اُن کی روزمرّہ کی زندگی کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ مگر خود اُن کے خطوط جو اُنھوں نے اپنے صاحب زادے کے نام لکھے ہیں اور جو ایک مجموعے کی صورت میں "مواعظۂ حسنہ" کے نام سے طبع ہوئے ہیں بہت زیادہ اُن کی زندگی کے اُس پہلو کو روشن کرتے ہیں جس میں اُن کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے محنت وجفاکشی۔ کفایت شعاری اور وقت کی قدر۔ استقلال اور ہمت یہ تمام عمدہ اوصاف مولانا میں موجود تھے +

ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لینے کے بعد مولانا نے کچھ دنوں سر سالار جنگ اعظم کے زمانے میں ریاست حیدر آباد کی ملازمت کی جہاں اُن کے صاحب زادے مولوی بشیر الدین احمد اب بھی ایک عہدے پر ممتاز ہیں۔ حیدر آباد سے واپسی کے بعد کچھ دنوں پبلک کی خدمت کرتے رہے اور ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمنِ حمایت الاسلام کو خصوصاً اپنے بیش بہا لکچروں سے وقتاً فوقتاً فائدہ پہونچاتے رہے۔ ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ کانفرنس کے موقعے پر نواب محسن الملک مرحوم سے کچھ ناچاقی پیدا ہو گئی تھی جس کے باعث ایک عرصے تک وہ علی گڈھ کالج سے ناخوش رہے جس کے ساتھ اُن کا تعلق ابتدائی قیام سے اب تک بہت مربیانہ رہا تھا +

۱۹۰۰ء کے اسٹرا کلب کے موقعے پر مولانا سب سے آخر مرتبے کالج میں تشریف لائے تھے۔ گزشتہ کانفرنس کا اجلاس دہلی میں ہونے کے سبب امید کی جاتی تھی کہ شاید مولانا پھر ایک مرتبہ اُس میں شریک ہو کر اپنی فصاحت سے حاضرین کو محظوظ کریں گے۔ مگر سچ یہ ہے کہ وہ علی گڈھ کالج اور اُس کے متعلقات سے بالکل قطعِ تعلق کر چکے تھے +

اب ہم کو حسبِ ذیل چند الفاظ اُن کی خصوصیات کے متعلق لکھنے باقی رہے ہیں (۱) اُن کو لکچر دینے میں خاص ملکہ تھا۔ اگرچہ اُن کا لکچر ایک مرکز پر قائم نہ رہتا تھا تاہم اُس کے تمام حصے دلچسپ اور ظرافت آمیز ہوتے تھے اور باوجود اس کے کہ اُس میں عربی اور انگریزی الفاظ کی بھرمار ہوتی تھی سامعین کی توجہ اس کی طرف سے نہیں ہٹتی تھی۔ وہ پوری توجہ اور شوق سے اُس کو آخر تک سنتے رہتے تھے۔ جب یہ بات مشہور ہوتی تھی کہ فلاں وقت اُن کا لکچر ہوگا تو وقت سے پہلے مقامِ لکچر میں لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ اُن کا لکچر اُن کی زبان سے سننے میں خاص لطف آتا تھا۔ مگر مطبوعہ لکچر کو پڑھنے میں وہ لطف نہیں آتا تھا۔ (۲) قرآن شریف کا ترجمہ جب اُنھوں نے شروع کیا تو احتیاطاً چند مولوی ملازم رکھے جو مختلف تفسیریں نظر کے سامنے رکھتے تھے۔ جب مولانا کسی آیت کا ترجمہ لکھواتے تھے تو یہ مولوی تفسیروں سے اُس ترجمے کی مطابقت کرتے تھے۔ اور ترجمے کی درستی اور نادرستی پر بحث کرتے تھے۔ غرض کہ اس احتیاط اور غور و فکر اور بحث مباحثے کے بعد ترجمہ تیار ہوا۔

مگر سنا گیا ہی کہ ترجمہ شائع ہونے کے بعد بھی جب کبھی کسی شخص نے اُن کو کسی آیت کے ترجمے میں کوئی غلطی جتائی تو انھوں نے دوسرے ایڈیشن میں اُس کی اصلاح کردی (۳) کفایت شعاری کے ذریعے سے اُنھوں نے روپیہ جمع کیا تھا اور اسی عادت کے ذریعے سے اُنھوں نے روپے کو بچانا چاہا۔ تاہم قومی کاموں میں وہ روپے کی کثیر مقدار بے دریغ دے ڈالتے تھے اور غریب مسلمان طلبہ کی خفیہ امداد کرتے رہتے تھے (۴) معاملات کی یہ کیفیت تھی کہ وہ ہر شخص کی نسبت جو اُن سے قرضہ طلب کرے۔ یا اُن کے ساتھ کسی تجارت میں شریک ہو بے تکلف اعتبار کرلیتے تھے۔ اس عادت کے سبب اُنھوں نے بارہا ہزاروں روپے کا نقصان اُٹھایا۔ (۵) عربی ادب میں وہ خاص قابلیت رکھتے تھے اور اس لحاظ سے اُن کا شمار ہندوستان کے نامور ادیبوں میں تھا۔ حدیث اور تفسیر میں بھی اُن کو خاص دستگاہ تھی۔ اکثر طلبار اُن کے مکان پر آتے اور اُن کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے۔ بعض علمی مسائل میں وہ اپنی خاص رائے بھی رکھتے تھے اور اُس کو طلبار کے سامنے بے تکلف بیان کردیتے تھے۔ (۶) سنا گیا ہی کہ آخر میں وہ آنکھوں سے معذور ہوگئے تھے۔ مگر جب تک بینائی روشن رہی وہ کتاب اور اخبار کے مطالعے اور مضمون نویسی اور تصنیف و تالیف کے مشغلے سے باز نہیں آئے (۷) باوجود دولت مند ہونے کے اُن کا طریقۂ زندگی بہت سادہ اور طالب علمانہ تھا کوئی شخص اُن کے لباس یا طرزِ ماند و بود سے یہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ وہ دولت مند ہیں۔ (۸) مذہباً وہ آزاد خیال تھے۔ مگر اِن کی آزادخیالی ان لوگوں کی سی آزادخیالی نہ تھی جو بذاتِ خود مذہب کے اصول و فروع سے واقف نہیں ہوتے۔ مگر مسائلِ مذہبی کے متعلق نہایت جرأت اور دلیری سے بحث کرتے ہیں۔ غرض کہ مرحوم خاص عادات وخیالات رکھتے تھے اور اُن کا وجود مسلمانوں کی قوم کے لیئے قابلِ فخر تھا۔ افسوس ہی کہ اب وہ وجودِ گرامی ہمیشہ کے لیئے آنکھوں سے غائب ہوگیا۔ جب تک اُردو زبان میں اُن کے لکچر موجود ہیں جب تک اُن کا ترجمۂ قرآن موجود ہی جو نہایت فصیح اور سلیس اُردو میں ہی۔ جب تک اُن کی وہ قصہ آمیز کتابیں موجود ہیں جو عورتوں کی اصلاح اور تعلیم کے لیئے لکھی گئی ہیں اُن کی یاد کبھی دلوں سے فراموش نہیں ہوگی۔ مرحوم بلاشبہ نام ورمشاہیرِ ہند میں سے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اخبارِ عام لاہور مطبوعہ ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء

مولوی نذیر احمد شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب دہلی کے حکیم اجمل خاں صاحب کے زیرِ معالجہ رہ کر منگل کے روز فوت ہوگئے۔ جنازے کے ساتھ بے شمار لوگ تھے۔ اسلامی حلقے میں اس موت پر سخت افسوس کیا جاتا ہی لاہور میں خبر موت پہنچنے پر جمعرات کے روز اسلامیہ ہائی سکول اور کالج بند رہے +

چودھویں صدی راول پنڈی مطبوعہ ۱۵ مئی ۱۹۱۲ء

مولانا شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب کے انتقال سے مسلمانوں کے درمیان سے ایک ایسی صورت اُٹھ گئی ہی جس کا عکس مسلمانوں کی موجودہ نسل کے دلوں سے کبھی محو نہیں ہوگا۔ وہ ایک ایسی عظیم الشان شخصیت تھی جس کا نظیر صدیوں میں مشکل سے پیدا ہوگا اور وہ زندگی ایک ایسی زندگی تھی جس پر مسلمانوں کی قوم تمام دنیا کے سامنے فخر سے یہ کہہ سکتی ہی کہ اُن میں مولوی نذیر احمد مرحوم جیسا شخص پیدا ہوا تھا۔ مرحوم و مغفور مولوی صاحب کی ذات اس قدر کمالات کی جامع تھی کہ وہم و تخیّل کو بھی ان کا تصوّر کرنے میں ایک طویل وقت درکار ہوگا اور وہ زندگی ایک مسلمان کی زندگی کا ایسا نمونہ تھی کہ کوئی مسلمان اُس سے بڑھ کر کوئی خواہش نہیں کرسکتا کہ اُس کو ویسی ہی زندگی نصیب ہو اور کوئی مسلمان اس سے بڑھ کر قومی خدمت اور بھلائی کا کوئی کام نہیں کرسکتا کہ مولانا مرحوم کی ایک مفصّل اور بسیط سوانح عمری تیار کردے۔ خداوند کریم ان کو مغفرت عطا فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے +

افضل الاخبار دہلی ۱۶ مئی ۱۹۱۲ء

(مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب شمس العلما مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل ایل ۔ ڈی (ایڈنبرا) ڈی۔ او۔ ایل (پنجاب) کے انتقال پرملال کی خبر مختصر طور سے پیوستہ اشو میں لکھی جاچکی ہی۔ اب مفصل طور سے افسوس کے ساتھ لکھا جاتا ہی۔ کہ مرحوم کی موت کا باعث فالج ہوا تھا۔ جس نے چھ ہی روز میں کام تمام کردیا +

مولانائے مرحوم فارسی اور عربی کے ایک جلیل القدر فاضل۔ اور زبانِ اُردو کے لاثانی اور زبردست ادیب ہونے کے علاوہ زبان انگریزی میں بھی اچھی مہارت اور علوم قدیمہ وجدیدہ میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ اور ابتدائے سن تمیز سے اپنا وقت ہمیشہ علوم وابنائے جنس کی خدمت اور اعانت میں صرف کرتے تھے +

مولانا سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ کے خیالات مطبوعہ پیسہ اخبار روزانہ ۱۷ مئی ۱۹۱۲ء

شمس العلما مولانا ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی رحلت:- (نوشتہ جناب مولانا سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ) ہائے افسوس ہائے افسوس۔ آج دہلی کا آفتاب علوم کیا تمام ہند کا آفتاب جہاں تاب رات کے ۸ بجے غروب ہوگیا۔ آسمانی آفتاب شام ہی سے چھپ جاتا ہی۔ مگر دین و دُنیا کے روشن کرنے والے سورج نے آسمانی سورج سے کہیں زیادہ اپنی درخشانی دکھائی اور چمکتی ہوئی شعاعوں سے ادبِ اُردو کی دُنیا کو روشنی پہونچائی۔ یہ کون سا آفتاب تھا جس کے جہان سے اُٹھتے ہی علمی دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ یہ جناب شمس العلما مولوی حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی۔ وغیرہ کا دم قدم تھا + ہمارا یہ کہنا غلط اور سرتاسر غلط ہی۔ کہ وہ آفتاب نور افشاں دُنیا سے اُٹھ گیا۔ نہیں نہیں اُس کی علمی شعاعیں علمی فیض رسانیاں اس ظلمت کدہ کو اب بھی اپنی نورانی جھلک دکھاتی رہیں گی۔ یہ شخص اپنے وقت کا مسیحا تھا۔ جس نے کبھی عورتوں کے مردہ دلوں کو انوکھی اور لاجواب کتابیں لکھ کر جلایا۔ اور اُن میں شوقِ علم کی روح پھونکی۔ کبھی نوجوانوں کو اپنی عبرت انگیز تصنیفات سے نیک اور پارسا بنایا کبھی اپنے لکچروں سے لوگوں کو قومی خدمت پر مائل کیا۔ کوئی مشکل سے مشکل علم ایسا نہ تھا جسے حضرت ممدوح نے پانی نہ کردیا ہو۔ اخلاقی اور دینی مسائل اُنھوں نے اس خوبی سے بیان کئے کہ دل میں کھُب گئے۔ قرآن شریف کے ترجمے نے ہزاروں بلکہ لاکھوں علوم عربیہ کے ناواقف مسلمانوں کو کلام آلٰہی کا لطف۔ اُس کی خوبیاں اُس کی باریکیاں۔ اس کے لاینحل عقدوں کو حل کرکے اس طرح دلوں میں بٹھائیں۔ کہ پڑھنے والوں کو مزہ آنے لگا۔ اور سُننے والوں کے دل ہرے ہوگئے +

حضرت موصوف کی ذات میں صرف علمی فیاضی ہی نے جنم نہیں لیا تھا۔ بلکہ بیش قرار نقدی کے عطیات نے بھی اُن کو حاتمِ وقت ثابت کردیا تھا آپ نے سینکڑوں بے روزگاروں کو روپیہ دے کر روزگار سے لگایا۔ بیکاروں کو گرہ سے روپے دے دے کر کماؤ پوت بنایا۔ نادار طالب علموں کو خود بھی پڑھایا اور اُن کے اخراجات اپنے ذمے لے کر انگریزی تعلیم سے بھی محروم نہ رکھا +

آپ کے لیکچر غضب کے ہوتے تھے۔ جس جگہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کا لیکچر ہوگا وہاں مخلوق ٹوٹی پڑتی تھی۔ قدم رکھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی لوگ وقت مقررہ سے گھنٹوں پہلے آجمتے تھے۔ جس وقت حضرت تشریف لاتے تھے خوشی کے نعروں سے سارا مکان گونج اُٹھتا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایک شیر دل شیوہ بیان اپنے کلام سے دلوں کو ہلا دینے کے لیے آرہا ہی ہنگام تقریر آپ کی

آواز سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایک بہادر شیر ڈکرا رہا ہے جس بیان کو لیا ظرافت سے۔ متانت سے طرزِ بیان سے اس کا روپ دکھا دیا۔ چاہا روتوں کو ہنسا دیا۔ اور چاہا ہنستوں کو رُلا دیا۔ گویا تمام حاضرینِ جلسہ ایک کٹھ پتلی تھے۔ جس کا تار آپکے ہاتھ میں تھا جس طرف ہاتھ اُٹھایا تلوار کے بغیر ذبح کرتے چلے گئے۔ جس طرف نظرِ لطف اُٹھائی گویا سیکڑوں کو دولتِ عظیم بخش دی۔ کسی موقعے پر عاشقانہ نیاز کسی موقعے پر معشوقانہ انداز عجیب سماں باندھ دیتا تھا۔ اگر کسی انجمن کے واسطے چندہ مانگا۔ تو لوگوں کے دلوں پر یہ سحر چھایا کہ اپنی جیبیں خالی کرکے یار دوستوں کی جیبیں قرضِ حسنہ کے لیے ٹٹولنے لگے۔ کوئی عالم اپنے زمانے میں بغیرِ کوشش کے اس قدر اعزاز کا مستحق نہ ہوا جس قدر مولوی نذیر احمد صاحب نے باوجود استغنا اعلےٰ ترین اعزازی ڈگریاں حاصل کیں اور بیش قرار انعامات لیئے ایسے بے کپٹ بے کینہ۔ صاف دل۔ صاف گو آدمی اب کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ مرنے سے دو چار برس پیشتر حاسدوں نے اُمہات الامہ کی آڑ پکڑ کر آپ کے دل کو ازحد صدمہ پہونچایا۔ جس کا اثر مرتے دم تک باقی رہا۔ اس صدمے نے آپ کی عمر کے آخری برسوں میں تعلیم و تعلم کا دروازہ بند کرا دیا۔ اور مولوی صاحب کو گوشہ نشین بنا دیا گو کتاب مذکور میں بعض الفاظ بہ ظاہر ذرا سبک تھے اور مولوی صاحب ان کو بدلنے پر بھی راضی تھے۔ مگر چوں کہ خود غرضوں کا مطلب اس سے نہیں نکل سکتا تھا اس وجہ سے انھوں نے دوسرا پہلو اختیار کیا۔ اور آخر کتاب کو ناپید کرا دیا۔ یہ پادری احمد شاہ صاحب شائق کی کتاب امہات المومنین کا جواب تھا۔ اور ایسا دنداں شکن جواب تھا۔ کہ معترضین کے دانت کھٹے کر دیتا۔ مگر افسوس کہ لوگوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقع نہ ملا۔ اس کتاب کی آڑ میں کفر و الحاد کے فتوے مولانا نذیر احمد کے برخلاف لکھوائے گئے۔ مگر ان فتووں سے نہ مولوی صاحب کافر بنے اور نہ کفر کی کوئی شرط بدلائل ثابت ہوئی۔ البتہ اُن کی تصانیف اور علمی فیض کا دروازہ بند کرانا تھا۔ سو کرا دیا۔ اصل بات کو نہ سمجھے مولوی صاحب کی طرزِ تحریر کو نہ پرکھا۔ کہ وہ ہمیشہ ناولانہ رنگ میں لکھتے تھے۔ اور اس رَو میں حسبِ موقع جو نئے الفاظ مناسب معلوم ہوتے ان کو نہیں چھوڑتے تھے مثلاً چترائی اور چاتر ہم معنی الفاظ ہیں مگر لفظ چلتر نے جو عاشقانہ فسانہ نگاروں نے عورتوں کی بے وفایانہ عیاری کے واسطے مختص کر لیا تھا یہ غضب ڈھایا۔ کہ ایک بہت بڑے فاضل کا دل دُکھا دیا۔ اگر چلتر کی بجائے چترائی لکھا جاتا تو یہ اعتراض بھی اُڑ جاتا اور ان کا دل نہ دُکھتا۔ لیکن یہ دل دُکھانا خود غرضوں کے حق میں اچھا اور ہمارے حق میں بُرا ہوا۔ کیوں کہ اس نے بہت سے بیش قیمت لعل و جواہر کو ان کی معدنِ طبیعت سے باہر نہ آنے دیا۔ ورنہ اس تین چار برس کے عرصے میں خدا جانے کون کون سے گلِ ناشگفتہ کھلتے اور کیا کیا بہار دکھاتے۔ یہ منصفانہ رائے شاید ہمارے واسطے بھی ایسا فتوے لیئے کھڑی ہو۔

مولوی صاحب کا سن ۸۲ برس سے کم نہ تھا۔ گویا وہ اپنی عمرِ طبیعی کو پہونچ چکے تھے۔ مگر ان کا ایک ایک سانس غنیمت تھا ہائے مولوی صاحب اب تم کہاں اور ہم کہاں۔ وہ درس و تدریس کا دار العلوم بند ہو گیا۔ اگرچہ آپ کی تصانیف نے آپ کو زندہ دلوں اور ذی حیات اصحاب میں ہر وقت شمار ہونے کے قابل بنا دیا ہے۔ آپ کی صحبت ہر وقت میسر ہے۔ مگر وہ لب و لہجہ کہاں۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ کہاں وہ اخلاق سے بھرے ہوئے الفاظ کہاں کہ بات بات میں مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں۔

ہم آپ کو نہیں روتے اپنی قسمتوں کو روتے ہیں۔ جتیرا آنسوؤں سے دھوتے ہیں مگر ہمارے چہروں کی اُداسی ماتمی رنگت میں فرق نہیں آتا +

ہم سے زیادہ قلق مولوی بشیر الدین احمد صاحب آپ کے فرزند رشید کو ہی جن کے سر سے ایسا بابرکت سایہ اور بے نظیر باپ اُٹھ گیا ویگر لواحق بھی اس کہرام سے باہر نہیں مگر مرضی مولا جو خدا تعالےٰ کو منظور تھا وہ ہوا۔ ایسے شخص کا نعم البدل ناممکن ہی۔ صبر و شکر کے سوا چارہ نہیں۔ اگرچہ وہ اپنے نیک اعمال کے باعث دعائے مغفرت کے ضرورت مند نہیں مگر ہماری محبت اور ہمارے دل نہیں مانتے کہ ہم اُن کی روح پاک کو درود و فاتحہ کا ثواب نہ پہونچائیں اور ان کے عزیزوں کے ساتھ دلی ہمدردی نہ برتیں آپکے ارتحال پرُملال کی دو ہجری تاریخیں پیش نظر ہیں اگرچہ بعض لوگ ان کو حقارت کی نظر سے دیکھیں گے مگر ہم تو ظاہر کیے بغیر نہیں رہتے ایک "افتخار دین" دوسری "چراغ دین نبی"۔ دوسری تاریخ اُن کے حسب حال ہی کہ آپ نے جو دینی کام کیے اُنھوں نے آپ کو دین نبی کا چراغ ثابت کردیا اور گمراہوں کو سیدھا راستہ دکھا دیا تھا +

پھول لاہور ۸ / مئی سنہ ۱۲ء

شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب نے فالج کی بیماری سے ۳ مئی کو دہلی میں انتقال کیا۔ ہندوستان کو اس موت سے سخت نقصان پہونچا +

تہذیب نسواں لاہور ۸ / جون سنہ ۱۲ء

شمس العلماء مولانا نذیر احمد مرحوم

نذیر احمد کی مرگ پرُالم کا واقعہ سُن کے　　ہوا سکتہ۔ نہ دل میرا رہا اپنے ٹھکانے میں
گراتا رہتا ہی۔ ہر روز بجلی آسماں ظالم　　مزا ملتا ہی اس کو قوم کی کھیتی جلانے میں
سدا روتی ہیں آنکھیں قوم کی قحط الرجالی کو　　ہی دل ٹکڑے مصیبت پر مصیبت کے اُٹھانے میں
کمی میں اک اضافہ ہوگیا پھر بدنصیبی سے　　بڑھا اک باب نو قومی مصیبت کے فسانے میں
نذیر احمد ہماری قوم میں فرد یگانہ تھا　　ذرا تاخیر تو کرتا یہاں سے اُٹھ کے جانے میں
اندھیرا قوم میں پھیلا ہی۔ اُس کی موت سے ہر سو　　وہ سورج تھا ہماری قوم کے روشن بنانے میں
ادیب و نکتہ داں اُس سا ملے۔ ہرگز نہیں ممکن　　نہ باور ہو تو لے کر شمع کو ڈھونڈو زمانے میں
ہوئی ہی مرثیہ خواں فخرِ ملت کی زباں میری　　سعادت مل گئی مجھ کو اسی رونے رُلانے میں

خاکسار بنت حفیظ اللہ امرتسر

مولانا نذیر احمد کی سوانح عمری
پیسہ اخبار لاہور ۳۰ مئی سنہ ۱۲ء

مولانا نذیر احمد کی سوانح عمری۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب خلف الرشید جناب شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب دہلوی اپنے ایک تازہ گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں کہ پیسہ اخبار میں میرے والد مرحوم کے حالات جو آپ نے لکھے ہیں۔ ان کے لیئے میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ مولانائے مرحوم کی سوانح عمری اُن کی زندگی ہی میں لکھی جا چکی ہی۔ اور چھپ بھی گئی ہی۔ صرف تھوڑی سی تکمیل باقی ہی ذرا ہماری پریشانی اور تکلیف کم ہو تو ان شاء اللہ یہ کتاب عنقریب شائع کردی جائے گی،، خدا کرے کہ مولوی بشیر الدین احمد

صاحب کو جلد اپنا وعدہ پورا کرنے کا موقع ملے اور لوگوں کو طویل انتظار کی وہ زحمت نہ اُٹھانی پڑے، جو شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی مرحوم اور خان بہادر شمس العلماء منشی محمد ذکاء اللہ صاحب دہلوی مغفور کی سوانح عمریوں کے معاملے میں پیش آئی ہے۔ جن کا ان کے ورثار کی طرف سے اسی طرح وعدہ کیا گیا تھا اور اب تک وہ پورا نہیں ہوا۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے اپنے گرامی نامے کے ساتھ وہ مطبوعہ گشتی چھٹی بھی ارسال کی ہے جو اپنے والد مغفور کی تعزیت کے پیاموں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے انھوں نے مختلف اصحاب کے نام بھیجی ہے۔ مولوی صاحب کو اس امر سے بہت تسلی ہے کہ اس حادثۂ روح فرسا میں ایک بڑا گروہ ان کے غم کو بٹانے والا ہے۔" آپ کو زیادہ تر افسوس اس امر کا ہے کہ اُن کی جگہ کسی طرح پر نہیں کی جاسکتی۔" مولوی بشیر الدین احمد صاحب کا یہ خیال درست ہے کہ اسلام اور قوم کی جو عظیم الشان خدمتیں اُن سے ظہور میں آئی ہیں وہ قیامت تک اُن کو مرنے نہ دیں گی۔ لیکن ملک و قوم مولوی صاحب موصوف سے اس امر کے متوقع ہیں کہ نہ صرف وہ اپنے والد مرحوم کی سوانح عمری حسب وعدہ جلد شائع کر دیں بلکہ اُن کی اور جو تصانیف نظم یا نثر مکمل یا نامکمل صورت میں ان کے پاس موجود ہوں ان کو بھی چھپوا دیں کیوں کہ مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ ادب اردو کے لیے ایک قیمتی چیز ہے۔

قطعات تاریخ نوشتہ شمس العلماء خان بہادر نواب عزیز جنگ المتخلص بہ ولا

فجع الوریٰ موت الادیب الفاضل — وھو المحقق للمخفی و للجلی
قال الولا تاریخہ بید اھلہٖ — وصل النذیر باحمد وھو العلی
۱۳۲۰ھ

قطعہ تاریخ نوشتہ مولوی فضل ستار صاحب المتخلص بہ لااُبالی امروہوی

بہ اندوہِ نذیر احمد کہ مردہ — نوائے تلخ تر از زہر گویم
زمانہ کرد بر ما قہر — گویم
سن فوتش مسیحی لااُبالی
رئیسِ نام ور فاضل ادیبے — نذیر احمد برفت از دہر گویم
۱۲ ۶۱۹

تاریخ وفات نوشتہ مولوی محمد عبد الخالق صاحب مدرس نارمل سکول حیدر آباد دکن

چوں حافظ مصحفِ الٰہی — کوس رحلت ازیں جہاں زد
گفتند ملک کہ آہ گردید — وارد بجناں نذیر احمد
۱۳۳۰ھ

تاریخ وفات مصنفہ مولوی عبد الجلیل صاحب المتخلص بہ طوفان سابق ڈپٹی کلکٹر رئیس قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ

شد مسند علم و فضل خالی — چوں شد ز جہاں نذیر احمد
تاریخ نوشت کلک طوفاں — وارد بجناں نذیر احمد
۱۳۳۰ھ

اقتباسات از رسائل

از عصمت دہلی

بابتہ مئی ۱۹۱۲ء

غم مغفور و استاد مرحوم

بے نظیر تھیں اور لاجواب بے مثل تھیں اور نایاب" وہ پاک اور صاف روحیں" جو عالم حیات میں "ہشاش بشاش آئیں شاداں و فرحاں ہیں" اور شگفتہ و خنداں رخصت ہوئیں دنیا ان کے فراقِ ابدی پر خون روئی۔ آسمان و زمین اُن کی موت پر بیتاب ہوئے زندوں نے اُن کا ماتم اور مردوں نے ان کا غم کیا۔ اپنوں نے سر پیٹے۔ غیروں نے آہ اور سُننے والوں نے واہ کی +
اُن کی رخصت عزیزوں کی بربادی۔ اُن کا کوچ۔ دوستوں کی بدنصیبی اور ان کی موت قوم کی موت تھی +

یہ متبرک ہستیاں کیا تھیں؟ کیا ہو گئیں اور کیا کر گئیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے وجود پر دنیا ناز کرتی رہی اور طبقۂ انسانی تا دم ابد ان کے نام سر آنکھوں پر رکھے گا جن کی تقریریں بے ہوشوں کو ہشیار جن کی تحریریں بے خبروں کو خبردار کر گئیں ہنستوں کو رُلانے اور سوتوں کو جگانے والے۔ آج خود مونہ سر لپیٹے جنگل بیابان میں پڑے ہیں +

مئی ۱۹۱۲ء کی تیسری رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے غم مغفور و استاد مرحوم شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب کا جنازہ وسطِ صحن میں رکھا ہوا ہے غسل و کفن ہو چکا صبح کا انتظار اور دفن کی دیر ہے کہ یہ نورانی صورت ہمیشہ ہمیشہ کو پیوند زمین ہو جائے۔ رات اپنی منزل طے کر رہی ہے۔ آسمان تاروں سے پٹا پڑا ہے۔ اور وہ گھر جس میں ہر وقت شیر دھاڑ رہا تھا سنسان پڑا ہوا ہے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ کے نعرے لگا رہے ہیں اور راشد بدنصیب اُس مُنہ کو تک رہا ہے جس سے پھول جھڑتے اور اُن آنکھوں کو دیکھ رہا ہے جس کو ظالم موت ہمیشہ کو بند کر گئی +

جسدِ خاکی سے رخصت ہونے والی روح! اپنے ادنےٰ خادم کا آخری سلام قبول کر۔ کیسی کیسی مقدس روحیں تیرے استقبال کو آئی ہیں محبت بھری نظروں سے میرے سلام کا جواب دے اور اصلی گھر سدھار جا +

آج نواب مرزا کا کوچہ فردوسِ بریں کا نمونہ ہے عالم ارواح کے وہ مکین جن کے نام صفحۂ دنیا پر چمک رہے ہیں اس رنگین مکان میں جمع ہیں اور جھوم جھوم کر اُس شعر کو ادا کر رہے ہیں جو آج سے تقریباً پندرہ برس پہلے مولانائے مرحوم نے سر سید کی شان

میں کہا تھا۔

اِسے روئے گی سر پر ہاتھ رکھ کر قوم بدقسمت　　اور اس کو دیکھ لے گا جو کوئی جیتا رہا باقی

(۱) عالمِ خیال اُستادِ مرحوم کے طفیل آج اُن مُقدّس صورتوں کی زیارت کر رہا ہے جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں۔ اہلِ قلم کی یہ بزرگ جماعت مرحوم سرسید کی صدارت میں عالمِ ارواح سے چل کر اس پاک روح کے استقبال کو آئی ہے جس کی قومی خدمات کا ڈنکا آسمان تک بج رہا ہے بقا و دوام کے مہکتے ہوئے پھول اُن کے مبارک ہاتھوں میں ہیں اور ملاءِ اعلیٰ کے بسنے والے بآوازِ بلند قومی موت کے نعرے لگا رہے ہیں +

(۲) موت یا فراقِ ابدی امیر۔ غریب۔ بڈھے۔ جوان۔ ہندو مسلمان۔ ہر ایک کا قابلِ افسوس ہے۔ مگر شمس العلما مولوی نذیر احمد کی موت ہم سے ایک ایسے بزرگ کو جدا کر گئی جس کی نظیر آنے والی دُنیا اب مشکل سے پیدا کرے گی۔ مولانائے مرحوم کب پیدا ہوئے کہاں ہوئے کیا سیکھا کس سے سیکھا۔ یہ پھر سہی اس وقت تو رونا یہ ہے کہ ''بزرگوار کی موت کیا کر گئی +

ابھی تو مونہہ سے یہ لفظ نکالنے کو جی نہیں چاہتا خدا نہ کرے کہ مقدّس اُستاد کا سایہ سر سے اُٹھے مگر کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ راشد اور راشدہ کے ساتھ تمدّن دونوں یتیم ہو گئے +

جو آنکھیں مولانائے مرحوم کی تحریر کا لُطف اُٹھا چکی ہیں اور جو کان مولانائے مغفور کی تقریر کا مزا لوٹ چکے ہیں وہ شاہد ہیں اس امر کے کہ شمس العلما مولانا نذیر احمد کی نظیر کامل ایک صدی میں بھی زمانہ پیدا نہ کر سکا۔ زندہ ہیں وہ سماں دیکھنے والی آنکھیں کہ مولانائے مرحوم کی تقریر پر مُن برسے کبھی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں اور کبھی ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے +

اُستادِ مرحوم کا وطن گو ضلع بجنور تھا اور دلّی میں جس وقت تشریف لائے تو سن پندرہ سولہ سال کے قریب تھا زبان کو جو کچھ ماں کی گود سے لینا تھا لے چکی تھی مگر مولانائے مرحوم نے دلّی کی زبان اس طرح حاصل کی کہ اُردوئے معلّٰی کا مزہ آ گیا سرزمینِ شاہجہان آباد اُس زبان پر مدّۃ العمر ناز کرے گی جو مغفور کے ساتھ قبر میں دفن ہو گئی +

اور بہت عرصے تک تو شمس العلما مولوی نذیر احمد پر حسرت کے آنسو بہائے گا اور قوم ہمیشہ مولانائے مرحوم کی بیش بہا خدمات کی ممنون رہے گی +

پنجابی کٹرہ جو دلّی نے ریلوے سٹیشن پر اس طرح قربان کیا کہ آج اُس کا نام و نشان تک نہیں میرے آباؤ اجداد کا مسکن تھا اور پنجابی کٹرے کی وہ مسجد جس میں میرے جدِّ امجد مولوی محمد عبد الخالق صاحب حدیث کا درس دیتے تھے طلبا کا دار القیام۔ ۱۸۵۰ء یا اُس کے لگ بھگ کا ذکر ہے کہ علاّمہ موصوف تحصیلِ علوم کی غرض سے اس مسجد میں داخل ہوئے گو اقبال کا ستارہ پیشانی پر چمک رہا تھا مگر افلاس کی مصیبت سر پر ٹوٹ رہی تھی تاہم شوقِ علم پائے ثبات اُکھڑنے نہ دیتا تھا +

اِن ہی دنوں میں میری بڑی پھوپی کے عقد کی تجویز پیش ہوئی۔ اگلے لوگوں کی باتیں اُن ہی لوگوں کو سزاوار تھیں۔ بڑی بڑی درخواستیں موجود تھیں اور ارمان تھا کہ مولوی زادی کی پالکی دروازے پر اُتر والیں مولانائے مرحوم کی طرف کیا عزیز و اقارب اور کیا دوست آشنا کسی کا وہم و گمان بھی نہ تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ امیروں۔ رئیسوں۔ عالموں۔ فاضلوں کے ہوتے ساتھ ایک پردیسی طالب علم کو کون پوچھتا مختصر یہ کہ مولوی عبد الخالق صاحب مرحوم کے سامنے سب نام پیش کیے گئے

اللہ غنی کس دل گردے کے لوگ اور کیسے صابر و شاکر بندے تھے مولوی صاحب مرحوم کیا فرماتے ہیں جس شخص میں یہ تین صفتیں ہوں اُس سے کرو نماز کا پابند معاملے کا اچھا اور زبان کا سچا۔ امیدواروں میں تو ایک بھی اس کسوٹی پر پورا نہ اُترا تلاش کے دائرے کو وسیع کیا تو نگاہ مولانائے مغفور پر جا کر ٹھٹکی۔ آج مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم اور مولوی نذیر احمد صاحب مغفور دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں مگر مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم جیسے جید عالم کی پوتی کا بیاہ لینا جس کے عقد کی شرطیں یہ کچھ کڑی ہوں استادِ مرحوم ہی کا کام تھا۔ خدا غریقِ رحمت کرے میری بڑی پھوپی کو اس شادی کا ذکر اس طرح فرماتی تھیں کہ جب مسجد میں نکاح ہو چکا ہی تو دولھا کو ہم سب نے بھی دیکھا کُرتا۔ پاجامہ سفید تھا ٹوپی بھی خاصی تھی مگر جوتی کے کنّے نکلے ہوئے تھے اماں نے ایک عورت کے ہاتھ چپکے سے ایک روپیہ بھیجا کہ جوتی پہن لو۔ تھوڑی دیر بعد وہی عورت پونے چار آنے واپس لائی اور کہا سوا بارہ آنے کی جوتی آئی ہی +

یہ تعلق مولانائے مرحوم کے واسطے کوئی مابہ الامتیاز شے نہ تھی مدرسے کا سلوک اُن سے وہی تھا جو ہمیشہ رہا اور جو سب طالب علموں سے تھا شام ہوتے ہی تھوڑی سی روئی اور تیل سب کو مل گیا اپنے ہاتھ سے بتیاں بٹو اور جلاؤ جس کا تیل زیادہ خرچ ہو وہی شاباش کا مستحق ہی مسلمانوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی اور اگلے زمانے کے لوگ انتظام اتنا معقول کہ تیل کی ایک بوند بھی ضائع نہ ہو اور شوق ایسا بڑھا ہوا کہ چراغ ٹمٹما رہا ہی تیل ختم ہو گیا رات کہیں کی کہیں پہونچی مگر سبق یاد کیے بغیر سونے کو جی نہیں چاہتا مولانائے مرحوم اکثر فرماتے تھے مدرسے میں سناٹا ہوتا تھا سب پڑے سوتے تھے اور میں چراغ کے آگے اپنا سبق یاد کرتا ہوتا تھا +

یہ تھا وہ ذوق و شوقِ تعلیم و تربیت اور فیضِ صحبت جس نے مولانائے مرحوم کو انسانیت کے پورے جواہرات سے مزین کرنے کے بعد اُن کا اسمِ گرامی آسمانِ ادب پر قمرِ چہار دہم کی طرح چمکا دیا +

مجھے اس وقت استادِ مرحوم کی قابلیت ملازمت احسانات خدمات کسی سے بحث نہیں البتہ کچھ کہنا ہی اُس کتاب کے متعلق جو اُمہات الامہ کے نام سے مشہور ہوئی اور جس پر بحث کرتے ہوئے بارہ[1] مئی کے روزانہ پیسہ اخبار میں مولوی سید احمد صاحب نے اُن لوگوں کو جنھوں نے محض اغراضِ نفسانی کی وجہ سے اس کتاب کی مخالفت کی نہایت معقولیت سے جواب دیا ہی +

مولانائے مرحوم قبر میں جا پہونچے اور مجھ کو پہونچنا ہی مگر میں شاہد ہوں اس امر کا کہ گزشتہ دس سال میں مرحوم کی زبان سے کلامِ ربانی کی کبھی کوئی آیت اس طرح نہ نکلی کہ آنکھ سے آنسو نہ گر رہا ہو +

ناظرینِ تمدن کو وہ مضمون یاد ہوگا جو مئی ۱۹۱۱ء کے پرچے میں "انسان فرشتے کی عینک سے" کے عنوان سے شائع ہوا یہ مضمون جب مولانائے مرحوم نے سُنا چہرہ سُرخ ہو گیا بدن کانپ رہا تھا۔ ناخوش ہوئے اور میرے سامنے ایک مختصر سا لکچر شروع کیا وہ وقت میری آنکھ کے سامنے ہی کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام آتے ہی اُن کی حالت بگڑ گئی زار وقطار رونے لگے اور مجھ سے فرمایا اگر اجرائے تمدن کا مقصد اسلام کی تضحیک ہی تو آیندہ مجھ کو صورت نہ دکھانا +

وہ شخص جو اسلام اور بانیٔ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایسا شیدا تھا کیا اِس حملے کا مستحق تھا کہ علمائے اسلام یہ فتوے دیں کہ اس کے جنازے کی نماز درست نہیں +

[1] مئی کے دوسرے ہفتے کی کوئی سی تاریخ ۱۲

حق الامر یہ ہی کہ اُمہات الاُمّہ وہ کتاب تھی کہ نہ آج مسلمانوں میں کوئی ایسا نظر آتا ہی نہ آیندہ برسوں نظر آنے کی اُمید ہی کہ غیر مسلموں کے سامنے اس قابلیت سے پیغمبرِ اسلام صلعم کی رسالت کو ثابت کر جائے اور مسلمانوں کے واسطے اتنا لٹریچر مہیا کر دے۔ جو امہات الاُمّہ میں ہی +

قوم کی بدقسمتی ہی کہ علاّمہ بلگرامی نے اُمہات الاُمّہ کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی خواہش ظاہر کی اور یقیناً دیر یا سویر میں اجازت حاصل کر لیتا مگر علاّمہ موصوف کی موت نے تکمیل نہ ہونے دی +

بعض اخباروں کی رائے کہ مولانائے مرحوم کو جب یہ معلوم ہوا کہ علمائے اسلام اس پر معترض ہیں تو کتاب اُن کے حوالے کر دی قطعی غلط ہی جس طرح یہ کتاب حاصل کی گئی اور جو اس کا حشر ہوا اس کا خیال تکلیف دہ ہی۔ انتقال سے چند روز پہلے جب میں نے امہات الاُمّہ کی اشاعت کے واسطے عرض کیا تو خاموش ہو گئے مگر میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ صورت چند روز کی مہمان ہی اصرار کیا مجبور کیا ضدّ کی ہٹ دھرمی کی خوشامد کی آخر مولوی رحیم بخش کو بُلا کر کہا کہ کوئی جلد مل سکتی ہی اُنھوں نے جواب دے دیا تو فرمانے لگے کہ "بیٹا جانے دو" ایسے ناز بردار بزرگ ایسے شفیق اُستاد اب کہاں میری التجا حد سے بڑھ گئی تو چاروں طرف کتاب تلاش کی آخر ایک جگہ سے بمشکل تمام دس روز کے واسطے ایک خاص شرط پر مل سکی۔ رات کا وقت تھا کہ مجھ کو طلب فرمایا کتاب دی اور حکم دیا کہ اپنے ہاتھ سے اس کی نقل کر لو اور تکمیل کے بعد مجھ کو سُنا دو ڈھائی سو روپے تک کے خریدار ایک ایک جلد کے موجود ہیں ایسا نہ ہو کہ کتاب تلف ہو جائے میں نے مار امار کتاب نقل کی لکھ کر حاضر ہوا۔ مناسب ترمیم اور تغیر و تبدل کے بعد وہ بیش بہا اوراق اب میرے پاس ہیں لیکن مجھ جیسا گوشہ نشین جو داخل شدہ ضمانت ہی کے واسطے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا ہی۔ مخالفین کا کیا مقابلہ کر سکتا ہی البتہ کتاب میرے کلیجے سے لگی ہوئی ہی اور اگر اس کی اشاعت میرے ہاتھوں ہو گئی تو یہ کہوں گا +

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

اُستاد مرحوم کے مفصل حالات جو کچھ لکھ سکتا ہوں آیندہ پرچوں میں لکھوں گا۔ سرِدست وہ چند الفاظ امہات الاُمّہ کے دیباچے سے نقل کرتا ہوں جو بتائیں گے کہ شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب نے یہ کتاب کیوں لکھی۔ باقی آیندہ　　"راشد الخیری"

"کئی برس ہوئے گذرگانوے کے ایک پادری صاحب مذہبی مناظرے کے پیرائے میں حدِّ اعتدال سے بڑھی ہوئی آزادی عمل میں لائے کہ اپنے ایک رسالے میں پیغمبرِ آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت اُن کی بی بیوں کے بارے میں بڑی زباں درازی کی جس سے جمہور مسلمین کی دل آزاری ہوئی مسلمان جگہ جگہ استغاثۂ فوجداری کی تیاریاں کرنے لگے اور جگہوں کا حال تو معلوم نہیں دلّی سے کچھ لوگ فریاد لے کر شملے گئے ہارے پادری صاحب کی کتاب کی اشاعت حکماً بند کر دی گئی۔ اسی اثنا میں سر سید احمد خاں مرحوم مغفور بھی پادری صاحب کی کتاب کا جواب لکھ رہے تھے۔ وہ پورا نہیں ہونے پایا تھا کہ سیّد صاحب انتقال فرما گئے۔ ہم نے نہ تو پادری صاحب کی کتاب دیکھی نہ سیّد صاحب کا ادھورا جواب مگر اتنی بات پہلے سے معلوم ہی کہ پادری صاحب نے سخت زبانی کے سوائے اعتراض میں کوئی نئی بات اپنی طبیعت سے تو ایجاد کی نہ ہو گی۔ اعتراض تو نہیں مگر جواب خود قرآن میں موجود ہی

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً - جواب کا ہونا دلالت کرتا ہی کہ نزولِ قرآن کے وقت بھی پیغمبر صاحب کی زندگی میں بعض لوگ زن و فرزند کے تعلّقات کو خلافِ شانِ پیغمبر سمجھتے اور ان ہی تعلقات کی وجہ سے جنابِ رسالت مآب کی رسالت کے منکر تھے غرض پُرانا اعتراض ہی اور علمارِ اسلام نے اس کے دنداں شکن جواب بھی دیئے ہیں مگر مسلمان ہوکر اپنے پیغمبر کے تقدّس کی اپنے مقدور بھر اور اپنے طور پر واجبی حمایت کیئے بدون ہم سے نہیں رہا جاتا اور یہ بات بھی ہی کہ اعتراض کسی مسلمان کے کان میں پڑے اور اس کو جواب نہ آتا ہو اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدّس کی نسبت خیالِ فاسد موہم سوءِ ادب دل میں بیٹھ جائے تو ایمان کے جاتے رہنے کا خوف ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا - (ماخوذ از اُمہات الامّہ)

از نظام المشائخ دہلی جمادی الاخری ۱۳۳۰ھ

وفات مسلمانوں علی الخصوص اہلِ حلقے کے لیئے یہ خبر الم انگیز ہی کہ دہلی کے شہرۂ آفاق بزرگ مولوی حافظ ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے گزشتہ ہفتے میں وفات پائی۔ مرنے والا کون تھا؟ سر سید احمد خاں کا قوتِ بازو۔ اُردو زبان کا فروغ دہندہ۔ دورِ جدید میں سب سے عمدہ آزادی و بے باکی سے لکچر دینے والا۔ اگلے وقت کے مسلمانوں کی چلتی پھرتی نشانی۔ مگر یہ امور ظاہرداری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اربابِ باطن جن چیزوں کے قدر دان ہیں وہ مرحوم کا اُردو ترجمۃ القرآن اور کتاب "الحقوق والفرائض" وغیرہ ہیں۔ نیز زندگی کا وہ آخری حصہ ہی جس میں مرحوم دنیاوی تعلقات ترک کرکے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ یہ ایام ہمارے عقیدے میں اُن کی عمر کے بہترین ایام تھے۔ گھر کا چُپ چاپ گوشہ۔ تلاوتِ قرآن۔ نماز۔ ذکرِ خدا۔ ذکرِ اولیاء اللہ۔ اُن کے مونس و دم ساز تھے۔ راقم الحروف سے اکثر تخلیے کی صحبتیں رہتی تھیں جن میں خدا والوں کی باتیں ہوتی تھیں۔ اور مرحوم کو زار قطار رُلواتیں۔ کون سمجھ سکتا ہی کہ ڈپٹی صاحب کے رُوکھے خشک مزاج وجود میں گریہ و بکا جیسا درویشی وصف ہونا ممکن تھا۔ مگر یہ ایک واقعہ ہی جو راقم کو بارہا پیش آیا +

عجیب اتفاق ہی۔ خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ۔ اور شمس العلماء حافظ نذیر احمد نئے زمانے کے اُن لوگوں میں شمار ہوتے تھے جن کو لذتِ دین سے نا آشنا سمجھا جاتا ہی مگر دونوں کا انجام کار درویشانہ ہوا +

مولوی ذکاء اللہ مرحوم نے مرنے سے چند روز پہلے چشتیہ طریق کے تمام خاص اوراد ذوق و دلی سے حاصل کیئے۔ اور اُن میں ایسے منہمک ہوئے کہ آخری سانس تک پاسِ انفاس جاری تھا۔ نیز وصیت کرکے ایک نظامیہ بزرگ کے پہلو میں مرقد بنوایا +

ڈپٹی صاحب پر اپنے یارِ غار کی مثال کا گہرا اثر پڑا تھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ میاں حلقہ قائم کیا ہی تو اُس کی کوئی اندرونی کڑی میرے دل میں بھی ڈال دو۔ حلقے کے جلسوں میں شرکت کے ہمیشہ آرزومند رہے۔ لیکن چونکہ جلسے رات کو ہوتے ہیں علالت کی وجہ سے کبھی شرکت کا موقع نہ ملا۔ القصہ مرحوم کی وفات ہم سب خدام الحلقے کے لیئے موجبِ تاسف ہی۔ حضرات مشائخ سے التماس ہی کہ وہ مرحوم کے واسطے دعائے مغفرت کریں +

از الناظر (لکھنؤ) جون ۱۹۱۲ء

مسلمانوں کی قومی کشتی طوفان زدہ تو ایک مدت سے تھی مگر اب بالکل ہی گرداب میں پھنسی نظر آتی ہی۔ ناخدایان خواب آلود بہ ظاہر جو کچھ معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہی کہ ہنوز مستِ غفلت ہیں اور غضب یہ ہی کہ جو بیدار و ہشیار تھے بلکہ اوروں کو جگاتے اور ہوش میں لاتے تھے وہ ایک ایک کرکے اُٹھتے

جاتے ہیں۔ یہ سال ہمارے قومی رہنماؤں کے حق میں نہایت مہلک ثابت ہوا۔ ابھی ایڈیٹر وکیل اور مولوی عزیز مرزا کی بے وقت موت پر مسلمانوں کے اشکِ غم خشک نہ ہوئے تھے کہ خان بہادر آنریبل شیخ غلام صادق کے سے تعلیمی دلچسپی رکھنے والے بزرگ قوم نے انتقال کیا۔ اور ابھی شیخ صاحب موصوف کے گل ہائے مزار مُرجھانے نہ پائے تھے کہ شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی نے اس دارِ فانی کو خیرباد کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگر سرسید کو مسلمانوں کے قومی آسمان کا آفتاب کہا جائے تو مولانا نذیر احمد اُس آسمان کے ماہ تاباں کہے جاسکتے تھے۔ اور اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے اُس بڑے مصلح کے ساتھ مل کر جن بزرگانِ قوم نے ہماری قومی کشتی کو منزلِ مقصود پر پہونچانے میں جدوجہد کی ہے اُن کے گروہ میں مولانا ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم پر کسی شخص کی آمد آمد کا وہ غلغلہ نہیں ہوتا تھا جو مولانا کے لیکچر کے وقت ہوا کرتا تھا اور پبلک کا یہ غیر معمولی رجحان اور بھٹکے ہوئے قافلے کا اس شدّ ومدّ کے ساتھ مولانا کی بانگ درا پر دوڑنا اس بات کا پورا اور کافی ثبوت ہے کہ مولانا کی اعلےٰ قابلیتوں نے دلوں پر نہایت گہرا اثر کیا تھا۔ اور یہ حسنِ قبول مولانا کی سچّی عظمت اور اصلی منزلت کو بہت بلند کردیتا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی انشاپردازی ہماری زبان کی سب سے قیمتی ملک ہے۔ غالب و آزاد کی طرح مولانا نذیر احمد کا بھی ایک خاص رنگ ہے اور چونکہ یہ رنگ قوم کے اخلاق اور معاشرت کی اصلاح کے اہم ترین مباحث پر چڑھایا گیا ہے اس لیئے بلاشبہہ اُس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ مولانا کی شاعری سے عام طور پر لوگوں کو زیادہ واقفیت نہیں ہے جس کی وجہ اصلی یہ ہے۔ کہ اُنھوں نے اپنے آپ کو ملک کے سامنے بحیثیت شاعر کے کبھی پیش نہیں کیا۔ جو نظمیں اُنھوں نے وقتاً فوقتاً لکھیں وہ کسی نہ کسی قومی جلسہ میں پڑھی گئیں اور اُس کے باہر لوگوں کو اُن سے واقف ہونے کا موقع نہیں ملا۔ مگر ہمارے کرم فرما مولوی افتخار عالم مارہروی نے حال ہی میں اُن کی تمام نظموں کا مجموعہ "مجموعۂ نظم بے نظیر" کے نام سے شائع کیا ہے اور یہ گراں بہا جواہرات کا گنجینہ صرف ۸ر میں دفتر الناظر سے مل سکتا ہے آیندہ کسی موقع پر ہم اس مجموعے پر تفصیلی ریویو کر کے ناظرینِ الناظر کو مولانا کی شاعرانہ حیثیت سے پوری طرح روشناس کرائیں گے۔ ہمیں مولانا کے پس ماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی ہے +

از ادیب (الہ آباد) بابتہ جون سنہ ۱۹۱۲ء

مولانا نذیر احمد مرحوم (ولادت غالباً سنہ ۱۸۳۲ء۔ وفات ۳ مئی سنہ ۱۹۱۲ء) اتنی بات ہر شخص جانتا ہے۔ کہ موت و زندگی فنا و وجود میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن اس علم کے باوجود بھی ہمارے اعمال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دنیا اپنے مناظرِ عبرت کے پیش کرنے میں ہمہ وقت مشغول ہے۔ فنا و موت کے مؤثرات ہر پہر لگے جاری ہیں۔ بڑے بڑے تاج دار و کج کلاہ دفعتہً تودۂ ریگ بن جاتے ہیں۔ بسترِ گل و فرشِ مخملیں پر استراحت کرنے والے چشم زدن میں پیوندِ خاک ہوجاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن ہمیں خبر تک نہیں ہوتی۔ اور اگر خبر ہو بھی۔ تو اثر نہیں۔ تاہم ان ہی موتوں میں سے بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جو ہم جیسے مدہوشوں تک کو چونکا دیتی ہیں۔ اور جن سے دو ایک۔ سو پچاس۔ افراد متاثر نہیں ہوتے۔ بلکہ جن سے ساری جماعت میں صفِ ماتم قائم ہوجاتی ہے۔ سارے ملک کے عشرت کدوں میں سنّاٹا چھا جاتا ہے۔ اور ساری قوم کے شبستانِ عیش بے چراغ ہوجاتے ہیں۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد صاحب۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ڈی۔ او۔ ایل۔ کی وفات بھی اسی قسم کی ایک موت ہے۔ وہ کوئی انفرادی سانحہ۔ کوئی شخصی واقعہ۔ نہیں۔ بلکہ ایسا عالم گیر حادثہ ہے جس کا احساس ہر اُردو داں فرد کے لیئے ناگزیر ہے۔ مرحوم موجودہ لوگوں میں ادبِ اُردو کے سب سے بڑے محسن تھے اور

اس بنا پر ادیب جس کا مقصدِ اوّلین ادبِ اُردو کی خدمت گزاری ہی - اُس کا فرض ہی - کہ مرحوم کی وفات پر اشکِ حسرت بہائے - اور اُن کی میت پر تعزیت کے پھول چڑھائے +

موجودہ دَور نے سنجیدہ مضامین کے جو چند گراں پایہ مصنفینِ اُردو پیدا کیئے - اُن کے بہترین افراد یہ ہیں - سر سید - آزاد - نذیر احمد حالی - اور شبلی - ان میں سے ہر ایک اپنے رنگ میں منفرد ہی - اور اس میں کمال کا درجہ رکھتا ہی - اِس لیئے ان میں سے کسی ایک کو قطعیت کے ساتھ - دوسرے پر ترجیح دینا ایک بے جوڑ سی بات ہی - تاہم بعض خصوصیات کے لحاظ سے ایک کو دوسرے پر علانیہ تفوق حاصل ہی مثلاً موجودہ سلیس او عام فہم طرزِ تحریر کو علمی التصانیف[1] میں رواج دینے کا فخر سر سید کو حاصل ہی - سوانح عمریاں لکھنے کی بنیاد حالی کے ہاتھوں پڑی - انگریزی مذاق کی مناسبت سے اُردو میں ایک خالص انشا پردازانہ طرزِ ادا کی ایجاد کا سہرا آزاد کے سر ہی - دقیق علمی مباحث و نیز تاریخی واقعات کے بیان میں شگفتگی و دلآویزی پیدا کر دینے سے اعزاز کا مستحق شبلی ہی - غرض اپنے اپنے امتیازی خصوصیات کے لحاظ سے ہر مصنف اپنی جگہ یگانۂ فن نظر آتا ہی - تاہم ایک شے ایسی ہی جس میں اُردو کا کوئی مصنف نذیر احمد کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور وہ اُس کی وسعتِ اثر ہی - اُردو کے بہتر سے بہتر اہلِ قلم کا بھی حلقۂ اثر محدود ہی - اُس کی تصنیفات کے مطالعہ کرنے والے خاص خاص طبقات ہیں - لیکن نذیر احمد کے نام سے بچّہ بچّہ واقف ہی - نیم تعلیم یافتہ مرد جو آزاد و شبلی کا ایک صفحہ سمجھنے کی بھی استعداد نہیں رکھتے - نذیر احمد کی کتابوں کو پڑھتے ہیں - اور مزے مزے لے کر پڑھتے ہیں خواندہ مستورات جنھیں سر سید - حالی - و ذکار اللہ کی خشک تحریروں سے وحشت ہوتی ہی نذیر احمد کے نام پر سر دُھنتی ہیں - عام افراد جو عربی و فارسی سے مطلق بے بہرہ ہیں - نذیر احمد کے وضع کردہ الفاظ و اصطلاحات کو روزمرّہ گفتگو میں بلا تکلف استعمال کرتے ہیں - یہ قبولِ عام یہ وسعتِ اثر بلا وجہ نہیں - اِس کے اسباب ہیں جنھیں ہم نذیر احمد کی انشا پردازی کی دیگر خصوصیات کے ساتھ ذیل میں نمبروار الگ الگ دکھاتے ہیں +

(۱) - ترجمۂ تعزیراتِ ہند - یہ عام قاعدہ ہی - کہ دُنیا کی معمولی زندگی اور روزانہ کاروبار میں ہم جن الفاظ کا سب سے زیادہ استعمال کرتے ہیں وہ وہ ہوتے ہیں جن کا تعلّق حاکمِ وقت کے قوانین سے ہوتا ہی - حکّامِ عدالت - اہلِ عملہ - وکلا و پیروکار - فریقینِ مقدمہ ملازمانِ پولیس ان سب کی مجموعی تعداد بجائے خود - آبادیِ ملک کا بہت بڑا حصّہ ہوتی ہی - پھر عام باشندوں میں بھی شاذ و نادر افراد ایسے ہوتے ہیں جنھیں عدالتی کارروائیوں سے کسی قسم کا تعلق نہ ہو - اس لحاظ سے یہ بالکل قدرتی امر ہی کہ قانونی اصطلاحات لٹریچر کا نہایت اہم جزو ہو بلا - چنانچہ مولانا نذیر احمد کی ادبی اہمّیت کا اصلی راز یہ ہی - کہ انھوں نے قانونِ فوجداری کی قاموسِ اعظم مجموعہ قوانینِ تعزیراتِ ہند کا ترجمہ کیا - اور انگریزی الفاظ - اصطلاحات و طرزِ تحریر کو اس خوبی کے ساتھ اُردو کے قالب میں بدلا - کہ اگر خود اُردو میں اصل کتاب تصنیف کی جاتی تو امید نہیں - کہ اس ترجمے سے بہتر ہو سکتی - قانونی اصطلاحات کے وضع کرنے میں انتہائی احتیاط - دُور اندیشی - نکتہ سنجی - اور زباں دانی کی ضرورت ہی - اس لیئے کہ معنی میں ذرا سا گھٹ بڑھ ہوا - کہ قانون کا سارا منشار فوت ہو گیا - لیکن مولانا نذیر احمد نے اس خدمت کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیا - کہ اخلاف کے لیئے اس میں اصلاح کی گنجائش نہ رہی - اور ان کے وضع کردہ اصطلاحات تمام ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک پھیل گئے - استحصال بالجبر - خیانتِ مجرمانہ - ازالۂ حیثیتِ عرفی - اِقدامِ جرم - ارتکابِ جرم - قتلِ عمد - مجمعِ خلافِ قانون -

[1] علمی التصانیف کی قید اس لیئے ہی کہ پنچ کے سطوط وغیرہ میں اس طرزِ تحریر کی اصل بانی غالب تھا ۱۲

استحقاقِ حفاظتِ خود اختیاری۔ حبسِ بیجا۔ سکۂ تلبیس۔ مداخلتِ بیجا۔ جرائم خلافِ وضعِ فطری۔ حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور۔ چند منجملہ اُن صدہا الفاظ کے ہیں۔ جن کو آج جاہل سا جاہل شخص بھی بلا تکلف استعمال کرتا ہی۔ اور تعلیم یافتہ افراد تک یہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ الفاظ اُردو کی عام ارتقائی رفتار کے ساتھ ساتھ وجود میں آئے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہی کہ اُردو میں ان کو روشناس کرنے کا فخر صرف ایک فردِ واحد یعنی نذیر احمد کو حاصل ہی۔ ان الفاظ کی پیدائیش کو ایک قرن سے زائد گزر چکا۔ لیکن انصاف سے کہو کہ ان مفاہیم کو ادا کرنے کے لیے ان سے بہتر کوئی الفاظ آج بھی کسی کے ذہن میں آتے ہیں؟ اور صرف تعزیرات ہند ہی نہیں بلکہ ضابطۂ فوجداری۔ قانونِ اسٹامپ۔ قانونِ انکم ٹیکس بھی مولانا ہی کے ترجمہ ہیں +

(۲) ترجمۂ قرآن۔ جس طرح اجتماعی زندگی میں ہمیں قانونی و سرکاری معاملات سے ہر وقت سابقہ رہتا ہی۔ اسی طرح حیاتِ منزلی پر عموماً سب سے زیادہ گہرا اثر مذہب کا ہی۔ اہلِ اسلام کی خانگی زندگی بھی مذہب کے اثر میں اس قدر محیط ہی۔ کہ رواجاً ان کے یہاں ہر فرد پر قرآن کی روزانہ تلاوت کرنا فرض ہی۔ اس بنا پر اس کی سخت ضرورت تھی کہ ان کی الہامی کتاب کا ترجمہ ملکی زبان میں موجود رہے۔ چنانچہ جب سے اُردو زبان ہندوستان میں عام طور پر رائج ہوئی۔ اُس وقت سے اب تک قرآن کے متعدد ترجمے ہو چکے ہیں۔ لیکن آج سے میں سال قبل جتنے اُردو ترجمے موجود تھے۔ ان کی عبارت بجائے خود چیستان تھی۔ اور عربی زبان سے معتدبہ واقفیت رکھنے والے ہندوستانی مسلمان کے لیے یہ فیصلہ دشوار تھا کہ قرآن کے اصل متن اور اُس کے اردو ترجمے میں اُس کے لیے زیادہ قریب الفہم کون ہی۔ شمس العلما نذیر احمد نے ادبِ اُردو کے خزانے کی اس کم مایگی کو رفع کر دیا اور اگرچہ ان کا ترجمہ بھی نقائص سے خالی نہیں۔ تاہم یہ ایک امرِ واقعی ہی کہ اردو میں کوئی ترجمۂ قرآن اس سے بہتر کیا۔ بلکہ اس کے برابر بھی اب تک موجود نہیں +

عام ترجموں کے برخلاف الہامی کتابوں کے مترجم کے لیے صرف زبان دانی و انشا پردازی کافی نہیں۔ بلکہ اُن کے ترجمے کے لیے یہ ضرور ہی کہ جو زورِ کلام اور واعظانہ طرزِ ادا اصلِ کتاب میں ہو وہی اس میں بھی قائم رہے۔ اور متن کے مطالعہ کرنے والے جس خشوع و خضوع کی کیفیت اور ایک فوق البشر قوت کے احساس سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت و اثر ترجمے خواں پر بھی پڑے۔ بائبل کے مترجمین نے اس نکتے کو خوب سمجھ لیا ہی۔ چنانچہ اس کے مختلف زبانوں میں جو ترجمے ہوئے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے ذہن ایک ہی قسم کے احساسات سے متاثر ہوتا ہی۔ مولانا نذیر احمد نے بھی اس کی کوشش کی اور گو اس میں پوری کامیابی تو انھیں حاصل نہیں ہوئی۔ تاہم اس معرکے میں بھی وہ ایک بڑی حد تک فتح مند ثابت ہوئے۔ ذیل میں ہم بائبل اور قرآن کے ایک مشترک قصے کا ترجمہ بطورِ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جس سے ناظرین کو یہ اندازہ کرنے میں مدد ملے گی کہ مولانا نذیر احمد اور مترجمینِ بائبل اپنی اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ قصۂ ذیل کا خاکہ یہ ہی۔ کہ حضرت ابراہیم کے پاس کچھ فرشتے انسان کی شکل میں آکر مہمان ہوئے ہیں جنھوں نے سارہ کو ولادتِ فرزند کی خوش خبری دی ہی۔ اور اس کے بعد جا کر قومِ لوط کو برباد کیا ہی +

ترجمۂ بائبل

پھر خداوند ممرے کے بلوطوں میں اُسے یعنی ابرہام کو نظر آیا اور وہ دن کو گرمی کے وقت اپنے خیمے کے دروازے پر بیٹھا تھا۔ اور

ترجمۂ قرآن

اور (جب) ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کے آئے (تو) اُنھوں نے (ابراہیم کو) سلام کیا۔ ابراہیم نے سلام کا جواب دیا

اُس نے اپنی آنکھیں اُٹھا کر نظر کی اور کیا دیکھا؟ کہ تین مرد اُس کے
پاس کھڑے ہیں۔ وہ انھیں دیکھ کر خیمے کے دروازے سے اُن کے
ملنے کو دَوڑا۔ اور زمین تک اُن کے آگے جُھکا۔ اور بولا کہ اے خداوند
اگر مجھ پر تیری مہربانی ہی تو اپنے بندے کے پاس سے چلے نہ جائیے
کہ تھوڑا سا پانی لایا جاوے۔ اور آپ اپنے پاؤں دھو کر اس درخت
کے نیچے آرام کیجیے۔ میں تھوڑی روٹی لاتا ہوں۔ تازے دم ہوجیے
بعد اس کے آگے جائیے۔ کیونکہ اسی لیئے اپنے بندے کے یہاں آئے
ہیں۔ تب انھوں نے کہا یوں ہی کر جیسا تُو نے کہا۔ اور ابرہام خیمے
میں سرہ کے پاس دوڑا گیا اور کہا تین پیمانے آٹا لے کر جلد گوندھ کے
پُھلکے پکا۔ اور ابراہام گلّے کی طرف دَوڑا اور ایک موٹا تازہ بچھڑا
لا کر ایک جوان کو دیا اور اُس نے جلد اُسے تیار کیا۔ پھر اُس نے
گھی اور دودھ اور اُس بچھڑے کو جو اُس نے پکوایا تھا لے کے اُن کے
سامنے رکھا اور آپ اُن کے پاس درخت کے نیچے کھڑا رہا اور اُنھوں
نے کھایا۔ تب اُنھوں نے اس سے کہا کہ تیری جورو سرہ کہاں ہی؟ وہ
بولا دیکھو خیمے میں ہی اور اس نے کہا میں زندگی کے حساب سے وقتِ
معیّن پر تیرے پاس پھر آوں گا۔ اور دیکھ تیری جورو سرہ کو بیٹا
ہوگا۔ اس کے پیچھے خیمے کے دروازے میں سرہ اُس کی سُنتی تھی
اور ابرہام اور سرہ بوڑھے اور بہت دن کے تھے اور سرہ سے عورتوں
کی معمولی عادت موقوف ہوگئی تھی۔ تب سرہ نے اپنے دل میں ہنس کر
کہا کہ بعد اس کے کہ میں ضعیف ہوگئی اور میرا خداوند بھی بوڑھا ہوا کیا
مجھ کو خوشی ہوگی؟ پھر خداوند نے ابرہام سے کہا کہ سرہ کیوں کر ہنس کر
بولی کہ کیا میں جو ایسی بڑھیا ہوگئی۔ سچ مچ جنونگی؟ کیا خداوند کے
نزدیک کوئی بات مشکل ہی؟ میں معیّن وقت پر تجھ پاس پھر آونگا
اور سرہ کو بیٹا ہوگا۔ تب سرہ نے انکار کر کے کہا کہ میں نہیں ہنسی۔
کیوں کہ وہ ڈرتی تھی۔ پھر اُس نے کہا نہیں تُو البتہ ہنسی +

تب وے مرد وہاں سے اُٹھ کر سدوم کی طرف متوجہ ہوئے اور ابرہام
انھیں رُخصت کرنے کو ان کے ساتھ چلا۔ اور خداوند نے کہا کہ یہ میں

پھر ابراہیم نے بلا توقف بچھڑا (یعنی اُس کا) بُھنا ہوا (گوشت اُن کے
سامنے) لا موجود کیا۔ پھر جب دیکھا کہ اُن کے ہاتھ تو کھانے کی
طرف اُٹھتے ہی نہیں تو اُن سے بدگمان ہوئے اور جی ہی جی میں
اُن سے ڈرے وہ بولے (کہ آپ کسی طرح کا) خوف نہ کیجیے۔ ہم تو
(فرشتے ہیں اور) قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں (کہ اُن کو اُن کی
بدکرداریوں کی سزا دیں) اور (اس گفتگو کے وقت) ابراہیم کی
بی بی (سارہ) بھی کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ (فرشتوں کے اطمینان
کر دینے سے) خوش ہوگئیں تو ہم نے اُن کو (اُن ہی فرشتوں کے
ذریعے سے پہلے) اسحٰق (بیٹے) اور اسحٰق کے بعد یعقوب (پوتے
کے پیدا ہونے) کی خوش خبری دی۔ وہ لگیں کہنے ہائے میری
کم بختی کیا (اس عمر میں) میرے اولاد ہوگی اور میں تو بڑھیا ہوں
اور یہ (جو) میرے شوہر ہیں (یہ بھی) بوڑھے (ہیں) ایسے میں
ہمارے ہاں اولاد کا ہونا بے شک (بڑی) عجیب بات ہی فرشتے
بولے کیا تم کو خدا کی قدرت سے (یہ امر کچھ) عجیب معلوم ہوتا ہی
اے اہلِ بیتِ (نبوت) تم پر خدا کی رحمت اور اُس کی برکتیں (نازل
ہوں) بے شک خدا سزاوارِ حمد (و ثنا اور اپنے بندوں پر) بڑا
(ہی کرم کرنے والا) ہی۔ پھر جب ابراہیم (کے دل) سے خوف دُور ہوا
اور اُن کو (اولاد کی) خوش خبری بھی مل سکے لگے قوم لوط کے بارے
میں ہم سے جھگڑنے۔ بے شک ابراہیم بڑے بُردبار بڑے نرم دل
(ہر بات میں خدا کی طرف) رجوع کرنے والے تھے (ہم نے فرمایا کہ)
ابراہیم اس خیال کو چھوڑ دو۔ تمھارے پروردگار کا (جو) حکم (تھا
وہ) آ پہنچا اور ان لوگوں پر ایسا عذاب آنے والا ہی جو (کسی طرح)
ٹل نہیں سکتا۔ اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس آئے تو اُن کا
آنا اِن کو بُرا لگا اور (اُن کے آنے) کی وجہ سے تنگ دل ہوئے اور
لگے کہنے کہ یہ (آج کا دن) تو بڑی مُصیبت کا دن ہی۔ اور لوط کی
قوم کے لوگ (لڑکوں کا آنا سُن کر ارادہ بد سے) دَوڑے دَوڑے
لوط کے پاس آئے اور یہ لوگ پہلے سے بُرے کام تو کیا ہی کرتے تھے

جو کرتا ہوں کیا ابرہام سے چھپاؤں ابرہام تو یقیناً ایک بزرگ اور بڑی قوم ہوگا اور زمین کی سب قومیں اُس سے برکت پائیں گی کیونکہ میں اُس کو جانتا ہوں کہ وہ اپنے بیٹوں اور اپنے بعد اپنے گھرانے کو حکم کرے گا اور وے خداوند کی راہ کی نگہبانی کر کے عدل اور انصاف کریں گے تاکہ خداوند ابرہام کے واسطے جو کچھ کہ اُس نے اُس کے حق میں کہا ہے پورا کرے۔ پھر خداوند نے کہا اس لیے کہ سدوم اور عمورہ کا چلّانا بلند ہوا اور اُن کا جرم نہایت سنگین ہوگیا ہے۔ میں اب اُتر کر دیکھوں گا کہ اُنھوں نے سراسر اُس چلّانے کے مطابق جو مجھ تک پہونچا کیا ہے یا نہیں اور اگر نہیں تو میں دریافت کروں گا۔ تب وے مرد وہاں سے اپنا مونہہ پھیر کے سدوم کی طرف چلے۔ پر ابرہام ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا ✚
اور وے دو فرشتے شام کو سدوم میں آئے اور لوط سدوم کے پھاٹک پر بیٹھا تھا اور لوط اُنھیں دیکھ کر اُن کے استقبال کے لیے اُٹھا اور اس سے پہلے کہ وے لیٹے شہر کے مردوں یعنی سدوم کے مردوں نے جوان سے لے کے بوڑھے تک سب لوگوں نے ہر طرف سے اُس گھر کو گھیر لیا اور اُنھوں نے لوط کو پکار کر کے اُس سے کہا کہ اے مرد جو تیرے یہاں آج کی رات آئے کہاں ہیں؟ اُنھیں ہمارے پاس باہر لا تاکہ ہم اُن سے صحبت کریں۔ تب لوط دروازے سے اُن پاس باہر گیا اور کواڑ اپنے پیچھے بند کیا۔ اور کہا کہ اے بھائیو ایسا بُرا کام نہ کیجیو اب دیکھو میری دو بیٹیاں ہیں جو مرد سے واقف نہیں مرضی ہو تو اُن کو تمھارے پاس نکال لاؤں اور جو تمھاری نظر میں پسند ہو اُن سے کرو مگر اِن مردوں سے کچھ کام نہ رکھو کیونکہ وے اسی واسطے میری چھت کے سایہ میں آئے تب اُنھوں نے کہا کہ ہٹ جا پھر اُنھوں نے کہا کہ یہ ایک شخص یہاں گزران کرنے آیا سو حاکمی کیا چاہتا ہے۔ اب ہم تیرے ساتھ اُن سے زیادہ بدسلوکی کریں گے تب وے اُس مرد یعنی لوط پر حملہ کر کے آئے اور کواڑ توڑنے کو لپکے۔ تب اُن مردوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر لوط کو اپنے پاس گھر میں کھینچ لیا اور دروازہ بند کر دیا اور اُن مردوں کو جو گھر کے دروازے پر تھے کیا چھوٹے کیا بڑے اندھا کر دیا سو وے دروازہ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گئے۔ تب اُن مردوں نے لوط سے کہا کیا یہاں تیرا اور کوئی ہے؟ داماد یا بیٹے یا بیٹیاں اور جو کوئی تیرا اس شہر میں ہے تو اُسے لے کر اس مقام سے نکل جا کیونکہ ہم اس مقام کو غارت کریں گے۔ اس لیے کہ ان کا چلّانا خدا کے حضور بہت بلند ہوا

لوط (نے جو ان لوگوں کو آتے دیکھا تو) لگے کہنے کہ بھائیو! یہ میری بیٹیاں (موجود) ہیں (ان سے نکاح کر لو) یہ تمھارے لیے (حلال اور) پاکیزہ تر ہیں تو (ان لڑکوں کی طرف نظر نہ کرو اور) خدا سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے بارے میں میری آبروریزی نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ تم کو تو معلوم ہے کہ ہم کو تمھاری بیٹیوں سے کسی طرح کا سروکار ہی نہیں اور ہمارے ارادے سے بھی تم بخوبی واقف ہو (لوط) بولے اے کاش (آج) مجھ کو تمھارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ پاتا (فرشتے) بولے کہ لوط! ہم تمھارے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں یہ لوگ ہرگز تم تک نہیں پہونچ پائیں گے تو تم اپنے اہل (و عیال) کو لے کر کچھ رات (رہے) سے نکل بھاگو اور (پھر) تم میں سے کوئی مڑ کر (بھی اُدھر کو) نہ دیکھے مگر تمھاری بی بی کہ (وہ بے دیکھے نہیں رہنے کی اور) جو (عذاب) اِن لوگوں پر نازل ہونے والا ہے وہ اُس پر بھی ضرور نازل ہوگا اِن (کے عذاب) کا وقت مقرر صبح ہے۔ کیا صبح قریب نہیں؟ پھر جب ہمارا حکم (عذاب) آپہونچا تو (اے پیغمبر) ہم نے (اُلٹ کر) اُس (بستی) کے اوپر کے حصے کو اُس کے نیچے کا حصہ کر دیا اور (اُوپر سے) اُس پر برسائے جھے ہوئے کھڑنجے کے پتھر جن پر تمھارے پروردگار کے ہاں نشان کیا ہوا تھا (کہ یہ اُس قوم پر برسیں گے) ✚

{سورۂ ہود رکوع ۷}

اور خداوند نے اُس کے غارت کرنے کو ہمیں بھیجا اور ایسا ہوا کہ جب وہ اُن کو باہر نکال لائے تو اُس نے کہا کہ اپنی جان لے کر بھاگ۔ اپنے پیچھے مت دیکھ اور میدان میں کہیں مت ٹھیر اور جس وقت لوط صغر میں داخل ہوا سورج کی روشنی زمین پر پھیلی تب خداوند نے سدوم اور عمورے پر گندھک اور آگ خداوند کی طرف سے آسمان پر سے برسائی۔ اور اُس نے ان شہروں کو اور اس سارے میدان کو اور ان شہروں کے سب رہنے والوں کو اور سب کچھ جو زمین سے اُگا تھا غیست کیا۔ مگر اُس کی جورو نے اُس کے پیچھے سے پھر کر دیکھا اور وہ نمک کا کھمبا بن گئی (پیدائش باب ۱۸ و ۱۹) +

اقتباساتِ بالا میں جزئی اختلافات کے ساتھ ایک ہی واقعہ کا بیان ہے مگر طرزِ بیان کے فرق سے دیکھو کہ ذہن پر دونوں کا کتنا مختلف اثر پڑتا ہے مترجمین توریت نے لفظ کے بالمقابل لفظ رکھنے کا التزام کیا۔ اور اس لیئے اُن کی تحریر میں وہ عظمت و متانت نمایاں طور پر موجود ہے جو کلام ربانی کے لیئے ضروری ہے اور جس سے مولانا نذیر احمد کا ترجمہ خالی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ چونکہ مترجمینِ توریت زبانِ اردو کے ماہر نہ تھے۔ اس لیئے تورِیت اُردو کا ادبی حیثیت سے کوئی پایہ نہیں بلکہ بعض جگہ اُس کی عبارت معمّا بن گئی ہے۔ چنانچہ اسی اقتباساتِ بالا میں ایک سے زاید ایسی ضمیریں استعمال ہوئی ہیں۔ جن کا مرجع متعین کرنا آسان نہیں۔ بہ خلاف اس کے مولانا کا ترجمۂ قرآن۔ معانیٔ کلام۔ شستگی بیان۔ ہمواریٔ عبارت کے لحاظ سے اُردو انشا پردازی کا ایک اعلےٰ نمونہ ہے۔ جسے شروع سے آخر تک پڑھ جائیے۔ اور کسی ایک مقام پر بھی نہ پیچیدگیٔ مفہوم کی وجہ سے اٹکنا پڑے گا۔ نہ تعقید و ناہمواری کی کوئی مثال ملے گی۔ بلکہ ان کے ترجمے کا غالب حصّہ تو ترجمہ معلوم ہونے کی بجائے خود اُنھیں کی تصنیف کا کوئی جزو نظر آتا ہے۔ غرض اگر مولانا اس ترجمے میں کسی قدر زیادہ متانت و سنجیدگی کو کام میں لاتے۔ تو یہ ترجمہ بے عیب ہوتا اور اب بھی قرآن کے موجودہ ترجموں میں کوئی اُس کے لگ بھگ بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۹۶ء سے پہلے قرآن کا ترجمہ پڑھنے والے لوگ خال خال تھے۔ لیکن اب جس کثرت سے پڑھا جاتا ہے۔ وہ محتاجِ ذکر نہیں +

(۳) مولانا کی تعمیمِ اثر کا تیسرا عنصر اُن کی وہ تصنیفات ہیں جو انھوں نے تعلیمِ نسواں کے لیئے تیار کی تھیں۔ دُنیا کی کوئی تحریک صحیح معنی میں اُس وقت تک عالم گیر و پائدار نہیں کہی جاسکتی۔ جب تک کہ طبقۂ اناث اُس سے متاثر نہ ہو اس لیئے کہ آیندہ نسل کے افراد میں کسی عقیدے یا خیال کو جڑ و فطرت بنا دینے والی تعلیم گاہ۔ کالجوں کے لکچر ہال۔ اور یونیورسٹیوں کے محل نہیں بلکہ آغوشِ مادر ہے۔ آج جدید تعلیم یافتہ گروہ۔ تعلیم و حریتِ نسواں کے نعرے لگاتے لگاتے تقریباً تھک چکا ہے۔ لیکن اس کی کوششوں کی مناسبت سے اب تک جو اس تحریک کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کا خاص سبب یہی ہے کہ خود ہماری مستورات میں ابھی اپنی اصلاحِ حالت کا پورا احساس نہیں پیدا ہوا اور اس الزام کا داغ جدید گروہ کی پیشانی سے کسی طرح نہیں مٹ سکتا کہ باایں ادعا و بالاخوانی اس کے کسی فرد سے یہ آج تک نہ ہو سکا کہ لڑکیوں کے لیئے کوئی اعلےٰ نصاب تعلیم تیار کرے۔ شمس العلماء مرحوم پہلے شخص تھے جنھوں نے آج سے کوئی چالیس سال پیشتر مراۃ العروس تیار کی یہ کتاب ایک قصّے کی صورت میں ہے جس میں اکبری و اصغری دو سگی بہنوں کے واقعاتِ زندگی کے پردے میں حیاتِ منزلی اور خانہ داری کی تقریباً تمام مسائل کی تعلیم دی ہے۔ زبان اس قدر صاف و سلیس ہے کہ سواد خواں لڑکیاں نہایت آسانی سے سمجھ جاتی ہیں۔ بہ اعتبار قصّے کے اس قدر دلچسپ اور مذاقِ نسواں کے مطابق ہے۔ کہ گھر کی بڑی بوڑھی عورتیں جو خود نہیں پڑھ سکتیں اپنی خواندہ بیٹیوں

اور بہوؤں سے پڑھوا کر سُنتی ہیں۔ گورنمنٹ نے بھی اس کتاب پر مصنّف کی کافی حوصلہ افزائی کی۔ ایک ہزار جلدیں خود خرید کیں ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔ اور سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر نے ایک طلائی گھڑی مصنّف کو صلے میں عطا کی۔ لیکن گورنمنٹ کی قدر شناسی سے زیادہ قابلِ قدر خود پبلک کی قدر دانی ہے۔ جس کے شوق کو دیکھ کر مختلف مطابع نے متعدد بار اس کتاب کو بڑی تعدادوں میں شائع کیا۔ اور سب نسخے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے جس گھر میں تعلیم کا کچھ بھی چرچا ہے۔ وہ اس کتاب سے خالی نہیں۔ ہندوستان کی متعدّد زبانوں کے علاوہ انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے +

مراۃ العروس ہی کے ہم مقصد مولانا کی چند اور کتابیں مثلاً بنات النعش۔ توبۃ النصوح۔ محصنات وغیرہ بھی شائع ہوئیں جن میں بعض علمی و مذہبی مسائل کو نہایت آسان پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہ سب کتابیں گورنمنٹ و پبلک دونوں میں مقبول ہوئیں خصوصاً توبۃ النصوح جو ادبی حیثیت سے اُردو میں ایک نصابی (کلاسیکل) کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں نصوح کا خواب۔ کلیم کی حسرتناک سرگزشت یہ چند باب ایسے ہیں جن کا وجود اُس وقت تک نہیں مٹ سکتا جب تک کہ دنیا میں اُردو زبان باقی ہے۔ ان کے علاوہ مولانا نے بچّوں کے لیے صرف و نحو پر بھی دو ایک رسالے لکھے اور اُن کو بھی قبولِ عام کی سند حاصل ہوئی +

وضعِ اصطلاحاتِ قانون۔ ترجمۂ قرآن۔ بچّوں اور عورتوں کے لیے کتابوں کی تصنیف ان سب کا مجموعی اثر یہ پڑا کہ ملک کا گوشہ گوشہ نذیر احمد کے نام سے گونج اُٹھا۔ اور اُن کے موضوعات و مصطلحات اس کثرت سے اُردو لٹریچر کے رگ و ریشے میں پیوست ہو گئے۔ کہ موجودہ اُردو سے اُن کو علیحدہ کرنا ناخن کو گوشت سے جدا کرنا ہے۔ انگلستان میں ایک سے ایک بڑے ادیب و شاعر گزرے ہیں لیکن اس ساری جماعت میں صرف شیکسپیر ایسا شخص ہوا ہے جس کے مخترعہ تشبیہات۔ تمثیلات۔ استعارات۔ اور الفاظ کہیں ضرب المثل اور کہیں محاورہ بن کر انگریزی زبان کے اجزاءِ غیر منفک ہو گئے ہیں۔ جنھیں ہزارہا انگریزی داں اپنا سمجھ کر بلا تکلف استعمال کرتے جاتے ہیں اور اس خصوصیت کے لحاظ سے نذیر احمد کو شیکسپیرِ اردو کہنا مطلق مبالغہ نہیں +

(۴) نذیر احمد کی انشا پردازی کی اہم ترین خصوصیت سلاستِ بیان ہے۔ اُن کی تحریر گویا ایک صاف و شفاف پانی کا چشمہ ہوتی ہے جس پر نظر تیرتی چلی جاتی ہے۔ اور مفہوم خود بخود ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہے۔ ادبِ خالص (Belles-lettres) پر جو کتابیں ہوتی ہیں۔ مثلاً آزاد کی اکثر تصنیفات اُن میں اس وصف کا قائم رکھنا چنداں دشوار نہیں۔ لیکن فقہ و دینیات جیسے خشک و زاہدانہ مضامین میں اس روانیِ تحریر کا برقرار رہنا بغیر زبان پر انتہائی قدرت و عبور کے ممکن نہیں۔ مولانا نے اپنی آخر حصّۂ عمر میں الحقوق والفرائض کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب تین جلدوں میں بہت اہتمام سے تالیف کی۔ جس میں تمام فقہی مسائل سے متعلق پہلے ضروری آیات و احادیث مع ترجمے کے نقل کی ہیں۔ اِس کے بعد من المترجم کے زیرِ عنوان۔ اُن کی شرح و تفصیل کی ہے۔ اس کا مجموعی حجم قریب ایک ہزار صفحے کے ہے۔ لیکن ساری کتاب ابتدا سے انتہا تک دلچسپیوں کا ایک سلسلہ ہے اور ہماری کتب میں پبلک کا موجودہ مذاق جو علمی مسائل میں بھی لطفِ زبان تلاش کرتا ہے۔ کسی موقعے پر اس کے مطالعے سے وحشت نہیں کرتا۔ ذیل میں ہم اس کتاب کے چند اقتباسات مثال کے طور پر درج کرتے ہیں۔ شروع کتاب میں "توحید کا عنوان" قائم کر کے لکھتے ہیں[1] (جلد ا صہ ۲۸ و ۲۹)

[1] ان اقتباسات میں بعض عربی عبارتیں بھی تھیں جو ہم نے حذف کر دیں ۱۲

دنیا کے اس عظیم الشان کارخانے کا ذرہ ذرہ سمندروں کا قطرہ قطرہ درختوں کا پتّا پتّا خدا کی ہستی کا گواہ ہے۔ اس لیے کہ کوئی چیز چھوٹی ہو یا بڑی زمین میں ہو یا آسمان میں خشکی میں ہو یا تری میں جان دار ہو یا بے جان اس خوبی اور عمدگی کے ساتھ ہے کہ اس سے بہتر ہونا ممکن نہیں۔ آپ سے آپ نہیں بن گئی ضرور کسی کے بنائے سے بنی ہے۔ ہم نے اس بنانے والے کی جستجو کی اور زمین سے لے کر آسمان تک چھان مارا تو کسی کو اس لائق نہ پایا جس کو دیکھا عاجز۔ جس کو ٹٹولا درماندہ روئے زمین پر ہم ہی سب میں پیش پیش تھے کہ عقل رکھتے تھے۔ سو ایاز قدرِ خود بشناس" سن کر اپنا سا مونہ لے کر رہ گئے۔ ناچار آسمان پر نظر دوڑانی چاہی تو ابراہیم علیہ السلام کا قصہ یاد کر کے خاموش بیٹھ گئے۔ اور سمجھے کہ جس کی جستجو ہے وہ چشم سر سے دیکھنے کی چیز نہیں۔ بنی اسرائیل نے شوخ چشمی کی۔ تو فاخذتھم الصاعقۃ کی سزا پائی۔ موسیٰ علیہ السلام نے غلبۂ شوق میں آ کر حوصلہ کیا تو خرّ موسیٰ صعقا سے شرمندگی اٹھائی۔ یعنی خدا ہمارے حواسِ ظاہری کی گرفت سے بالاتر ہے۔ اور یہ ہمارے حواس کا قصور ہے ✢ ۔ ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

ہاں چشمِ دل سے دیکھا جائے تو دنیا آئینہ خانہ ہے۔ اور در و دیوار خدا کے نور سے پڑے جگمگا رہے ہیں ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار　　جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

اسی سلسلے میں غیر موحد قوموں کے مذہبی معتقدات کو مختصراً ذکر کر کے لکھتے ہیں ✢

غرض ہندوؤں نے اتنے خدا بنا ڈالے۔ کہ ایک خدا کے حصّے میں پورا ایک بندہ بھی نہیں آتا۔ اور یہ نہ سمجھے کہ خدائے واحد کے سوا کوئی اور خدا بھی ہوتا تو دو باسن ایک جگہ رکھے ہوئے کھٹکھٹا اٹھتے ہیں ایسا تو کیا ہے کہ دو یا زیادہ خداؤں میں اختلاف نہ ہو اور اختلاف ہو تو دنیا ایک لمحہ نہیں ٹھیر سکتی۔ دو بادشاہ آپس میں لڑتے ہیں تو ملک کے ملک خاک سیاہ ہو جاتے ہیں اور خداؤں کی لڑائی تو خدا کی پناہ۔ پس دنیا کا ایک اسلوب پر چلا جانا صاف اس بات کی دلیل ہے کہ تمام عالم میں ایک خدا کی حکومت ہے (جلد ا صفحہ ۱۳) ✢

پیغمبرِ اسلام کے واقعاتِ زندگی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں ✢

ابو طالب کی وفات کے بعد ابو طالب کا مرنا تھا کہ دشمنوں نے بڑا زور باندھا۔ اور نوبت بہ اینجا رسید کہ پیغمبر صاحب کے راستے میں کانٹے بچھائے۔ کہ خانۂ کعبہ کو جاتے ہوئے پاؤں میں چبھیں۔ ایک بار سجدے میں تھے کسی موذی نے اونٹ کا بوجھ لا کر گردن پر ڈال دیا۔ کہ اٹھ نہ سکیں۔ زبردستی لپٹ پڑے اور گلا گھونٹا۔ نو مسلموں میں سے جس کو پکڑ پاتے بری طرح ستاتے۔ آخر پیغمبر صاحب نے نو مسلموں کو اجازت دی کہ حبشے چلے جاؤ اور خود طائف تشریف لے گئے کہ وہاں کے رئیس سے امداد کی توقع تھی وہاں بھی معاملہ بالعکس پیش آیا اور وہاں کے باشندوں نے پتھر مارے اور نکال دیا۔ ناچار مکّے واپس آئے یہاں دشمنوں نے ملنا جلنا۔ کھانا پینا تک بند کر دیا۔ طرح طرح کے لالچ دیئے۔ ڈراوے دکھائے۔ جب دیکھا کہ یہ شخص کسی طرح باز نہیں آتا۔ اور جو کوئی ایک دفعہ اس کا کلمہ بھر لیتا ہے۔ پھر اپنے قول سے نہیں پھرتا۔ تو صلاح یہ ٹھیری کہ ہنگامہ کر کے اسے مار ڈالو۔ بہت ہوگا تو دیت بھرنی آجائے گی سب باچھ کر کے بھر دیں گے۔ یہ منصوبہ باندھ کر ایک رات

گھر کو آ گھیرا۔ پیغمبر صاحب کو خبر ہوئی۔ تو اپنی جگہ علی رضؓ کو لٹا ابو بکرؓ کو ساتھ لے چپکے سے مکّے سے ۳ میل کے فاصلے پر غارِ
ثور میں جا چھپے۔ دشمن جو نرغہ کیے گھر کو گھیرے پڑے تھے۔ اُن کو خبر نہیں۔ صبح ہوئی تو دیکھا پیغمبر صاحب کا پتہ نہیں
علی رضؓ اُن کی چادر اوڑھے پڑے ہیں۔ چھتّے کی بھِڑوں کی طرح جستجو کے لیے نکل پڑے۔ خدا کی قدرت غارِ ثور پر سے
ہو کر گزرے اور سوجھ نہ پڑا۔ (جلد ۲ صفحہ ۳۶۷) ✤

یہ نمونہ اُن کے عام اندازِ تحریر کا ہی جس سے اُن کی کوئی کتاب مستثنےٰ نہیں۔ مبادی الحکمت کے عنوان سے انھوں نے ۱۸۷۱ء
میں منطق پر ایک رسالہ لکھا ہی۔ اس میں بھی جہاں منطقی اصطلاحات آگئے ہیں۔ وہاں تو مجبوری ہی۔ ورنہ عموماً یہی شگفتہ طرزِ ادا قائم
ہی۔ سررشتۂ تعلیم نے اس رسالے کی کافی سرپرستی کی۔ اور گورنمنٹ نے پانچ سو روپے انعام دیا۔ یہ رسالہ گو مختصر ہی۔ تاہم اردو میں کوئی
دوسری کتاب اب تک اس کے مساوی درجے کی نہیں شائع ہوئی۔ مولانا کی جو دیگر قابلِ ذکر تصنیفات ہیں۔ مثلاً ابن الوقت رویائے
صادقہ۔ فسانۂ مبتلا۔ ان سب کا یہی طرزِ تحریر ہی۔ یہ کتابیں افسانے کی صورت میں ہیں۔ جن میں سے آخر الذکر میں تعدّدِ ازواج وغیرہ کی
معاشرتی خرابیاں دکھائی گئی ہیں۔ اور مقدم الذکر ہر دو کتب میں جدید مذاق والے مذہب پر جو اعتراضات کرتے ہیں۔ ان کے جواب
دینے کی کوشش کی گئی ہی۔ ابن الوقت زبان و نیز مادّے کے لحاظ سے ان سب میں بہتر ہی۔ اس کو تصنیف کیے ہوئے تقریباً پچیس
سال ہو چکے ہیں لیکن مولانا نے ۱۸۸۸ء میں ہمارے فیشن پرستوں اور ان کے اور انگریزوں کے باہمی تعلّقات کا جو نقشہ کھینچا تھا۔
وہ خفیف تغیر کے ساتھ اس وقت تک بالکل صحیح و مطابقِ واقعہ ہی۔ ان کتابوں میں نہ کوئی پلاٹ ہی۔ اور نہ مختلف مناظر کی تصویر کشی
کی گئی ہی۔ اس لیے انھیں ناول تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اسی کے ساتھ یہ قدیم مذاق کے مطابق جن و پری کے مافوق الفطرت افسانے بھی
نہیں۔ ان میں روز مرہ کے واقعاتِ زندگی کا عکس اُتارا گیا ہی جس میں اور اصل صورت میں خط و خال تک کا فرق نہیں۔ اور اس سے
ظاہر ہوتا ہی۔ کہ مولانا نے ابنائے زمانہ کی کتنی صحیح نبض پہچانی تھی ✤

(ھ) لیکن مولانا کی فصاحتِ کلام و سلاست سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں۔ کہ ان کے رنگ انشا پردازی کا تتبع آسان ہی۔ یا یہ کہ وہ خود
بغیر غور و فکر کے برجستگی کے ساتھ تصنیف و تالیف کیا کرتے تھے۔ بلکہ برعکس اس کے واقعہ یہ ہی۔ کہ بجز آزاد کے ان کے رنگ کا تتبع سب سے
زیادہ مشکل ہی۔ ان کی تقلید کرنے والے کے لیے سب سے ضروری شرط یہ ہی کہ اُردو زبان کے محاورات و ضرب الامثال اگر کُل کے کُل نہ یاد
ہوں۔ تو کم از کم ان کا جزوِ غالب تو ضرور نوکِ زبان ہو۔ اسی کے ساتھ شاعری کا عنصر بھی اتنا قوی ہو۔ کہ ہر دعویٰ۔ ہر واقعے کی تمثیل
عام و معمولی مثالوں کے ذریعے سے دے سکے۔ اس کے علاوہ عربی و فارسی زبان میں نہ صرف کافی مہارت رکھتا ہو۔ بلکہ ان کے لٹریچر پرا سے
اس قدر عبور حاصل ہو۔ کہ اُن کے مقولہ جات اشعار۔ ضرب الامثال تلمیحات۔ قصہ طلب حوالہ جات۔ سب بے تکلف
اُردو میں کھپا سکے۔ آخری۔ اور نہایت دشوار شرط یہ ہی کہ امتیاز اس قدر صحیح رکھتا ہو کہ ان چیزوں کو اس طرح استعمال کرے کہ ہر جگہ آمد ہی آمد قائم رہے
آورد کی کہیں جھلک تک نہ آئے۔ ظاہر ہی کہ ان شرائط میں سے بعض فطری ہیں اور بعض کسبی۔ اور جس وقت تک کوئی شخص ان کا جامع نہ ہو اور ان کے ساتھ شوخی و ظرافت
کا بھی حصّہ وافر نہ ہو۔ نذیر احمد کا کامیاب متبع نہیں ہو سکتا۔ سرسید اور شبلی کی تصانیف سمجھنے کے لیے اردو زبان کے معمولی لغات سے واقفیت کافی ہی اور اسلیے

ملہ یہ خیال جس قدر عام ہی۔ اسی قدر غلط ہی۔ اپنے طرزِ تصنیف کا حال مولانا خود بیان کرتے ہیں "ہم نے بھی اپنی عمر کا معتد بہ حصہ اسی شغل (تصنیف و تالیف) میں گزارا ہی تو اطمینان سے برسوں میں مسودے کیے ہیں۔ برسوں مسودے زیرِ نظر رہے ہیں۔ اور اس پر بھی آخری پروف تک ترمیم و اصلاح ہوتی رہی ہی تب کہیں جا کر کتاب کو صلۂ قبول حاصل ہوا ہی" (الحقوق۔ جلد ۳۔ صفحہ ۲۲۱) مولانا کے جاننے والوں کا بیان ہی کہ وہ اپنے لکچروں کی تیاری میں اسی قدر محنت کرتے تھے ۱۲

ملک کے اُردو خواں باشندے اُن سے بہ آسانی متمتع ہو سکتے ہیں لیکن نذیر احمد کی انشا پردازی کی داد دینے کے لیے ہندوستان کے رسم و رواج ملکی و قومی روایات مسلمانوں کے مذہبی احساسات وغیرہ سے واقف ہونا بھی ناگزیر ہی۔ اس حیثیت سے ہم مولانا کی مثال انگلستان کے مصنفین میں پروفیسر ہکسلے سے پاتے ہیں۔ ہکسلے ایک نامی گرامی سائینس داں ہونے کے ساتھ انگریزی ادب کا بھی ایک مسلّم اُستاد سمجھا جاتا ہی لیکن اس کی تحریر میں لاطینی و یونانی حوالے انجیل کے متعلق تلمیحات۔ انگریزی خصائل و عادات کی طرف اشارات اس کثرت سے آتے ہیں کہ بقول بعض ناقدین کے اُس کی انشا پردازی کی داد صرف اُس کے تعلیم یافتہ ہم وطن دے سکتے ہیں +

(۳) مولانا کے ان کمالات کے اعتراف کے ساتھ ہمیں یہ بھی کہنا پڑتا ہی کہ محاورات کی افراط اور صفائی زبان کے جوش میں اُن کی تحریر اکثر پایۂ متانت سے گر جاتی تھی اور اس میں بعض نہایت سخیف الفاظ و جملے اُن کے قلم سے نکل جاتے تھے۔ مثلاً "دوھنا سیٹھ" بُوجھ بجھکّا۔ ناکڑا۔ دُم دبا کر بھاگے۔ ہراتی جاتی۔ من مانی گھر جانی۔ ہتھے پر سے اُکھڑ جانا۔ کھسیانی بلّی کھمبا نوچ کر کھاتی ہی۔ وغیرہ یہ ایسے الفاظ و امثال ہیں جو اُن کی تصانیف میں جا بجا پائے جاتے ہیں اور جن میں سے بعض اُن کے ترجمۂ قرآن تک میں موجود ہیں بعض مقامات پر اُن کی تشبیہات بھی بہت بھدّی ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں کہ "بدزبانی دیگ غضب کا پہلا اُبال ہی"۔ اور ایک نقص جو اُن کی تصانیف میں تو نہیں۔ مگر ان کے بعض لکچروں اور خطوط میں پایا جاتا ہی۔ وہ انگریزی الفاظ کا بلا ضرورت استعمال ہی۔ مثلاً اپنے ایک لکچر میں انھوں نے۔ آڈمنس۔ اسٹینڈرڈ۔ ویکرسکس۔ وغیرہ ایسے انگریزی الفاظ کا بیجا استعمال کیا ہی جن سے خالص اُردو داں جماعت نامانوس ہی۔ لیکن اس قسم کی جزئی فروگذاشتوں سے اُن کے مسلّم الثبوت ادبی تبحّر اور علم و فضل پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ماہتاب میں گو داغ ہیں۔ لیکن اُس کے نورِ عالم افروز سے کون انکار کر سکتا ہی +

یہاں تک ہم نے مولانا کی انشا پردازی کے اندرونی خصوصیات بتائے۔ ان کے علاوہ دو خارجی اسباب کا بھی اُن کے طرزِ تحریر و عنوانات تصنیف پر خاص اثر پڑا۔ ایک یہ کہ مولانا شروع ہی سے معقول عہدوں پر فائز رہے۔ اس لیے انھوں نے تصنیف و تالیف کو مدارِ معاش نہیں بنایا۔ اور اسی لیے ان کی تحریروں میں معتقداتِ عام کی خوشامد اور مذاقِ عوام کی پاسداری نہیں بلکہ اس کے بجائے آزادی رائے کا جوہر موجود ہی۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے معاصرین کے برخلاف انگریزی سے بخوبی واقف تھے۔ آزاد حالی۔ و شبلی کو انگریزی زبان کی ناواقفیت کے باعث بہت سی باتوں میں پیچھے رہ جانا پڑا۔ لیکن نذیر احمد کے متعلق مسٹر کیمسن سابق ڈائرکٹر تعلیمات شہادت دیتے ہیں۔ کہ وہ (یعنی مؤلف مبادی الحکمت) انگریزی میں بھی ایسی دست گاہ کافی رکھتا ہی۔ کہ علمی کتابوں کو اُن کی اصلی زبان میں پڑھ سکتا ہی (دیباچہ کتاب مذکور)

مولانا کی تصانیف موسومۂ بالا کی فہرست پڑھنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہی۔ کہ وہ سخت مذہبی آدمی تھے۔ بے شبہہ۔ اگر مذہبی شخص کے یہ معنی ہیں کہ آدمی اپنے مذہب کے متعلق عقیدۂ راسخ رکھتا ہو۔ تو مولانا سخت مذہبی تھے لیکن اگر اس کے مفہوم میں تعصب و تنگ خیالی بھی داخل ہیں۔ تو مولانا اس سے کوسوں دُور تھے۔ مرحوم درحقیقت اپنی روشن خیالی۔ رواداری۔ اور بے تعصبی کے لحاظ سے دیگر علمائے مذہب کے لیے ایک قابل تقلید نمونے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ مذہبی فسادات و رنجشوں کو مٹانے کی کوشش کی۔ اپنے ترجمۂ قرآن اور نیز دیگر مذہبی کتب کے ذریعے سے انھوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو غیر مذہب والوں سے دوستانے قائم رکھنے کی اصلاح دی۔ یہاں تک کہ اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر جو مضمون انھوں نے لکھا (اور غالباً یہی اُن کا آخری مضمون ہی) اُس کا عنوان مسلمان

اور عیسائی ہو اور اس میں مذہبی دلائل سے دونوں قوموں کے اتحاد پر زور دیا ہے۔ اسی مضمون کی تمہید میں وہ ضمناً ہندو مسلمان کے تعلقات کے بارے میں فرماتے ہیں:۔ (رسالہ تمدن بابت اکتوبر ۱۹۱۱ء)۔

ہندو مسلمانوں میں تو مثل مشہور ہے کہ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کی ایک کے بدون گزر نہیں ہو سکتی اور حکومت بھی دونوں کو سازگاری اور صلح کاری پر مجبور کرتی ہے۔ فریقین کے ناعاقبت اندیش تنگ چشموں نے رسم و راہ کے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو مخالفت کا رنگ دے کر دونوں میں ایک طرح کی منافرت پیدا کر دی ہے۔ مگر ہم اُس کو دیرپا منافرت نہیں سمجھتے۔ اگر شبے مانند شبے دیگر نمے مانند۔ اور سمجھ دار لوگوں نے اس کا توڑ بھی شروع کر دیا ہے۔ کوئی دن جاتا ہے کہ بعض اخبار جو اس آگ کو بھڑکاتے رہتے ہیں خود بند ہو جائیں گے +

مولانا کی ادبی زندگی پر ایک اجمالی نظر ہم اوپر کے صفحات میں کر چکنے کے بعد اس تعزیت نامے کو ختم کرتے ہیں۔ اور مسٹر راشد الخیری ایڈیٹر تمدن کی خدمت میں اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے ہم اُن سے اُس شخص کے سوانح زندگی اور علمی کارناموں کی تفصیل شائع کرنے کی درخواست کرتے ہیں جو قرابتِ نسبی کے لحاظ سے ان کا نانا۔ اور قرابتِ علمی کے لحاظ سے ان کا محترم پیشرو ہوا ہے +

مرحوم گو اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ چکے تھے۔ تاہم اُردو زبان کی ضروریات پر نظر کرتے ہوئے ان کی موت بالکل قبل از وقت واقع ہوئی ہے اردو کا شمار ابھی مہذب زبانوں میں نہیں اور نہ اُس وقت تک ہو سکتا ہے۔ جب تک کہ اُس میں علمی تصانیف نہایت کثرت سے نہ موجود ہوں۔ لیکن اس کے لیے پہلا مقدمہ یہ ہے کہ اردو میں علمی اصطلاحات کا ایک کافی ذخیرہ موجود ہو۔ اور یہی وضعِ اصطلاحات کی وہ اہم ترین و عظیم الشان خدمت ہے جس کا پورا کرنے والا نذیر احمد کے بعد بظاہر اَور کوئی نظر نہیں آتا +

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب کس کے گھر جائے گی سیلابِ بلا میرے بعد

از سینٹ سٹیفنز کالج میگزین دہلی نومبر ۱۹۱۲ء

ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم:۔ افسوس ہے کہ مولوی حافظ ڈاکٹر نذیر احمد شمس العلما ایل۔ ایل ڈی۔ ڈی۔ او۔ ایل۔ دہلوی ۲۷ اپریل سے کوئی ایک ہفتے تک بعارضۂ فالج بیمار رہ کر تقریباً اسی برس کی عمر میں رہ گرائے عالمِ بقا ہوئے۔ ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

دُنیا ایک آمد و شد کی جگہ ہے۔ کون ہے جسے یہاں مرنا نہیں ہے اور بظاہر میں ادنےٰ و اعلےٰ سب برابر ہیں۔ لیکن نہیں۔ اوصاف کے لحاظ سے ایک ایک میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ جن کی ہستی اور سعی و عمل کا تعلق اپنی ذات اور آس پاس کے تنگ دائرے تک محدود ہو۔ ہمیشہ اور ہر زمانے میں بہت اور بہ کثرت ہوتے ہیں۔ لیکن وہ جن کے وجود اور اعمال و اوصاف کا اثر دُور دُور تک پڑا ہو ہمیشہ کم ہوئے اور کم تر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم ایک حد تک ایسے ہی بڑے اور خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جن کی زندگی اور زندگی کے کاموں کا اثر اُن کی ذات اور آس پاس کے حلقے سے تجاوز کر کے دُور دُور تک پڑتا رہا اُن کا وجود ایک بافیض وجود تھا۔ اور اُن کی جد و جہد کامیاب سعی و عمل کا ایک اچھا نمونہ۔ وہ اپنی پامردی سے آپ بڑھے۔ اپنے علمی مشاغل سے خود کامیاب ہوئے اور دوسرے مستفید ہوئے۔ کہ اس قسم کے لوگوں کے حالاتِ زندگی دوسروں کے لیے بھی بہت کچھ سبق آموز۔ اور اُن کے کچھ نہ کچھ حقوق اپنوں سے گزر کر غیروں پر بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ان صفحات میں ڈاکٹر

نذیر احمد مرحوم کی زندگی کے مختصر حالات بیان کریں۔ جو غالباً بے سود نہ ہوں گے +
ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کا آبائی وطن بجنور رہا۔ لیکن ننھیال دہلی میں تھی۔ اسی تعلق سے اُن کے والد مولوی سعادت علی بجنور سے آکر دہلی رہنے لگے۔ یہ ایک مسجد میں رہا کرتے تھے اور مسجد کی خدمت ہی ان کی وجہ معاش تھی۔ ڈاکٹر مرحوم خود فرمایا کرتے تھے۔ "میں مسجد کی روٹیوں سے پلا ہوں۔ اور بڑی فلاکت میں پڑھا ہوں" +

تعلیم

مرحوم ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لیئے عربی اور مذہبی تعلیم پانی ضروری تھی۔ عرصے تک یہ اپنی ننھیال کے بعض علماء سے پڑھتے رہے۔ جب تقریباً مستعد ہوگئے تو آرزو ہوئی کہ کوئی اعلےٰ سبق مولوی مملوک علی صاحب کے یہاں شروع ہو جائے جو اُس وقت شہر میں بڑے پائے کے عالم تھے۔ اور گورنمنٹ کالج دہلی میں عربی کے پروفیسر بھی۔ خود کہا کرتے تھے کہ مولوی صاحب کو فرصت نہ تھی۔ میں نے باصرار التجا کی تو فرمایا۔ اچھا۔ جس وقت ہم مدرسے جایا کرتے ہیں آجایا کرو۔ راستے میں چلتے چلتے جو پڑھ سکو گے پڑھا دیا کریں گے۔ اُس زمانے کی طالب علمی ایسی ہی کٹھن تھی۔ مرحوم نے اسی کو غنیمت جانا۔ مولوی مملوک علی ہینس میں سوار ہو کر کالج کو چلتے۔ یہ کتاب کو لے کر ساتھ ہو لیتے۔ ہینس کے ساتھ دوڑتے۔ ٹھوکریں کھاتے۔ گرتے۔ مگر واہ رے شوق! اس پر بھی سبق ہو جانے کو دولت سمجھتے۔ مولوی مملوک علی کی ہم رکابی میں کالج کا راستہ دیکھ کر کچھ دنوں کے بعد ان کے دل میں بھی خیال آیا کہ آؤ کالج میں داخل ہو جائیں۔ باصرار تمام والد کی طرف سے اجازت ملی اور یہ کالج میں داخل ہوگئے۔ یہ وہی کالج تھا جس کی معنوی بنیادوں پر ہمارے کالج کی عمارت قائم ہے۔ اور جس نے عربی۔ فارسی۔ اور انگریزی کے متعدد نام بردار پیدا کیے تھے +

ڈاکٹر مرحوم کالج میں داخل ہوئے تو غالباً ٹیلر صاحب کالج کے پرنسپل تھے۔ وہ ان کی ذہانت و ذکاوت دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ایک دن کہنے لگے۔ "نذیر احمد تم انگریزی کیوں نہیں پڑھتے؟ دیکھو اب تک تم پڑھ لکھ کر فارغ ہوگے اور دنیا میں قدم رکھو گے انگریزی کی ضرورت بڑھ جائے گی۔ ڈاکٹر مرحوم نے کہا۔ آپ والد سے فرمائیں؟ اگر وہ اجازت دے دیں تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ مولوی سعادت علی اکثر کالج آیا جایا کرتے تھے ایک دن ٹیلر صاحب نے اُن سے بھی وہی کہا۔ اس وقت مسلمانوں کو انگریزی سے کچھ ایسی نفرت تھی کہ مولوی سعادت علی نے ٹیلر صاحب کی یہ ہمدردی و دل سوزی کی باتیں سُن کر کہا تو یہ کہا۔ خدایا! اگر اس لڑکے کو انگریزی سے روزی کمانا ہو تو ابھی مر جائے۔ میں اس کی زندگی کا روادار نہیں + بیچارے ٹیلر صاحب یہ سُن کر خاموش ہو گئے۔ اور یہ بدستور عربی کے درجوں میں ادب۔ فلسفہ۔ وریاضی وغیرہ پڑھتے رہے اور آخر کالج کے تمام درجے طے کر کے سندِ تکمیل حاصل کر لی۔ آجکل کی طرح یہ نہ سمجھنا کہ مدرسے کے ساتھ ہی اُن کے پڑھنے لکھنے اور علمی ذوق و شوق کا خاتمہ ہو گیا۔ نہیں وہ عمر بھر پڑھتے رہے اور کبھی سیر نہ ہوئے۔ جیسا کہ اُن کی آیندہ زندگی کے حالات سے معلوم ہوگا +

دورِ ملازمت اور علمی مشاغل

ڈاکٹر مرحوم اوّل اوّل کوئی بیس پچیس روپے ماہوار کے مدرس ہوئے۔ چونکہ قابلیت کا جوہر رکھتے تھے اور حکام قدر داں اور جوہر شناس تھے اور زمانہ بھی وہ تھا کہ سر رشتہ تعلیم میں ایسے لوگوں کی ضرورت تھی یہ جلدی ہی ترقی کر کے ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ میں "ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز" ہوگئے جن دنوں یہ الہ آباد میں تھے صاحب انسپکٹر ان کے دفتر کا معائنہ کرنے آئے۔ یہ انگریزی سے نابلد تھے۔ مگر ان کا اسسٹنٹ انگریزی داں

تھا صاحب انسپکٹر کو اس کی خبر نہ تھی۔ وہ دفتر میں آکر انگریزی میں گفتگو کرنے لگے۔ اور اسسٹنٹ ان کی بجائے صاحب انسپکٹر کا صحیح مخاطب بن کر جواب دینے لگا۔ یہ بات ان کو نہایت شاق و ناگوار گزری۔ ٹیلر صاحب کا کہنا یاد آگیا بگڑ کر کہنے لگے۔ میری موجودگی میں تم گفتگو کے کیونکر مجاز ہو سکتے ہو؟ کیا تمھیں اپنی انگریزی دانی کا کچھ گھمنڈ ہے؟ اچھا۔ اب مجھ پر انگریزی ملازمت حرام ہے جب تک کہ بقدرِ ضرورت انگریزی نہ پڑھ لوں۔ اُس غریب نے ہر چند معذرت کی۔ صاحب انسپکٹر نے بھی بار بار سمجھایا۔ مگر ان کی غیرت ایک نہ مانی۔ زبردستی چھ مہینے کی رخصت لی اور دن رات انگریزی کی تحصیل میں مشغول ہو گئے اور چھ مہینے میں معمولی انگریزی لکھنے پڑھنے اور بولنے کے قابل ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے تھوڑی تھوڑی انگریزی کی تحصیل برابر جاری رکھی اور آخر میں اچھے خاصے انگریزی داں ہو گئے۔ بے شک وہ انگریزی کے گریجوایٹ اور سکالر نہ تھے۔ اور نہ بے ساختہ انگریزی بول سکتے اور نہ عمدہ لکھ سکتے تھے۔ لیکن اُن کی انگلش فہمی نہایت اعلےٰ تھی۔ اور ہندوستانی گریجوایٹ اور سکالروں سے کم نہ تھی۔ ہاں اُنھوں نے انگریزی کے مطالعے اور انگلش فہمی سے ہزاروں گریجوایٹوں کی نسبت زیادہ استفادہ کیا۔ اور زیادہ کام کیے۔ لیکن سب اُردو میں۔ اور یہی ہونا چاہیئے تھا اور چاہیئے۔ مرحوم کو انگریزی کے فاضل ہونے کا دعوےٰ نہ تھا۔ اور نہ بغیر کسی اشد ضرورت کے اب وہ انگریزی بولتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ جو لطف اور آسانی اپنی زبان میں ہے وہ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں اسی لیے اب آخر میں بولنے کی مشق بہت کم ہو گئی تھی۔ تاہم میں نے خود اپنے کانوں سے فاضل انگریزوں کو یہ کہتے سنا کہ ڈپٹی صاحب انگریزی اچھی بول لیتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک گریجوایٹ نے ان سے پوچھا کہ مولوی صاحب آپ انگریزی کتنی جانتے ہیں؟ لگے کہنے۔ تم جتنی اُردو جانتے ہو۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ میں انگریزی اپنی مادری زبان کے برابر جانتا ہوں۔ بلکہ سائل کو حکیمانہ اسلوب پر یہ سمجھانا تھا کہ تم نے انگریزی پڑھ کر اپنی مادری زبان کو بھلا دیا۔ نہ بول سکتے ہو نہ سیدھی سی دو سطریں اُردو میں لکھ سکتے ہو۔ ہاں سمجھ لیتے ہو۔ سو یہی حال میری انگریزی کا ہے۔ سمجھ لیتا ہوں لیکن نہ اچھی طرح بول سکتا ہوں اور نہ جیسی چاہیئے لکھ سکتا ہوں۔ غیر زبان ہے اتنا بھی بہت ہے۔ لیکن افسوس ہے تمھاری حالت پر کہ اپنی زبان کھو بیٹھے اور کھوتے جاتے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ ہم کامل ہو گئے!

ڈاکٹر مرحوم ابھی انسپکٹر آف سکولز ہی تھے۔ انگریزی کا مشغلہ اور تالیف و تصنیف کا سلسلہ جاری تھا کہ گورنمنٹ کی طرف سے انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ اُردو میں شروع ہوا۔ سر ولیم میور، گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کو اس ترجمے کی صحت کا بڑا خیال و اہتمام تھا۔ مولوی کریم بخش اور مولوی عظمت اللہ اُردو کے ترجمے پر مامور ہوئے۔ ڈاکٹر مرحوم کی قابلیت اور زبان دانی کا سکہ بھی حکام کے دلوں پر پہلے سے بیٹھ چکا تھا۔ یہ اُس اُردو ترجمے کی درستی اور درستی کے بعد سر ولیم میور کو سنانے پر مامور ہوئے۔ جو عربی اور فارسی کے ماہر تھے۔ ڈاکٹر مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ جب ترجمے میں کوئی سبک لفظ آجاتا اور میں اُس کو زبان کی سلاست کی وجہ سے رہنے دیتا تو سر ولیم کہتے کہ یہ لفظ سبک سا ہے اسے بدل دو۔ میں کہتا مشکل ہو جائے گا۔ فرماتے۔ کیا مضایقہ۔ یہ ترجمہ جاہلوں اور بدلیاقتوں کے لیے نہیں ہے۔ کہتے تھے اس کے بعد میں نے اصطلاحات کو بلند کرنا شروع کیا۔ اور اُس وقت میری عربی کی معلومات میرے کام آئیں اور میں عربی کا مطالعہ اور زیادہ سرگرمی سے کرنے لگا۔

انڈین پینل کوڈ کے ترجمے کا اندازہ یہ تھا کہ پہلے دونوں مترجم باہمی ردّ و کد سے ترجمہ کر کے ڈاکٹر سررشتۂ تعلیم کے پاس بھیج دیتے جو خود بھی عربی و فارسی خوب جانتے تھے۔ جب وہ اس ترجمے کو دیکھ لیتے تو سر ولیم میور کی خدمت میں بھیج دیا جاتا

جہاں ڈاکٹر مرحوم اس کی زبان اور اصطلاحات پر نظر ڈالتے۔ زاں بعد سر ولیم میور کو سنایا جاتا۔ کہتے تھے اتفاقاً ایک دن ڈاک نہ پہونچی اور مجھے یہ فکر ہوئی کہ کل کیا سناؤں گا۔ جی میں آیا آؤ خود زور آزمائی کروں۔ اصل کتاب اور ڈکشنری لے کر بیٹھ گیا شدنی بات تھی روزانہ چار پانچ پیرگراف ترجمہ ہوکر آیا کرتے تھے میں نے گیارہ پیرگراف کر لیئے۔ ترجمے کو بار بار پڑھا۔ لفظ لفظ پر اطمینان کیا۔ اور عبارت و معنی درست کیئے اور دوسرے دن پیش جا کی۔ سر ولیم سُن کر اور پیرگراف گن کر کہنے لگے آج ترجمہ زیادہ ہی کیا بات ہے۔ اور دن چار پانچ پیرگراف ہوتے تھے۔ آج گیارہ کیوں ہیں؟ میں نے عرض کیا۔ کل ڈاک نہیں آئی میں خود کتاب لے کر بیٹھ گیا جو ترجمہ ہوگیا حضور کے سامنے پیش کر دیا سر ولیم سُن کر بولے۔ ہوں تو یہ ترجمہ تم نے کیا ہے۔ اچھا جاؤ تم بھی مولوی عظمت اللہ کے ساتھ شریک ہو کر کام کرو۔ اور بمناقشہ ترجمہ کرو۔ اصطلاحات کا ذرا زیادہ خیال رکھنا۔ اب یہ بھی ترجمے میں آکر شریک ہو گئے اور اصطلاحات کے گویا مالک بن بیٹھے۔ جو اصطلاحات کی تلاش و تجویز کی مشکلات کو جانتے ہیں وہی اس کا خوب اندازہ کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر مرحوم کو اس خصوص میں کیا کچھ کاہش و کوشش کرنی پڑی ہوگی۔ حق یہ ہے کہ مرحوم کا یہ کام اُن کی قابلیت و کوشش کی ایک زبردست سند ہے اُنھوں نے اُردو میں اُس وقت قانونی اصطلاحات پیدا کیں جبکہ زبان میں اِن کا کہیں وجود نہ تھا اور پھر وہ ایسی مقبولِ عام ہوئیں کہ نہ آج تک اُن میں تغیر ہوا۔ اور نہ اِس وقت تک ہی اُن سے بہتر اصطلاحات متعین ہو سکی ہیں

جب یہ ترجمہ ختم ہوا اور بتمام و کمال مترجمین کی طرف سے ایک مکلّف خریطے میں بحضور سر ولیم پیش کیا گیا تو سر موصوف نے تینوں مترجموں کو ایک ایک کو چھ چھ سو روپے کی سنہری گھڑی عنایت کی۔ اور ڈپٹی کلکٹری کا وعدہ کر کے اُن کے نام اوّلین امیدواروں میں درج کرا دیئے۔ اور مرحوم تھوڑے دنوں میں ڈپٹی کلکٹر بندوبست ہو گئے اور پھر ضلع میں آ گئے مسجد کے حجرے میں پڑا رہنے والا لڑکا۔ مولوی مملوک علی کی پنیس کے ساتھ دوڑنے والا طالب علم اب ضلع کا کلکٹر ہے جسے باپ نے انگریزی پڑھنے سے باز رکھا تھا وہ زمانے کی رہنمائی سے بقدرِ ضرورت انگریزی پڑھ چکا ہے۔ کافی شہرت اور عزت حاصل کر لی ہے۔ دُکھ سُکھ کے دن گزر چکے ہیں۔ آسودگی اور حکومت دونوں حاصل ہیں اب اَور کیا چاہیئے۔ مگر کیا وہ علمی ذوق و شوق سے۔ جس کی بدولت یہ سب کچھ حاصل ہوا ہے۔ دست بردار ہو گیا؟ نہیں۔ انگریزی کا مشغلہ جاری ہے۔ اور جادو نگار قلم اُردو لٹریچر میں جان ڈال رہی ہے۔ آخر اب یہ جدّ و جہد کیوں ہے؟ بہت کچھ مل گیا۔ ترقی کی شاہ راہ تک رسائی ہو گئی۔ ہاں یہ سب کچھ سچ ہے مگر علم کا ذوق اور کام کا شوق ہے کہ آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ اور کیا جس علم کی بدولت سب کچھ ملا ہو۔ جو عزت۔ شہرت آسودگی کا موجب ہوا ہو اُس کے تمام احسانات فراموش کر کے بندۂ خور و خواب بن جانا روا ہو سکتا ہے؟ کسی کو یہ گوارا ہو تو ہو مگر مرحوم کو نہ تھا۔

مرحوم ابھی ڈپٹی کلکٹر ہی تھے کہ کوئیل مینز ھیوں (سمٰوات) ایک ہیئت کی کتاب رزیڈنٹ کشمیر نے لکھی جو کسی وقت شاید ڈاکٹر مرحوم سے کچھ پڑھ بھی چکے تھے۔ کتاب کی تصنیف کے ساتھ ہی اُنھوں نے اُس کے اُردو ترجمے کا بھی اعلان کیا اور بہترین ترجمے کے لیئے ایک ہزار کے انعام کا اشتہار دیا۔ مولوی صاحب کو بھی ترجمے کے لیے لکھا۔ ان کی نگاہ سے ترجمے کا اعلان پہلے سے گزر چکا تھا اور یہ آمادہ تھے۔ غرض ترجمہ کیا اَور بھی متعدد ترجمے ہوئے۔ موازنہ کے لیئے دہلی میں ایک کمیٹی بیٹھی جس میں سر سید بھی شریک تھے کمیٹی نے تمام ترجمے دیکھ کر فیصلہ کیا کہ بہترین ترجمہ ڈپٹی کلکٹر نذیر احمد کا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی بعض ممبروں نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ یہ ترجمہ موجودہ ترجموں میں سب سے بہتر ہے لیکن ریمارک ایبل یہ بھی نہیں ہے۔ اس لیئے انعام بجائے ایک ہزار کے پانسو

مترجم کو ملنا چاہیے رزیڈنٹ موصوف نے پانسو ڈاکٹر مرحوم کے پاس بھیج دیے اور ان کا ترجمہ رزیڈنٹ حیدرآباد کی معرفت سر سالار جنگ اوّل کو روانہ کیا کہ نظامِ سابق کے نانا امیر کبیر سے درست کرا دیں جو علمِ ہیئت کے یگانہ ماہر تھے۔ ترجمہ امیر کبیر نے دیکھا اور یہ کہکر واپس کر دیا کہ اس ترجمے کی اصلاح اور نظرِ ثانی بھی وہی شخص خوب کر سکتا ہے جس نے ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ جن ہاتھوں میں ہوکر امیر کبیر کے پاس پونہچا تھا اُنھیں ہاتھوں سے رزیڈنٹ کو واپس ہو گیا۔ اور پھر پھرا کر پھر مرحوم کے پاس آیا۔ یہ جزوی ردّ و بدل کے بعد باقی پانسو کے دعوے دار ہوئے۔ ابھی نامہ و پیام جاری ہی تھا کہ رزیڈنٹ کشمیر کا انتقال ہو گیا تاہم اِن کا روپیہ رزیڈنٹ موصوف کی میم صاحب نے بھیج دیا اور انہیں پورا ایک ہزار روپیہ ترجمے کے انعام کا مل گیا مگر رزیڈنٹ صاحب کی ناگہانی موت کی وجہ سے وہ ترجمہ نہ چھپ سکا۔ ڈاکٹر مرحوم اس وقت غالباً پانسو کے گریڈ میں تھے۔ کیا ایک ہزار کے بھوکے تھے کہ ترجمے کی زحمت گوارا کی۔ آنکھوں کا تیل نچوڑا۔ دماغ سوزی کی چھٹیوں کے دن غارت کیے۔ راتوں کو بیٹھے مگر ترجمہ کرتے رہے۔ اب بھی بہت سے ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ ایم۔ اے۔ بی۔ اے ہیں اکثر مولوی اور پنڈت بھی کہلاتے ہیں کوئی بھی اُن میں ایسا علمی شغلہ رکھتا ہے اور ڈاکٹر مرحوم کی طرح لکھتا پڑھتا ہے۔ بعض لوگ کہیں گے کہ مرحوم لالچی تھے روپے کی امید میں محنت کرتے رہے۔ بجا ہے۔ رزیڈنٹ کشمیر اور امیر کبیر بھی شاید نرے زر پرست ہی تھے کہ تالیف و تصنیف اور حصولِ کمال کے لیے عرق ریزیاں کرتے رہے اگر وہ علم کا صحیح ذوق رکھتے تھے تو کیوں ڈاکٹر مرحوم کے اِن مشاغل کو علم دوستی پر محمول نہ کیا جائے۔ بات یہ ہے کہ نہ کرنے والے ہمیشہ کرنے والوں کے کاموں کو ذلیل اغراض سے وابستہ دکھا کر اپنے ترفّع کا اظہار کیا کرتے ہیں لیکن کام کی عزّت باتوں سے نہیں حاصل ہو سکتی۔ اور کسی کے خاک ڈالنے سے آفتاب پر خاک نہیں پڑ سکتی۔

خدا کی شان دیکھو۔ دہلی کی کمیٹی ڈاکٹر مرحوم کے ترجمے کو بہترین ترجمہ قرار دینے کے باوجود بھی ان ریمارک اپیل کہتی اور نیز اکملہ ناقص ٹھیراتی ہے مگر اُس کی یہ ہی عیب چینی اور خوردہ گیری ڈاکٹر مرحوم کی ترقّی کا باعث بنتی ہے۔ ترجمہ سر سالار جنگ کے ہاتھوں امیر کبیر کے پاس پونہچتا ہے اور اُس ماہرِ یگانہ کا منصفانہ ریمارک سر سالار جنگ کے گوش گزار ہوتا ہے جو ہمیشہ لائق لوگوں کی تلاش میں رہا کرتے تھے اور اُن کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ ڈپٹی کلکٹر نذیر احمد کو حیدرآباد بُلانا چاہیے۔ وہ گورنمنٹ سے ڈاکٹر مرحوم کی خدمات کچھ عرصے کے لیے مستعار لیتے ہیں اور ڈاکٹر مرحوم سرکار گورنمنٹ سے پانسو کے گریڈ سے آٹھ سو ماہوار کی تنخواہ پر حیدرآباد پہنچتے ہیں اور بندوبست پر مامور ہوتے ہیں۔ جب میعاد ختم ہوتی ہے تو ڈاکٹر مرحوم اپنا استعفا پیش کرتے ہیں اور واپسی کی اجازت چاہتے ہیں۔ سر سالار جنگ کہتے ہیں نہ جاؤ۔ یہیں رہو۔ یہ اپنوں کے لیے مراعات کے خواستگار ہوتے ہیں۔ سر سالار جنگ ڈاکٹر مرحوم کے نابالغ فرزند کا دو سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کرتے ہیں۔ اور ان کے متعدد لواحقین کو حیدرآباد میں معقول اسامیاں دیتے ہیں اور ڈاکٹر مرحوم یوں بعزّت و احترام حیدرآباد دکن میں رہ جاتے ہیں اور گورنمنٹ کی ملازمت سے قطعِ تعلّق ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر مرحوم حیدرآباد میں مستقل طور پر ریاست کے ملازم ہونے کے بعد اپنے حسنِ عمل کے صلے میں برابر ترقی کرتے گئے یہاں تک کہ آخر اِن کو ۱۷ سو ماہوار تنخواہ ملنے لگی اور بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہو گئے جسے یہاں کے فنانشل کمشنر کی برابر سمجھنا چاہیے محنت و جاں فشانی اِن کا شیوہ تھا اور عزّت و قدر افزائی سر سالار کا آئین۔ یہ سب کچھ تھا مگر یہاں آکر عرصے تک یہ اپنے علمی

مشاغل جاری نہ رکھ سکے جس کا اِن کو افسوس رہا کرتا تھا - مگر حُسنِ اتفاق دیکھیے کہ سرسالار جنگ کو خیال ہوا کہ نظام (سابق) کی تعلیم کے لیے اُن کے شایانِ شان ایک نصاب مرتب کرایا جائے - یہ کام اِن کے سپرد ہوا - اور انھیں پھر علمی مشغلہ مل گیا - جب وہ نصاب مرتب ہوگیا تو اہلِ نظر نے دیکھا اور پسند کیا - مگر کتاب ہیئت کے ترجمے کی طرح یہ بھی مطبوع نہیں ہوا - اور بعض مصلحتوں کی وجہ سے خاص رکھا گیا - اِس نصاب کی ترتیب میں ڈاکٹر مرحوم نے کیا کچھ کوشش و کاوش نہ کی ہوگی - مگر افسوس وہ نگاہوں سے اوجھل رہا - اگر چھپ جاتا تو بالیقین ڈاکٹر مرحوم کی اعلٰے قابلیت کا ایک بڑا ثبوت ہوتا اور بہتوں کو اُس سے فائدہ پونہچتا +

حیدرآباد میں ڈاکٹر مرحوم کو جس قدر زیادہ دن ہوتے گئے اُسی قدر اُن کی عزت بڑھتی گئی اور اُن کی علمی ذی مایگی کا اعتراف زیادہ ہوتا گیا - خصوصاً سرسالار جنگ ان کے بہت ہی معتقد ہوگئے تھے - اسی وجہ سے اُنھوں نے اپنے فرزند لائق علی خاں کو جو بعد میں سرسالار ثانی ہوئے ان کی شاگردی میں دیا - اور وہ خود ان کے گھر آکر پڑھنے لگے - راجہ سرکشن پرشاد ان کے ہم جولی تھے - یہ بھی ساتھ آتے - اور دونوں باادب بیٹھ کر ڈاکٹر مرحوم سے پڑھا کرتے - عرصے تک یہی وتیرہ رہا یہاں تک کہ لائق علی خاں جوان ہوگئے - اور سرسالار اول کا انتقال ہوگیا - اُن کے انتقال کے بعد لائق علی خاں سرسالار جنگ ثانی کے خطاب سے باپ کے جانشین اور حیدرآباد کے وزیر ہوئے - ڈاکٹر مرحوم کی پہلے ہی کچھ کم قدر و منزلت نہ تھی - مگر اب ان کو خیال ہوا اور بجا ہوا کہ سعادت مند شاگرد وزیر ہوا ہے - اقبال کا ستارہ اور چمکے گا - یہ خبر نہ تھی کہ عروج کی انتہا ہو چکی ہے - وقتِ زوال قریب آ لگا ہے اور یہ شدنی شاگرد ہی کے ہاتھ سے ہونی ہے +

نئے سرسالار جنگ نوجوان تھے اور حوالی وحواشی ان کے مزاج میں درخور رکھتے تھے ڈاکٹر مرحوم جانتے تھے مگر کچھ نہ کہتے تھے - جب ملتے مشفقانہ انداز سے ملتے اور جو کچھ سُننا ہوتا کہہ سُن کر چلے آتے - اور کبھی زیادہ نہ بیٹھتے جو لوگ سرسالار کے مزاج میں درخور رکھتے تھے وہ ان کی طرف سے صاف نہ تھے کھٹکتے رہتے تھے کہ مبادا اُستادی کے پردے میں ہاتھ صاف کر جائیں - خود کہا کرتے تھے کہ لوگوں کو یہ اندیشہ تھا اور مجھے حاشا کہ اس کا خیال بھی نہ تھا - مگر شدنی ہو کر رہتی ہے - ایک دن سرسالار کے پاس گئے اور صحبت طویل ہوگئی جب شاگرد کی طرف سے زیادہ بے تکلفی ہوئی تو بعض کلماتِ نصیحت اِن کی زبان سے بھی نکل گئے مگر غضب یہ ہوا کہ حریفوں کے کان میں اِس کی بھنک پڑ گئی - کان بھر دیے گئے - سرسالار کا رُخ بدلا - اور ڈاکٹر مرحوم نے بھی یہی مصلحت دیکھی کہ پنشن لے کر حیدرآباد چھوڑ دیں - چناں چہ پنشن لی اور دہلی چلے آئے +

تالیف و تصنیف میں سرگرمی و پبلک لائف

اس وقت سے پہلے پہلے مرحوم صرف تحریر کے دھنی تھے اور لوگوں نے اُن کے قلم ہی کی جولانیاں دیکھی تھیں - زبانِ گویا کے جوہر ابھی نہ کھلے تھے - مگر اب دہلی آجانے کے بعد جہاں ایک طرف مرحوم نے تالیف و تصنیف کے پُرانے مشغلے کو چمکایا اور بڑھایا - دوسری طرف اُس خداداد طلاقتِ لسانی اور زورِ تقریر سے جس کی شاید اُن کو بھی اب تک خبر نہ تھی بڑے بڑے پبلک جلسوں کو گرمانا شروع کر دیا - اور پہلے ہی دن سے وہ دھاک بندھی کہ زبان زبان سے نذیر احمد - نذیر احمد سُنا جانے لگا +

مرحوم کا دستور تھا کہ جب کبھی کسی بڑے جلسے میں کسی خاص موضوع پر لکچر دینا ہوتا تو اُسے پہلے سے قلم بند کر لیتے - معلوم نہیں

کہ وہ ابتدا انہیں اُس کے پابند رہتے تھے یا نہیں۔ لیکن آخر میں جب ہم نے اُنہیں تقریر کرتے سُنا اور اُن کے وہ قلم بند لکچر دیکھے جو بعض اوقات قبل از تقریر چھپ جایا کرتے تھے تو یہی دیکھا کہ وہ اس تحریر کے ہرگز پابند نہ ہوتے تھے۔ رَو کی طرح جدھر جاتے تھے نکل جاتے تھے۔ وقت تمام ہو جاتا تھا اور وہ مشکل سے چھوٹے ہوئے پائنٹ پر آ سکتے تھے۔ طبیعت کی آمد اور زبان کی روانی کسی حصۂ بحث پر جمنے نہ دیتی تھی۔ اُن کو اکثر یہ شکایت رہتی کہ وقت کافی نہ دیا گیا۔ اور سامعین حافظے میں ڈھونڈتے رہ جاتے کہ فاضل لکچرار نے موضوع کے متعلق کیا کیا کہا۔ مگر کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ با ایں ہمہ اُن کی تقریر ایسی پُرزور اور شان دار۔ دل کش و دل چسپ ہوتی تھی کہ لوگ اُن کے وقت کا پہلے سے انتظار کیا کرتے تھے۔ اور تقریر کے وقت ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے فطرت نے اُن کو کلّہ جبڑا خطابت کے لائق دیا تھا۔ آواز نہایت بلند اور گونج دار تھی۔ عام لکچراروں کی طرح وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے نہ تھے۔ صرف بلند آواز سے گویا ہوتے۔ اور وہی ہزاروں کے مجمع میں گونج جاتی۔ آواز میں اُن کی ایک رعب تھا۔ کبھی مجلس بے قابو نہ ہونے پاتی۔ اگر وہ ذرا بھی ابتری کی جھلک پا جاتے دفعتًہ گرج پڑتے۔ اور مناسب موقع وہ شیریں ادائی یا تلخ نوائی اختیار کرتے کہ یہاں سے وہاں تک سنّاٹا چھا جاتا۔ جذبات کا گرمانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ تقریر میں خود ہنستے اور بھرے مجمع کو ہنسا دیتے۔ خود روتے اور سب کو رُلا دیتے۔ اِسی تاثیرِ بیان کی وجہ سے جن جلسوں میں چندہ ہونے والا ہوتا چندے کی وصولی اُن کی تقریر کے بعد عمل میں لائی جاتی۔ وہ اکثر اپنی ذات سے چندہ شروع کرتے اور پھر ایک ایک کی جیب جھاڑ لیتے۔ اُن کے مزاج میں ظرافت بہت زیادہ تھی۔ اور اگر تلخ گوئی پر آ جاتے تو بھی کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ پبلک ان کڑوے گھونٹوں کو بھی دوا سمجھ کر پیتی رہی۔ مگر جب ایک آدھ دفعہ نہ پیے گئے تو ڈاکٹر مرحوم شاید صرف اپنی خیر اندیشی کو پیشِ نظر رکھ کر جھنجلا گئے اور ایسے ملول ہوئے کہ پبلک لائف کو خیرباد کہہ بیٹھے اور اب پانچ چھ برس سے کسی پبلک جلسے میں شریک نہ ہوتے تھے۔ تب بھی تقریبًا اُنھوں نے سترہ اٹھارہ برس اپنی زبان سے پبلک کی خدمت کی۔ متعدد نیک تحریکیں اُن کی زبان کی آب یاری سے سرسبز ہوئیں۔ اور لاکھوں کا چندہ اُن کی زبان کی جنبش سے جمع ہو کر نیک کاموں میں لگا۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی اِس قسم کی خدمات اکثر مسلمانوں سے مخصوص رہیں لیکن وہ خدمات اگر ایک لحاظ سے قومی تھیں۔ تو دوسرے لحاظ سے انسانی بھی تھیں اس لیے اپنے پرائے سب کے نزدیک قابلِ ستایش ہوئیں اور ہونی چاہئیں تھیں۔ ڈاکٹر مرحوم شاعر اور شاعری کے مدّعی نہ تھے لیکن عربی۔ فارسی۔ اُردو۔ تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُن کا عربی۔ فارسی۔ کلام جو کبھی محض تفنّنِ طبع کے طور پر موزوں ہو جایا کرتا تھا۔ اُن کی زبان اور مسوّدات سے آگے نہیں بڑھا۔ لیکن اُردو کی نظمیں جو عمومًا اُنھوں نے کسی لکچر میں پڑھنے اور سامعین کے دلوں کو برمانے اور اُن کے جذبات کو گرمانے کے لیے کہیں لکچروں کا جزو بن کر شائع ہوتی رہیں۔ باوجودیکہ مرحوم نے شعر و سخن کی طرف کبھی خاص توجہ نہ کی تھی لیکن پھر بھی اُن کا کلام شاعرانہ جزالت سے خالی نہ ہوتا تھا۔ اور چوں کہ وہ اپنی نظم میں کام کی باتیں کہتے اور حقائق کی تصویر کھینچتے تھے سُننے والے اُن کے کلام سے متاثر ہوتے تھے اور جس کے کلام کو یہ بات نصیب ہو جائے وہ فی الجملہ شاعر ہے اگرچہ وہ اپنے تئیں شاعر نہ کہتا ہو +

تصنیفات

ڈاکٹر مرحوم نے جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں مدرسی اور ڈپٹی انسپکٹری کے زمانے سے تالیف و تصنیف یہ سرگرمی شروع کر دی تھی۔ جو بادشاہِ حیدر آباد تمام زمانہ مُلازمت میں برابر جاری رہی۔ دہلی آئے

کے بعد یہ سرگرمی اَور بھی زیادہ ہوگئی۔ مذہبی اور مذہبی رنگ کی تراجم وتالیفات کے انبار سے قطع نظر کرلیے پر بھی اُن کی عام اخلاقی
وعلمی تصانیف کچھ کم نہیں بلکہ بہت زیادہ ہی اور کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس صنف میں بالخصوص نہایت خوش تصنیف اور خوش نصیب مصنف تھے
خوش تصنیف اس لیے کہ اُن کی یہ کتابیں مقبول ہوئیں۔ بار بار چھپیں اور کئی کئی مطبعوں میں چھپیں اور ہاتھوں ہاتھ فروخت
ہوگئیں اور ہو رہی ہیں۔ جب تک اُنھوں نے خود اپنی کتابوں کے چھپوانے کا انتظام نہیں کیا بہت سے مطبع اُن کی کتابوں
سے مالا مال ہوئے۔ بہت سے بُک سیلر بن گئے۔ اور اب بھی کم و بیش فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ ان کی بعض کتابوں نے وہ
قبولِ عام پایا کہ انگریزی میں ترجمہ ہوئیں۔ ہندوستان میں جو زبانیں ذرا بھی لٹریری حیثیت رکھتی ہیں اُن میں ان کا ترجمہ
ہوا۔ گزشتہ صدی کیا مدتہائے دراز سے کم از کم ہندوستان میں کسی مصنّف کی تصانیف کو یہ رُتبہ حاصل نہیں ہوا وہ
اپنی تصنیف کی بدولت جہاں اُستاد ہو گئے۔ اُن کی کتابوں سے بلا قیدِ ملّت و مشرب ہندو مسلمان کرسچن سب نے استفادہ کیا ہندوؤں
نے ان کی یہ کتابیں تفنُّناً پڑھیں مسلمانوں نے ان کو سر آنکھوں پر رکّھا۔ یوروپین نے بھی ان کو اپنا راہ نما بنایا اور ان سے
اردو حاصل کی۔ جہاں جہاں اُردو مکاتب و مدارس ہیں ہر جگہ اُردو کے کورسوں میں ان کتابوں کا انتخاب موجود ہی اور اُستاد
و طالبِ علم دونوں مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ غرض کہ ڈاکٹر مرحوم اگرچہ ایک مسلمان مصنّف تھے لیکن اُن کی اس صنف کی
تصانیف سے فیضِ عام کا چشمہ جاری ہوا۔ جو مدّت ہائے دراز تک جاری رہے گا اور آنے والی نسلوں کو مرحوم کی یاد دلاتا رہے گا
وہ خوش نصیب مصنّف تھے اِس لیے کہ اُن کے جیتے جی اُن کی کتابیں مقبول ہوگئیں۔ یہ بات اچّھے اچّھے مصنفوں میں
سے کم تر ہی کو نصیب ہوتی ہی۔ اُنھیں اپنی تصنیف سے نہ صرف شہرت و عزّت حاصل ہوئی بلکہ دولت بھی۔ اُنھیں اکثر
کتابوں کی تصنیف و تالیف کے صِلے میں سرکار سے بیش قرار انعام ملے۔ اور جب مرحوم نے اپنی کتابوں کے چھاپنے کا
آپ انتظام کر لیا تو اُن سے لاکھوں روپیہ کمایا اور گھر بیٹھ کر زمانۂ ملازمت سے زیادہ دولت جمع کی اِن باتوں سے بڑھ کر
مصنّف کی خوش نصیبی اَور کیا ہو سکتی ہی۔ ڈاکٹر مرحوم پنشن لے کر دہلی آنے اور قومی معاملات میں شریک ہونے کے بعد سے
زیادہ تر قومی اور مذہبی رنگ کی کتابیں لکھتے رہے۔ مگر بعض اخلاقی نتیجے خیز۔ عام دل چسپی کی کتابیں بھی اپنے خاص رنگ
میں لکھیں اور عمومیت کے پہلو کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ۱۹۰۳ء کے دربارِ تاجپوشی کے متعلق گورنمنٹ کی طرف سے جو کتاب
انگریزی میں تیار ہوئی تھی۔ گورنمنٹ کے حکم سے اُس کا ترجمہ کیا۔ اِس ترجمے میں اگرچہ دوسروں کا بھی ہاتھ تھا لیکن فرض ادا کرنے
کا زیادہ تر فرض خود ڈاکٹر مرحوم ہی نے ادا کیا۔ اِس لیے اس کی کریڈٹ کے خود ہی مستحق ہوئے +

اُن کی تالیف اور ترجمے کا سلسلہ تقریباً موت کے وقت تک جاری رہا۔ اگرچہ کچھ دنوں سے آنکھیں کم زور ہو گئی تھیں۔
نظر بہت کم آتا تھا۔ رعشہ بڑھ گیا تھا اور لکھنے سے معذور تھے۔ مگر لکھنے پڑھنے کا ایسا چسکا پڑا تھا کہ ہاتھ اور آنکھوں سے مجبور
تھے تو دوسروں سے کام لیتے تھے۔ ترجمہ یا اَور کچھ چاہتے دوسروں سے لکھواتے۔ اور پھر اصل اور ترجمے کا فقرہ فقرہ سُنتے
اور اپنے انداز پر بنواتے جاتے۔ اور یوں وہ اجنبی تحریر اُن کی تحریر ہو جاتی +

اُن کی تحریر کا انداز خاص تھا۔ الفاظ کی شوکت عبارت کی متانت۔ طرزِ ادا کی بلاغت ان کے قلم کی خاص اور
مابہ الامتیاز صفت تھی۔ بعض اعتراض کے پیرائے میں شاکی رہے کہ مولانا مغلق الفاظ لکھتے ہیں اور غیر مانوس لغت لاتے ہیں

یہ ایک حد تک صحیح بھی تھا لیکن اُن کے اِس انداز سے زبان کو وسعت ہوئی۔ بہت سے نئے الفاظ جو مقبولِ عام ہو گئے اُن کی بدولت زبان میں داخل ہوئے اِس لیے اُن کا یہ انداز قابلِ ستایش ہے۔ نہ لائقِ ملامت۔ ایسے ہی مصنفوں کی بدولت زبان وسعت پایا کرتی ہے۔ نہ لکیر کے فقیروں سے۔ اُن کا اسلوبِ بیان بھی نرالا تھا۔ محاورے کو وہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ مگر عام اسلوب کی شاہِ راہ پر چلنا اُن کو پسند نہ تھا۔ جہاں عام طرزِ ادا مبتذل پاتے خود اکثر رفعت و متانت اختیار کرتے اگر کسی باب میں عام روش ثقاہت و متانت کے دوش بدوش ہوتی اور اُس کا بدلنا دشوار ہوتا تو خود بلندی سے پستی کی طرف آجاتے۔ متانت و رزانت چھوڑ کر سبکی اختیار کر لیتے مگر عام پامال راستے پر نہ چلتے۔ اسی لیے اب کہ پیرانہ سالی کی وجہ سے دماغ زیادہ غور و فکر کا متحمل نہ رہا تھا جیسے آخر میں سمندِ بیان توسنی کرنے لگا تھا۔ ادہم قلم بھی کبھی کبھی سکندری کر جاتا تھا۔ اور اُن کی بعض بعض تحریریں استعجاب کی نگاہوں سے دیکھی جانے لگی تھیں +

ڈاکٹر مرحوم کی زندگی کا سب سے بڑا کام اُن کی تصنیف و تالیف ہے جس کی تنقید کے لیے ایک دفتر چاہیئے۔ لہٰذا ہم اس سے مطلق تعرض نہیں کرتے اور اسی وجہ سے ہم نے اپنے اس مضمون میں اُن کی کسی تصنیف و تالیف کا نام تک نہیں لیا۔ لیکن چوں کہ ہماری غرض اِس مضمون سے زیادہ تر یہ ہے کہ ڈاکٹر مرحوم کی لائف کے وہ خاص خاص نمایاں خد و خال دکھائیں جو عبرت انگیز اور سبق آموز ہو سکیں اس لیے اتنا ہمیں کہنا ہی چاہیئے ڈاکٹر مرحوم نے غالباً سب سے پہلی کتاب "چند پند سود مند" لکھی۔ جو اپنی تحریر کے لحاظ سے ایک معمولی کتاب ہے۔ اس کو پڑھ کر زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُس کے مصنف کو تصنیف کا شوق ہے۔ اور زبان کے کثیر الفاظ پر عبور و استحضار رکھتا ہے اور بس۔ مگر جس قلم سے یہ کتاب نکلی تھی آگے بڑھ کر وہی اعجاز نگار ہو گئی اور اُسی سے مرآۃ العروس۔ توبۃ النصوح۔ بنات النعش۔ ابن الوقت جیسی بلند پایہ کتابیں نکلیں۔ جنھوں نے مصنف کو آسمانِ شہرت کا تارہ بنا کر چمکایا۔ اور اُس کے نام کو چار چاند لگا دیے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آدمی اگر کچھ بھی طبیعت اور سلیقہ رکھتا ہو تو کرتے کرتے بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ ایک خوبی ڈاکٹر مرحوم کی بعض عام تصانیف میں یہ بھی ہے کہ انھوں نے علمی مسائل کے ساتھ بہت سے مغربی خیالات اور اہلِ یورپ کی بعض اخلاقی خوبیاں نہایت عمدگی کے ساتھ اُردو لٹریچر میں جذب کیں۔ اور جو انگریزی پڑھی تھی اُس سے استفادہ کیا۔ اِس طریق پر مشرق و مغرب کو باہم قریب کرنے کی جو کم و بیش مشکور کوشش ان کی طرف سے عمل میں آئی وہ بھی کسی طرح نظر انداز نہ ہونی چاہیئے بلکہ دوسروں کو اُس سے سبق آموز ہونا مناسب ہے +

علمی خطابات

ڈاکٹر مرحوم عرصے سے شمس العلما اور ایل ایل۔ ڈی تھے۔ پہلا خطاب اُن کو گورنمنٹ سے ملا تھا اور دوسرا ایڈنبرا یونیورسٹی سے۔ سر ولیم میور ہندوستان سے واپس ہونے کے بعد ایک زمانے میں ایڈنبرا یونیورسٹی کے ڈین ہو گئے تھے۔ اُن ہی دنوں میں ڈاکٹر مرحوم کے کسی انگریز دوست نے سر ولیم میور سے اِن کا تذکرہ کیا اُن کو ابھی کچھ کچھ یاد تھے تحقیق کے بعد کہ یہ وہی نذیر احمد ہے جس نے تعزیراتِ ہند کا ترجمہ کیا تھا انھیں ایل ایل ڈی بنا دیا یوں ڈاکٹر مرحوم سمندر پار کی ایک نامور یونیورسٹی سے علمی خطاب کا اعزاز پا چکے تھے مگر ہندوستانی یونیورسٹیوں میں پائے چراغ تاریک کی مصداق ابھی اندھیرا ہی تھا کہ آخر پنجاب یونیورسٹی میں ایک حق گو۔ دوست نواز آواز بلند ہوئی اور ڈاکٹر مرحوم کوئی دو ڈھائی برس ہوئے کہ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈی۔ او۔ ایل۔ بنائے گئے +

تعلیمی مشغلہ

ڈاکٹر مرحوم کو تالیف و تصنیف کے علاوہ پڑھانے کا بھی شوق تھا۔ جب سے وہ دہلی آئے ایک نہ ایک سبق اُن کے ہاں جاری رہا۔ عربی علمِ ادب میں چوں کہ ان کو زیادہ توغل تھا لہٰذا ادب نہایت شوق و خوبی کے ساتھ پڑھاتے تھے۔ باقی چیزوں کو چوں کہ چھوڑے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا اور اب طبیعت کاوش کی متحمل نہیں رہی تھی اس لیے اگر کوئی کچھ اَور پڑھنا چاہتا تو بلا تکلف معذوری کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ وہ ہمارے کالج کے آنریری عربک پروفیسر بھی تھے اور جب کبھی ضرورت یا کام کی کثرت ہوتی وہ نہایت شوق سے مدد دیتے۔ اور ہمیشہ کہا کرتے۔ مَیں حاضر ہوں۔ اس کے علاوہ مرحوم کو کالج اور کالج اسٹاف سے خاص اُنس اور تعلق تھا۔ اخلاقی مدد سے گزر کر انھوں نے کالج کی مال سے بھی مدد کی۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ بورڈنگ توسیع کی مد میں پانسو روپیہ دیا تھا۔ اور مزید عطیہ کا ارادہ رکھتے تھے +

کیریکٹر

ڈاکٹر مرحوم کا نمایاں ترکیریکٹر یہی تھا کہ وہ علم دوست تھے اگرچہ تمام عمر پڑھنے میں گزری تھی مگر اس پیرانہ سالی میں بھی پڑھنے سے سیر نہیں ہوتے تھے بمطالعہ ان کا برابر جاری رہتا تھا۔ اور نئی نئی باتوں کے حصول کا شوق۔ کوئی تین چار برس ہوئے کہ ایک پنڈت جی سے سنسکرت شروع کی تھی۔ مگر جب آنکھوں نے جواب دے دیا تو مجبور ہو گئے۔ ابتدا سے کفایت شعار تھے۔ اسی کی بدولت وہ دولت مند ہوئے۔ عمر کے ساتھ اُن کی جزرسی بڑھتی گئی۔ پیسے پیسے پر ان کی نظر رہتی تھی۔ اِسی لیے لوگ آخر میں کنجوس کہنے لگے تھے۔ لیکن درحقیقت یہ بات نہ تھی "حساب جو جو بخشش سو سو"۔ اُن کا اصول تھا۔ انھوں نے قومی کاموں میں ہزاروں روپیہ دیا۔ جن کو مدد کا مستحق سمجھا اُن کی مدد کی اور فراخ حوصلگی سے مدد کی۔ چوں کہ اُن کا بہت سا روپیہ مارا گیا تھا اور آخر میں وہ محتاط ہو گئے تھے لوگ سمجھتے تھے کہ زرپرست ہو گئے ہیں۔ وہ سادہ مزاج تھے۔ ہمیشہ سادگی سے رہے اور سادہ لباس پہنا۔ حتیٰ کہ حیدرآباد میں بھی جہاں نمایش و طمطراق لازمۂ شرافت و لیاقت ہے۔ یہ سادگی میں بسر کرتے اور اسی میں معزز و محترم رہے۔ سچ ہے لباس سے کوئی آدمی نہیں بن جاتا۔ اُن کے مزاج میں ظرافت و متانت دونوں تھیں لیکن بعض اوقات دونوں حد سے بڑھ جاتی تھیں۔ اُن کے شناسا بہت تھے۔ لیکن جہاں تک مَیں جانتا ہوں وہ کثیر الاحباب نہ تھے۔ دوستوں کی اُن کی نگاہوں میں قدر تھی۔ لیکن طبیعت نازک اور ذرا زودرنج تھی اور جلدی صاف نہ ہوتے تھے اسی نازک مزاجی کی وجہ سے انھوں نے پبلک لائف کو خیرباد کہا۔ اور اسی کی بدولت بعض گومگو وجوہات کی بنا پر وہ اہلِ وطن سے برگشتہ ہوئے اور اہلِ وطن نے اُن کی طرف سے سردمہری اختیار کر لی تھی +

آخری وقت کے خیالات

اگرچہ ڈاکٹر مرحوم ایک عرصے سے پبلک لائف چھوڑ چکے اور اُس کی دلچسپیوں سے مُنہ موڑ چکے تھے لیکن جو کام سالہا سال کیا ہو اُس کا بالکل دل سے فراموش ہو جانا کوئی آسان بات نہیں ہوتی اسی لیے اب انھیں رہ رہ کر پبلک یاد آنے لگی تھی اور چوں کہ زبان و قلم میں پہلی سی طاقت اور توانائی نہیں رہی تھی اور اللہ نے اُن کو دولت دی تھی اور علم اور علمی مشاغل اُس دولت و ثروت کا موجب ہوئے تھے اس لیے اُن کا عزم بالجزم تھا کہ اب مال سے پبلک کی تعلیمی خدمات انجام دیں اور بقائے نام کا کام کر جائیں۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا علم ہے کہ ڈاکٹر مرحوم ایک لاکھ سے متجاوز رقم گورنمنٹ کی معرفت تعلیمی امداد کے لیے عطا کرنے والے تھے اور چوں کہ مرحوم کو ہمارے کالج سے خاص تعلق تھا وہ دو ایک بیش قرار دائمی وظیفوں کی رقم کالج کو بھی دینا چاہتے تھے۔ مرحوم کا یہ ارادہ کچھ پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ جو اُن سے ملتے جلتے تھے وہ سب اس سے باخبر تھے۔ بعض تو یہاں تک کہہ چکے تھے کہ ع درکارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست + مسٹر انڈرروز اور مسٹر رڈرا سے

اس کا نہ صرف مذکور آچکا تھا بلکہ یہ بھی طے پالیا تھا کہ آپ کے ولایت سے واپس آنے پر آپ اور دو ایک اور آدمیوں کے ہاتھوں ہی سے یہ
کام سرانجام ہوں گے۔ مگر افسوس موت نے مہلت نہ دی اور یہ تمام ارادے یوں ہی ناتمام رہ گئے۔ ہاں مرحوم کے نام بردار فرزند جو بفضلہ
تعالےٰ خود بھی دولت مند ہیں چاہیں تو مرحوم کی مردہ آرزوؤں کو زندہ کرکے نہ صرف باپ کی روح کو خوش کرسکتے ہیں بلکہ خود بھی
نام وثواب دونوں سے بہرہ ور ہوسکتے ہیں +

صاحبو! مرنا سب کو ہے۔ ڈاکٹر مرحوم کی موت کوئی انوکھی بات نہیں وہ تقریباً عمر طبعی کو پہنچ چکے اور بہت کچھ کر چکے تھے۔
افسوس صرف اس بات کا ہے کہ جس قابلیت اور جس وضع کا آدمی اٹھ گیا ہے۔ نہ اس کا کوئی صحیح جانشین موجود ہے اور نہ پیدا ہونے
کی توقع۔ کیوں کہ جس قالب میں یہ پرانے لوگ ڈھلے تھے مدت ہوئی کہ وہ ٹوٹ چکا زمانے کا رنگ بدل گیا ہے۔ اور قابلیت کی کایا
پلٹ گئی ہے لائق وقابل ہوں گے مگر نذیر احمد سے کہاں ہوں گے اور کیوں کر ہوں گے ألا كل شيء ما خلا الله باطل ۔۔ از سینٹ سٹیفنز کالج میگزین دہلی

آخری حالات

انتقال سے کوئی تین مہینے پیشتر سے گھر سے نکلنا مطلقاً چھوڑ دیا تھا۔ مزاج میں چڑچڑا پن اور غصہ زیادہ
ہوگیا تھا۔ دنیا کو فی الواقع ترک کر دیا تھا کسی سے ملنا پسند نہ کرتے تھے۔ کئی کئی وقت کھانا نہ کھاتے تھے
گو جانتے تھے کہ موت قریب ہے لیکن پھر بھی معاملات کے سلجھانے اور سمیٹنے کی کوشش نہ کی۔ نہ اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو دخل
دیا۔ وصیت مرحوم نے زبانی یا تحریری کسی قسم کی نہیں کی نہ اپنی جائداد کی تقسیم کی۔ جو کچھ معاملات اور جتنی بھی جائداد تھی بہ استثنائے
معدودے چند سب خاکسار کے نام تھی۔ خود بطور میرے مختار عام کے کاروبار کرتے تھے۔ اگر اپنے جیتے جی جائداد کو بانٹ جاتے
یا وصیت کر جاتے تو کوئی جھگڑا بکھیڑا بعد میں نہ پڑتا۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ میرے بعد خوب جوتیوں میں دال بٹے گی اور ضرور
ایسا ہی ہوتا لیکن خاکسار نے سب پر خاک ڈال دی۔ پس ماندوں میں صرف دو ہی تھے میں اور میری بہن۔ لوگوں نے بہت کچھ
الجھاوے ڈالے اور کوئی دقیقہ ہم دونوں کو لڑوا دینے کا اٹھا نہ رکھا مگر خدا کا شکر ہے کہ آپس ہی میں سب کچھ طے ہوگیا کسی کو کانوں
کان بھی خبر نہ ہوئی۔ چوں کہ خاکسار کے نام بیشتر حصہ جائداد غیر منقولہ کا تھا اس لیے قانوناً اور شرعاً میں اس کا مالک تھا مگر میری
ہمشیرہ صاحبہ کی یہ خواہش ہوئی کہ علاوہ اس جائداد کے جو خاص مرحوم کے نام تھی اس میں بھی حصہ شرعی دو۔ میں نے سوچا کہ عدالت
کے مخمصوں میں کون پھنسے بہتر یہی ہے کہ جو وہ مانگیں آنکھ بند کرکے دے دوں اور میں نے ایسا ہی کیا کہ بلا امتیاز کسی امر کے کہ وہ
جائداد میرے نام ہے۔ یا والد مرحوم کے نام ہر قسم کے متروکہ میں بلا چوں وچرا اپنی بہن کو حصہ دے دیا اور ان کی خوشنودی کے مقابلے
میں مالی نقصان کی کچھ پروا نہ کی۔ ع۔ ہیں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر +

شکریہ

میرے والد کی وفات حسرت آیات پر ہندوستان کے ہر حصے سے صدائے ہمدردی بلند ہوئی۔ والد مرحوم کے
دوستوں نے جو میرے بھی بزرگ تھے اور میرے دوستوں نے میرے غم کو بہت کچھ ہلکا کر دیا۔ جب میں دیکھتا ہوں
کہ میری اس مصیبت میں سارا ہندوستان شریک ہے تو ضرور میرے دل کو تسلی ہوتی ہے کہ میرے باپ کو لوگ کیسی اچھی طرح یاد
کرتے ہیں اور میرے دل کے ساتھ کتنے دل غمگین ہیں۔ چنانچہ خاکسار نے متعدد اخباروں میں شکریے کی تحریر بھی چھپوا دی ہے
اور اب پھر ان تمامی ہمدردان قوم اور احباب کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میری اس مصیبت میں میری دلی ہمدردی
کی۔ اللھم افرغ علینا صبرًا وثبت اقدامنا +

آخری ناتمام تصنیف

مرحوم کے زیرِ تصنیف "مطالب القرآن" نامی ایک مبسوط کتاب تھی - قرآن شریف کے تمام مضامین بابواب
انھوں نے چھپوا لیے تھے اور ہر ہر مضمون پر اپنی طرف سے ایک جامع اور بسیط مضمون لکھتے چلے جاتے تھے اور جتنا لکھتے تھے اُتنا ہی چھپ
بھی جاتا تھا چنانچہ ربع کتاب چھپ کر تیار ہی باقی سہ ربع نہ تصنیف ہوئی نہ چھپنے کی مہلت ملی کہ پیغام اجل آگیا - جتنا اُن کے مرنے
کا افسوس مجھے ہی اُسی قدر اس کتاب کے ادھورے رہ جانے کا بھی ہی - کیوں کہ بقول منشی محبوب عالم صاحب کے اُن کی تصانیف
کا ایک ایک جملہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہی اور حیف کہ وہ چشمۂ فیض بند ہوگیا - لوگ زیادہ تر اُن کے کلام کے خواہش مند ہیں
خاکسار کا ارادہ ہی کہ جس طرح بھی ممکن ہو اُس کی تکمیل خود کر دے لیکن یہ بات اُس وقت تک ناممکن ہی جب تک کہ میں ملازمت
میں پھنسا ہوا ہوں - پھر میری بیوی کی مرگِ مفاجات چھوٹے چھوٹے بچّوں کو چھوڑ کر اُن کا اُٹھ جانا - یہ سب باتیں انسان
کے ہوش و حواس منتشر کر دینے کو کافی ہیں اگر حیاتِ مستعار باقی ہی تو میں پنشن لے کر جب گھر بیٹھوں گا جسے کچھ زیادہ زمانہ
نہیں ہی یا یہ کہ اسی درمیان میں اگر مجھے اطمینانِ قلب ہوا اور تفکرات و مکروہاتِ زمانہ سے بہ افضالِ الٰہی تھوڑی سی بھی مہلت
مل گئی تو پھر میں ابھی اس کام کی طرف متوجہ ہو جاؤں گا - گو میں اس کتاب کی تکمیل اُس خوبی سے نہ کر سکوں گا جیسی کہ مرحوم
نے ابتدا کی تھی اور میرا لکھا ہوا اُس میں اسی طرح صاف الگ تھلگ معلوم ہوگا جیسے تاج گنج کی مرمت چغلی کھاتی ہی لیکن
بھلا بُرا جیسا کچھ مجھ سے بن پڑے اُس کی تکمیل کر دینا میرا فرض ہی خدا اس فرض سے ادا کرے ✤

مرحوم کے تجارتی کاروبار

یہ بات مخفی نہیں ہی کہ باکار آدمی سے بے کار نہیں بیٹھا جاتا - مرحوم جب تک سرکارِ انگریزی
کی ملازمت میں رہے سلسلہ تصانیف کا جاری تھا جب دکن میں گئے کلام مجید حفظ
کیا تلنگی زبان پڑھتے رہے غرض کوئی وقت اُن کا سرکاری کام یا کتب بینی سے خالی نہ رہتا تھا - حافظہ اس بلا کا تھا کہ اُقلیدس
کی شکلوں کے دعوے اس وقت تک نوکِ زبان تھے - ریاضی سے بھی اُن کو کافی دل چسپی تھی مشکل سے مشکل سوال دقیق سے
دقیق اقلیدس کے مسائل کو بہ آسانی حل کرتے تھے - ہزارہا اشعار اُردو فارسی عربی کے اَزبر تھے -

جب والد مرحوم حیدر آباد کی ملازمت سے دست کش ہو کر پنشن لے کر خانہ نشین ہوئے تو ایک ایسے شخص کے لیے جو مدت العمر
مشاغل میں منہمک رہا ہو خالی بیٹھے رہنا ایک مصیبت تھی - دہلی میں بھی اُنھوں نے تعلیم و تعلّم کا مشغلہ جاری رکھا تھا - صبح
سویرے حدیث اور علمِ ادب کا درس دیا کرتے تھے منتخب لوگ اُن سے پڑھنے آتے تھے - اور خود بھی سنسکرت پڑھا کرتے
تھے تصنیف و تالیف کا مشغلہ پھر تازہ ہوا لیکن تصنیف و تالیف پہلے زمانے کی طرح نہ تھی بلکہ مذہبی کتابوں کا سلسلہ تھا
چنانچہ ترجمۂ کلام مجید اور الحقوق و الفرائض - اجتہاد - اُمّہات الاُمّہ وغیرہ اسی خانہ نشینی کے زمانے کے مشاغل ہیں - پنجاب
یونیورسٹی اور حیدر آباد کے اعلیٰ امتحانات کے وہ مُمتحن تھے - کسی معمولی شخص کے لیے یہ مشاغل مصروفیت کے لیے بالکل کافی تھے
لیکن اُن کی بے چین طبیعت کو جب بھی کافی مشغلہ نہ تھا اُن کے لنگوٹیا یاروں میں احسان اللہ پنجابی ایک شخص تھے (جو چند سال
ہوئے کہ مر گئے) ان کی دکان حبش خاں کے پھاٹک میں تھی وہاں کثرت سے جایا کرتے تھے - بھلا ان کو ایسی سونے کی چڑیا کہاں
ملتی تھی - رفتہ رفتہ تجارت کی چاٹ ڈال دی - کچھ روپیہ ان کا شامل کیا اور فرضی منافعہ بتلا کر کئی سالوں کے بعد ان کو ایک
معتد بہ نقصان دے کر علیحدہ ہوئے جس کا خمیازہ اب تک بھگتتا جا رہا ہی - اسی طرح دلّی کے سیکڑوں شخص ان کو لپٹ گئے

اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں روپیہ ان کا گھسیٹ لیا۔ شروع شروع میں فرضی نفع کی طمع دلائی آگے چل کر اصل سرمایہ بھی غارت کیا۔ مانا کہ مرحوم ایک بڑے ذی علم و تجربے کار شخص تھے لیکن ضرور نہیں ہی کہ ہر ذی علم ایک بڑا تاجر بھی ہو۔ یہ فن ہی دوسرا ہی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا۔ کہ لاکھوں روپیہ برباد کیا لیکن کچھ ایسے ننانوے کے پھیر میں پھنسا دیا تھا کہ نہ پائے رفتن و نہ روئے ماندن سانپ کی چھچھوندر تھی کہ نہ اُگلی جائے نہ نگلی جائے۔ نقصان پر نقصان اُٹھاتے تھے۔ لوگوں کی بدمعاملگی سے تنگ آ گئے تھے۔ آئے دن کی مقدّمے بازی سے متنفّر تھے۔ لیکن پھر بھی شہد کی مکھّی کی طرح اُور لت پت ہوتے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ مرتے دم تک یہ مجھلہ نہ چھوٹا پر نہ چھوٹا + دُنیا بھر کے تچّے اور آزاد ان کے پاس بھیگی بلّی بن کر آتے تھے۔ چند دن میل ملاپ بڑھاتے خوشامد درآمد کرتے۔ بگلا بھگت بن کر ان پر داؤ ڈالتے تھے اور اچھّی طرح مالامال ہو جاتے تھے۔ مرحوم اپنی طرح سب کو ایمان دار سمجھتے تھے اور ان کی چکنی چُپڑی باتوں اور دامِ تزویر میں اس طرح پھنس جاتے تھے کہ معمولی سے معمولی سمجھ کا آدمی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ سوائے اس کے کہ اس کو قدرتِ الٰہی کہا جائے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ کَون یقین کرے گا کہ ایسا فریس ایسا باخبر شخص یوں اپنی دولت کو لُٹا رہا ہی۔ زر دادن و دردِ سر خریدن سُنتے تھے یہاں تو اپنی آنکھوں دیکھ لیا بعض لوگ اُن کے ایسے مُنہ چڑھے تھے اور اس درجے اُن پر اعتماد بڑھا ہوا تھا کہ اُن کے مقابلے میں اپنا بیٹا بھی ہیچ تھا۔ گو مرحوم کو ایسے ہی لوگوں سے لاکھوں روپے کے نقصان پہونچے لیکن پھر بھی ایک معتبر بیٹا اُور دوسرا اُس سے بڑھ کر پیدا ہوا اسی طرح بہت سے لوگ بن گئے اور ہماری دولت مفت میں غارت ہوئی۔ غیروں پر اعتماد اور بھروسا اس درجے بڑھا ہوا تھا کہ خود کبھی کسی کاروبار یا حساب کو دیکھتے ہی نہ تھے جو جس نے کہہ دیا آمنّا و صدّقنا اگر کسی نے سچّی ہمدردی یا دلی خیرخواہی سے کچھ مخالفت کی تو اُسے جھڑک دیا۔ جائداد اور املاک کا یہ حال تھا کہ کبھی اُنھوں نے کسی جائداد کو دیکھا بھی نہیں کہ کدھر ہی کیسی ہی کیا کرایہ آتا ہی مرمّت میں کیا صرف ہوا۔ جو کارپردازوں نے کہہ دیا پتھّر کی لکیر ہو گیا۔ ہزارہا روپے کی جائدادیں رہن تھیں لیکن یہ خبر نہیں کہ جس قدر روپیہ دیا ہی آیا اُس کی مساوی جائداد بھی مکفول ہی یا نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ ہزار ایک صاحب لے گئے دلّال اور قبالے نویس سے مل ملا کر اُنھوں نے ہزار دو ہزار کا کھنڈر مکفول کر دیا۔ جب نالش ہوئی تو اَور گرہ سے ہزار پانسو خرچ ہوا ملا کیا پانچ چھہ ہزار کی جگہ چھہ سات سو یا بعض اوقات وہ بھی نہیں۔ ایسی ایک مثال نہیں صدہا مثالیں موجود ہیں۔ اقرار نامہ۔ تمسّک۔ دستاویز سب بالائے طاق جو معاملہ دیکھو زبانی نہ لکھا نہ پڑھی نہ گواہ نہ شاہد بہت ہوا تو ایک ہینڈ نوٹ لکھوا لیا۔ اب اُن ہینڈ نوٹوں کو شہد لگا کر چاٹا کرو۔ ہینڈ نوٹ اُسی کا بکار آمد ہی جس کے پلّے کچھ ہو اور جس کے پاس کچھ ہی ہی نہیں اُس کا ہینڈ نوٹ ردّی کاغذ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ صبح سے شام تک ایک سلسلہ لگا رہتا تھا جن کو سارے شہر میں دمڑی نہ مل سکتی تھی وہ یہاں سے جھولی بھر کے روپے لے جاتے تھے جن کو مرحوم بڑا ایمان دار سمجھتے تھے وہی بڑے بے ایمان تھے۔ چنانچہ اُن کی زندگی کے آخری دنوں میں اُنھیں خود اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ قریب چار پانچ لاکھ روپے کے اُن کا نقصان اُن کے حدِّ علم میں ہو چکا تھا اور روز بروز ہوتا جاتا تھا مگر کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑتی تھی اور اُن کے حواریّین اُن کو بڑھاوے چڑھاوے دیتے تھے کہ فلاں معاملے میں اگر پانچ ہزار اَور ڈال دیے جائیں تو سب روپیہ تر جائے گا اور وہاں کا یہ حال تھا کہ ہر چہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ جب لوگ

ان کو خوب لوٹ کھسوٹ چکے تو اور ذرائع بھی بے ایمانی کے نکالے کہ اُلٹی مرحوم پر نالشیں کر دیں۔ روپیہ بھی کھایا اور اُلٹا دعوی بھی کیا یہ نتیجہ تھا اُس غیر معمولی بھروسے کا جو یہ خود غرضوں پر کرتے تھے۔ نوبت یہاں تک پونہچی تھی کہ روپیہ ان کا داد و ستد دکان کا نام سب غیر شخص کا بھلا ایسا شخص گھر آئی ہوئی دولت پر کیوں لات مارنے لگا رفتہ رفتہ وہ سب لے کر بیٹھ گئے۔ اب نوبت اس حد تک پونہچی تھی کہ اپنے معتبرین کے ہاتھ میں چک بکس حوالے کر دی تھیں وہ سیاہ و سفید کے مالک تھے جس قدر رقم چاہتے تھے بنک سے نکالتے تھے اور جس کو چاہتے تھے دیتے تھے کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ ایک ایک شخص کو ایک ہی معاملت کے دو دو چک دیتے میں نے خود دیکھا ہے کہ دیئے گئے۔ مگر کہے کون۔ برا کون بنے مفت کی دشمناگی کون لے۔ اگر بہت دل جلا اور کبھی کہا بھی تو ٹکا ٹکا تو ڑ کے یہ جواب ملا کہ میری دولت ہے میں لٹاتا ہوں مجھے اختیار ہے کسی کو کیا۔ تم لوگ میرا مرنا چاہتے ہو۔ فلاں شخص پر بدگمانی کی کیا وجہ ہے محض حسد اور جلن سے ایسا کہتے ہو انھیں پر مجھ کو ایسا بھروسہ ہے کہ اگر بشیر میرے ساتھ بے ایمانی کرے گا تو وہ بھی کرے گا۔ میں نے ان ہی وجوہ سے بالکل دخل دینا چھوڑ دیا میری کنارہ کشی نے خود غرضوں کو اور موقع دیا۔ ایک سوانگ مشین ہی کا معاملہ قابل غور ہے کہ جو شخص اپنے پلنگ پر سے ہل نہ سکتا ہو وہ لاکھوں روپے کا معاملہ کرے اور سنگر کے مقابلے پر کھڑا ہو جائے جس آج سوانگ مشینوں کا بادشاہ ہے دیکھنے کو جا بجا ایجنسیاں کھلی ہیں ولایت سے مال پر مال آرہا ہے مگر کسی نے یہ نہ دیکھا کہ ہو کیا رہا ہے مرحوم کی حیات ہی میں ساٹھ ہزار روپے کا یک مشت نقصان صرف اسی معاملے میں ہو چکا تھا جس کو انھوں نے سُن کر کہا اونھ! مجھے کیا پروا ہے میں اس نقصان کو ایسا سمجھتا ہوں جیسا ایک مچھّر کو مار کر پھینک دیا۔ اُن کے مرنے کے بعد یہ بلا میرے گلے پڑی اور چار و ناچار مجھے اس معاملے کو سنبھالنا پڑا۔ دیکھتا ہوں تو ایک طوفانِ بے تمیزی ہے حساب کتاب کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ مال جو پڑا ہے وہ بکتا نہیں اور چھتیس ہزار کی مشینیں ولایت سے چلی آرہی ہیں چنانچہ نو ہزار روپے تو مجھے دینے ہی پڑے باقی ہزار تمتبّہ سے ڈھائی ہزار روپے تاوان دے کر معاملہ منسوخ کرایا لیکن یہ معاملہ جو بیس سال سے چل رہا ہے اور جا بجا اس کی ایجنسیاں ہیں اور ہزار ہا درزیوں سے اس کا معاملہ ہے سمیٹے نہیں سمٹتا ہر طرح کوشش اس بات کی کی جا رہی ہے کہ کسی طرح خواہ وہ نقصان ہی سے کیوں نہ ہو یہ معاملہ سمٹ جائے۔ دیکھیے وہ دن کب آتا ہے کہ اس مخمصے سے نجات ہو۔ یہ ایک مثال کے طور پر میں نے بیان کیا ایسی سیکڑوں مثالیں ہیں۔ عبد الرزاق سوت والے کارخانہ کھول کر ولایت کی سیر کو بھی تشریف لے گئے روپیہ کسی کا ولایت کی سیر کرے کون۔ گئے کیوں؟ مشینری جو آئی تھی اُس کو یہاں کوئی فٹ نہیں کر سکتا تھا اس واسطے بہ نفسِ نفیس ولایت گئے تھے وہاں سے آئے نتیجہ یہ ہوا کہ نالش نوشی کی نوبت پونہچی اُس میں ہزار ہا روپیہ خرچ ہوا عبد الرزاق صاحب دیوالیئے بن کر سستے چھوٹ گئے پچیس ہزار کی مشینری نوسو میں نیلام ہوئی اور پچاس ہزار روپیہ جو اس معاملے میں پھنسا وہ جا جو کے تین ہزار روپیہ جھاڑ لیا وہ بھی میں نے والد مرحوم کو تو یہ بھی نہ ملتا نہ کبھی معاملے کو یہ لوگ سمیٹنے دیتے۔ احسان اللہ کی شراکت میں پچاس ہزار روپے کا نقصان ہوا سُنا کہ ٹمبا کو کا جہاز جل گیا۔ ہر بلائے کز آسماں آید بخانۂ انوری کجا باشد۔ حاجی سراج الدین صاحب جو عقلِ کُل تھے چالیس ہزار کی دھول وہ لگا گئے۔

ہزار ہا روپے کی ہنڈیاں لوگوں کے محض اعتبار پر سکار دیں اور کچھ خبر نہ لی کہ اس کا انجام کیا ہو گا جب چالیس ہزار پر نوبت پونہچی تو ایجنٹ الہ آباد بنک نے خود اپنے مینجر کو بھیجا کہ مولوی صاحب سے کہو کہ آپ ہنڈیاں کیسی سکار رہے ہیں یہ

لوگ معتبر نہیں ہیں ہم تو آپ کے اعتبار پر رقم برابر دیے رہے ہیں ایسا نہ ہو کہ آگے چل کر کچھ جھمیلا پڑے جب آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ ایک دم چالیس ہزار کی رقم ہنڈیوں کی بابتہ ہاتھ سے نکل گئی اُن میں سے دو چار لوگوں پر نالش بھی کی گئی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا اور رقم بھرتی پڑی۔ مرزا لطیف اللہ بیگ نامی ایک صاحب ہیں اُن کو دیکھیئے اور سترہ ہزار روپے اُن کے پلّے باندھے گو میں تو اُن کا سترہ روپے کا اعتبار بھی نہ کرتا۔ اِسی طرح ولایت علی۔ قمر الدین تاجرانِ لمپ و کرامت علی وغیرہ نے ہزار ہا روپے کا نقصان دیا آخر کو دونوں نے دیوالہ نکال دیا اور اب کرامت علی صاحب نے اُلٹا دعویٰ کیا ہے +

مرزا لطیف اللہ بیگ صاحب سے جو نقصان کو پہنچا وہ پہنچا با این ہمہ اُن کے صاحب زادے کو بھی تین ہزار روپے دے دیئے کہ لو بیٹا خالی ہاتھ بیٹھے کیا کرتے ہو کچھ بیوپار کرو مرزا صاحب کا بیٹھ پیچھا ہے اُنھوں نے منع بھی کیا لیکن کچھ اثر نہ ہوا اُنھوں نے کیا بیوپار کیا یہ تو اُن کو معلوم ہے مگر ہمارے پاس چک کا کوپن ہے اور اُن کے پاس یہ بھی نہ رہا جیسے بے مشقت روپیہ ملا تھا خوب گلچھرّے اُڑائے مرنے سے چند ہی ہفتے پہلے پھر اُسی شیشے والے کو پانچ ہزار روپے دیئے دستاویز نہ تمسّک صرف ایک ہینڈ نوٹ پر۔ لوگوں نے منع بھی کیا کہ یہ شخص دو دفعہ دیوالہ بھی نکال چکا ہے اسے روپیہ نہ دیجیے۔ کہنے والا مُفت میں بُرا بنا مہر الٰہی سے اُنھوں نے کہہ دیا کہ بھئی میں تو تم کو روپیہ دینے کو طیار ہوں روپیہ دھرا ہے لے جاؤ مگر فلاں شخص منع کرتے ہیں۔ غرض اُن کی قسمت کا روپیہ بھالیا اور لیتے ہی اپنے لڑکے کی بڑی دھوم دھام سے شادی کی چند روز بعد مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا اُن کے انتقال کے ساتھ ہی مہر الٰہی صاحب نے گودام میں سے سارا مال باہر کر خالی گودام کو قفل لگا دیا اور اب مزے سے چین کرتے ہیں دینے لینے کو ٹکا پاس نہیں نالش سے وہ ڈرتے نہیں البتہ ہم ڈرتے ہیں کہ اَور ہزار پانسو روپے نالش میں خرچ ہوں گے اور پھر ڈگری لے کر ان کے پاس کیا دھرا ہے جو تعمیل کرائیں گے +

دو لڑکے کشمیری کے تھے اُن کو خود پڑھایا کرتے تھے اور اُن کے ساتھ بہت سلوک کرتے تھے جب وہ جوان ہو گئے تو ہزار روپے اُن کو بھی دے دیئے کہ اس سے بیوپار کرو بیوپار تو وہ کیا خاک کرتے کچھ پتنگ بازی میں اُڑایا کچھ تماش بینی میں اب قلاّنچ بنے پڑے پھرتے ہیں۔ ایسی صدہا مثالیں ہیں کہاں تک دُہراؤں۔ جس پر بڑی عنایت ہو گئی تھی سہ پہر کو اُس کی دُکان پر خود جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ چند دن شمس العارفین صاحب کی دُکان پر نشست رہی۔ مدتوں حاجی سراج الدین صاحب جوتے والے کی دکان پر بیٹھتے رہے جن کے صاحب زادے عبد الرحمٰن صاحب کو پڑھا لکھا کر بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کرا دیا۔ شکر خدا کا کہ جوتے کی دُکان تو چھوٹی جب وہ مر گئے تو باہر کا آنا جانا بند کر دیا اب انتقال سے چند دن پیشتر مہر الٰہی صاحب نے شیشے میں اُتار لیا تھا تیسرے پہر کا وقت آیا آندھی جائے مینہ جائے اور وہ مع اپنے صاحب زادے صالحین کے موجود مرحوم اب بلا مدد کے چل پھر نہ سکتے تھے دونوں باپ بیٹے آتے تھے اور اس سونے کی چڑیا کو اپنی دکان پر لے جا کر بٹھاتے تھے جس نے پانچ ہزار کا سونے کا انڈا اِن کو دیا اور اگر زندگی وفا کرتی تو نہیں معلوم ایسے کتنے پانچ ہزار لیتے۔ جب کبھی میں چھٹی پر دہلی جاتا تھا یہ تماشا دیکھا کرتا تھا کہ لوگ خالی ہاتھ آتے ہیں اور مالا مال ہو کر جاتے ہیں مگر میری کیا مجال تھی کہ میں کچھ عرض کر سکتا۔ لقمان کو حکمت کون سکھلا سکتا تھا۔ قدرتِ خدا کا تماشہ دیکھتا تھا اور چُپ رہتا تھا۔ اب خود بھی ان نقصانات کو محسوس کرتے تھے مگر ہم لوگوں سے چھپاتے تھے کہ نقصانِ مایہ و شماتت

ہمسایہ۔ ابھی حال کا ذکر ہی کہ مجھ سے کہنے لگے کہ یہ حافظ اشفاق علی چھ ہزار روپے میرے کھا گیا۔ مَیں نے اشفاق علی سے پوچھا اُنھوں نے کانوں پر ہاتھ دھرے کہ حاشا للہ میں نے ایک حبہّ بھی نہیں کھایا۔ مَیں حیران رہ گیا کہ یہ کیا معاملہ ہی کہ وہ فرماتے ہیں دس نہیں بیس نہیں ہزاروں روپیہ کھا گیا اور یہ بالکل نالوٹ۔ میں خود ان معاملات سے کوسوں دُور بھاگتا تھا جب کئی دفعہ سُنا تو مجھ سے نہ رہا گیا مَیں نے عرض کیا آپ یوں فرماتے ہیں اور حافظ جی بالکل مُنکر ہیں کہ میں نے ایک دمڑی بھی نہیں کھائی آخر مَیں بھی عمر بھر یہی معاملے مقدمے کرتا رہا ہوں میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کس طرح کھا گئے اور یہ رقم تھوڑی نہیں جو بول پچ جائے نہ ایک دم کھائی ہو گی بلکہ بدفعات تو کوئی سا معاملہ میرے سپرد کر دیا جائے کہ میں تحقیقات کروں اور دیکھوں کہ اصلیت کیا ہی۔ فرمانے لگے ہاں بیٹا ضرور دیکھو۔ مولوی رحیم بخش کو حکم ہوا کہ میاں بشیر کو بتلاؤ اُنھوں نے ایک معاملہ جس میں ڈھائی سو روپے غبن تھے مجھے بتلایا کاغذات متعلقہ میں نے دیکھے حافظ جی صاحب جن کو اتنا لمبا چوڑا اور اس شدّ و مدّ سے دعویٰ تھا اُن کو میں نے پکڑا حافظ صاحب نے کہا کہ ہاں بے شک ہوئی تو مجھ سے غلطی میں نے کہا کہ تم کو جرم کا اقبال ہی تو کہنے لگے ہاں ہی میں نے کہا لکھ دو۔ اُنھوں نے اپنا اقبال بیان لکھ دیا۔ میں سامنے گیا اور عرض کیا کہ ایک مقدمہ تو ان پر ثابت ہی۔ کہنے لگے بلاؤ اشفاق علی کو (یہ صاحب ہمارے عزیز بھی ہیں) اُن سے پُوچھا اُن کو سوائے اقرار کے انکار کا مقر نہ تھا۔ ہنس کر کہنے لگے بیٹا! ہم نے تم کو معاف کیا نہ دنیا میں ہمارا تمہارا کا سبہ ہی نہ دین میں مواخذہ۔ بات رفت گزشت ہوئی وہ بغلیں بجاتے چل دیئے میں مُفت میں نکّو بن گیا۔ پھر کئی دن کے بعد ارشاد ہوا کہ میاں بشیر تم نے اشفاق علی کے مقدمات طے نہ کیے مَیں نے عرض کیا کہ ایک مقدمہ اُن پر ثابت ہوا تھا تو اُس کا کیا نتیجہ ہوا جو اَور کروں آپ نے تو اُن کو معاف فرما دیا بس خاموش ہو گئے۔ ایسا معاملہ متعدد لوگوں سے پیش آیا جن کے ہزار ہا روپے کے ہینڈ نوٹ موجود ہیں جو سیکڑوں اور ہزاروں تو کیا ایک پوسٹ کارڈ کی قیمت کے بھی نہیں جب غیر اس دھڑلّے سے دن دہاڑے لُوٹتے تھے تو اپنے بھلا کیوں نہ موندتے۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ بھائی میں نے کمایا اور مَیں نے ہی گنوایا۔ انسان سے غلطی بھی ہو جایا کرتی ہی میں بھی انسان ہوں۔ کبھی کہتے تھے کہ جس طرح کسی کو جوئے اور شراب کی لت پڑ جاتی ہی۔ اور چھوڑے نہیں چھوٹتی اسی طرح مجھے تجارت کی لت ہی۔ میری زندگی تک ممکن نہیں ہی کہ یہ کاروبار بند ہو۔ دلّال دن بھر پھرتے رہتے تھے اور ساری دلّی میں اُنھوں نے چھانٹ چھانٹ کر نادہندوں ناداروں مفلسوں۔ بدمعاشوں میں روپیہ پھنسوا دیا۔ خدا اُن کا بھلا کرے۔ اس طرح میرے خیال میں کم سے کم چھ لاکھ روپیہ خالصے لگ گیا۔ دُنیا کا قاعدہ ہی کہ دوسروں کی آمدنی کا اندازہ بہت فراخ دلی سے لگاتے ہیں۔ مرحوم کی ساکھ اور بھرم کے اعتبار سے چاروں طرف سے اخباروں میں اُودھم مچ گئی تھی کہ بارہ لاکھ روپیہ نقد چھوڑ مرے میں بھی خیال کرتا ہوں کہ اگر اس طرح اُن کا روپیہ نوچا کھسوٹا نہ جاتا تو دس لاکھ کا سرمایہ ہونے میں کوئی شک نہ تھا کیوں کہ ڈھائی لاکھ روپیہ تو صرف اُن کی پنشن ہی کا ہوا مگر جس طرح اُن کی دولت کو گھونسیں لگ گئی تھیں اور دیمک چاٹ رہی تھی تو خزانہ قارون بھی خالی ہو جاتا۔ اب ڈوبا ہوا روپیہ چھوڑ کر دیکھا جائے تو اب بھی مرحوم کا ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ مہذب ثقہ لوگوں میں پھنسا ہوا ہی جن سے بجز چکنی چپڑی باتوں کے ایک خرمہرہ وصول ہونے کی امید نہیں۔ نالش اُن پر کرنا فضول کیوں کہ وہ کچّی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں پہلے ہی سے اپنی جائداد ادھر اُدھر منتقل کر کے بچنت ہو گئے ہیں

اب اُن پر نالش کرکے کیا لیں گے کوہ کندن وکاہ برآوردن پہلے نالش پر مُٹھی مُٹھی گرہ سے روپیہ لگائیں دوا دوش کریں۔ جب کہیں برسوں میں ڈگری ہو تو وہاں ڈھاک کے تین پات ڈگری کو شہد لگا کر چاٹا کریں۔ کئی شخصوں نے پہلے ہی دیوالہ نکال دیا ہی پھر ایک جگہ معاملہ نہیں کلکتہ۔ لاہور۔ رانی کھیت۔ بھوپال۔ جھانسی۔ ساگر۔ کانپور۔ لکھنؤ۔ علی گڈھ۔ گوالیار وغیرہ چوطرف روپیہ بکھرا پڑا ہی۔ مجھ کو دیکھیے ملازمت کے دھندے میں گرفتار۔ کدھر حیدرآباد کہاں دہلی۔ یک سر و ہزار سودا مجھ سے یہ جھگڑا کہاں ہو سکتا ہی۔ مگر مثل مشہور ہی بندھا خوب مار کھاتا ہی۔ وہ مجھ پر صادق آگئی۔ بنک کا بڑا بھرم تھا وہاں صرف پچاس ہزار روپے نکلے جو ان خون چوسنے والوں کی دست برد سے اس وجہ سے محفوظ رہے تھے کہ وہ روپیہ نہ ہوتا تو آئے دن ولایت سے مال کا چالان کیسے آتا۔ ہُنڈیاں کیسے سکاری جاتیں۔ تجارت اور لین دین کا پھیلاؤ کیسے ہوتا۔ بنک اسی کی طمانیت پر روپیہ دیتا تھا جب کام چلتا تھا ورنہ گھر میں تو دس روپے بھی نقد نہ تھے۔ اس کے علاوہ کل جائداد مساکر ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہوگی۔ بارہ لاکھ کی جگہ ہمارے جو پلے پڑا وہ تو یہ ہی بشرطیکہ یہ بھی محفوظ رہ سکے۔ آیندہ کے جھمیلے۔ آئے دن کے مقدمے۔ انواع و اقسام کی ذمہ داریاں اگر چین لینے دیں تو بھی غنیمت ہی۔ مرحوم کے معاملات تجارتی کو میں نے حتی المقدور بہت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہی ورنہ یہ معاملات ایک طلسم ہوش رُبا ہیں اور خدا کی قدرت کاملہ کا نمونہ ہیں۔ وہ شخص جو اوّل درجے کا محتاط ہو جس نے اپنی گاڑھی کمائی سے بہزار دقّت روپیہ جمع کیا ہو جو اپنی ذات پر ایک پیسہ بھی صرف کرنا گوارا نہ کرتا ہو اور جسے لوگ کنجوس بھی کہتے ہوں (گو وہ کنجوس نہ تھے البتہ مُسرف بھی نہ تھے) وہ ایک طرف تو ایسا تنگ دست ہو اور دوسری طرف ایسا لکھ لُٹ ہو۔ فاعتبروا یا اولی الابصار +

شرحِ ایں قصّۂ دل سوز نہ گفتن تا کے
سوختم سوختم ایں راز نہفتن تا کے

مطبع مثل مشہور ہی کہ آپ کام مہا کام دوسروں کے بھروسے پر جو کام کیا جائے گا وہ ضرور خسارت دے گا۔ رہن۔ بیع۔ داد و ستد کے معاملے کچھ کم نہ تھے جو ایک مطبع کی پخ بھی اپنے پیچھے لگا لی خود نگرانی کر نہیں سکتے تھے دوسروں کو دخل نہ تھا اور جن کو دخل تھا وہ خود غرض پھر کام چلے تو کیسے۔ مرحوم کی کتابوں کی جیسی قدر ہوئی اور جس قدر مانگ تھی اُس سے ہزار ہا تاجر بن گئے خدا جانے مرحوم نے خود سوچا یا کسی نے سُجھایا کہ اپنی کتابیں خود اپنے اہتمام سے چھپوائیں تو کتابیں بھی اچھی چھپیں گی اور منفعت بھی ہوگی چنانچہ مطبع الضاری اور نذیر حسین تاجر کتب کے ذریعے سے کام چلنے لگا چند سال کے بعد اپنا ایک مطبع کھڑا کیا جس کا نام شمسی پریس رکھا اور اپنی کتابیں اور ترجمۂ کلام مجید مختلف تقطیع کا اور حمائلیں چھپنے لگیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کُین ایسی تھی کہ اگر احتیاط سے باقاعدہ طور پر چلائی جاتی تو لاکھوں روپے کے وارے نیارے تھے لیکن اس میں بھی ناکامیابی اور نقصان ہی رہا +

نکاسی کا کوئی باقاعدہ طریقہ نہ تھا۔ اشتہار کبھی دیا ہی نہیں گیا قیمت میں رعایت کسی سے کی نہیں پھر نکاسی ہو تو کیسے۔ حالت یہ تھی کہ ہزار ہا کلام مجید اور ہزار ہا حمائلیں چھپی جاتی تھیں اور ردّی خانے میں اٹم کے اٹم لگے ہوئے تھے۔ ردّی خانے کی سیل سے دیمک نے بڑے ذخیرے کو تباہ کیا کیوں کہ چھاپنے اور رکھ دینے کے بعد دیکھتا کون تھا۔ یہاں تو بس یہ دُھن تھی

کہ چھاپے جاؤ اور اس خیال سے مگن تھے کہ دُولاکھ کا سٹاک ہے۔ تجارت کے بڑے اصول کم منافعہ اور جلد نکاسی کے سراسر خلاف یہاں عمل تھا۔ مطبع دس بارہ برس رہا مگر حساب ایک دن نہ ہوا کہ کیا صرف ہوا اور کیا آمد ہوئی۔ کوئیں کی مٹی کوئیں ہی کو لگ گئی۔ مرحوم اسے غنیمت سمجھتے تھے کہ گرہ سے کچھ دینا نہیں پڑتا حساب دیکھنے کی اُن کو عادت نہ تھی۔ والد کی وفات کے بعد سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اس مطبع کو بند کیا کہ کھاتا دھن تھا اور پھر سٹاک کو دیکھا تو گاجر مولی کی طرح پڑا تھا جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دس مہینے سے اُس کی تہذیب ہو رہی ہے اور اب تک ہو نہ چکی قیمت بھی میں نے نصف سے بھی کم کردی لاگت پر ۲ر لگا کر بہت سا سٹاک نکال ڈالا کیوں کہ مجھے گلا نا سڑانا منظور نہ تھا اب جو سٹاک ہے اور بہت کچھ ہے اُس کے نکالنے کی فکر میں ہوں۔ مطبع کا حساب آج تک دیکھا نہیں گیا تھا اب دیکھا گیا تو زیادہ نہیں کیا لکھوں اور لکھنے سے نتیجہ ہی کیا۔ اپنا مال کھوٹا تو پرکھنے والے کا کیا دوش۔ اپنا گھٹنا کھولیے اور آپ ہی لاجوں مریے بارہ سو روپے مجھے گرہ سے دینے پڑے جب خدا خدا کر کے گلو خلاصی ہوئی اب اِسے منافع سمجھ لیجیے یا جو چاہے سمجھیے میں اِسے ہی غنیمت سمجھا کہ بارہ سو دے کر میرے گلے کی پھانسی نکلی۔ نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز *

مولانائے مرحوم کی یادگار

جناب مولوی نذیر احمد صاحب نے باوجودیکہ عمرِ طبعی کو پہنچ کر اور دُنیا کی ساری بہاریں لُوٹ کر انتقال کیا تھا تاہم اُن کی وفات پر سارے ہندوستان میں اس سرے سے لے کر اُس سرے تک ایک ہل چل مچ گئی۔ کوئی جگہ تو جگہ مگر سربرآوردہ مسلمانوں کا کوئی گھر بھی ایسا نہ تھا جہاں اُن کا ماتم نہ ہوا ہو۔ ایسی موت نے اُس خاص گھر پر کیا اثر کیا ہوگا جن سے یہ نعمتِ عظمیٰ منتزع ہو گئی محتاجِ بیان نہیں نہ اِس کا اندازہ کرنا کوئی آسان کام ہے۔ جن کے دلوں پر اس کا صدمہ ہے وہ زندہ در گور ہیں۔ مرحوم کثیر الاولاد نہ تھے اُن کی اولاد میں صرف میں اور میری بہن ہیں۔ بہن اپنے گھر کی ہیں۔ شادی بیاہ کے بعد یُوں بھی لڑکیوں کے تعلقات میکے سے ضعیف ہو جاتے ہیں لے دے کے ایک خستہ جان میں ہی رہ گیا۔ صرف باپ کے مرنے کا صدمہ بیٹے کے لیئے کیا کم مُصیبت ہو سکتی ہے چہ جائیکہ ایسا باپ! جو نہ کہیں کا بہت بڑا رئیس تھا نہ جاگیردار نہ منصب دار نہ کروڑپتی دولت مند مگر خداوند تعالیٰ نے اُن کا نام چار دانگِ عالم میں بلحاظِ علم و فضل ایسا مشہور کیا تھا کہ اُن کی موت نے تمامی ہندوستان کو ایسا صدمہ پونہچایا اور اُن کی موت سے ہر طرف سے ایسی دردانگیز صدائیں بلند ہوئیں کہ ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے رئیس کے واسطے بھی اگر ہوتیں تو اتنی ہی ہوتیں نہ کہ اس سے زیادہ۔ مجھ پر صدماتِ پیہم کا ایسا ہجوم تھا کہ ہوش و حواس بجا نہ تھے اور اب تک ہیں۔ مجھے چاروں طرف دُنیا اندھیر نظر آتی ہے۔ یادگار کے قائم کرنے کا خیال تو دل میں ضرور تھا مگر اُس پر کچھ غور کرنے کا موقع نہ ملا تھا کہ سب سے پہلے ۳۰ مئی ۱۹۱۲ء کے ہفتہ وار پیسہ اخبار میں "مولانا نذیر احمد کی یادگار" پر یہ مضمون نکلا۔

ہم عصر ایڈووکیٹ لکھنؤ اور بعض دیگر اخبارات زور دے رہے ہیں کہ اہلِ اسلام کو شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب دہلوی مرحوم ایل ایل۔ ڈی۔ او۔ ایل۔ کی کوئی موزوں یادگار قائم کرنی چاہیئے۔ اس ضرورت پر سب سے پہلے پیسہ اخبار کے ایڈیٹوریل کالموں میں نوٹس لیا جا چکا ہے اور مولانائے مرحوم کے ورثہ اور بالخصوص مولوی بشیر الدین احمد صاحب کو اس امر پر توجہ دلائی جا چکی کہ گو مولانا ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مغفور کا ترجمۂ قرآن اور دیگر مُفید تصانیف اُن کی بہترین یادگار ہیں جو زبانِ اُردو کی مُستند اور قابلِ قدر کتابوں میں داخل ہو جانے کے باعث ان شاء اللہ صدیوں تک رائج رہیں گی۔ اور نہ صرف ہندوستان بلکہ مغرب کے تعلیمی اور ادبی حلقوں میں بھی مولانائے مغفور کا نام عزت و احترام کے ساتھ زندہ رکھیں گی لیکن مولانا نذیر احمد صاحب

مغفور نے چل کر ادب کے علاوہ دوسری لائنوں میں بھی قوم کی شاندار خدمات انجام دی ہیں اور اپنے پُرتاثیر لکچروں سے مسلمانوں کے قومی مرکز تعلیم علی گڈھ کالج ایجوکیشنل کانفرنس انجمنِ حمایت اسلام مدرسۂ طبیہ دہلی وغیرہ کو بہت بڑے فائدے پہنچائے ہیں اور وقتاً فوقتاً بیش قرار نقد عطایا بھی دیئے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی عقیدت مندی اس امر کی مقتضی ہے کہ اوّل تو ان تمام انسٹیٹیوشنوں ورنہ کم از کم علی گڈھ کالج میں جس کے مولانائے مرحوم ابتدا سے ٹرسٹی رہے ہیں اور اس طویل زمانۂ تعلق میں - دامے - درمے - قلمے - قدمے اُس کو بہت فائدہ پہنچا چکے ہیں۔ ان کی کوئی موزوں یادگار کسی مفید صیغے کی صورت میں قائم کی جائے اور اس کے لیے مسلمان پبلک سے چندہ لیا جائے جو ان شاء اللہ بہت جلد معقول مقدار میں جمع ہو جائے گا۔ میرے لیے اس تحریر نے ایک تازیانے کا کام دیا اندھا کیا چاہے دو آنکھیں جب میں نے دیکھا کہ قوم اس بات پر آمادہ ہے تو اگر میں قدم نہ بڑھاتا تو مجھ سے زیادہ نالائق کوئی شخص ہو نہیں سکتا تھا مجھے کامل یقین تھا کہ اگر علی گڈھ کالج میں میری جانب سے سلسلہ جنبانی ہوگی تو بہت جلد یہ کارروائی عملی صورت اختیار کرے گی۔

میرے باپ نے جو سلوک علی گڈھ کالج سے کیا اور میرے والد کے وہ تعلقات جو سرسید اور نواب محسن الملک اور وقار الملک بہادر سے میں اپنے بچپنے سے دیکھتا چلا آتا تھا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی میرے دل میں کسی قسم کا مخالفانہ خطرہ نہ ڈال سکتے تھے بلکہ ان ہی خیالات نے مجھے آمادہ کیا اور میں نے سب سے پہلے نواب وقار الملک بہادر کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا کہ اگر علی گڈھ کالج کوئی یادگار میرے والد کی قائم کرنا چاہتا ہو تو میں اس میں ایک معقول چندہ دوں گا اور دل میں سمجھ لیا تھا کہ ہم خرما و ہم ثواب ضرور وہاں سے میری استدعا کے موافق جواب آئے گا لیکن من در چہ خیالم و فلک در چہ خیال - وہاں سے مجھ پر ایک بم کا گولا پھینکا گیا اور ٹکا سا جواب مل گیا کہ علی گڈھ کالج کی طرف سے کوئی یادگار قائم نہیں کی جا سکتی۔ بے شک یہ فیصلہ کالج کا میرے والد کے حق میں ایک صریح بے انصافانہ فیصلہ تھا اور بہ حیثیت ان کے فرزند ہونے کے میرا پہلا فرض تھا کہ میں اس کو پبلک کے سامنے لاؤں چنانچہ میں نے تہذیب نسواں اور وطن میں اپنی تحریر چھپوائی جس کی تردید علی گڈھ گزٹ نے کی وہ تردید مصداق عذر گناہ بدتر از گناہ تھی یعنی مرے پر سو دُرّے مرحوم کے سارے احسانات ملیامیٹ کر دیئے سے بھی دل ٹھنڈا نہ ہوا بلکہ مرحوم پر ایک غلط الزام بھی لگایا کہ اُنھوں نے آخر عمر میں اُمہات الامہ لکھ کر مسلمانوں کا دل دُکھایا۔ اس واسطے ہم نے یادگار قائم کرنے سے انکار کیا۔ اس امر کا فیصلہ کہ علی گڈھ کالج کی یہ رائے کس حد تک واجبی تھی مجھے کرنے کی ضرورت نہیں کہ خود پبلک نے اچھی طرح خبر لی ہے اور ساری قلعی کھول دی ہے لہذا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ میں اُن تحریرات کو من و عن چھاپ دوں ناظرین خود فیصلہ فرمالیں کہ حق کس کی جانب ہے۔

علی گڈھ کالج کی ہمدردی انتخاب

از تہذیب نسواں مورخہ ۲۷ جولائی ۱۲ء

دُنیا جہان کو معلوم ہے کہ میرے والدِ مرحوم جناب مولوی نذیر احمد صاحب نے علی گڈھ کالج کے ساتھ کیا کیا۔ سرسید مرحوم خود ان کی امداد کے معترف تھے۔ جا بجا ان کے ساتھ پھرے دُور دراز مقامات کانفرنس میں گئے۔ اپنے بیش بہا لکچروں کے ذریعے سے ہزاروں نہیں لاکھوں روپیہ چندہ دلوایا۔ خود بھی ہزارہا روپیہ چندہ دیا۔ بورڈنگ بنوائے جب حیدرآباد میں تھے۔ اور سرسید تشریف لائے تھے۔ تو ایک کثیر رقم چندہ کی فراہم کی غرض سخنے۔ قدمے۔ درمے ہر طرح مدد کرتے رہے۔ نہ صرف سرسید کی حیات تک بلکہ اُن کے بعد بھی بہ ایں پیرانہ سالی زحمت شاقہ گوارا کر کے دُور دُور مقامات پر گئے۔ لیکن جب ہاتھ پاؤں نے جواب دے دیا۔ اور ضعیفی نے آن دبایا۔ تو نقل و حرکت سے مجبور ہو گئے۔ اور ایسے مجبور ہوئے۔ کہ گھر سے نکلنا چھوڑ دیا

حتیٰ کہ باوجودیکہ دعوت دی گئی تھی۔ مگر پھر بھی کارونیشن دربار میں نہ جا سکے۔ ایسی حالت میں اُنھوں نے خوشی سے نہیں مجبوری سے خانہ نشینی اختیار کی۔ اور نہ صرف علی گڈھ کالج کی خدمت سے دست کش ہوئے۔ بلکہ مدرسہ طبیہ دہلی۔ اور انجمن حمایت الاسلام لاہور سے بھی اُنھوں نے کنارہ کشی کی ۔

میرے مکرم دوست منشی **محبوب عالم** صاحب نے **پیسہ اخبار** میں والد مرحوم کی یادگار قائم کرنے کی پُر زور تحریک کی تھی۔ اور اس توقع کا اظہار کیا تھا۔ کہ قوم کی طرف سے وافر چندہ فراہم ہو جائے گا۔ یادگار کی نسبت یہ بھی لکھا تھا۔ کہ علی گڈھ بنائے۔ یا انجمن حمایتِ اسلام۔ یا مدرسۂ طبیہ۔ اور اُن کا یہ خیال اسی وجہ سے تھا۔ کہ مرحوم نے اُن کے لیئے مدت العمر اپنی جان چھڑکی۔ میں نے منشی صاحب موصوف کو لکھ دیا تھا۔ کہ مدرسۂ طبیہ سے تو مجھے اُمید نہیں۔ کیوں کہ گھر کی مُرغی دال برابر۔ دہلی والوں کو کفر کے فتاوے سے اتنی فرصت کہاں۔ جو کسی کی یادگار بنائیں؟ اب اگر نگاہ پڑتی ہی۔ تو پہلے علی گڈھ کالج پر۔ اور پھر انجمنِ حمایت اسلام لاہور پر۔ چنانچہ میں نے اِسی بنا پر سکرٹری صاحب علی گڈھ کالج کی خدمت میں ایک خط لکھا تھا۔ کہ اگر قوم کی طرف سے مرحوم کی کوئی یادگار بنانا تجویز کیا جائے۔ تو میں سب سے پہلے ایک معقول رقم چندے کی دُوں گا۔ مجھے توقع تھی کہ اس کا جواب بجز منظوری کے دوسرا نہ آئے گا۔ لیکن افسوس صد افسوس میری کیا بلکہ ساری قوم کی خلافِ توقع مجھے یہ رزولیوشن ملا ۔

نقل رزولیوشن نمبر ۱۹

اجلاس سنڈیکیٹ علی گڈھ مورخہ ۲۳ جون ۱۹۱۲ء دربارۂ یادگار مولانا ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم ۔

"چوں کہ مولانائے مرحوم نے عرصے سے کالج سے اپنا قطع تعلق کر لیا تھا۔ لہذا کالج کی طرف سے کسی ایسی کارروائی کا موقع نہیں ہی" ۔

جس کو پڑھ کر میں سناٹے میں آگیا۔ کیا میرے والد جو بوجہ کہولت کے نشست و برخاست سے معذور ہو گئے تھے۔ جب بھی وہ علی گڈھ کالج سے علٰحدہ نہ ہوتے؟ کیا وہ برائے نام ٹرسٹی رہتے۔ اور کیا یہ بات خلافِ دیانت نہ تھی۔ کہ وہ ٹرسٹی تو رہتے اور کچھ کام نہ کرتے؟ چنانچہ ان ہی وجوہ سے نواب **وقار الملک** نے سکرٹری شپ سے استعفا دے دیا۔ پس کیا بہ حالتِ مجبوری ایسا کرنے سے اُن کے تمام احسانات جو علی گڈھ کالج پر مدت العمر کرتے رہے چشم زدن میں ہٹ گئے؟ اور کیا ان محنتوں اور کوششوں اور جاں فشانیوں پر ایک دم پانی پھر گیا۔ افسوس صد افسوس۔ یہ اُس جگہ کا رزولیوشن ہی۔ جن کا اوڑھنا بچھونا قومی ہم دردی ہی۔ اب تبلایئے۔ کہ کون شخص اُن سے کیا توقع رکھ سکتا ہی۔ مرحوم کی یادگار قائم کرنے میں سراسر کالج ہی کا فائدہ تھا۔ اگر کالج کی طرف سے کوئی یادگار قائم نہیں کی جاتی۔ تو کالج کی بے رُخی اور بے اعتنائی اور احسان فراموشی خود ایک ایسی یادگار قوم کے سامنے پیش کی جاتی ہی۔ جو کبھی مٹ نہ سکے گی۔ اور لوگ دیکھ لیں گے۔ کہ مولوی نذیر احمد صاحب جیسے شخص کے ساتھ کالج نے ایسا سلوک کیا۔ کہ اُن کے ماتم میں ایک دن کالج بھی بند نہ کیا یادگار قائم کرنا تو کارے دارد۔ تو دوسروں کو کیا توقع ہو سکتی ہی کہ اُن کے دُنیا سے اُٹھ جانے کے بعد اُن کا نام کوئی بھلائی سے بھی لے گا مرحوم کی یادگار گو علی گڈھ کالج قائم نہ کرے۔ مگر کالج کے بورڈنگ جو اُن کے نام پر کھڑے ہیں۔ سٹریچی ہال کے کتبے۔ کالج کے رجسٹر کانفرنس کی رپورٹیں۔ مرحوم کے متعدد لکچر اُن کو صفحۂ دُنیا سے کیسے مٹا سکتے ہیں؟ مرنے والے مر گئے۔ مگر قوم کے دلوں پر اُن کا سکہ بیٹھا ہوا ہی جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ ہاں اتنا ضرور ہی کہ ہ

کرتے کس مُنہ سے ہو غربت کی شکایت غالب ۔ تُم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں

جب علی گڈھ جیسی باوقعت مسلم سوسائٹی نے یہ فیصلہ کیا ہی۔ تو اب انجمن حمایت اسلام سے کیا توقع کی جا سکتی ہی؟

خاکسار دل افگار بشیر حیدرآباد۔ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء

علی گڈھ کالج میں یادگار مولٰنا نذیر احمد خاں مرحوم

علی گڈھ کالج میں یادگار مولٰنا نذیر احمد خاں مرحوم

شمس العلماء مولٰنا نذیر احمد خاں مرحوم کے احسانات اپنی قوم پر اس کثرت سے ہیں کہ شمار میں نہیں آسکتے خصوصًا سب سے زیادہ علی گڈھ کالج پر۔ پھر انجمن حمایت الاسلام لاہور۔ اور اس کے بعد مدرسۂ طبیہ دہلی پر۔ اِن احسانات کے لحاظ سے اور دوسری جلیل القدر خدمات کے خیال سے بھی کہ مرحوم نے اُردو علم ادب کو اپنی تصانیف سے نہایت گراں بہا مدد دی۔ قوم کے لئے مقتضائے احسان مندی و شکر گزاری یہ تھا کہ اگر تین جگہ نہیں تو صرف علی گڈھ کالج میں ہی جو اہل اسلام کی تعلیمی اور قومی خدمات کا مرکز ہے۔ مولٰنا مرحوم کی ایک عالی شان یادگار قائم کی جاتی۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو اس سے کئی نہایت مؤثر قومی فائدے حاصل ہوتے۔ اوّل تو قوم میں اپنے محسن کی شکر گزاری کی عادت طبیعتوں میں راسخ ہوتی۔ دوم جو اور پیشوایانِ قوم خدماتِ قومی میں مصروف ہیں۔ اُن کے لئے حوصلہ افزائی ہوتی اور قومی کام اس سے بڑی مدد پاتے۔ سوم علی گڈھ کالج کی عمارت کا ایک حصہ اس یادگار کے نام سے بغیر اپنے خرچ کے بالکل مفت میں لوگوں کے چندے سے تعمیر ہو جاتا۔

مگر ہمیں اپنے معزز دوست مولوی بشیر الدین احمد صاحب معتمدِ مال گزاری حیدرآباد کی وہ مراسلت جو ذیل میں درج کی جاتی ہے دیکھ کر بے انتہا حیرت۔ افسوس اور رنج ہوا۔ اِس مراسلت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ممبرانِ سنڈیکیٹ علی گڈھ کالج مولٰنا مرحوم کی یادگار اپنے کالج میں بنانا پسند نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ مولٰنا مرحوم نے انتقال سے کچھ عرصے پہلے علی گڈھ کالج سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اس لئے وہ اس عزت اور قدر افزائی کے مستحق نہیں رہے۔ ہمیں اس استدلال پر سخت حیرت ہے۔ مولٰنا مرحوم کی یادگار کی تجویز اُن خدمات کے صلے میں ہے جو اُن سے بزمانۂ تعلق علی گڈھ کالج ظہور میں آئیں۔ اور وہ خدمات صفحاتِ تاریخ علی گڈھ سے کس طرح مٹ سکتی ہیں۔

میں بذاتِ خود اس بات کو نہایت پسندیدگی سے دیکھتا ہوں۔ کہ کالج کا ہر ٹرسٹی جب اس عمر کو پہنچ جائے کہ وہ اپنے عہدے کے فرائض کو پوری محنت اور مستعدی سے انجام نہ دے سکے۔ تو اُسے ضرور اپنے عہدے سے استعفا دے دینا چاہیئے۔ ٹرسٹی کا لفظ خان بہادری کے خطاب کی مانند نہیں ہے۔ جو محض اعزاز کا کام دیتا ہے۔ اور اخیر وقت تک نام کے ساتھ رہتا ہے۔ ٹرسٹی کو بے انتہا سخت ذمہ داری کے فرائض انجام دینے ہوتے ہیں اور ہر ایماندار ٹرسٹی کو لازم ہے کہ جب ان میں اس قدر محنت کی ہمت نہ رہے۔ جو اُن کے کام کے لئے ضروری ہے۔ تو وہ علیٰحدہ ہو جائے۔ اِس لحاظ سے مولٰنا مرحوم نے ٹرسٹیانِ کالج کے لئے اپنی ذات سے ایک نہایت اچھی قابلِ تقلید مثال قائم کی۔

علاوہ ازیں اگر مولانا مرحوم کے قطع تعلق کی وجہ سے اُن کی گزشتہ خدمات بھی کالعدم ہو سکتی ہیں۔ تو پھر وہ تمام یادگاریں بھی۔ جو احاطۂ کالج میں موجود ہیں مٹا دینی چاہیئیں۔ اسٹریچی ہال میں سے اُن کے نام کا کتبہ نکال کر پھینک دینا چاہیئے۔ اور بورڈنگ ہوس کا جو کمرہ اُنھوں نے بنوایا۔ وہ منہدم کروا دینا چاہیئے۔

سب سے بڑی حیرت اس خیال سے ہوتی ہے۔ کہ جو رزولیوشن مولٰنا مرحوم کی یادگار کے خلاف منظور کیا گیا ہے۔ وہ

اس عہد میں کیا گیا۔ جب کہ اس کشتی قوم کے ناخدا خدا کے فضل وکرم سے عالی جناب نواب **وقار الملک** ہیں۔ ممکن ہی کہ باوجود کوشش کے وہ اپنے جلیسوں کو اپنا ہم رائے بنانے میں کامیاب نہ ہوئے ہوں مگر قوم کے اطمینان کے لیئے اس بات کا ظاہر کر دینا نہایت ضرور ہی کہ مولانا مرحوم کی یادگار قائم کرنے کے باب میں خود جناب نواب ممدوح کی کیا رائے تھی۔

ہمارے اخبار کی سب معاون خواتین اپنے اوپر مولانا مرحوم کے بے شمار احسانات سمجھتی ہیں۔ اور انھیں ہندوستان میں زنانہ لٹریچر اور تعلیم کا بانی جانتے ہیں۔ انھیں کارکنان قوم کی اس بے مروتی سے بے انتہا رنج ہو گا کہ ان کو کالج کے احاطہ میں اس بزرگ مرحوم کے نام پر مفت عمارت بنوانی بھی منظور نہیں۔ کیا حقیقت میں **نذیر احمد** ایسا ہی بُرا آدمی تھا کہ مرنے کے بعد بھی علی طور پر اُن کے ذکر خیر کیئے جانے پر اس قدر کراہت۔ حقارت اور رنج اور غصے کا اظہار کیا جائے۔ (خاکسار سید ممتاز علی)

ٹرسٹیان کالج کا شکوہ
علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ
۳۱ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء

اخبار تہذیب نسواں مطبوعہ ۲۷ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء میں ایک خط جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب خلف الصدق جناب شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم و مغفور کا شتہر ہوا ہی جس میں وہ اس بات پر اپنی نارضامندی کا اظہار کرتے ہیں کہ ٹرسٹیوں نے علی گڈھ کالج میں جناب مرحوم و مغفور کی یادگار قائم کرنے سے انکار کیا۔ اور اس انکار کی بنیاد پر وہ ٹرسٹیوں کو ایک ناشکر گزار جماعت قرار دیتے ہیں۔ ٹرسٹیوں کے اجلاس سنڈیکیٹ مورخہ ۲۲ جون سنہ ۱۹۱۲ء کا وہ رزولیوشن نمبر ۱۹ حسب ذیل ہی۔

"چونکہ مولانا مرحوم نے عرصے سے کالج سے اپنا قطع تعلق کر لیا تھا۔ لہذا کالج کی طرف سے کسی ایسی کارروائی کا موقع نہیں ہی"

جناب موی بشیر الدین احمد صاحب نے جن الفاظ میں ٹرسٹیوں کی شکایت پبلک کے سامنے پیش کی ہی اُس کے لحاظ سے اگر واقعات کا اظہار کچھ نہ کیا جائے تو اندیشہ ہی کہ پبلک کو اس معاملے میں سخت غلط فہمی واقع ہو گی۔ اور اب چونکہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے خود اس مسئلے کو پبلک کے سامنے پیش کیا ہی تو جو کچھ اس مسئلے پر مزید روشنی پڑے اُس کی ذمہ داری خود موصوف ہی پر ہو گی۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہوا ہی جس وقت یہ معاملہ سنڈیکیٹ میں پیش ہوا تو اُس وقت سنڈیکیٹ کے سامنے سخت مشکل پیش تھی کہ جناب مرحوم نے اپنی رحلت سے کچھ عرصہ پیشتر جو ایک کتاب "امہات الامہ" کے نام سے تصنیف فرمائی تھی۔ اُس سے مسلمان بہت ہی برہم ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ ایک وقت میں اُن کی جان کی طرف سے اندیشہ کیا جا رہا تھا۔ اسی وجہ سے منتظمان مدرسۂ طبیہ دہلی کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ اپنے ایک بہت ضروری جلسے میں جو اسی زمانہ میں منعقد ہوا تھا اور جس کی صدارت ہز آنر نواب لفٹنٹ گورنر بہادر (پنجاب) بالقابہ نے فرمائی تھی۔ جناب مرحوم و مغفور کو تشریف لانے کی تکلیف دیں۔ جناب مرحوم و مغفور کے دوستوں نے اگرچہ بہت کوشش کی اور اُس کتاب کو تلف بھی کرا دیا۔ لیکن در حقیقت جو صدمہ کہ اُس کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں کو پہنچ چکا تھا وہ پوری طرح آخر تک رفع دفع نہیں ہوا۔ مگر سنڈیکیٹ نے مناسب نہیں سمجھا کہ اِس قسم کا کوئی ذکر اپنے رزولیوشن میں کرے اور انھوں نے وہ سادہ سادہ رزولیوشن پاس کر دیا جو اوپر درج ہی۔

پھر مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے کچھ اپنے ہی صرف سے اپنے والد ماجد کی یادگار کالج میں قائم کرنی نہیں چاہی تھی بلکہ وہ چاہتے تھے کہ کالج اپنی طرف سے فراہمیِ چندہ کی اپیل قوم سے کرے۔ جس میں وہ خود بھی ایک معقول شرکت کریں گے۔ اِس طرح پر یادگار قائم کرنے کی ذمہ داری خود کالج کے منتظموں پر آجاتی تھی اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ایسا کوئی اپیل ٹرسٹیانِ کالج کی طرف سے پبلک میں شائع ہوتا تو یقیناً اُس پر راسخ الاعتقاد مسلمانوں کو برہمی پیدا ہوتی اور وہ کالج پر لے دے کرتے۔ اور اُس وقت کالج کی طرف سے پبلک کے برہم ہونے کا اس سے زیادہ خطرہ ہوتا جتنا کہ جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے اپنے عنایت نامے کے اخبار میں مشتہر کرنے سے اُس کا اندازہ کیا ہوگا۔

ہم کو یہ بھی یقین ہی کہ جناب مرحوم وموصوف جیسے لائق اور قابل شخص نے کسی نہ کسی وقت ضرور اپنی اس غلطی پر خدا سے (جو غافر الذنب وقابل التوب ہی) توبہ کی ہوگی۔ اور ہم لوگوں کو اب بفحوائے "اذکروا موتکم بالخیر" اُن کی نسبت نیک گمان کے سوا اور کچھ گمان نہ رکھنا چاہیئے۔ اور ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالٰے جناب مرحوم ومغفور کی (جن کی بہت سی خدمات اسلام کے واسطے ہو چکی ہیں) مغفرت کرے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب ہم کو معاف کریں کہ کالج کو ناواجب نقصان سے محفوظ رکھنے کی غرض سے ہم نے اصلِ واقعہ پر کسی قدر روشنی ڈالنے کی جرأت کی ہی۔ آخر میں ہماری دعا ہی کہ خدا سب مسلمانوں کا خاتمہ بخیر کرے۔ آمین۔

علی گڈھ کی قومی ہمدردی کی ایک بے نظیر مثال

وطن۔ ۲۹ جولائی ۱۹۱۲ء

اے اجل گر تنِ بے جاں تہِ خاکش سپری
نہ توانی کہ نکو نامیش از یاد بری

میرے والدِ ماجد جناب شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی۔ ڈی۔ او۔ ال کے انتقال سے سارے ہندوستان میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ تمام نامور اُردو کے اخبارات نے اُن کے انتقال پر اظہارِ افسوس کیا۔ افسوس ہی کہ علمی دُنیا اُن کے چشمۂ فیض سے محروم ہو گئی۔ اُن کا مرنا قوم کے لیئے ایک ناقابلِ برداشت صدمہ تھا کیوں کہ چاروں طرف سناٹا نظر آتا ہی۔ جو اُٹھ جاتا ہی اِس زمانۂ قحط الرجال میں اُس کا بدل نہیں مل سکتا۔ میرا خیال تھا کہ سب سے پہلے اُن کی یادگار کے قائم کرنے کی صدا علی گڈھ سے اُٹھے گی۔ جو قومی مرکزِ تعلیم ہی۔ اور علی گڈھ کالج پر مرحوم کا بڑا حق تھا۔ خود معتدبہ رقم چندوں میں وقتاً فوقتاً دی۔ لکچروں کے ذریعے سے ہزار ہا روپے دلوائے۔ سر سید اور محسن الملک بہادر کے ساتھ دربدر پھرے۔ جو ابھی کل کی بات ہی۔ مگر جب بوڑھے ہو گئے نشست وبرخاست سے معذور ہو گئے۔ دُور دراز مقامات کے سفر کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ ناچار ٹرسٹی شپ چھوڑ دی اور چھوڑنا لازمی تھا کہ راست بازی اور دیانت کا یہ تقتضا نہ تھا کہ برائے نام ٹرسٹی رہیں اور کام نہ کر سکیں۔ اگر یہ وجہ معقول نہ تھی تو پھر نواب وقار الملک کا سکرٹری شپ سے علٰحدہ ہونا بھی عذرِ لنگ ہوگا۔

میرے والد کی یہ حالت تھی کہ وہ ڈی۔ او۔ ال کی ڈگری لینے لاہور نہ جا سکے۔ جس پر لفٹنٹ گورنر نے افسوس کا اظہار کیا۔ اور مرحوم سے ملاقات کی تمنا ظاہر کی۔ کارونیشن دربار کی دعوت آئی اِسی مجبوری سے

نہ جاسکے۔ کیا اس صراحت کے بعد بھی اُن کا علی گڈھ کالج کے جلسوں میں شریک نہ ہونا کوئی بہانہ یا گریز سمجھا جاسکتا ہی۔ لیکن افسوس ہی کہ اُن کی موت پر علی گڈھ کالج نے کان تک نہ ہلایا۔ سب سے پہلے پیسہ اخبار نے یادگار کی صدا بلند کی اور لکھا کہ علی گڈھ کالج۔ انجمنِ حمایت الاسلام۔ مدرسۂ طبیۂ دہلی سے یادگار قائم کی جائے جس کے لیے قوم تیار ہی معتد بہ چندہ فراہم ہو سکے گا۔ میں نے علی گڈھ لکھا۔ امید تھی کہ ضرور وہاں یہ تحریک منظور ہو گی۔ کیوں کہ ہم خرما و ہم ثواب۔ علی گڈھ کالج کی اس پیرایے میں بھی امداد ہو گی۔ مگر معلوم ہوا کہ وہاں تو بھرے ہوئے بیٹھے تھے۔ سوکھا سا جواب یہ ملا۔

ریزولیوشن نمبر ۱۹۔ باجلاس سنڈیکیٹ ۲۳ جون ۱۹۱۲ع " دربارۂ یادگار مولنا ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم۔ چوں کہ مولنا مرحوم نے عرصے سے علی گڈھ کالج سے اپنا تعلق قطع کر لیا تھا۔ لہذا کالج کی طرف سے کسی ایسی کارروائی کا موقع نہیں ہی"۔

ہم پبلک کے سامنے اس جواب کو پیش کر کے عرض کرتے ہیں کہ یہی صلہ مرحوم کی جاں فشانی کا قوم کی طرف سے ملا ہی۔ مرحوم کی یادگاریں علی گڈھ کالج میں سر بہ فلک کھڑی ہیں۔ اُن کے لکچر علی گڈھ کالج کے تائیدی مضامین میں بھرے پڑے ہیں۔ کیا اس پر بھی کوئی واقعات سے انکار کر سکتا ہی۔ ہٹ دھرمی کا کوئی علاج نہیں۔ یہ فتویٰ اُس خطے کا ہی۔ جہاں قومی ہم دردی کی تخم ریزی کی جاتی ہی۔ اگر قومی ہم دردی اسی کا نام ہی کہ کسی کے مرتے ہی اُس کے حقوق سب ملیامیٹ ہو جائیں تو ایسی قومی ہم دردی کو ہمارا سلام ہی۔ میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اگر کوئی یادگار قائم کرنا تجویز ہو تو میں معقول چندہ دوں گا۔ مگر وہاں تو سرے سے انکار ہی انکار ہی۔

ع ان تلوں تیل ہی نہ تھا گویا

مانا کہ کئی برس ہوئے کہ مرحوم نے ٹرسٹی شپ چھوڑ دی تھی لیکن اس سے کیا اُن کے تمام مساعیِ جمیلہ یک قلم کالعدم ہو گئے۔ حاشا و کلّا۔ جب علی گڈھ جیسے مہذّب مقام سے یہ جواب ملا ہی۔ تو اب انجمن حمایت الاسلام اور مدرسۂ طبیہ سے کیا توقع کی جاسکتی ہی ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

انجمن حمایت الاسلام پر بھی مرحوم کے کم احسانات نہیں ہیں۔ سالہا سال تک وہ سالانہ جلسوں میں لاہور جاتے رہے اور اُن کے لکچروں کی بہ دولت ہزارہا روپیہ چندہ ملا۔ کم و بیش یہی حال مدرسۂ طبیۂ دہلی کا ہی۔ لیکن دہلی کی سرزمین میں سوائے مذہبی مخالفتوں اور کفر کے فتوے دینے کے اب باقی کیا رہا ہی۔ گھر کی مرغی دال برابر۔ وہاں سے مجھے پہلے ہی امید نہ تھی ؎

کرتے کس مونہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

اب لے دے کے انجمن حمایت الاسلام لاہور رہ گئی۔ اگر کچھ کریں گے تو زندہ دلانِ پنجاب ہی کریں گے ورنہ بالخیر و شما بسلامت۔ آخر میں اس قدر عرض کرنا ضروری ہی کہ مرنے والے مر گئے۔ خدا اُن کو غریقِ رحمت کرے لیکن

علی گڈھ کالج کی یہ سرد مہری خود ایک ایسی یادگار ہی جو مدۃ العمر قائم رہے گی - مولٰنا مرحوم کے علمی کارنامے دُنیا میں ایسے پھیلے ہوئے ہیں کہ اُن کا نام مٹنے نہ دیں گے - لیکن یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اَور اور دکھانے کے اَور - مسلمانوں میں اب بھی قومی سپرٹ باقی نہیں ہی - احسان مندی اور شکر گزاری کے عمدہ صفات سے قوم اب بھی محروم ہی - من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ - والسلام

(بشیر الدین احمد مددگار معتمدِ مالگزاری سیٹیشن روڈ حیدرآباد دکن)

ایک ناشکر گزار جماعت
البشیر ۶ اگست سنہ ۱۹۱۲ء

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے صاحبزادے نے کوئی درخواست ٹرسٹیانِ محمڈن کالج کو بھیجی تھی جس میں اُنھوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ٹرسٹیانِ کالج شمس العلماء موصوف کی کوئی یادگار کالج میں قائم کریں قوم سے اپیل کی جاوے اور وہ خود بھی معقول امداد اس یادگار کے قیام میں دیں گے جس وقت یہ درخواست سنڈیکیٹ کے اجلاس میں پیش ہوئی - اُس وقت سنڈیکیٹ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۳ رجون میں یادگار قائم کرنے کی تجویز سے انکار کیا - اور صرف یہ رزولیوشن پاس کیا کہ "چونکہ مولٰنا مرحوم نے عرصے سے کالج سے اپنا قطع تعلق کر لیا تھا - لہٰذا کالج کی طرف سے کسی ایسی کارروائی کا موقع نہیں ہی"

اِس رزولیوشن کے پاس ہونے پر شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے صاحبزادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے اخبارات میں کوئی مضمون شائع کرایا جس میں ٹرسٹیوں کی اِس کارروائی پر اظہارِ ناراضی کیا گیا ہی - اور ٹرسٹیوں کو ایک ناشکر گزار جماعت کا خطاب دیا ہی - اس مضمون کے جواب میں کالج کے ارگن علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں ایک لیڈنگ آرٹیکل شائع ہوا ہی اور اُس آرٹیکل کے شائع کرنے کی ضرورت یہ بیان کی گئی ہی کہ "پبلک میں غلط فہمی پیدا نہ ہونے پاوے - سنڈیکیٹ کے رزولیوشن شائع ہونے کی وجہ یہ لکھی ہی "جس وقت یہ معاملہ سنڈیکیٹ میں پیش ہوا - تو اُس وقت سنڈیکیٹ کے سامنے سخت مشکل پیش تھی" الخ تحریر علی گڈھ گزٹ شائع ہو چکی ہی - جو مضمون کہ کالج کے ذمہ دار اخبار میں شائع ہوا ہی اگر یہ مضمون شائع نہ ہوتا تو بہت زیادہ بہتر تھا اور جس طرح تمام دوسری کارروائیاں صیغۂ راز میں رہتی ہیں اگر سنڈیکیٹ کی یہ عقلمندی بھی ڈھکی چھپی رہتی تو ہم زیادہ شکر گزار ہوتے - رزولیوشن جن الفاظ میں پاس کیا گیا ہی مضمونِ مذکور سے ثابت ہوتا ہی کہ نہ تو اس میں صداقت کا پہلو نظر آتا ہی اور نہ اخلاقی جرأت کا اگر یہ وجہ صحیح ہی جو مضمون مذکور میں لکھی گئی ہی تو سنڈیکیٹ کی تاریخ میں ایک شرمناک الزام ہی - کیونکہ اِس سے غلط بیانی اور بزدلی دونوں کا ثبوت ملتا ہی اور ہم کو دلی صدمہ ہوتا ہی کہ قوم کی لیڈری ایسے اصحاب کے ہاتھوں میں چلی گئی ہی جن میں نہ صداقت ہی اور نہ اخلاقی جرأت !!! کاش سنڈیکیٹ کا انکار یادگار قائم نہ کرنے میں اس اصول پر ہوتا کہ جب کہ نواب محسن الملک کے یادگاری چندے میں کامیابی نہیں ہوئی تو ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی یادگار قائم کرنے کی اپیل بھی کامیاب نہ ہو گی تو ہزار درجہ بہتر ہوتا - رزولیوشن کے الفاظ بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی یادگار اس وجہ سے قائم نہیں ہو سکتی کہ مولٰنا ممدوح نے عرصے سے کالج سے قطع تعلق کر لیا تھا - ان الفاظ پر اعتراض ہو سکتا ہی کہ جناب مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم

مغفور بھی بہت عرصے تک کالج سے بالکل علیحدہ رہے۔ پھر اُن کی یادگار قائم کرنے کی اپیل کیوں کی گئی۔ اگر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی یادگار قائم نہ کرنے کی اصلی وجہ وہی ہی جو اس مضمون میں لکھی گئی ہی تو صداقت اور اخلاقی جرأت سے کام لے کر رزولیوشن اُن ہی الفاظ میں پاس کرنا مناسب تھا تاہم ہمارے نزدیک جب کہ مولانا کی اُس کتاب کو کسی نے نہیں دیکھا تو صرف دہلی کے چند عوام اشخاص کی مخالفت کی وجہ سے مولانا کی تمام عمر کی قومی اور مذہبی خدمات پر خاک ڈالنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ مولانا مرحوم کی نیکی اور صداقت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہی کہ اُنھوں نے کتاب کی تمام جلدیں تلف کرنے کی غرض سے بلا عذر حوالے کر دیں۔ اگر اُس کتاب میں کلماتِ کفر تھے تو مولانا کا کتاب کو بغرض تلف کرنے کے حوالے کر دینا خود اِس بات کا ثبوت ہی کہ مولانا مرحوم نے اُن عقائد سے توبہ کر لی تھی۔ علاوہ ازیں کالج کے معاملات میں عقائد سے بحث کرنا کبھی جائز قرار نہیں دیا گیا۔ اگر یہ کارروائی جائز ہو تو بہت سے ٹرسٹی آج ایسے ہیں کہ جن کے عقائد نہ صرف جمہور اہلِ اسلام بلکہ سرسید کے عقائد کے بھی خلاف ہیں کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہی کہ لارڈ میکڈانل جیسے مسلمانوں کے دشمن کی یادگار قائم ہو لیکن مولانا نذیر احمد صاحب جیسے لیڈر کی یادگار کی تحریک کرنے سے محض اِس بنیاد پر انکار کیا جائے کہ دہلی کے چند عوام الناس مخالف ہو جاویں گے۔ جن اشخاص کی بدولت مولانا نذیر احمد صاحب کے خلاف فتنہ برپا ہوا وہ سرسید کی بھی سخت مخالفت کر چکے ہیں اور کبھی اُنھوں نے کالج کی امداد نہیں کی۔ ایسے اشخاص کی مخالفت سے خوف زدہ ہونا سخت افسوس ناک ہی۔ ہماری قوم میں کیوں ایثار پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں ہماری قوم میں آریوں اور ہندوؤں کی طرح ایثارِ نفس کرنے والے اور قومی خدمت کرنے والے پیدا نہیں ہوتے۔ اِس کی وجہ صرف یہ ہی کہ ہمارے قومی کالج میں زرپرستی اور عوام الناس کا خوف روز بروز بڑھتا جاتا ہی۔ قومی خدمات کرنے والوں کی عزت نہیں کی جاتی۔ لیکن جن لوگوں سے مالی نفع پونہچنے کی امید ہوتی ہی یا کسی مضرت کے پونہچنے کا اندیشہ ہوتا ہی۔ اُن کو ٹرسٹی بنایا جاتا ہی۔ اسٹیج پر اُن کی تعریف ہوتی ہی۔ اُن کی ہر قسم کی آؤ بھگت ہوتی ہی قومی دشمنوں کے شکریے کے رزولیوشن پاس کیے جاتے ہیں۔ خواہ کوئی شخص کالج کا اور سرسید کا کالج بھی مخالف کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر یہ خیال کیا جاتا ہی کہ اُس کی چاپلوسی اور خوشامد کرنے سے ایک بڑی جماعت ہماری معین و مددگار ہو جاوے گی۔ تو اُس کی آؤ بھگت کی جاتی ہی۔ ایسے بہ کثرت واقعات ہماری نظروں کے سامنے ہیں اور ہمارا دل اُن واقعات کو دیکھ کر جلا جاتا ہی اور ہم کو قومی ترقی کی طرف سے روز بروز سخت مایوسی ہوتی جاتی ہی۔ لیکن مولانا نذیر احمد صاحب کے ساتھ اُن کے مرنے کے بعد جو سلوک کیا گیا اُس سے ہم کو اِس قدر صدمہ پونہچا ہی کہ جس کو ہم بیان نہیں کر سکتے اور اگر یہ ہی لیل و نہار رہے تو ہم کو قومی ترقی کی طرف سے بالکل نا امید ہو جانا چاہیے کیوں کہ دنیا کی تاریخ میں ہم کو کوئی نظیر ایسی نہیں ملتی کہ کسی ملک کسی قوم اور کسی فرقے یا جماعت نے ترقی کی ہو جس میں اُس ملک اُس قوم اُس فرقے اور اُس جماعت کے ہمدردوں اور جان نثاروں کے ساتھ سرد مہری اور ذلت کا برتاؤ کیا گیا ہو اور عزت کی گئی ہو صرف دولت اثر اور قوت کی بنیاد پر۔ فرگسن کالج پونہ اور دیانند کالج لاہور کو دیکھو کہ وہاں کس طرح والیانِ ملک امرا رؤسا سے زیادہ عزت کی جاتی ہی اُن لوگوں کی جو افلاس و مصیبت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور جن کی ظاہری حالت نہایت ذلیل ہی اور اُس کے مقابلے میں کوئی ایک نظیر پیش کرو اپنے قومی کالج میں۔ یہی وجہ

ہی کہ ہمارا کالج آج تک کوئی ایک شخص بھی ایسا پیدا نہ کر سکا جس کو ہم دیانند کالج اور فرگسن کالج کے پروفیسروں کے مقابلے میں پیش کر سکیں۔!!!

علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۳۱ جولائی پر وطن کی رائے مطبوعہ ۷ اگست ۱۹۱۲ء

وطن اِس بحث میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب اپنے باپ کی نیک نامی کو محفوظ رکھنے کے لیئے کافی سے زیادہ استعداد رکھتے ہیں۔ البتہ وہ اتنا لکھ دینا ضروری سمجھتا ہی کہ کتاب امہاۃ الامۃ کا ذکر کرنے سے علی گڈھی ہم عصر نے بلاشُبہہ ایک محض بے محل و بے موقع چوٹ کی ہی۔ تمام قوم میں اب تک شاید ہی کسی شخص کے دل میں اس کتاب کی یاد باقی رہی ہوگی جسے خواہ مخواہ محض ایک بہانہ گھڑنے کے لیئے پھر تازہ کرنے کی کوشش کی گئی ہی۔ راسخ الاعتقاد مسلمانوں کی ہی محض دل جوئی اگر مانع ہوتی تو ان مسلمانوں کی پاس خاطر سے منتظمانِ علی گڈھ کالج کو مدت سے اپنے نظم و نسق اور خاص کر مالی انتظام میں معقول قطع بُرید کر دینی چاہیئے تھی۔ یادگار قائم کرنے سے ایسی ترش روئی کے ساتھ انکار کر دینا اگرچہ بعض افرادِ قوم کو جو مرحوم کی بیش قدر خدمات اور خاص کر ترجمۂ قرآن کریم کے احسان گراں بار کا خاص اعتراف کرتے تھے بہت کچھ شاق گزرا لیکن اِس کی تہ میں انھیں بھی کسی خاص امر کے نہ ہونے کا مطلق گمان نہ گزرا۔ مگر اب یہ عذرِ لنگ طبعاً انھیں بھی یہ قیاس کرنے پر مجبور کر دے گا کہ اس انکار کی تہ میں ضرور کوئی اور معاملہ ہی۔ چناں چہ بعض علانیہ اسے مولوی صاحب مرحوم اور نواب وقار الملک کے ذاتی تعلقات کی تمام معلوم غیر خوش آہنگی کی طرف منسوب کر رہے ہیں نواب محسن الملک کی وفات پر جب مولوی مشتاق حسین صاحب وقار الملک کا نام تجویز ہوا تو مرحوم نے اِس کی تائید کرنا پسند نہ فرمایا۔ بلکہ اپنی مشہور صاف گوئی سے کام لے کر یہ کہنے سے بھی نہ ٹلے کہ میں امروہہ کے حق میں کبھی رائے نہیں دے سکتا۔ اور گو انھوں نے بعض لنگوٹیے دوستوں کے تحکمانہ اصرار پر آخر منظوری پر دستخط کر دیئے مگر اس انتخاب کو اپنی رائے میں قوم اور کالج کے حق میں ایسا مضر سمجھا کہ اُس دن سے معاملاتِ کالج میں دخل دینا چھوڑ دیا چناں چہ مخولہ بالا معترض کی رائے میں اِس انکار سے اِس کا بدلہ لیا گیا ہی۔ یقین ہی کہ ہم عصر علی گڈھ گزٹ اِس پہلو سے بھی اِس معاملے پر روشنی ڈالنا منظور کرے گا۔ رہا کتاب امہاۃ الامۃ کا معاملہ۔ اِس پر فقط شہر دہلی کے چند علماء نے عام رائے میں ایک تموج پیدا کیا تھا سب راسخ الاعتقاد مسلمان اِن سے متفق الرائے نہ ہوئے تھے نہ دہلی کی حدود سے باہر کوئی مخالف تحریک پھیلی تھی پیرایۂ بیان بے شک اکثر نے ثقاہتِ مضمون کے حسبِ حال قرار نہ دیا تھا مگر مصنف کی نیک نیتی اور اخلاص پر شُبہہ کرنے والے وہی ہو سکتے تھے جو مرحوم کی ساٹھ سالہ دینی و قومی خدمات سے بے خبر تھے یا بے خبر رہنا چاہتے تھے۔

ٹرسٹیانِ کالج علی گڈھ و یادگار مولٰنا نذیر احمد مرحوم

تہذیب نسواں مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۱۲ء مع خط خاکسار بشیر الدین احمد

ٹرسٹیانِ کالج علی گڈھ و یادگار مولٰنا نذیر احمد خاں مرحوم

۲۷۔ جولائی کے تہذیب میں مولوی بشیر الدین احمد صاحب کا ایک خط اِس شکایت کا شائع ہوا تھا کہ ٹرسٹیوں نے علی گڈھ کالج میں اُن کے والد ماجد شمس العلماء مولوی نذیر احمد خاں مرحوم

کی یادگار اس بنا پر قائم کرنے سے انکار کیا کہ مولانا مرحوم نے کالج سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ صاحب علی گڈھ گزٹ نے اس تحریر کے جواب میں تین باتیں لکھی ہیں۔ تینوں نہایت لطیف ہیں۔

اوّل تو یہ کہ کالج سے قطع تعلق کا تو یوں ہی بہانہ تھا۔ اس کا اصلی سبب کچھ اَور ہی تھا۔

دوم مولانا مرحوم نے جو ایک کتاب امہاۃ الامہ (عیسائیوں کی کتاب کی تردید میں لکھی تھی) اس سے بعض لوگ بہت برہم ہو گئے تھے۔ اس لیئے ٹرسٹیوں کو یادگار بنانے کی جرأت نہ ہوئی مبادا لوگ اُن سے بھی برہم ہو جائیں

سوم۔ خیر ٹرسٹی یادگار بنا بھی دیتے اور لوگوں سے نمٹ لیتے بشرطے کہ مولوی بشیر الدین یادگار کے لیئے بہت سا روپیہ انھیں دے دیتے۔ مگر مشکل تو یہ ہوئی کہ مولوی بشیر الدین سارا روپیہ نہ دیتے تھے۔ بلکہ یہ چاہتے تھے کہ کالج پبلک سے بھی چندہ وصول کرنے کی دردسری کرے۔

ہم موٹی عقل کے آدمی اِن باریک نکتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ صرف اتنا کہنا جانتے ہیں کہ مولانا مرحوم کی مخالفت تو دہلی کے صرف چند لوگوں ہی نے کی تھی۔ لیکن علی گڈھ میں ایسے لوگوں کی یادگاریں منظور ہوئی ہیں جن کو ہندوستان بھر ہی نہیں بلکہ مکّے و مدینے کے علمار نے کافر و مرتد کہا۔ مگر ٹرسٹیانِ کالج نے اُن کی بیش بہا خدمات قومی کی قدر کے آگے حرمین شریفین کے فتووں کو پسِ پشت ڈال دیا۔ نیز اگر میں غلطی نہیں کرتا تو خیر خواہی کالج کے اعزاز میں کالج غیر مسلموں کی موت پر بھی بند کیا گیا ہے۔ مگر اس مرحوم عالمِ دین و مترجمِ کلام رب العالمین کا رتبہ ٹرسٹیانِ کالج کے نزدیک غیر مسلموں کا سا بھی نہ ہوا۔

مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے اب ایک اَور تحریر شائع کرنے کے لیئے بھیجی ہے جو ہم درج ذیل کرتے ہیں۔ مگر آیندہ یہ سلسلہ جاری رکھنا فضول ہے کس کی شکایت اور کس سے شکایت؟ از ماست کہ بر ماست۔

من از بیگانگاں ہر گز نہ نالم کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

خاکسار سید ممتاز علی

اُونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ

علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مطبوعہ ۳۱ جولائی میں جو وجہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم و مغفور کی یادگار تیار نہ کرنے کی لکھی ہے کہ اُن کی اخیر تصنیف امہاۃ الامہ سے مسلمان بھڑک گئے تھے۔ اُس کے متعلق مجھے تھوڑی سی توضیح کرنا ضرور ہے۔ ٹرسٹیانِ کالج نے جس بنا پر یادگار کا بنانا نامنظور کیا ہے۔ اوّل تو اُسے کالج سے رتّی برابر تعلق نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر چند مسلمانوں نے شورش برپا کی تو وہ کل قوم کی بددلی پر محمول نہیں ہو سکتی۔ امہاۃ الامہ کی نسبت جب ایسی خلاف واقع شہرت خاص اسباب سے چند اشخاص نے پسِ پردہ کر دی۔ تو مرحوم کو اس کا اس قدر قلق ہوا کہ انھوں نے اس کے بعد سے پھر سلسلۂ تصنیف اور تالیف کو قطعاً بند کر دیا۔ اور کتاب کو جلوا دیا کہ کسی طرح مخالفین کے دلوں میں ٹھنڈک پڑے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ نفسِ کتاب کے حُسن و قبح پر میں بحث کرنا فضول سمجھتا ہوں اس لیئے کہ جب وہ کتاب صفحۂ دُنیا سے مٹا دی گئی اور مصنّف بھی مٹ گئے تو مُردوں کی ہڈیاں اُکھیڑنے سے کچھ فائدہ

نہیں۔ لیکن صرف دو اقتباس اس کتاب کے متعلق میں یہاں درج کرتا ہوں۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ کتاب کس سلوک کی مستحق تھی۔ اور اس سے کیا سلوک کیا گیا۔ پہلی تحریر مولوی سید احمد صاحب مصنفِ فرہنگ آصفیہ کی ہے جو پیسہ اخبار میں شائع ہوچکی ہے۔ اور دوسری مولوی عبدالراشد صاحب الخیری ایڈیٹر رسالہ تمدن و عصمت کی ہے۔ ناظرین اس پر سے خود فیصلہ فرمالیں۔ اور یہ دونوں تحریریں اُن کی وفات کے بعد کی ہیں۔

اؔ "مرنے سے دو چار برس پیشتر حاسدوں نے امہات الامہ کی آڑ پکڑ کے آپ کے دل کو از حد صدمہ پہنچایا۔ جس کا اثر مرتے دم تک باقی رہا۔ اِس صدمے نے آپ کی عمر کے آخری برسوں میں تعلیم و تعلّم کا دروازہ بند کردیا اور مولوی صاحب کو گوشہ نشین بنادیا۔ گو کتاب مذکور میں بعض الفاظ ذرا سبک تھے۔ اور مولوی صاحب اُن کے بدلنے پر بھی راضی تھے مگر چوں کہ خود غرضوں کا مطلب اس سے نہیں نکل سکتا تھا۔ اِس وجہ سے اُنھوں نے دوسرا پہلو اختیار کیا اور آخر کتاب کو ناپید کرادیا۔ یہ پادری احمد شاہ صاحب شائق کی کتاب امہات المومنین کا جواب تھا اور ایسا دندان شکن جواب تھا کہ معترضین کے دانت کھٹے کردیتا۔ مگر افسوس کہ لوگوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقع نہ ملا۔ اس کتاب کی آڑ میں کفر و الحاد کے فتوے مولانا نذیر احمد کے برخلاف لکھوائے گئے۔ مگر ان فتووں سے نہ مولوی صاحب کا فربنے اور نہ کفر کی کوئی شرط بدلائل ثابت ہوئی۔ البتہ اُن کی تصانیف اور علمی فیض کا دروازہ بند کرانا تھا سو کرادیا۔ اصل بات کو نہ سمجھے۔ مولوی صاحب کی طرزِ تحریر کو نہ پرکھا۔ کہ وہ ہمیشہ ناولانہ رنگ میں لکھتے تھے۔ اور اس رَو میں جو ن سے الفاظ مناسب ہوتے اُن کو نہیں چھوڑتے تھے۔ مثلاً چترائی اور چلتر ہم معنی الفاظ ہیں مگر لفظ چلتر نے جو فسانہ نگاروں نے عورتوں کی بے وفایانہ عیاری کے واسطے مختص کرلیا تھا۔ یہ غضب ڈھایا۔ کہ بہت بڑے فاضل کا دل دُکھادیا۔ اگر چلتر کے بجائے چترائی لکھا جاتا۔ تو یہ اعتراض بھی اُڑ جاتا۔ اور اُن کا دل نہ دُکھتا لیکن دل کا دُکھانا خود غرضوں کے حق میں اچھا اور ہمارے حق میں بُرا ہوا۔ کیوں کہ اُس نے بہت سے بیش قیمت لعل و جواہر کو اُن کی معدنِ طبیعت سے باہر نہ آنے دیا۔ ورنہ اِس تین چار برس کے عرصے میں خدا جانے کون کون سے گُلِ ناشگفتہ کھلتے۔ اور کیا کیا بہار دکھاتے۔ یہ منصفانہ رائے شاید ہمارے واسطے بھی ایسا فتویٰ کھڑا کرے"

۲۔ حق الامر یہ ہے کہ امہات الامہ وہ کتاب تھی۔ کہ نہ آج مسلمانوں میں کوئی ایسا نظر آتا ہے نہ آیندہ برسوں نظر آنے کی امید ہے کہ غیر مسلموں کے سامنے اِس قابلیت سے پیغمبر اسلام صلعم کی رسالت کو ثابت کر جائے۔ اور مسلمانوں کے واسطے اتنا لٹریچر مہیّا کردے۔ جو امہات الامہ میں ہے۔ قوم کی بدقسمتی ہے کہ علاّمہ بلگرامی نے امہات الامہ کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور یقیناً دیر یا سویر میں اجازت حاصل کرلیتے۔ مگر علاّمہ موصوف کی موت نے تکمیل نہ ہونے دی۔ بعض اخباروں کی رائے کہ مولانائے مرحوم کو جب یہ معلوم ہوا۔ کہ علمائے اسلام اِس پر معترض ہیں۔ تو کتاب اُن کے حوالے کردی قطعی غلط ہے جس طرح یہ کتاب حاصل کی گئی۔ اور جو اس کا حشر ہوا۔ اِس کا خیال تکلیف دہ ہے۔ میں نے مارا مار کتاب نقل کی۔ لکھ کر حاضر ہوا۔ مناسب ترمیم اور تغیر و تبدل کے بعد وہ بیش بہا اوراق اب میرے پاس ہیں۔ لیکن مجھ جیسا گوشہ نشین جو داخل شدہ ضمانت ہی کے واسطے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا ہے۔ مخالفین کا کیا مقابلہ کرسکتا ہے البتہ کتاب

میرے کلیجے سے لگی ہوئی ہے۔ اور اگر اس کی اشاعت میرے ہاتھوں ہو گئی تو یہ کہوں گا۔

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

صرف ان ہی دو تحریروں سے ناظرین کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ بر کا کوا بنا دیا گیا۔ در پردہ اس کی وجہ کچھ اَور ہی تھی۔ جو دل جلوں نے بدلہ لیا۔ اب اس کا اعادہ فضول ہے۔ کفر کا فتویٰ بھی چند فتح پوری کی مسجد کے طالب علموں نے دے دیا۔ لیکن ایسا فتویٰ کس پر نہیں ہوا۔ جتنے بڑے علمار گزرے ہیں سب کے ساتھ کم و بیش یہی سلوک کیا گیا یہ بھی ایک پروانہ بخشایش ہے۔ کیا سرسید اس سے محفوظ تھے۔ یا کون سا بڑا عالم اس سے بچ گیا۔

قیل ان الالٰہ ذو ولد　　　قیل ان الرسول قد کھنا
ما نجی اللہ والرسول معًا　　　من لسان الوریٰ فکیف انا

اگر اس قسم کے چند خود غرضوں کی مخالفت مانعِ قیامِ یادگار ہے۔ تو اس سے زیادہ مخالفت سرسید کی تھی وہ نیچری بھی تھے۔ اور کافر بھی۔ پھر اُن کی یادگار کیوں بنائی گئی؟ آخر سب مخالف دب دبا گئے۔ اور آج اُن ہی کا کام سراہا جا رہا ہے۔ کیا سرسید کی تفسیر پر کم شورش مچی تھی؟ یادگار کی صدا میں نے بلند نہیں کی۔ کیوں کہ میں خوب جانتا ہوں کہ اُن کی یادگار صفحۂ دنیا پر اَن مٹ طریقہ پر قائم ہے۔ یہ تو سب سے پہلے منشی محبوب عالم صاحب کی تحریک تھی تعجب ہے کہ ہندوستان کے نامی گرامی کل اخباروں نے جو قوم کی آواز کہلاتے ہیں۔ مرحوم کی وفات پر بڑے بڑے آرٹکل لکھے۔ سارے ہندوستان کی انجمنوں اور سوسائیٹیوں نے تعزیت کے رزولیوشن پاس کیئے۔ صدہا تار بھیجے۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ مسلمان مرحوم سے برہم تھے۔ اس واسطے ہم یادگار قائم کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ تو یا تو یہ بیان غلط ہے۔ یا یہ سب لیڈر اور رزولیوشن لغو۔ بہر حال احیاۃ الامۃ پر اگر اُبال تھا بھی تو وہ گیا گزرا ہوا۔ آج اُسے تازہ کرنا۔ اور اُس کی آڑ میں یادگار نہ قائم کرنے کی توجیہ کرنا جیسی رقیع بات ہے وہ خود دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں۔ اب میں اِس بحث مباحثے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اتنا بھی اس وجہ سے لکھنا پڑا کہ مرحوم کی ذات پر ایک غیر واقع الزام کا اتہام تھا۔

(خاکسار دلفگار بشیر)

شمس العلما مولانا مولوی ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم اور ٹرسٹیانِ علی گڈھ کالج۔ علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۱۴ اگست سنہ ۱۹۱۲ء

اتنی سب مراسلت جل جلا کر اور اتنے بڑے شور و شغب کے بعد

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اِک قطرۂ خون نکلا

مولوی آفتاب احمد صاحب کا خط قابلِ ملاحظہ ہے۔ علی گڈھ کالج کا راز فری میسنوں کا سا راز ہے۔ جو آج تک کسی کی سمجھ میں آیا ہی نہیں۔ وہاں خود یہ حالت ہے کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ خدا بھلا کرے آفتاب احمد خاں صاحب کا کہ اُنھوں نے بھڑکتی آگ پر ایک سرد پانی کا چھینٹا تو دیا۔ خیر کسی طرف سے تو صدائے خوش گوار آئی۔

اڈیٹر صاحب علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ! تسلیم۔ آج کل ہمارے قومی اخبارات میں اس پر بحث ہو رہی ہو کہ ٹرسٹیان علی گڈھ کالج نے شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی یادگار کے متعلق جو رزولیوشن پاس کیا وہ کسی طرح مناسب نہ تھا۔

پبلک میں ٹرسٹیان کی اس کارروائی پر نہایت سخت الفاظ میں نکتہ چینی ہو رہی ہو اور اُن کو ناشکر گزار جماعت کا لقب دیا جا رہا ہو۔

لیکن حقیقت یہ ہو کہ جماعتِ ٹرسٹیاں کے سامنے یہ مسئلہ کبھی پیش نہیں ہوا۔ اور مجھ کو یقین ہو کہ اگر جماعتِ ٹرسٹیان کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوتا۔ تو بہت سے ٹرسٹی ہرگز اس رائے سے اتفاق نہ کرتے جو ٹرسٹیانِ موجودہ اجلاس سنڈیکیٹ نے قرار دی۔

میری ناچیز رائے میں شمس العلماء مرحوم کی علمی اور مذہبی خدمات کوئی منصف مزاج شخص فراموش کر نہیں سکتا۔ اور نہ وہ کسی عارضی اعتراف کی محتاج ہیں۔ اُردو لٹریچر کی جو خدمت اُنھوں نے کی وہ کبھی مٹ نہیں سکتی۔ متعدد علمی اور اخلاقی تصانیف کے ذریعے سے قوم میں علمی مذاق کے پھیلانے اور اصلاحِ خیالات میں جو حصّہ اُنھوں نے لیا اُس کی یاد ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اور اِن سب سے بڑھ کر کلام پاک کے مقدس مطالب کو عام فہم اُردو میں ترجمہ کر کے اسلام کی جو خدمت اِس مُلک میں مرحوم نے کی وہ اُن کی مغفرت اور دائمی یادگار کے لئے بالکل کافی ہو۔

پس جماعتِ ٹرسٹیان اِس نکتہ چینی کی مستوجب نہیں ہو جو پبلک میں اُن پر کی جا رہی ہو۔ (خاکسار آفتاب احمد)

(جناب آنریبل صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب)

بزرگانِ علی گڈھ کالج کا عذر یادگارِ مولانا نذیر احمد خاں قائم نہ کرنے کا از مولانا حسن نظامی

تہذیبِ نسواں مع ۱۲ اگست ۱۹۱۲ء

بزرگانِ علی گڈھ کالج کا عذر یادگارِ مولانا نذیر احمد خاں قائم نہ کرنے کا

منیجر صاحب تہذیبِ نسواں۔ السلام علیکم۔ آج میں نے آپ کے پرچے میں مولانا بشیر الدین احمد صاحب کی وہ دردناک تحریر دیکھی جس میں مولانا نذیر احمد صاحب کی یادگار اور علی گڈھ کالج کے انکار کا ذکر تھا افسوس ہو کہ مجھ کو آج تک اس قصّے کی خبر نہ ہوئی۔ کون کہتا ہو کہ دہلی کے علماء نے مرحوم کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا؟ سب جھوٹ ہو۔ چند حریص اور خود غرض لوگوں نے شورش برپا کی تھی۔ مگر معقول اہلِ علم اس شورش سے علیحدہ اور بیزار تھے۔ جو لوگ اس مخالفت کے بانی تھے۔ میں جب کبھی اُن کے ہاں گیا۔ سوائے جوڑ توڑ اور غیبت و بدگوئی کی باتوں کے کبھی ذکرِ خدا رسول اُن کے ہاں نہ سنا۔ مگر مولانا نذیر احمد سے مرتے دم تک جب ملنا ہوا۔ ہمیشہ خدا اور خدا والوں کا چرچا رہتا تھا اور اب آخرِ وقت میں تو اُن کی خدا ترسی اور رقیق القلبی کا یہ عالم تھا۔ کہ ایک آیت سُناتے اور بے اختیار روتے۔ ایسے سچّے خدا پرست کو کافر کہنے والے میرے عقیدے میں

دوزخ کے کنارے ہیں۔

میں آپ کو رسالہ نظام المشائخ کا وہ پرچہ بھیجتا ہوں۔ جس میں مرحوم کی وفات کے زمانے میں اظہارِ الم کیا گیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ درویشی طبقہ میں اُن کو کس نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

مولانا بشیر الدین احمد صاحب سے میرا تعارف نہیں اور نہ میری عادت کہ آج کل کے مصنوعی ہمدردی کرنے والوں کی طرح رزولیوشن بازی کرتا۔ لیکن آج اُن کی تحریر سے متاثر ہو کر آپ کو لکھتا ہوں۔

رہا علیحدگیٔ کالج والا قصہ۔ اِس کی حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ کانفرنس میں جب مولانا کی تقریر سے کچھ بدمزگی ہوئی تو میں اُس وقت موجود تھا۔ مجھ کو بھی وہ تقریر ناگوار ہوئی تھی۔ اِس کے بعد نواب محسن الملک مرحوم نے ایک پرائیویٹ خط میں مجھ کو لکھا۔ کہ مولانا سے صفائی کی بات چیت کروں۔ جس میں نواب صاحب نے خود دہلی آکر معافی مانگنے کی آمادگی ظاہر کی تھی میں مولانا مرحوم سے ملا۔ اور اُس خط کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے فرمایا۔ منشی ذکاء اللہ صاحب کے پاس بھی اِس قسم کا خط آیا ہے۔ مگر میں کسی رنجش کے سبب نہیں۔ بلکہ خلوت پسندی کے تقاضے سے اب پبلک زندگی کا ترک ہی کرنا اولیٰ سمجھتا ہوں۔ لیکن کالج کی بہتری و بہبودی کا خواستگار مدت سے ہوں۔ اور آخر تک رہوں گا۔ اِس کو اس سے کیا سروکار؟

یہ ہے اِن دونوں الزاموں کی حقیقت۔ اب مولانا بشیر الدین احمد سے خطاب ہے کہ وہ کیوں یادگار بازی کے قصوں اور نمائشی کاموں کی طرف رغبت کرتے ہیں۔ ہندوستان کے ہر مسلمان کے دل میں مرحوم کی شاندار یادگار موجود ہے۔ اور رہے گی۔ علی گڈھ کالج کی یادگار پتلیوں کا تماشا ہے۔ پتلی والے کے تار اور ہاتھ کے اشارے پر یادگاریں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ باقی اللہ اللہ خیر سلّا۔

(حسن نظامی)

منیجر - یہ بالکل سچ ہے کہ مولانا نذیر احمد خاں کی بزرگی اور جلالتِ قدر اس سے بالا اور ارفع و اعلیٰ ہے۔ کہ علی گڈھ کالج میں اُن کی یادگار اینٹ پتھر کی بنے۔ لیکن اس عالی شان اسلامی دار العلوم کی یادگاریں پتلیوں کے تماشے کا درجہ حاصل کریں۔ کیا یہ رونے کا مقام نہیں ؟ کیا بزرگانِ کالج کو چند حریص۔ خود غرض۔ شورش پسند لوگوں کے ساتھ اتفاق کرنا مناسب تھا؟

مولانا مرحوم کی یادگار کے متعلق مخبرِ دکن مدراس کی رائے مطبوعہ ۴ ستمبر سنہ ۱۹۱۲ عیسوی

یادگار شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب

علی گڈھ کالج میں قیامِ یادگار شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم کے متعلق آجکل اسلامی صحائف میں حرف زنی ہو رہی ہے مولانائے موصوف کے خلف الرشید جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب کی تمنا ہے کہ قومی مرکزِ علم میں اپنے لائق باپ کی یادگار قائم ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ذمہ دارانِ کالج کی طرف سے اس معاملے میں اطمینان بخش دلچسپی ظاہر نہیں ہوئی۔ جب اس سرد مہری کے متعلق شکایت ہونے لگی تو نواب وقار الملک بہادر نے اس کی یہ وجہ پیش کی کہ مولانائے مرحوم نے کالج کی جانب سے اپنی عنانِ توجہ پھیر لی تھی اور اُن کی ذات سے کالج کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ علاوہ بریں مرحوم نے آخرِ عمر میں ایک کتاب موسوم بہ امہات الامہ لکھی تھی جس سے مسلمانوں

کی سخت دل شکنی ہوئی اِس کے ساتھ بعض اصحاب کو یہ شکایت بھی ہی کہ مولانائے مرحوم نے اپنے رئیسانہ تمول سے قومی کاموں کی جیسے کہ چاہیئے تائید نہیں فرمائی - گو نواب صاحب کا ڈفنس اور دوسرے حضرات کے عذر بجائے خود درست ہوں - مگر معاملے کے دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے - کالج سے مرحوم کو عرصۂ دراز تک خاص تعلّق رہا - آپ سر سید احمد خاں مرحوم کے زبردست معاون سمجھے جاتے تھے - بعد میں اگر آپ کو ویسا اُنس نہ رہا تو اُس کی بھی کوئی وجہ ہوگی بعضوں کا خیال ہی کہ نواب محسن الملک بہادر سکرٹری کالج سے مرحوم کو کچھ شکر رنجی ہوگئی تھی اور ایسی صورت میں آپ کا معاملاتِ کالج سے دستکش ہونا ہی مناسب تھا رہا یہ امر کہ آپ نے ایک ایسی کتاب لکھی تھی جو موجبِ دل شکنی مؤمنین ہوئی - ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نے مسلمانوں کے دل دُکھانے کے خیال سے کتاب مذکور لکھی تھی بلکہ اُس کو یوں خیال کیا جائے کہ جو کچھ اُن کے پاس محقّق ہوا حوالۂ قلم کیا گیا - زمانۂ سلف میں کئی فضلا نے ایسی ایسی کتابیں لکھی ہیں جن پر تکفیر کے فتوے جاری ہو گئے - لیکن امہاۃ الامّہ کا معاملہ ہی جُدا گانہ ہی یعنی جب مصنّف علّام کو یہ معلوم ہو گیا کہ اُس کی وجہ سے اپنے بھائیوں کی دل شکنی ہوئی ہی تو فوراً اپنی کل مطبوعہ جلدیں علمار کے ذریعے تلف کروائیں جس نے اپنی عزیز تصنیف کو اپنے ہم قوموں کی دل داری کے خیال سے تلف کروا دیا ہو کیوں کر مستحقِ ستایش نہ ہو - مرحوم کی نسبت قومی معاملات میں دل چسپی نہ لینے کی شکایت بھی قابلِ تسلیم نہیں - کیوں کہ آپ کو کارہائے ندوۃ العلماً وانجمنِ حمایت الاسلام لاہور وغیرہ سے گہری دل چسپی رہی ہی - محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس آپ کے پُر اثر لکچروں سے محروم نہ رہا - ایک مصنّف کی حیثیت سے تو آپ کا پایہ نہایت بلند ہی - آپ نے اپنی قومی زبان اُردو کی وہ خدمت کی ہو کہ شاید ہی دوسرے شخص نے اُس سے بڑھ کر کی ہو - آج اُردو کی تائید میں انجمنوں پر انجمنیں قائم ہو رہی ہیں اور عمدہ کتابوں کی تصنیف کے لیئے انعامات عطا کرنے کی تجویزیں ہوتی ہیں - پھر بھی حسبِ دل خواہ کامیابی نہیں ہوتی

مولانائے مرحوم نے ترجمۂ قرآن شریف سے بھی قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہی جس سے فہمِ مطالبِ قرآنی میں بڑی مدد ملتی ہی - حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہی کہ بعد موت سب چیزیں منقطع ہو جاتی ہیں مگر اعمالِ صالح - خیراتِ جاریہ و اولادِ صالح - اِن میں سے اگر ایک بات بھی کسی کو حاصل ہو تو اُس کو خوش نصیب خیال کرنا چاہیئے - اور اگر وہ تینوں محاسن کا جامع ہو تو پھر کیا کہنا - اگر کسی کی اولاد صالح ہو تو ہمارے پاس بمنزلہ تینوں خوبیوں کے ہی کیوں کہ وہ خود عملِ صالح کا مظہر ہی اور اُس کی ذات سے خیرات جاریہ کی بھی امید بندھتی ہی - مثال کے لیئے مولوی بشیر الدین احمد صاحب کو لیجیئے - اور دیکھیئے کہ وہ اپنے والدِ مرحوم کے بقائے نام اور ثوابِ جاریہ کے لیئے کیسی فکر کر رہے ہیں گو اُنھیں اپنی کوششوں میں گونہ مایوسی بھی ہوئی - پھر بھی اُنھیں وہی خیال ہی - ہم امید کرتے ہیں کہ بزرگانِ علی گڈھہ ہمارے مرحوم بلند پایہ ادیب وبہی خواہِ قوم بزرگ کی یادگار قائم کرنے میں اُن کے سعادت مند فرزند کی ہمت افزائی میں دریغ نہ فرمائیں گے - اِس میں نہ فقط جملہ فدائیانِ قوم کی حوصلہ افزائی کا راز مستتر ہی بلکہ سعادت مند اولاد کی ہمتوں اور اُن کے کارہائے لائقہ میں مدد دینے کے ہم پایہ ہی - کون ہی جس نے تمام دینی اور دنیاوی امور انجام دیئے ہوں اور یہ بھی مشہور قول ہی کہ جو کام باپ سے نہ ہو سکا ہو اُس کو بیٹا انجام دیتا ہی جن لوگوں کو اس امر کی شکایت ہی کہ مولانائے

مرحوم کے تموّل سے قومی کاموں کو معتد بہ حصہ نہ مل سکا اُنھیں اطمینان سے متوقع رہنا چاہیئے کہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب جیسے اولادِ صالح کی نگرانی میں املاک مرحوم بالکل محفوظ و سربمہر ہیں۔ جس فیاضی کی مولانائے مرحوم سے تمنا کی جاتی تھی اس بات کی توقع اُن کے خلف الصدق سے بھی کی جا سکتی ہی۔ آنریبل صاحبزادے آفتاب احمد خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا کی ایک مراسلت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہی کہ اگر بورڈ آف ٹرسٹیانِ کالج کے روبرو یہ مسئلہ پیش ہوتا تو ہرگز مسترد نہ ہوتا۔ اِس سے امید بندھتی ہی کہ بزرگانِ کالج یادگارِ مولانائے مرحوم قائم کرنے میں جو ہر مردم شناسی و قدردانی اکابرینِ قوم کا ضرور ثبوت دیں گے۔ ہم یہ بھی کہنے پر مجبور ہیں کہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب اپنی تجویزِ یادگار پبلک کے آگے پیش فرمائیں تو مناسب ہو تاکہ اِس بات پر غور ہو سکے کہ اِس میں پبلک کو کیا حصّہ لینا چاہیئے اور مولوی صاحب کو اُس کے کامیاب بنانے میں کس قدر حوصلہ مندی کا اظہار کرنا ہوگا۔

یادگار کے متعلق آخری فیصلہ

مرحوم کے تعلّقات زیادہ تر علی گڈھ کالج۔ انجمن حمایت الاسلام۔ مدرسۂ طبّیۂ دہلی سے تھے۔ سرسید کے انتقال کے بعد اس میں شک نہیں کہ مرحوم کو علی گڈھ کالج سے وہ شغف نہ رہا تھا۔ پھر بھی نواب محسن الملک کی حیات تک کچھ نہ کچھ سلسلہ چلا ہی جاتا تھا۔ نواب وقار الملک کے عہد میں وہ رہا سہا تعلّق بھی جاتا رہا۔ دلوں کی خبر خدا جانے کہ اندرونی معاملہ کیا تھا مگر جہاں تک مجھے علم ہی مرحوم کئی کئی سال سے اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ نشست و برخاست سے بھی متعذر تھے اور اب تو ثقلِ سماعت اور ضعفِ بصارت نے بھی دبا لیا تھا۔ کہاں جاتے اور کیسے جاتے۔ برسوں سے باہر نکلنا۔ ملنا جلنا۔ لکچر دینا۔ سب چھوڑ چھاڑ دیا تھا۔ اور یہ حالت اُن کی کسی ناخوشی کی وجہ سے نہ تھی بلکہ مجبوری سے تھی۔ جب سے بصارت میں فرق آیا اکثر روتے رہتے تھے کہ میرا مشغلہ پڑھنے کا گیا۔ اب میرا جینا بالکل عبث ہی۔ ہمیشہ اُن کی دعا تھی کہ میں اپاہج ہو کر نہ جیوں کہ دوسروں پر بار ہوں۔ سو خدا نے اُن کی دعا پوری طرح قبول فرمائی۔ اُنھوں نے مرض الموت میں کسی سے خدمت نہ لی آناً فاناً ختم ہو گئے۔ علی گڈھ کالج نے تو یادگار بنانے کے متعلق سرے سے جوا ہی ڈال دیا۔ انجمن حمایت الاسلام نے کان تک نہ ہلایا۔ شاید اُن کو خبر بھی نہ ہو کہ کون مرگیا۔ مدرسۂ طبّیہ کے تعلقات حکیم عبد المجید خاں صاحب کے انتقال کے بعد ضعیف ہو گئے تھے تو حکیم اجمل خاں صاحب آیا جایا کرتے تھے لیکن پہلی سی بات نہ تھی۔ امہات الامّہ کے معاملے نے مرحوم کو ایسا سخت صدمہ دیا تھا کہ وہ پبلک لیف میں آنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے مدرسۂ طبّیہ کے سالانہ لکچروں کو بھی خیرباد کہا۔ جب علی گڈھ کالج نے سالہا سال کی محنت پر پانی پھیر دیا اور انجمن حمایت الاسلام نے رُخ تک نہ دیا تو مدرسۂ طبّیہ تو تیسرے درجے میں تھا۔ اُس سے نہ توقع تھی نہ شکایت۔ غرض اِدھر سے یادگار کا خاتمہ ہوا۔ مرحوم کی وفات کے بعد گو ایک تار تعزیت کا علی گڈھ کالج کے ٹرسٹیوں کی طرف سے خاکسار کے پاس آیا تھا۔ لیکن مدرسہ ایک منٹ کو بھی بند نہ ہوا۔ نہ کوئی تعزیتی جلسہ ہوا۔ حالانکہ ندوۃ العلماء کا مدرسہ جس سے مرحوم کو کوئی تعلق نہ تھا بند کیا گیا اور دوسرے مدارس حتّٰی کہ عربک سکول۔ سینٹ اسٹیفن مشن کالج دہلی بند ہوا اور نہ ہوا تو مسلمانوں کا قومی کالج! میں اپنی طرف سے یادگار قائم

کرنے کے متعلق نا امید ہو چکا ہوں۔

آزار او جراحتِ بیگانگاں رسد   مرہم منہ کہ زخمِ دل از آشنا رسید

میرے باپ کی یادگار میرے دل میں ہی اور جب تک مَیں زندہ ہوں۔ مَیں خود اُن کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی یادگار ہوں اور خدا کے فضل سے اُن کے پوتے بھی موجود ہیں اور یوں بھی اُن کی تصانیف ایک دوامی یادگار ہی جو مخالفین کے مٹائے سے بھی نہیں مٹ سکتی۔ ایک امہات الامہ نہیں۔ دس امہات الامہ کی آڑ پکڑیں۔ مسلمانوں میں اتنی قدرت نہیں اور قدرت کے علاوہ ہمت بھی نہیں اور ہمت کے سوائے صفائی قلوب بھی نہیں کہ اپنے کسی بزرگ قوم کی یادگار قائم کریں۔ ہاں البتہ کفر کے فتوے دینے کے لئے جس وقت کہو طیار ہیں۔ اب صرف ایک ضعیف سی امید مجھ کو مشن کالج دہلی سے ہی کیوں کہ پادری اینڈرو صاحب جو مرحوم کے بڑے دوست تھے وہ مجھے لکھ چکے ہیں کہ اُن کا ارادہ کالج میں یادگار قائم کرنے کا ہی اور اگر وہ اپنی آمادگی ظاہر کریں گے تو میں اُن کے ساتھ ہوں۔ مشن کالج میں یادگار قائم ہونے سے مجھے افسوس اور خوشی دونوں ہوں گی۔ افسوس اِس بات کا ہوگا کہ مسلمانوں کا کام عیسائیوں سے ہوا اور خوشی اس بات کی ہوگی کہ میرے والد کی یادگار نے عملی صورت اختیار کی۔ ایں ہم غنیمت است۔

امہات الامہ کا اخیر فیصلہ

جس عذر لنگ پر علی گڈھ کالج نے یادگار بنانے سے انکار کیا وہ امہات الامہ کی تصنیف تھی جس سے بیان کیا جاتا ہی کہ مرحوم کا مقصود مسلمانوں کا دل دُکھانا اور اُن کو آزار پہنچانا تھا۔ مسلمانوں کو اس کتاب سے دُکھ پہنچا یا نہیں اس کا علم تو مجھ کو نہیں ہی کیوں کہ میں نے سوائے چند دہلی کے مسلمانوں کے جو بانی مبانی اِس تمام شورش کے تھے اَور کسی کو شاکی تک نہ پایا نہ نفسِ کتاب میں سوائے اس کے کہ بعض جگہ شوخیٔ طبع سے کوئی فقرہ رَو میں نکل گیا ہو کوئی ایسی بات پائی جس سے اسلام کی توہین یا مسلمانوں کی دل آزاری مقصود ہو نہ مرحوم جیسے شخص سے اِس کی توقع ہو سکتی تھی کیوں کہ وہ بڑے پکّے مسلمان تھے۔ نماز کے سختی سے پابند تھے۔ نہایت خشوع و خضوع سے نمازِ پنج گانہ ادا کرتے تھے۔ خود حافظِ کلامِ الٰہی تھے۔ اکثر اوقات کلام مجید پڑھا کرتے تھے۔ مدّتوں سے اُن کو حالتِ وجد تھی۔ ہر وقت کلام مجید کی آیتیں۔ عربی کے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ اور زار و قطار روتے تھے۔ خدا کا ڈر تو اُن کے دل میں ایسا تھا کہ شاید کسی کے دل میں ہو۔ ہمدردی انسانی اُن کی فطرت میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کنبہ پروری۔ غربا سے سلوک۔ پوشیدہ امداد اور خیرات یہ سب باتیں اُن میں لاجواب تھیں۔ تکبر اور غرور اور نخوت اُن کو چھو نہیں گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی غریبی اور طالب العلمی کی حالت کو فخریہ بیان کیا کرتے ایسا شخص جس نے ساری عمر مذہبی زندگی بسر کی ہو۔ جس نے کلام مجید کا بے نظیر ترجمہ لکھا ہو۔ جس نے عمدہ سے عمدہ کتابیں اخلاق کی لکھی ہوں۔ جو طلبہ کو علم ادب اور کتب احادیث حسبۃً لِلّٰہ پڑھاتا ہو۔ جس کے لکچر سر سے پاؤں تک نصائح اور اخلاق کا مجموعہ ہوں جو بات بات پر قرآن مجید کی آیات اور احادیث سے استناد کرتا ہو جو کفر و الحاد سے کوسوں دُور ہو کیسے ممکن ہی کہ وہ شخص اپنی آخری عمر میں ایک ایسی کتاب لکھ دے جس سے مسلمانوں کے دل کیا دُکھیں گویا

خود اُس کی عاقبت خراب ہو۔ ایسی حرکت سوائے اِس کے کہ کوئی شخص مجنون ہو کسی ذی شعور سے ہو نہیں سکتی۔ اور یہ امر مسلّم ہی کہ مرتے دم تک اُن کے ہوش و حواس بجا تھے۔ امہات الامہ وہی مثل ہوئی کہ یاروں نے ایک نقطہ لگا کر دس کیا۔ اپنا دلی غبار اس پہلو سے نکالا۔ ماوشما کو کیا معلوم کہ کتاب میں کیا لکھا ہی۔ عوام نے ثقہ پوشوں سے سُنا سچ سمجھ گئے۔ دلّی کی سرزمین میں مذہبی مباحث کے نشو و نما کی خوب تاثیر ہی شمس العلماء مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی پر کب کفر کا فتوٰی نہیں ہوا جو ان پر نہ ہوتا۔ اگر ان پر کفر کا فتوٰی نہ ہوتا تو میری رائے میں اِن کی نیکنامی۔ اِن کی عظمت۔ اِن کی شہرت میں ایک بڑا نقص رہ جاتا۔ کفر کا فتوٰی بھی ماوشما پر نہیں ہوتا۔ بھی ایسوں ہی پر ہوتا ہی جن سے لوگ جلتے ہیں اور جلے پھپولے پھوڑتے ہیں جس زمانے میں امہات الامہ کی شورش بپا تھی میں نے بچشم خود ہر خطے اور ہر ناحیۂ ہندوستان سے معززین اور علماء کے صدہا خطوط والد کے نام دیکھے ہیں کہ آپ ہرگز اس کتاب کی اشاعت کو بند نہ کیجیے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ بیسیوں بیرسٹروں اور صدہا وکلاء نے لکھا کہ اگر عدالت تک یہ مقدمہ پہونچے گا تو ہم آپ کی طرف سے بلا مزد پیروی کرنے کو موجود ہیں۔ حکام نے بھی اِس شورش کو جاہلانہ ولولہ خیال کیا اور مرحوم کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن مرحوم کو شر و فساد بڑھانا منظور نہ تھا۔ انھوں نے چھپی چھپائی کتابیں حکیم اجمل خاں صاحب کے سپرد کر دیں اور انھوں نے جلوا دیں مگر پھر بھی لوگوں کے دل ٹھنڈے نہ ہوئے کہ اب یادگار قائم کرتے وقت مُردہ ہڈیوں کو اُکھیڑا گیا۔ امہات الامہ پر سرسید کی تفسیر سے زیادہ لے دے ہوئی ہی۔ امہات الامہ کا تو آج تک کوئی مفصل جواب بھی کسی نے نہیں لکھا۔ سرسید کی تفسیر کی تو دھجیاں بکھیری گئیں۔ سرسید کی دل آزاری (اگر مصلحانہ خیالات دل آزاری سے تعبیر کیے جا سکیں) تو مرحوم کی دل آزاری سے بدرجہا بڑھی ہوئی تھی اور کفر کے فتوے میں دونوں برابر تھے مگر بہت سی باتوں میں اِن پر بھی تفوق رکھتے تھے کہ دوزخ۔ بہشت۔ وجودِ ملائکہ۔ وجودِ شیطان کے قائل نہ تھے معجزات سے صریح انکار تھا لیکن اُن کی یادگار علی گڈھ کالج میں قائم کرنے سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ اور مرحوم سرسید کی خدماتِ قومی کی صحیح قدر اب ہو رہی ہی کہ مخالفین بھی اُن کو علیہ الرحمۃ سے یاد کرتے ہیں۔ قدرِ مردم بعدِ مردم۔ یہی حال ان شاء اللہ مرحوم کا ہو گا کہ آگے چل کر یہ لوگ پچتائیں گے اور ان ہی کو عمدگی سے یاد کریں گے اور اپنی قوم کی حالت پر سر پر ہاتھ دھر کر روئیں گے کہ افسوس اب کوئی ایسا بھی نہ رہا۔

امہات الامہ دُنیا کے پردے پر سے ناپید ہو گئی لیکن پھر بھی ہزارہا اُس کے خواہش مند موجود ہیں۔ مخالفین کی شورش نے اُس کی قدر بڑھائی۔ عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد۔ مولوی سید علی بلگرامی اگر زندہ رہتے تو لوگ دیکھ لیتے کہ اِس امہات الامہ کا انگلش ایڈیشن کیسے خزانے نکلتا مگر ع آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند۔ میں نے سمجھا تھا کہ مرحوم کے ساتھ امہات الامہ بھی خواجہ باقی باللہ میں دفن ہو گئی لیکن اب جو میں دہلی گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تو دھڑلے سے تمدن میں چھپ رہی ہی اور میرے ماموں زاد بھائی مولوی عبد الراشد صاحب الخیری اُسے چھاپ رہے ہیں۔ مجھے اُن کی اس جرأت پر تعجب ہوا۔ اُن سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ جب اوکھلی میں سر دیا تو دھماکوں کا کیا ڈر۔ شورش ان پر بھی بہت کچھ ہوئی۔ دھمکیاں بھی دیں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب تک دوڑے۔ واویلا کی مگر ایک نہ چلی اور چلتی کیسے جب اُس میں کچھ دم بھی ہوتا نتیجہ یہ کہ کتاب بلا غل و غش نکل رہی ہی اور مخالفین ہو نہ دیکھ رہے ہیں مجال نہیں کہ کان ہلائیں۔ یا عبد الراشد صاحب سے یہ پوچھیں کہ میاں تمھارے مونہ میں کے دانت ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ہر فرعونے را موسیٰ۔ میں نے خود جماعتِ مخالفین کے ایک بڑے رکن سے پوچھا کہ کیوں حضرت یہ کیا معاملہ ہی۔ یا وہ شور اشوری یا یہ بے نمکی۔ والد مرحوم کے وقت میں آپ نے آگ لگا دی تھی کتاب کو آگ لگا کر ہی چھوڑا۔ اب آپ کس خواب خرگوش میں ہیں تو انھوں نے ہنس کے جواب دیا "ارے میاں وہ تو مولوی نذیر احمد سے مقابلہ تھا۔ خاک از تودۂ کلاں بردار۔ یہ تو عبد الراشد چھاپ رہے

ہیں۔ اُن کے مُونہ بھی کون لگے ۔ اب اس سے منصف مزاج صاحبان اندازہ فرمالیں کہ نفسِ کتاب اُمہاۃ الامۃ سے بحث تھی یا م
نذیراحمد کی ذات سے۔ اگر نفسِ کتاب سے بحث ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ آج وہ کتاب نکل سکتی اور عبدالرشید صاحب کی ہمت کہو یا جراُت یا
نصیبی کہ اُمہاۃ الامۃ کی بدولت اُنکے رسالہ تمدن کو چار چاند لگ گئے۔ اشاعت اس کی بے انتہا بڑھ گئی جو سنتا ہی کہ اُمہاۃ الا
چھپ رہی ہو وہی اُس کا خریدار بن جاتا ہو۔ ناظرین کے ملاحظہ کے لیئے میں مولوی عبدالرشید صاحب کا وہ خط پیش کرتا ہوں جو
امرتسر مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۱۲ء میں چھپا ہی۔ گو اس میں اُنھوں نے لکھا ہی کہ مرحوم سے نظرثانی کرائی گئی مگر یہ فقرہ صرف ایک حکمتِ عملی ہی
اود ہاکر پیچھے نہ پڑیں۔ وہ صاحب جنکے پاس مطبوعہ نسخہ سابق موجود ہی ملالیں اور دیکھ لیں کہ کیا نظرثانی ہوئی ہی۔ بہرحال کتاب بی
رہی ہو اور بلاکم وکاست چھپ رہی ہی جو مرحوم نے لکھی تھی۔ اور اب چوں کہ مرحوم ہی دنیا کے پردے پر نہ رہے مخالفوں کی مخالفت
بھی سرد ہوگئیں۔ اور اُن کا اصلی مقصود جو اُن کا دل دُکھانا اور اپنا کام اُس کی آڑ میں نکالنا تھا۔ اب وہ موقع کہاں باقی رہا۔ ر
مولوی عبدالرشید وہ آہن بہ آہن کوفتن خود فتنہ پردازوں سے اگر کوئی اُن کے مقابلے پر آیا تو اچھی طرح سلٹ لیں گے۔

اُمّہاۃُ الاُمّہ

عم مغفور و اُستاد مرحوم شمس العلما مولوی حافظ نذیراحمد صاحب مرحوم نے جس وقت یہ کتاب تحریر فر
تو بعض تنگ خیال مسلمانوں نے جس میں زیادہ تر طلبا رِ مساجد شامل تھے اُس کی سخت مخالفت کی۔ جیس
جیسا کہ اس کے موضوع سے ظاہر ہی۔ اُن غیر مسلموں کے اعتراض کا جواب تھا جو رسالت مآب صلعم کے تعددِ ازدواج پر رکیک ح
کرتے ہیں۔ ظاہر ہو کہ ایسے شخص کو جو غیر مسلموں کے سامنے پیغمبرِ اسلام صلعم کی صداقت کا مدعی ہو حُسنِ عقائد کو الگ کر کے دعوی اپن
ثابت کرنا چاہیئے تھا۔ جو منطق، فلسفہ، معقول اور تاریخ کی کسوٹی پر پارس ثابت ہو یہی تھا قابل مصنف کا سب سے بڑا مقصو
کو بعض مسلمان برداشت نہ کرسکے اور کتاب بروۂ دنیا سے ناپید ہوگئی۔

اِس کتاب کی ناقدری کا جو کچھ اثر قابل مصنف پر ہوا اُس کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہی کہ جب علامہ بلگرامی مرحوم نے کتا
دیکھ کر یہ خواہش ظاہر کی کہ کتاب انگریزی میں ترجمہ کر کے یورپ کے سامنے پیش کی جائے اور علامہ بلگرامی اسی خدمت پر آمادہ ہوئے تو مولانا
مرحوم نے کوئی جواب نہ دیا۔

زیادہ افسوس اِس امر کا ہی کہ جب مولانائے مرحوم کی یادگار کے متعلق برادرِ مکرم مولوی بشیرالدین احمد صاحب نے تحریک کی۔ تو دگو
میں اُس کی تردید ہوئی۔ انسٹیٹیوٹ گزٹ نے جو ہماری قومی درس گاہِ علی گڈھ کا ارگن ہی اپنی بحث میں اس کتاب کا حوالہ بھی یادگار قا
نہ کرنے کے اسباب میں دیا حالانکہ امرِ واقعی یہ ہی کہ کالج اور کانفرنس کا ایک ایک ذرّہ اگر وہ احسان فراموش نہ ہو تو مدۃ العمر مولانائے مرحوم کے گیت گا
برادرِ معظم مولوی بشیرالدین احمد صاحب کو اُن کے مرحوم باپ کی خدمات کا جو معاوضہ محمڈن کالج علی گڈھ نے دیا وہ صرف اُن کی ذات تک محدود ون
بلکہ آئندہ کام کرنے والوں کے واسطے بھی ایک سبق تھا اگر صاحب نادے آفتاب احمد خاں صاحب کالج کے دامن سے یہ دھبّہ دُور کرنے کی کوشش فرماتے۔ واسـ
شاگردی اور قرابت سے علیحدہ ہو کر میری رائے میں اُمہاۃ الامۃ کا تلف ہونا موجودہ حالت میں مذہب کے لیئے ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔ اس لیئے جیسا کہ میں
میں اعلان کرچکا ہوں۔ میں نے اُمہات الامۃ کو زمانۂ حیات میں عم مغفور سے طبع ثانی کے واسطے نظرثانی کرایا۔ چوں کہ مجھے یہ حکم تھا کہ سوا اس
کتاب کا ایک لفظ بھی تبدیل نہ کیا جائے میں نے اُس کو باقساط رسالہ تمدن میں شائع کرنا شروع کیا اور یہ سلسلہ جون ۱۹۱۲ء سے جاری ہی۔ اب کہ میں اپنے اس
فرض کو پورا کرنا چاہتا ہوں کہ اُمہاۃ الامۃ انگریزی میں ترجمہ ہو میں عام طور پر اعلان کرتا ہوں کہ اگر کسی مسلمان کو کسی لفظ پر اعتراض ہو تو وہ اپنے اعتراض